رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
aanchalpk.com aanchalnovel.com
URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com
عید الاضحیٰ مبارک
قیمت =/50 روپے
نئے افق
قیمت =/50 روپے
شمارہ ستمبر ۲۰۱۸
Digitized by Google

رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

نئے اُفق

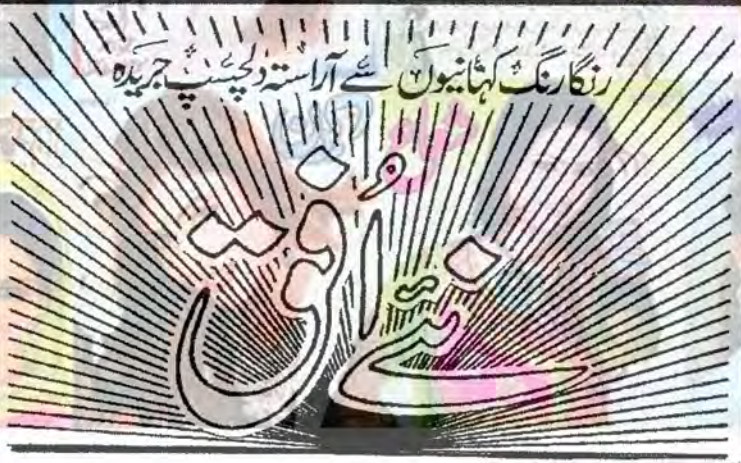

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

پاکستان (فی پرچہ)	50 روپے
پاکستان (سالانہ)	600 روپے

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین

جلد 42
شمارہ 08
ستمبر 2018

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
editorufaq@aanchal.com.pk

NAEYUFAQ PUBLICATION

URDU TUBES
www.urdutubes.com

10
دستک
مشتاق احمد قریشی

12
گفتگو
اقبال بیٹی

20
اقرأ
طاہر قریشی

22
حصار
امجد جاوید

84
اعتراف
محمد سلیم اختر

94
چال باز
ریاض بٹ

108
عورت نامہ
نفیسہ سعید

116
وہ تیس دن
عمارہ خان

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

136 — تیسری جنگ عظیم سے قبل — ڈاکٹر ریاض توحیدی

138 — سفید ہیولہ — زرین قمر

166 — آسیب — ماہ رخ ارباب

178 — بکرا چور — ایم زیڈ شیخ

185 — فن پارے — ادارہ

234 — ذوق آگہی — سباس گل

238 — خوش بوئے سخن — نوشین اقبال نوشی

242 — مرشد — ساحر جمیل سید

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74400 فون نمبرز 021-356203771/2
فیکس 021-356203773 نئے افق پبلی کیشنز کی ایک پیشکش ۔ مطبوعات نئے افق info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

وہی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے

گزشتہ دنوں مملکت خداداد پاکستان میں انتخابات ہو گئے کیسے ہوئے کیونکر ہوئے یہ الگ بات ہے تمام شکست خوردہ جماعتوں اور افراد کا کہنا ہے کہ اس بار جس طرح انتخابات میں دھاندلی کی گئی کبھی اس۔ سے پہلے اس طرح نہیں کیا گیا پچھلی بار ایک جماعت مسلم لیگ کو اکثریت ملنے پر بھی تمام متعلقین نے ایسا ہی کچھ کہا تھا حیرانگی تو اس بات پر ہوتی ہے کہ نہ صرف سیاسی جماعتیں بلکہ نام نہاد مذہبی جماعتیں بلکہ خالص ترین اپنے آپ کو کہنے والی اور ثابت کرنے والی مذہبی جماعتیں تک ایک آواز ہو کر انتخابات کو یکسر رد کر رہی ہیں پاکستان جو خالص ایک مذہبی نظریے پر قائم ہوا تمام سیاسی مذہبی اور دیگر اقسام کی متحرک جماعتیں بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی مملکت ہے میرا تمام سیاسی اور انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں سے سوال ہے کیا واقعی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مملکت خداداد پاکستان جس کا قیام اسلام کے نام پر ہوا اور اللہ نے اسے رمضان کی مبارک ترین شب میں قائم فرمایا اس مملکت کا آئین بھی اسے اسلامی مملکت قرار دیتا ہے پھر کیوں ہمارا ایمان دنیا کی ہوس میں اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کے قائم کردہ فیصلوں کی اپنے دنیاوی۔ مفادات کے لیے نفی کرتے ہیں قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''وہی عزت و ذلت کا مالک ہے'' وہ حاکم الحاکمین ہر کسی کی ہر طرح کی عزت و ذلت کا اختیار کل ہے کم از کم دین سے تعلق رکھنے والے تو اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں اگر اس بار ان تمام سیاسی، مذہبی جماعتوں کی مخالف جماعت کو اللہ نے کامیابی عطا کر دی ہے تو اس میں کسی کو حیران و پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں دنیا ہمارے اور تمام انسانوں کے لیے ایک کھلی امتحان گاہ ہے اللہ نے اب تک جن افراد کو اور بطور اجتماع جماعتوں کو مملکت خداداد اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع دیا انہوں نے اسے اپنی نااہلی اور موقع پرستی مفادات کی ہوس میں اس قابل نہیں رہنے دیا کہ رب کائنات انہیں اب مزید موقع دیتا اس لیے ہو سکتا ہے اب اس پروردگار عالم نے ایسے اسباب پیدا فرمائے ہوں جس سے جیتنے والی جماعت کی تمام رکاوٹیں ہٹتی چلی گئیں کیا پاکستانی عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے تین بار وزیراعظم بننے والے شخص اور اس کی جماعت نے بار بار موقع ملنے کے باوجود وہ نہ اسلام کے لیے نہ ہی مملکت خداداد پاکستان کے لیے کچھ کر سکا آخر کیوں؟ دراصل اللہ نے تو موقع دیا لیکن موقع سے فائدہ اٹھانے والوں نے اپنی آخرت کا سودا کر لیا اور دنیا کے فائدے حاصل کرنے میں لگ گئے اللہ نے اس شخص کو موقع دیا کہ وہ اب بھی سمجھ سکتا ہے تو سمجھ جائے سدھر جائے لیکن وہ تو لکیر کے فقیر کو مانند اپنی دنیا ہی کے حصول میں لگا رہا (کیونکہ تاجر ہمیشہ اپنی تجارت کے فروغ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اسے مفاد عامہ کی فکر نہیں ہوتی) تب اللہ کا غضب حرکت میں آیا جو شخص پوری طرح باخبر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس کی اہلیہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے کو بیرون ملک جہاں وہ ہر طرح سے محفوظ رہتا اپنے بچوں کے ساتھ ہی رہ رہا تھا اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خود قید و بند کے لیے وطن واپس آ جاتا ہے اور حسب توقع اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ قید ہو جاتا ہے اس تمام کارروائی کو اگر۔۔ سے سوچا اور سمجھا جائے تو اس میں اللہ کی حکمت و قدرت نظر آتی ہے کہ اللہ کس طرح عزت کی اونچے ترین مقام پر بٹھاتا ہے اور کس طرح لمحوں میں سب کچھ خاک نشین کر دیتا ہے بے شک اللہ ہر چیز پر ہر طرح سے قادر ہے نواز شریف کی جماعت مسلم لیگ ن ہو یا اور دیگر سیاسی مذہبی جماعتیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں (سب کے سب تجارت کرنے آتے ہیں) کوئی کم کوئی زیادہ اللہ نے ہر ایک کو خوب خوب ان کی اوقات سے سوا موقع دیا لیکن کسی نے حب الوطنی کے جذبے سے ملک و قوم کی ملنے والی ذمہ داری نہیں نبھائی سب کے سب شیطان کا شکار ہو کر مفاد پرستی کی ہوس کا شکار ہو گئے۔

اب اگر رب ذوالجلال جو حاکم الحاکمین نے بھی عمران خان کی جماعت کو موقع دیا ہے تو یونہی بلاوجہ نہیں دیا عمران خان کا ماضی ہر قسم کی بدعنوانی بے ایمانی سے پاک ہے اس میں اللہ نے لڑنے کا ہار اور جیت کو سہنے کا حوصلہ بھی دیا ہے اور دنیاوی علم بھی دیا ہے اس کا ماضی گواہ ہے کہ اس نے جب جب جس کام کا بیڑہ اٹھایا اسے پوری دیانت داری سے پورا کیا اس کے ذاتی کردار پر جا ہے جیسے داغ دھبے

Digitized by Google

ہوں لیکن ملک وقوم کے لیے اس نے اپنے دیدہ دل فرش راہ کر رکھے ہیں مفاد عامہ کے کام کرتا رہا ہے اس نے خود کو اور اپنے سے متعلق تمام افراد کو ہر وقت ہونے والے احتساب کے لیے پیش کیا ہے اگر ان کے دل میں کوئی چور ہوتا تو وہ کبھی یوں کھلے عام احتساب کی بات نہ کرتا نہ ہی خود کو احتساب کے لیے پیش کرتا کچھ لوگوں کے نزدیک اگر اس کے کردار میں کچھ خرابی ہے جو ذاتی نوعیت کی ہیں تو وہ ان سے انکار نہیں کر رہا نہ انہیں چھپا رہا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس میں منافقت نہیں ہے وہ جیسا بھی ہے سب کے سامنے ہے اب اس کا اصل امتحان شروع ہونے والا ہے مسند اقتدار پر براجمان ہوتے اس کے بھی چودہ طبق روشن ہو جائیں گے وہ اور اس کے ساتھی کتنے پانی میں ہیں پتا چل جائے گا۔

دیکھا اور سمجھا جائے تو اللہ نے ایم کیو ایم کے الطاف حسین کو بھی بہت موقع دیا ہر طرح کی سہولت سے نوازا فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھایا لیکن ان کا ہاضمہ خراب ہو گیا وہ اور ان کی جماعت اللہ کی عنایات وانعامات کو ہضم نہیں کر سکی اور لیے جانے والے امتحان میں فیل ہو گئے اور پھر عرش سے فرش پر گرا دیا گیا وہ شخصیت جس کے ایک اشارے پر لاکھوں کا مجمع سانس تک روک لیتا تھا آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا ہے خود اس کے دائیں بائیں رہنے والے جاں نثار اس پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو عزت جو مرتبہ دیا تھا وہ اسے سنبھال نہیں سکے اس بار جو کچھ ان کے اور ان کے ناراض ساتھیوں کے ساتھ ہوا وہ امر الٰہی ہے تکبر تو صرف اللہ کی ذات کے لیے ہی بجتا ہے۔

کون ہے جو اللہ کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے آج جو علمائے سیاست اور علمائے ریاست اور علما کرام جس طرح اپنی اپنی نادیدہ شکست پر تڑپ رہے ہیں وہ حیرانگی کی بات نہیں ہے سب کے سب اس حمام میں یکساں ہیں کوئی کسی سے کم نہیں ایک سے بڑھ کر ایک ہے اللہ کی منشا اور رضا کو سمجھ لیں تو کسی سے کوئی اختلاف نہ ہو اب اگر تمام تر کوشش واحتجاج کے بعد چند نشستیں کسی کو مل جائیں تو کیا عمران خان کی جماعت کا رستہ روک سکیں گے یا تمام منافع کو بدل سکیں گے اگر وہ کسی طرح کامیاب بھی ہو جائیں تو وہ کیا نیا کر سکیں گے عمران خان نے تو جب محسوس کیا کہ اس کی جماعت بازی جیت رہی ہے تو ایک ذہین کھلاڑی کی مانند فوراً فیصلہ کر کے عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خلاف ضابطہ طور پر عوام سے خطاب کر کے ایک نئی ریت ڈالی ہو سکتا ہے اللہ اس سے کوئی بڑا کام لینے والا ہو اہل وطن کو یہ یاد ہو گا کہ پیپلز پارٹی کے بانی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو جن کے بارے میں ان کے قریبی لوگوں کا کہنا تھا کہ صاحب پی کے ہوش میں آتے ہیں کے ذریعے نہ صرف مملکت اسلامیہ میں شراب پر پابندی لگوائی اور بر سہا برس سے قائم قحبہ خانوں کو کافر قرار دلوایا اور جمعہ کی چھٹی کو قانوناً نافذ کیا یہ سب قطعی جناب بھٹو کے اپنے بس کی بات نہیں تھی اللہ جس سے جو چاہتا ہے کرا لیتا ہے ایسے ہی ہو سکتا ہے اللہ جو عالم الغیب ہے جو ہر طرح سے ہر ہر چیز سے پوری طرح باخبر رہتا ہے خطے میں آنے والے وقت میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کے تدارک کے لیے اللہ نے عمران خان کو چنا ہو وہ اس سے یقیناً کوئی ایسا کام لینا چاہتا ہے جو سابقہ حکمرانوں کے بس کی بات نہ ہو گی اللہ نے انہیں ان کے کیے کی سزا یہیں اسی دنیا میں دے دی ان کے لیے یہ سزا بھی اللہ کا انعام ہو سکتی ہے اگر وہ اس پر قناعت کریں اور شکر ادا کریں ہو سکتا ہے کہ ان کی آخرت کی بھلائی اس میں مضمر ہو اللہ کی حکمتوں کو ہم نہیں سمجھ سکتے بندے کو تو ہر حال میں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے کیسی بھی تکلیف ہو یا راحت سب حکم الٰہی سے ہی ممکن ہے جو رب اتنا رحیم ہے کہ وہ ایک کانٹا چبھنے پر بھی اجر عطا کرتا ہے وہ کیسے کسی اپنے بندے کو تکلیف میں مبتلا کر سکتا ہے تمام اہل وطن کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور آنے والے وقت کی بہتری کا انتظار کرنا چاہیے ہو سکتا ہے کہ اللہ نے مملکت خداداد اسلامیہ کے لیے ایک بہتر بندوبست فرمایا ہو مسند اقتدار پر بیٹھنے والوں کے لیے انہیں راہ راست پر رکھنے کے لیے بھی ایک مضبوط حزب اختلاف کا بندوبست کیا تاکہ مسند اقتدار ملتے پر وہ کہیں اور کسی اور طرف پھسل نہ سکیں تمام اہل وطن کو اللہ کے حضور دعا کرنی چاہیے کہ آنے والے حکمرانوں کو سیدھی راہ پر چلنے والا اور وہ تمام کیے گئے سنہرے وعدے اور دعوے پورا کرنے والا بنائے جو انہوں نے عوام سے کیے ہیں اللہ ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور نئے آنے والے حکمرانوں کو ملک وقوم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

Digitized by Google

http://facebook.com/naeyufaqonlinemagazine
Email:editorufaq@aanchal.com.pk

گفتگو

اقبال بھٹی

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد

تمام قارئین کو عید آزادی مبارک ہو، اللہ اللہ کر کے عام انتخابات کا مرحلہ مکمل ہوا جب پرچا آپ تک پہنچے گا انتخابات کے نتیجے میں بننے والی نئی حکومت حلف اٹھا چکی ہوگی، قوم عید آزادی کے ساتھ نئے وزیراعظم عمران خان کا جشن بھی منا رہی ہوگی اس آزادی کے لیے ہمارے بزرگوں نے بہت قربانیاں دی ہیں لیکن افسوس ہم اس آزادی اور بزرگوں کی قربانی کی قدر نہ کر سکے یہ ملک اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا مگر ہم نے خود کو فرقوں اور قومیتوں میں بانٹ دیا ہم خود اپنے دشمن بن گئے آج ہم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہم خود دونوں ہاتھوں سے ملک کو نوچ رہے ہیں ہم پر جو حکمران مسلط رہے انہیں ہم نے ہی منتخب کیا اب دیکھیں عمران خان کیا کرتے ہیں کہ انہیں بھی قوم نے منتخب کیا ہے اگر ہم نیا پاکستان خود مختار پاکستان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں خود کو بدلنا ہوگا عمران خان کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں کہ اس کے ہلانے سے نیا پاکستان فوراً بن جائے گا یاد رکھیں اللہ بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا ہوش نہ ہو ہم نے اپنی حالت، خود بدلنی ہے اس ملک کو آگے لے جانا ہے ہر شخص دوسروں پر الزام لگانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکے کہ اس نے ملک و قوم کے لیے کیا کیا۔

اس ماہ معروف ادیب امجد جاوید کا ناول حصار بھی شامل اشاعت ہے طویل ہونے کے باعث یہ دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے انہوں نے نئے افق کے لیے ایک سلسلے وار کہانی بھی لکھنے کا وعدہ کیا ہے ان شاء اللہ حصار آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ جناب مدیران وایڈیٹر السلام علیکم اقبال بھٹی صاحب بمع اسٹاف خیریت مطلوب اللہ سب کو سلامت رکھے، لیجیے بہت بڑا معرکہ انتخابات کا بخیر و عافیت گزر گیا اور ہم نے زندگی میں پہلے اچھے اور ایماندار قسم کے پول دیکھے ہیڈ آف ٹیسٹ بھی مڈل کلاس اور غریبوں کا حامی آیا ہے کاش اللہ تعالیٰ ان کی اچھی نیت اور کام کرنے کے ارادے میں برکت ڈالے، آمین۔ معاشرے میں درد مند، غریبوں اور لو انکم والوں کے حامی بڑے بڑے کام کرنے والے آگئے ہیں جیسے آرمی چیف، چیف جسٹس وغیرہ چیف جسٹس نے بھاشا اور مہمند ڈیم کا بیڑہ اٹھالیا ہے اور اللہ برکت بھی ڈالے گا پچھلے دنوں ان ڈیموں کے لیے صدقہ جاریہ کا ذکر ہوتا رہا اس ضمن میں روزنامہ جنگ میں محترم مشتاق احمد قریشی کا قابل ستائش، قابل تعریف زبردست کالم پڑھا عنوان تھا دس روپے یہ کالم بھی پڑھنے کے قابل تھا چشم کشا اور دل میں اترنے والا جسٹس صاحب اور مشتاق احمد قریشی صاحب جیسے لوگ صدقہ اور بھرپور شرکت کر کے ڈیم بنانے کے لیے کہہ رہے ہیں اور ادھر ہمارے وزیر اعلیٰ کہہ رہے تھے کہ اقتدار میں آ کر بھاشا ڈیم چین سے بنوائیں گے مطلب اپنا حصہ جو وصول کرنا ہے۔ اللہ ہدایت دے، آمین۔ آیئے میگزین کی طرف۔ پہلے تو ایک اور ابن صفی نمبر کی خوش خبری سیروں دل کا خون بڑھا گئی انتظار رہے گا۔ میگزین بہترین پوزیشن میں ہے گیٹ اپ، تحریر، مواد اور انتہائی زبردست کہانیاں آپ لوگوں کی محنت ہی سے میگزین آج یہاں تک پہنچا۔ ہاں شکر ہے کہ ہم لوگوں نے دوسروں کی طرح ٹائٹل پر قیمت نمایاں طور پر لکھی تھی زبردست جناب ٹائٹل حسب معمول نمایاں، منفرد اور پرکشش، ماہ بہ ماہ بہتر سے بہترین۔ فہرست خوب صورت اور نکھری نکھری سی۔ گفتگو میں اقبال بھٹی نے بڑا خوب صورت چمن سجایا ہے، ابن صفی کا ذکر بھی مزہ دے گیا بے صبر دوسرے نمبر کے لیے، انتخابات کا ہاہو ختم ہو چکا اور سیٹوں سے محروم

اپنے زخم چاٹ کر بھرپور احتجاج کرنے کی تیاریاں شروع اور زخم چاٹ رہے ہیں۔ خطوط میں ریاض بٹ اوپر بیٹھے ہوئے ہیں خط زبردست ہے چشم کشا اور فرداً فرداً تبصرہ نگاروں کو خوب صورت جواب اور ان کی تسلی بھی کردی پوری طرح بڑا بہترین تبصرہ ہے اس دفعہ آپ کی کہانی چشم کشا اور دل میں اترنے والی خوب رہی دیرینہ دوست محترم ریاض حسین قمر رقمطراز ہیں منگلا سے وہ جگہ قیمتی انمول اور بجلی دینے والا منگلا جس کا میں چالیس سال پہلے آفیشل طور پر وزٹ کیا کرتا تھا جناب ریاض صاحب یاد آپ بھی آتے رہتے ہیں نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کی الفاظ کی تصیح کا بھی شکریہ۔ ہمارے تبصرہ نگار محمد رفاقت واہ کینٹ صاحب گفتگو اور ابن صفی نمبر کے بارے میں رطب اللسان ہیں ابن صفی کے بارے میں خوب۔ لکھا ہے میری کہانی کی تعریف کا بے حد شکریہ آپ نے اچھا لاہور کی زبوں حالی کا ذکر کیا انتخابات میں ساری کسر نکل گئی اللہ برکت ڈالے اگلی حکومت کی کارکردگی میں۔ چند افراد شرکت کیوں کر رہے ہیں ایم حسن نظامی آپ کا تبصرہ بہت ہی بہترین ہے مسلسل آتے رہا کریں شکریہ۔ کہانیوں کی بات امین بھایانی کی خاموشی کا شور میں مانی کا کردار ایک واقعہ ہے لحہ بہ لحہ قاری کہانی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا آخر تک نکل جاتا ہے اور ابو کے جذبات بھی زبردست اور سوچ بھی چشم کشا اسحاق جنجوعہ کی طواف قارئین کی نہ صرف آنکھیں کھول دیتی ہے بلکہ زبردست انوکھے خیالات، انداز بھی انوکھا کہ چوہدری کا وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑا ہونے کا ایسا انداز چوہدری صاحب کو لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے گمشدہ محبت بھی ابراہیم جمالی نے انوکھی لکھی سندھی کہانی کا ترجمہ بھی خوب مہارت سے کیا ہے سجاول خان نے چھوٹی کہانی میں ایک زبردست اور بڑی غلطی کو اجاگر کیا ہے کہانی بڑی اچھی لکھی گئی پلاٹ بہت بہترین تھا زبردست تھی آبگینہ تو عرفان رامے کی چشم کشا تاریخی کہانی تھی اور پرانے تاریخی ناول یاد آئے خان صاحب اکثر آیا کریں۔ نمک حرام کو شروع میں زیر بحث لا چکا ہوں ریاض بٹ کی زبردست اور انتہا سے زیادہ دلکش کہانی تھی۔ غلطی مہتاب خان کی چونکا دینے والی کہانی تھی۔ پچھلی کہانی کی مماثلت بھی محسوس ہوئی غلطی بڑی توجہ حاصل کرنے والی کہانی، ہے ویلڈن عارف شیخ میرا خیال ہے اس طرح کے ایک ہائی کلاس کے محکمہ میں رہ چکے ہیں اتنی شاندار تسلسل والی کہانی اور عوام کو پیچھے رکھنے والی اپنی مطلب کے حساب سے لاکھوں روپے ماہ بہ ماہ اپنی سہولت اور عیاشی پر بہا دینے والے نجانے کتنی میٹنگیں ہو جاتی ہوں گی شیخ صاحب آپ ہر ماہ آیا کریں منفرد طرز تحریر فن پارے ہمارے میگزین کا انوکھا سلسلہ آپ لوگوں نے شروع کر رکھا ہے دس عدد ایک سے بڑھ کر ایک تحریر مذہبی تحریر بہت ہی چشم کشا تھی انتہائی انوکھے آئیڈیا ز تحریر بھی بہت خوب مثلاً عبداللہ، دیوانہ پن، کسک اور تماشا بار بار پڑھنے کے لائق تھیں۔ دستک تو چشم کشا تحریر ہے اور زبردست خیالات اور طاہر قریشی کی تحریر الرزاق تو دل و دماغ میں اترنے اور اثر کرنے والی ہے جزاک اللہ جناب۔ کچھ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں اور یہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک معلوم ہوتی ہیں۔ تبصروں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے عرض کرتا ہے کہ دیرینہ دوست ماضی کے ساتھی آئیں اور اپنے میگزین کو بھی چار چاند لگائیں منچن آباد والے کہاں ہیں اور دوسرے پلیز آ جائیں۔ خوش بو سخن، بہترین اور عمدہ معیار کی طرف رواں دواں ہے نوشین صاحبہ کو مبارکباد شہزاد نیر، ربیعہ امجد، ریاض حسین قمر، ایم حسن نظامی، محمد اسلم جاوید، اقرا جٹ اور دعا علی بہترین۔ ذوق آگہی بھی آپ لوگوں کا بہترین چناؤ ہے اور سباس گل تو خود بھی خوش بو سخن میں آتی رہتی ہیں عبدالجبار رومی انصاری، ریاض بٹ، ایم حسن نظامی، ایس حبیب، گل مہر، ایم حسن کی تحریریں نسبتاً اچھی تھیں ویسے تو ہر تحریر ایک نگینہ تھی۔ آپ صاحبان کی مسلسل تگ و دو ان تھک محنت اور محنت شاقہ نے آج ہمارے میگزین کو ایک بلند مقام پر پہنچا دیا ہے صدر کے ایک اچھے بک اسٹال پر اکثر جاتا ہوں تو واقفیت بھی ہوگئی ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے میگزین کی فروخت ہونے کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو خوش آئند بات ہے۔ مجلس احباب کو سلام دعائیں۔

پرنس افضل شاہین...... بھاولپور۔ اس بار بھی نئے افق لیٹ ملا اور آج 28 جولائی کو تبصرہ لکھ رہا ہوں، پچھلا خط میں نے 30 جون کو ارسال کیا تھا مگر شائع نہ ہو سکا جبکہ خط دو دنوں میں پہنچ جاتا ہے چلیں کوئی بات نہیں اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں سرورق دیکھ کر یہ قطعہ ہونٹوں پر مچلنے لگا۔

Digitized by Google

کس رات کی آنکھوں میں پیمان سحر ہوسکا
یہ خواب جو کو نپل ہے کس رات میں سحر ہوگا
سہمے ہوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے
اس کا بھی یہاں کوئی اجڑا ہوا گھر ہوگا

انکل جی دستک میں ہمیں خبردار فرمارہے تھے جی ہاں پاکستان کا خطہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے چین ہمیشہ کی طرح پاکستان کا دوست تھا ہے اور ہمیشہ رہے گا، امریکا چین کی وجہ سے ہم سے پنگا نہیں لے رہا ہے۔ اسرائیلی، بھارتی، امریکی جاسوس پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، پاکستان پر اللہ کا کرم ہے اور یہ اسلام کے لیے بنا ہے افواج پاکستان سیسہ پلائی دیوار ہے ان کی وجہ سے اور چین کی وجہ سے دشمن پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا، پارلیمنٹرین نے فاٹا کو قومی دھارے میں لاکر بہت اچھا اقدام کیا ہے، گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب ابن صفی نمبر ایک اور شائق فرمانے کا کہہ رہے تھے ہمیں شدت سے انتظار ہے جی ہاں الیکشن ہو چکے ہیں عمران خان وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے والے ہیں ہماری دعا ہے عمران خان پاکستان کے لیے اس کے عوام کے لیے اسلام کے لیے اچھے اچھے اقدامات کرے، آمین۔ ریاض بٹ صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے، محترم میرا خط اور قطعہ پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ اور ہاں یاد آیا چند روز پہلے محترم عبدالجبار رومی ناچیز سے ملنے شاپ پر تشریف لائے تھے جن سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے آمین۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ رومی صاحب بلڈرز ہیں اور مختلف شہروں میں بلڈنگیں بناتے ہیں ویسے ان کی مستقل رہائش گوگومنڈی تحصیل بورے والا ضلع وہاڑی میں ہے جہاں سے بورے والا ایکسپریس وقار یونس بھی ہیں ریاض حسین قمر صاحب آپ کا تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ، محمد رفاقت صاحب میرا خط اور قطعہ پسند فرمانے کا شکریہ اور ہاں خادم اعلیٰ سے جان چھوٹ گئی ہے عمران خان وزیر اعظم بن چکے ہیں ایم حسن نظامی صاحب میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ، جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ بھی جاندار تھا اس بار بھی صرف پانچ ہی خطوط تھے خطوط نگار کہاں چلے گئے ہیں واپس آجائیں آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ خوش آمدید کہا جائے گا، ذوق آگہی میں عبدالجبار رومی، رشک حنا، شیزا بلوچ، خوش بوئے سخن میں شہزاد نیئر، اقراجٹ، دعا علی، رابعہ آفرین چھائے رہے، نئے افق میں لکھنے والوا سے سجانے والو کے لیے کہوں گا۔

مجھے عادت سی ہوگئی ہے تجھے شام لکھتی ہوں
تمہیں دلبر تمہیں محسن تمہیں گلفام لکھتی ہوں
میں ہاتھوں پر کتابوں پر درختوں پر دیواروں پر
میں جب لکھوں جہاں لکھوں تمہارا نام لکھتی ہوں

ملک عارف اعوان..... چوا سیدن شاہ جہلم سے رقمطراز ہیں محترم مشتاق احمد قریشی، اقبال بھٹی اور طاہر احمد قریشی صاحب سلام مسنون ایک طویل عرصہ بعد نئے افق نظر سے گزرا دیکھ کر بلکہ پڑھ کر خوشی ہوئی زمانہ طالب علمی میں تو میں ڈائجسٹوں کا شیدائی تھا پھر فوج میں جانے کے بعد ٹریننگ اور ڈیوٹی نے مجھے مطالعہ سے دور کر دیا اب ریٹائر ہوں پچھلے دنوں میرا چکوال جانا ہوا تو دوران سفر ایک صاحب کے ہاتھوں میں اگست کا نئے افق دیکھ کر 440 واٹ کا جھٹکا لگا ساری پرانی یادیں کسی فلم کی طرح چلنے لگیں کسی زمانے میں نئے افق میں روگی کے عنوان سے سلسلے وار ناول چھپتا تھا وہ میرا پسندیدہ سلسلہ تھا اس میں سطر سطر تجسس تھا پڑھتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے ہم کوئی فلم دیکھ رہے ہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا پھر شہباز نامی سلسلہ چھپا بعد میں ایم اے راحت کی ہمالیہ کی یاد آئی بہر حال میں نے چکوال کے بس اسٹاپ پر اترتے ہی پہلے بکسٹال پر حملہ کیا اور اس سے نئے افق طلب کیا پتا چلا کہ ان کے پاس چند کاپیاں آتی ہیں جو ختم ہوگئی ہیں بکسٹال والا میرے بھتیجے کا دوست تھا

Digitized by Google

میرے اصرار پر اس نے وعدہ کیا کہ دو دن بعد نئے افق مجھے منگوا دے گا خیر اس دن ہفتہ تھا مجھے دو دن چکوال رکنا تھا پریشانی تو بہت ہوئی کہ اتنے عرصے بعد اپنا محبوب رسالہ دیکھا اور وہ بھی نہیں ملا خیر پیر کے دن واپسی پر جب بس اسٹینڈ پہنچا اور اسٹال والے سے پتا کیا تو اس نے کہیں سے نئے افق منگوا رکھا تھا میں نے پرچہ بیگ میں رکھ لیا پہلے تو سوچا کہ دوران سفر مطالعہ کروں گا پھر سوچا رات میں گھر جا کر بستر پر اپنے محبوب سے کھل کر باتیں کروں گا گاؤں میں شام میں جلدی ہو جاتی ہیں لوگ سر شام ہی کھانا کھا کر بستروں میں دبک جاتے ہیں مجھے تو ویسے بھی اپنے محبوب سے ملنے کی جلدی تھی سو میں وقت سے پہلے ہی بستر میں گھس گیا اور نئے افق کھول لیا ایڈیٹوریل میں مشتاق احمد قریشی کے علاوہ سب لوگ نئے تھے لکھنے والوں میں بھی کوئی پرانا نام نہیں تھا میں نے حسب عادت سب سے پہلے سلسلے وار کہانی کھولی یہ تھی عمارہ خان کی وہ تیس دن حیرت ہوئی کہ اب خواتین بھی پر اسرار کہانیاں لکھنے لگی ہیں پڑھی تو اچھی لگی لیکن کہانی کا وہ معیار نہیں تھا جو ہمارے زمانے کی کہانیوں کا تھا جب مصنف سطر سطر موتی پروتے تھے لیکن بہر حال کہانی ٹائم پاس تھی اس کے بعد ساحر جمیل سید کی مرشد پر پہنچے یہ قسط نمبر 14 تھی ابتدا کا تو پتا نہیں لیکن قسط نمبر 14 پڑھ کا اندازہ ہوا کہ کہانی جاندار ہے کہانی کی بنت بہت خوب صورت تھی ایسا لگتا تھا جیسے مصنف نے لفظ لفظ موتی پروئے ہوں بہر حال کہانی بہت پسند آئی اس کے بعد امین بھایانی کی خاموشی کا شور سنا ایڈیٹر صاحب نے امین بھایانی کا بڑا خوبصورت تعارف کرایا جسے پڑھتے ہی میرا ذہن بن گیا کہ میں کوئی خوب صورت ماسٹر پیس پڑھنے جا رہا ہوں واقعی یہ ماسٹر پیس تھا اس کے بعد اسحاق جنجوعہ کی طواف اور ابراہیم جمالی گمشدہ محبت کا مطالعہ کیا بہت معیاری لگیں ابھی پرچا زیر مطالعہ ہے آپ سے درخواست ہے کہ چکوال چوا سیدن شاہ میں نئے افق کی دستیابی یقینی بنائیں۔

اقرا جٹ..... منچن آباد السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ امید واثق ہے سب خیریت سے ہوں گے اگست کا شمارہ آ گیا ہے یہ میسج لائبریری سے 21 یا شاید 20 کو مل گیا مگر بھائی 23 کو لے کر آئے ٹائٹل ناٹس، شاہین کو پروں کو پاکستانی پرچم کو رنگوں میں رنگے۔

اڑان ہے شاہین
پہچان ہے اسلام
نام ہے پاکستان

گفتگو کے لیے قلم مخروطی انگلیوں میں تھاما، علم کا فقدان، نہ لکھنے کا طریقہ وسلیقہ لفظوں کا ذخیرہ ندارد پھر بھی کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ لکھ پائیں جو پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر کر اک چاشنی بھر دے۔ جن جن کا شکوہ تھا کہ ہم کدھر غائب ہیں تو جی جناب ہم آ چکے ہیں پھر سے محفل خلوص میں۔ دستک دے کر انکل مشتاق احمد قریشی کی باتیں سنیں ہر ہر بات سے اتفاق کیا آئی لو پاک آرمی۔

اک سپاہی
بارڈر کی سرحدوں پر کھڑا
اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے
پاک وطن کی خاطر
وہ سپاہی
اپنے تمام جذبات
اپنے پیارے وطن سے
منسلک کر دیتا ہے

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
Digitized by Google

اور لہو کے اک اک قطرے سے
وطن کی آبرو محفوظ کر جاتا ہے
پاک افواج کو سلام

آج 24 ہے کل تو 25 کل الیکشن ہے دعا ہے کہ وہ حکمران آئے جو پاکستان کو سنوار دے پاکستان کو صحیح پاکستان بنا دے، آمین۔ گفتگو میں انٹری دی انکل اقبال کی باتیں سنیں ایک خوشخبری منتظر تھی بھائی پرنس غائب تھے، ابن صفی نمبر (جولائی کا شمارہ) اپنے معیار پر پورا اترا محفل میں شامل ریاض بٹ انکل، ریاض حسین قمر، محمد رفاقت، ایم حسن نظامی اینڈ جاوید احمد صدیقی براجمان تھے اور ایمی اپنی باتوں سے نئے افق میں قوس قزح بکھیرے ہوئے تھے سب کے خط قابل تحسین تھے منچن آباد والو کدھر غائب ہو اقرا انکل طاہر نے اسماحسنیٰ الرزاق (بہت رزق دینے والا) کا تفصیل سے بیان کیا پھر بڑھے کہانیوں کی طرف "وہ تیس دن" عمارہ خان تینوں قسطیں، ہی لاجواب فیصل اور شہیر غلط کر رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی مکافات عمل اس دنیا میں ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں بات وہیں آ جاتی ہے جانتے تو سب ہیں مگر عمل ہاں عمل کوئی کوئی کرتا ہے۔ مرشد زور وشور سے اپنے مخصوص انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اتنی مار کھانے کے بعد بندہ ویسے ہی ہل نہیں سکتا پھر یہ بندہ نہیں جن ہی ہوا۔ طواف اسحاق جنجوعہ اے ون بہت زبردست تحریر تھی بے شک اللہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دل سے کیا گیا ایک سجدہ ہی کبھی کبھی کافی ٹھہر جاتا ہے "خاموشی کا شور" امین بھایانی کی تحریر قابل تعریف و باکمال تھی۔ میرے خیال سے نئے افق میں ایک اور سلسلہ وار تحریر ہونی چاہیے "نوادر طلسمات" زرین قمر ونڈرفل اپنے مخصوص انداز میں جلوہ گر تھیں "دھوکا باز" خلیل جبار آج کل کی مناسبت سے لکھی گئی گریٹ تحریر "مجھے لکھنا نہیں آتا" ڈاکٹر حامد حسن جامی زبردست "گمشدہ محبت" ابراہیم جمالی واقعی برسوں یاد رہنے والی زندہ تحریر "چھوٹی غلطی" سجاول خان اے ون "آبگینہ" عرفان راماے ہسٹریکل اسٹوری ویری انٹرسٹنگ زبردست "نمک حرام" ریاض بٹ ونڈرفل "گھر کا بھیدی" ایم زیڈ شیخ زبردست تحریر غلطی مہتاب خان زبردست تحریر لفظوں کا دلکش جال "احلاس" عارف شیخ نائس فن پارے صوبیہ اطہر اعتزاز سلیم وصلی، وقار احمد ملک، صبا اورنگزیب، حمیرا تبسم، ابن عبداللہ، سلمان بشیر، فاطمہ عبدالخالق، ڈاکٹر ریاض توحیدی محفل میں براجمان تھے اپنے ساتھ لفظوں کا ذخیرہ تحریروں میں بھر لائے۔ "ذوق آگہی" راؤ تہذیب راؤ، عبدالجبار رومی، محمد رفاقت، ریاض بٹ، ایم حسن نظامی، پرنس افضل، ایس حبیب خان، یمنی غزل، سحر تبسم، سمیرا گل، گل مہر، صائمہ، شازیہ ایس گوہر، رشک حنا، سزا بلوچ اینڈ ام حسنیٰ سب کی چوائس زبردست تھی۔ "خوش بوئے سخن" شہزادو نیر، امیر حمزہ سلفی (فیس بک پر بڑی پڑھی آپ کی پوئٹری) ربیعہ رابیل، شاعر فرخ حجاز، معصومہ ارشاد، ایم حسن نظامی، ریاض حسین چوہدری قمر، پرنس افضل، محمد اسلم جاوید، ایس ایس پری، محمد فرقان رومان، نجم انجم، دعا علی، ڈاکٹر صفدر سعید (گریٹ) ممتاز راشد اینڈ قابل اجمیری سب کی نظمیں اور غزلیں لاجواب تھیں سب کو ایڈوانس میں عید الاضحیٰ مبارک، نئے افق کو بند کر کے رکھ رہے ہیں اور نیکسٹ نئے افق کا انتظار کرتے ہیں اللہ حافظ۔

بڑے شوق سے آئے ہیں تیری محفل میں
کہ تشنگی مٹ جائے اتنی سی جگہ سے

ریاض بٹ ...... **حسن ابدال** اس بار آپ نے کمال مہربانی کرتے ہوئے ماہ اگست 2018ء کا شمارہ 18 جولائی کو ہی بھیج دیا جو 20 جولائی کو مجھے مل گیا سرورق جشن آزادی کی مناسبت سے بہترین اور جاذب نظر ہے دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب دشمنوں کے ناپاک ارادوں اور کارروائیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ امریکا، انڈیا اور اسرائیل مل کر پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کرا رہے ہیں لیکن ہماری بہادر اور غیور افواج نے انہیں ناکوں چنے چبوا دیے ہیں خدا ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت کرے، آمین۔ محفل میں ایک اور خوش خبری منتظر ہے یعنی آپ میرے روحانی استاد محترم ابن صفی صاحب کو خراج عقیدت

Digitized by Google

پیش کرنے کے لیے ایک اور ابن صفی نمبر شائع کریں گے۔ ان شاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ اس نمبر کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ارسال کروں اب بڑھتے ہیں خطوط کی طرف آپ کا میں لفظوں کی صورت میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا کہ آپ میرا اتنا مان رکھتے ہیں بلکہ بڑھاتے ہیں مجھے پہلا نمبر دینے کا شکریہ اگلے نمبر پر قابل قدر اور قابل احترام ریاض حسین قمر کا خط ہے آپ نے ملکی حالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے شعر بھی زبردست ہے خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد رفاقت بھائی میرے پڑوسی باقاعدگی سے اور مفصل تبصرے کے ساتھ آتے ہیں اب آپ کے تبصرے جاندار ہوتے ہیں لفظوں کا استعمال بھی خوب ہے میری کہانی کو اتنا زیادہ پسند کرنے کا شکریہ ایم حسن نظامی بھائی کیسے ہو آپ کا تبصرہ بھی محفل کی جان ہے میری کہانی اور تبصرہ آپ کو پسند آیا مہربانی اور نوازش جاوید احمد صدیقی صاحب آپ کا تبصرہ قابل تعریف ہے آپ جس طرح میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس کا حق ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں پھر جذبے کب الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں ویسے آپ نے نمک حرام کہانی پر پسند کی مہر ثبت کی ہے حالانکہ پچھلی کہانی قاتل سے مقتول تک تھی نمک حرام تو اس ماہ شائع ہوئی ہے خیر یہ نام غلطی سے بھی چھپ سکتا ہے آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف واقعی امین بھایانی کی کہانی خاموشی کا شور بہت اچھی اور دل کو چھو لینے والی کہانی ہے کردار نگاری اور منظر نگاری بھی خوب ہے ویل ڈن میں نے اپنی زندگی میں بے شمار شاہکار کہانیاں پڑھی ہیں انہوں نے مجھے بے تحاشہ رلایا بھی ہے میرے اندر جذبات کی ہلچل بھی مچی ہے اسحاق جنجوعہ کی طواف بھی ایک ایسی ہی شاہکار کہانی ہے جس نے پل پل رلایا ہے اور سوچنے رب کے معجزات بھی دکھائے ہیں جنجوعہ صاحب آپ کی ایسی ہی کہانیوں کے ہم منتظر رہیں گے زرین قمر کا نام ہی اچھی کہانیوں کی پہچان ہے ان کی موجودہ کہانی بھی ایک بہت اچھی اور قابل تعریف کہانی ہے نواور طلسمات بھی ایک منفرد کہانی ہے ریگولر لکھاری خلیل جبار کی دھوکہ باز ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت کہانی ہے پتا نہیں بے وقوف صنف نازک کب تک شکاری مردوں کے جال میں پھنستی رہیں گی یہ تو صبا کی خوش قسمتی تھی کہ اسے عاصم جیسا اچھا مرد مل گیا بہر حال نذیر نے اپنے شیطانی کھیل میں اپنی جان تو گنوائی۔ ساتھ ہی صبا اور عاصم کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دیا ڈاکٹر حامد حسن حامی نے محترم ابن صفی صاحب کے متعلق اپنے زریں خیالات کا بڑی خوب صورتی اور دل کی گہرائیوں سے اظہار کیا جو بہت اچھا لگا خدا آپ کو خوش رکھے آمین۔ گمشدہ محبت ابراہیم جمالی کی ایک حساس اور دل کو چھو لینے والی تحریر ہے باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں ذوق آگہی میں عبدالجبار رومی کی اچھی باتیں سوچ کے در وا کر رہی ہیں محمد رفاقت صاحب آپ نے ووٹ کسے دیا بالکل موقع محل کی مناسبت سے لکھی ہے ایم حسن نظامی کی انمول ہیرے پرنس افضل شاہین کی مسکراہٹیں سحر تبسم سحری کی خوب صورتی بھی اچھی کاوش ہے باقی قارئین کا انتخاب بھی لاجواب ہے اب اجازت اگر زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔

محمد رفاقت..... واہ کینٹ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اور رسالے کے تمام اسٹاف کو میرا اسلام قبول ہو رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ نئے افق اپنے خوب صورت ٹائٹل سے رسالے کی رونق میں اضافہ کر رہا ہے اور آزادی کے شاہین سے سجا ہوا ہے پاکستان کا جھنڈا ہمیشہ سربلند رہے یہ میری دلی دعا ہے اللہ پاک پاکستان کو ہمیشہ سلامت رکھے الیکشن کی گہما گہمی ختم ہوگئی اور نئے پاکستان کی صبح کا آغاز ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ اس حکومت کو درست کام کرنے کی توفیق دے آمین۔ اب ہم سب کو پاکستان کی ترقی کے لیے مل کر کام کرنا ہوگا تمام اداروں نے اور خاص کر پاکستان کی فوج نے اس الیکشن کو کامیاب کیا جس کے لیے سب ادارے مبارکباد کے مستحق ہیں آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب مجھے اس دفعہ یہ رسالہ بہت سے زیادہ اچھا لگا اور پسند بھی آیا کیونکہ جو کہانی عرفان رامے نے آگینہ لکھی وہ مجھے بہت پسند آئی اس طرح کی کہانیاں نئے افق کی جان ہوتی ہیں مبارک ہو دوسری کہانی طواف بہت پسند آئی اسحاق جنجوعہ صاحب کو بہت بہت مبارک ہو دوسری کہانی دھوکہ باز، گمشدہ محبت، چھوٹی غلطی، نمک حرام، گھر کا بھیدی، غلطی، اجلاس سب ہی کہانیاں اچھی ہیں خوش بوئے سخن، ذوق آگہی بھی اس دفعہ بہت خوب

Digitized by Google

ہیں مرشد کی بھی قسط نمبر 14 پڑھ لی ہے اب آگے کیا ہوتا ہے یہ جاننے کے لیے اگلے ماہ کا انتظار کرنا پڑے گا وہ تیس دن بھی آگے بڑھ رہی ہے اور اچھی کہانی پیش کی ہے جو رسالے کی شان میں بھی اضافہ کر رہی ہے کس کس کہانی کی تعریف کروں سب ہی اپنی جگہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ محترم اقبال صاحب سے گزارش ہے کہ میں نے بھی دو عدد کہانیاں آپ کو ارسال کی ہیں اگر مل گئی ہیں تو ضرور بتائیں آتے ہیں خطوط کی طرف تو کیا بات ہے کہ سب حضرات کے پاس وقت نہیں ہے کہ خط لکھیں میری سب دوستوں سے پرزور اپیل ہے کہ اپنی اس بزم میں ضرور شرکت کریں یہ محفل سونی سونی سی ہوگئی ہے ریاض بٹ نے بہت اچھا لکھا جناب مبارک ہو دوسرے خط جو ریاض حسین قمر صاحب، ایم حسن نظامی اور راولپنڈی سے جاوید احمد صدیقی صاحب نے تحریر کیے ہیں آپ سب کا بہت بہت شکریہ محفل میں شرکت کرنے کا دستک میں "گھر کا بھیدی" مشتاق احمد قریشی نے خوب صورت انداز میں تشریح کی ہے۔ پاکستان میں نئی حکومت شروع ہونے والی ... میں ان گھر کے بھیدی پر بہت زیادہ نظر رکھنی پڑے گی۔ اللہ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے اجازت چاہوں گا۔ والسلام۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم لائق صد احترام جناب اقبال بھٹی صاحب سلام شوق امید ہے آپ مع اپنے رفقا کار خیریت سے ہوں گے رب ذوالجلال آپ سب کو سدا اپنے حصار رحمت میں رکھے، آمین۔ اگست کا نئے افق میرے سامنے ہے سرورق بہت خوش نما ہے ایک پرندے کے دونوں پروں پر پاکستان کا ہلالی پرچم بنا ہوا ہے جس نے سرورق کی شان کو دوبالا کر دیا ہے دستک میں محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اس سے اس قوم کی آنکھیں کھل جانی چاہیں اب تو ماشاء اللہ وطن عزیز میں انتخابات کا مرحلہ بھی بخیر و خوبی سر انجام پا گیا ہے اکا دکا چند واقعات کے علاوہ انتخابات کا عمل پرامن ہی رہا اور عوام نے اس میں بھرپور شرکت فرما کر اپنی حب الوطنی اور خلوص کا بھرپور مظاہرہ کیا گزشتہ بائیس سال سے کوشش میں لگی کامیاب قیادت کو رب کریم اس ملک کے لیے مبارک فرمائے اور یہ قیادت اس ملک کو واقعی ایک نیا ملک بنانے میں کامیاب ہو جائے ایک نیا پاکستان۔ جس میں کرپشن اور ناانصافی نام کی کوئی چیز نہ ہو خدا کرے محترم اقبال بھٹی صاحب آپ نے گفتگو کے آغاز میں ابن صفی مرحوم کے لیے جن دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ لائق تحسین ہے میرے پیارے بھائی اس بار بھی کرسی صدارت پر متمکن ہیں ان کا خط بڑا بھرپور اور ابن صفی نمبر پر ایک بھرپور تبصرہ ہے پیارے بھائی یہ آپ کی مجھ ناچیز سے بے پناہ محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ جس کے لیے میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں رب العزت آپ کو کامل صحت تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ محترم جناب محمد رفاقت نے بھی اپنے خط میں مرحوم ابن صفی کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ تعریف کے قابل ہے ایم حسن نظامی صاحب کا خط حسب معمول بڑا جاندار ہے نظامی بھیا خط پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ، محترم و مکرم جناب جاوید احمد صدیقی کا خط اور تبصرہ بڑا جاندار اور شاندار ہے صدیقی بھیا خط پسند فرمانے پر آپ کو ممنون احسان ہوں رب کریم آپ کو خوش و خرم رکھے، آمین۔ اوہ یہ کیا صدیقی صاحب کے خط کے بعد فل اسٹاپ لگا ہوا تھا چھپنے والے خط گنے تو پورے پانچ گزشتہ ماہ بھی پورے پانچ خط چھپے تھے بھئی کیا آ . . نے پنج تن پاک کے نام پر ہمیشہ پانچ ہی خط چھاپنے کا پروگرام تو نہیں بنا لیا، بلا جواز محفل سے غیر حاضر ہونے والے معزز قارئین سے پرزور اپیل ہے کہ وہ بھاگتے ہوئے آئیں اور محفل میں شریک ہوں اور آئندہ کے لیے شرکت کو یقینی بنائیں۔ لائق صد احترام جناب طاہر قریشی صاحب نے اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام الرزاق کے بارے میں جتنی معلومات جس پیارے انداز میں فراہم فرمائی وہ قابل تعریف ہیں اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے آمین۔ کہانیوں کا انتخاب جریدے کے عین شان کے مطابق ہے ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی خوب ہے یہ کوئی بے جا تعریف نہیں ہے ہمارے اس پیارے جریدے نے اپنا ایک معیار اور مقام بنایا ہوا ہے اور اسے برقرار رکھا ہوا ہے رب ذوالجلال نئے افق کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچائے آمین۔

حیدر آباد، لطیف آباد سے روبینہ خالد لکھتی ہیں ویسے تو میں آنچل کی مستقل قاری ہوں لیکن اس ماہ

Digitized by Google

میں نے نئے افق کا ٹائٹل دیکھ کر اسے بھی خرید لیا ویسے میں اسے مردوں کا رسالہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھی لیکن فہرست میں خواتین رائٹرز کے نام پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی اور خوشی ہوئی کہ مردوں کے مقابلے پر خواتین بھی آ گئی ہیں خاص طور پر عمارہ خان کی وہ تیس دن پڑھ کر خوشی ہوئی انہوں نے بڑی خوفناک کہانی بہت خوب صورتی سے لکھی پڑھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئیں واؤ خواتین بھی خوفناک کہانیاں لکھ سکتی ہیں کیا بات ہے میری طرف سے اتنی اچھی کہانی لکھنے پر عمارہ خان کو مبارکباد نوادر طلسمات زرین قمر غلطی مہتاب خان بھی بہت خوب صورت کہانیاں تھیں فن پارے واقعی فن پارے تھے صوبیہ اطہر کی راز جنوں، صبا اورنگزیب کا عبداللہ حمیرا تبسم کا دیوانہ پن، فاطمہ عبدالخالق بہت ہی خوب صورت افسانے تھے اس کے علاوہ امین بھایانی کا خاموشی کا شور، ابراہیم جمالی کی گمشدہ محبت، اسحاق جنجوعہ کا طواف نے مجھے نئے افق کا گرویدہ بنا دیا ہے اب میں آنچل کے ساتھ ہر ماہ نئے افق بھی خریدوں گی۔

عبداللہ جمالی ٹنڈو آدم سے رقم طراز ہیں یہ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے میں یہاں ایک لائبریری میں ملازم ہوں ہمارے پاس پاکستان بھر سے شائع ہونے والے تمام جرائد آتے ہیں اور میں ان تمام جرائد کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہوں کو جو بات نئے افق کو دیگر جرائد سے نمایاں کرتی ہے وہ ہے سیکس سے پاک اس کی کہانیاں برملا کہہ سکتا ہوں کہ نئے افق واحد پرچہ ہے جسے گھر کا ہر فرد سب کے سامنے پڑھ سکتا ہے اقبال بھٹی صاحب میری آپ سے درخواست ہے کہ اس معیار کو برقرار رکھیے گا امین بھایانی اور ابراہیم جمالی کو ہر ماہ شامل اشاعت کیا کریں زرین قمر آج کل اپنی تحریروں پر زیادہ توجہ نہیں دے رہیں اس ماہ نوادر طلسمات نے زیادہ متاثر نہیں کیا مرشد عروج پر جارہی ہے اس کے صفحات میں اضافہ بھی کیا جائے فن پاروں میں کلاسیکل ادیبوں کے افسانے بھی شامل کیے جائیں آبگینہ عرفان رامے نے تاریخ پر اچھا ناول لکھا اب اجازت چاہتا ہوں اللہ حافظ۔

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر میں فون کرنے سے گریز کریں

Digitized by Google

اقرأ

طاہر قریشی

الفتح

(بہت بڑا فیصلہ کرنے والا)

الفتاح: صیغہ واحد مبالغہ ہے' اس کا مادہ (ف' ت' ح) ہے' عربی زبان میں ''فتح'' کے معنی کھول دینے کے ہیں' یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا صفاتی نام ہے' اس صفتِ عالی کے باعث اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے آسانیاں پیدا فرماتا ہے' ان کے لئے اپنی رحمت اور رزق کے دروازے کھولتا ہے۔ ''فتاح'' کے معنی یہ بھی ہیں کہ سرگرداں لوگوں کو آسانیاں مہیا کرنا' ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ چونکہ بندوں کے امور میں آسانیاں پیدا فرمادیتا ہے۔ مشکل امور کو ان کے لئے آسان کردیتا ہے' فتح کا لفظ فیصلہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''فتاح'' اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم صفت ہے کہ وہی ذاتِ الٰہی حق و باطل کو بڑی وضاحت سے الگ کرتی ہے۔ ''فتاح'' کے معنی حاکم اور فیصلہ کرنے والے کے بھی ہیں' نصرت وغلبہ عطا کرنے والا' کھول دینے والا' اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اس لئے بھی فتاح ہے کہ وہ فیوض و برکات کے دروازے اپنے بندوں پر کھول دیتا ہے۔ بہت بڑا مشکل کشا ہے۔

ترجمہ:۔ کہو ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا' پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے

Digitized by Google

گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔ (سبا۔ ۲۶)

آیتِ کریمہ میں پروردگارِ عالم کو "فتاح علیم" کہا گیا ہے' اس سے یہ جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے' کیونکہ وہ ایسا حاکم ہے جو حق و باطل کے درمیان علم کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ حق و باطل کو الگ الگ کرنے پر پوری طرح قادر ہے' وہ ان کے درمیان کے فرق کو بھی نمایاں کرسکتا ہے' وہ حق پرستوں اور باطل پرستوں کو اکٹھا نہیں چھوڑتا' ہاں یہ شرط ضروری ہے کہ حق پسند اپنی سچائی کو پورے زور سے پیش کرے' اپنی پوری قوت و طاقت اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں پورے خلوصِ نیت سے لگادے اور معاملے کے نتیجے کو اللہ کے سپرد کردے۔ اللہ فتاح علیم فیصلہ کردے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کب' کس وقت کرتا ہے۔ فیصلہ کے لئے وقت بھی اللہ تعالیٰ خود مقرر فرماتا ہے۔ اس میں جلدی کا کوئی داعیہ کسی کو نہیں' کیونکہ یہ حق اللہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ حق و باطل کا آمنا سامنا کب کرتا ہے' کب فیصلہ کرتا ہے' وہی ذاتِ علیم و فتاح ہے۔

فضائل: جو شخص بعد نماز فجر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ستر (۷۰) مرتبہ اس صفتِ الٰہی کا ورد کرے گا اللہ اس کا دل منور کردے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

Digitized by Google

حصار

امجد جاوید

لفظ جادو میں ہی جادو ہے۔جادو ایک خطرناک اور منفی قوت ہے اور جادو کی کوکھ حسد ، کینہ اور بغض سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں محبت کی الوہی طاقت اور یقین موجودہو، وہاں جادو اثر انداز نہیں ہوتا۔محب اپنے محبوب کی جدائی پر سمجھوتہ توکرلیتا ہے مگر محبوب کے دُکھ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی سچی محبت کا معیار ہے۔سچی محبت جب قوت بنتی ہے تو یقین کے ساتھ سارے شیطانی حصار توڑ دیتی ہے۔ممکن اور ناممکن کی کشمکش ،یقین، بھروسہ اورحوصلے سے گندھی ایک پر تجسس ،حیرت انگیزاور جادو اثر داستان

URDU TUBES
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

Digitized by Google

اس دن ثانیہ علی اپنی ہی منگنی پر خود ہی حیران ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سب کچھ اس طرح بھی آناً فاناً ہو جائے گا۔ وہ یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ اس نے ذیشان احمد کو چاہا اور وہی اپنے ماما پاپا کے ساتھ منگنی کرنے ان کے شاندار لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ کہیں خواب تو نہیں؟ جو منظر وہ دیکھ رہی ہے، یہی حقیقت ہے؟ جیسے ہی اسے یہ احساس ہوتا کہ یہ سب سچ ہے، وہ نیند میں نہیں بلکہ جاگتی آنکھوں سے یہ سارے منظر دیکھ رہی ہے تو ایک لامتناہی خوشگواریت اس کے رگ و پے میں سرائیت کر جاتی۔ وہ مسرور سی اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بیوٹیشن اسے تیار کر کے آخری ٹچ دے رہی تھی۔ لاؤنج میں گونجتے ہوئے قہقہے اُسے سنائی دے رہے تھے۔ اتنی بڑی حقیقت اسے کسی خواب کی مانند لگ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں موجود ہو۔

یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا، اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ یہ دورانیہ دو برسوں پر محیط تھا۔ ذیشان سے اس کی پہلی ملاقات کل ہی کی بات لگ رہی تھی۔ ذیشان اس کا یونیورسٹی میں سینئر کلاس فیلو تھا۔ کلاس میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی گپ شپ کب لمبی لمبی ملاقاتوں میں بدل گئی انہیں احساس ہی نہیں ہوا۔ یوں ہنسی مذاق، گپ شپ اور باتوں میں ایک برس بیت گیا۔ اسے سب کچھ آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔

ذیشان شہر کے ایک بزنس مین چوہدری نذیر کا اکلوتا بیٹا تھا تو ثانیہ بھی اسی شہر کے بزنس مین مراد علی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دونوں ہی کے انداز اور سٹائل میں امارت جھلکتی تھی۔ وہ بہت جلدی ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ سال بھر کی ملاقاتیں رنگ لانے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ جہاں ذیشان کو یہ زعم تھا کہ اس کے والدین اس کی پسند کو ترجیح دیں گے وہاں ثانیہ کو بھی مان تھا کہ اس کی پسند کو قبول کیا جائے گا۔ چاہتوں بھری ملاقاتوں میں خواب نہ ہوں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں خواب دیکھنے لگے۔ ایک برس کب ختم ہو گیا انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ انہیں ہوش اس وقت آیا جب ذیشان یونیورسٹی سے فری ہوا اور امتحانات سے فراغت کے بعد اپنے پاپا کے ساتھ بزنس میں شامل ہو گیا۔

وقت تھوڑا آگے بڑھا۔ ذیشان کی ماما الماس بیگم نے اپنے بیٹے کی شادی کرنے کی بات چھیڑ دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی ماما کو اپنی چاہت کے بارے میں بتا دے۔ اسی کشمکش میں ایک برس مزید گزر گیا لیکن گھر میں یہ بحث عروج پر پہنچ گئی کہ ذیشان کے لئے کس لڑکی کا انتخاب کیا جائے۔ تبھی اس نے اپنی ماما کو اپنی پسند کے بارے میں بتا دیا۔ انہی دنوں اس کے پاپا چوہدری نذیر اپنے بزنس ٹور کے لئے لندن کا پروگرام فائنل کر چکے تھے۔ اس کی پسند کے بارے میں سن کر اس کے والدین نے ہاں کر دی۔ تب اس نے پاپا کے لندن جانے سے پہلے منگنی کر دینے پر زور دیا۔ یوں چند دنوں ہی میں ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا ہوا اور منگنی طے ہو گئی۔

اس بنگلے کے مکینوں کی امارت کا اظہار شاندار لاؤنج سے ہو رہا تھا۔ وہاں لاؤنج میں چند مہمان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دھیمی دھیمی سی گفتگو میں کسی بات پر قہقہے پھوٹ پڑا۔ اس قہقہے کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ثانیہ علی کے پاپا مراد علی نے انتہائی سنجیدگی سے سامنے بیٹھے ذیشان کے پاپا، چوہدری نذیر احمد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی یہ تو بہت اچھی بات کہی آپ نے، لیکن میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ ہماری اکلوتی بیٹی کی منگنی اور وہ بھی اتنی سادگی سے؟ آپ چند دن مزید رک جاتے نا تو بہت دھوم دھام سے یہ منگنی کر لیتے۔ کوئی بڑی سی پارٹی ارینج کرتے جس میں سبھی دوستوں کو بلاتے۔"

اس پر نذیر احمد نے اپنا کوٹ درست کرتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔

"مراد علی صاحب، ہمیں اپنے بچوں کی خوشیاں چاہئیں، منگنی اگر سادگی سے ہو گئی تو کیا ہوا۔ شادی، دھوم دھام سے کریں گے۔ مجھے کچھ عرصہ کے لئے لندن جانا پڑ گیا ورنہ، ویسے نہ ہوتا، جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔ میں بھی یہ سب دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ نے تو قریبی ملنے والوں کو بھی نہیں بلانے دیا۔" مراد علی نے ہنستے ہوئے کہا تو چوہدری نذیر احمد قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"اگر ایک کو بھی بلا لیتے نا تو نجانے کتنے ناراض ہو جاتے، فی الحال میں یہ افورڈ نہیں کر سکتا، ہم اور آپ ہیں نا، بہت ہیں منگنی کے لئے۔"

انہوں نے کہا تو چند لمحوں کے لئے ان میں خاموشی آ گئی۔

Digitized by Google

اسی خاموشی کو ذیشان کی ماما بیگم الماس نے توڑا

-

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، کہاں ہے ثانیہ؟ بھئی اُسے بلائیں نا، رسم ادا کریں۔"

اس پر ثانیہ کی ماما بیگم طلعت نے اندر کی جانب دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"بس ابھی آتی ہی ہوگی۔" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ بیوٹیشن کے ساتھ ثانیہ اندر سے شاہانہ انداز میں دھیرے دھیرے آتے ہوئے دکھائی دی۔ وہ انہی کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی تبھی بیگم طلعت نے بے ساختہ کہا۔ "لو یہ آ گئی۔"

سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلی بار سب نے اسے تیار ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس جہان کی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ کیا روپ اُترا تھا اس پر۔ ہر ایک کی نگاہ میں اس کے حسن کی ستائش تھی۔ ذیشان تو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ثانیہ کا ایسا روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج تک اس نے وہی عام سی، میک اپ سے بے نیاز ثانیہ کو دیکھا تھا۔ وہ تو ویسے ہی اس پر مرمٹا تھا۔ یہاں تو بن سنور کر وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔ بیوٹیشن نے اسے لے جا کر ذیشان کے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا۔

"ماشاءاللہ، چشم بدور، کیا پیاری لگ رہی ہے میری بیٹی۔" بیگم الماس نے یوں بے ساختہ کہا جیسے اس سے تعریف کیے بنا رہا نہ گیا ہو۔

"جی جی کیوں نہیں۔" بیگم طلعت نے کہا۔

"تو چلیں پھر، کریں منگنی کی رسم۔" الماس بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ایسے میں بیگم طلعت نے بے چین سی ہو کر داخلی دروازے کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے کسی کی آمد کا انتظار ہو۔ اس کی نگاہیں ہر بار مایوس ہو کر پلٹ آتی تھیں لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ انہی لمحوں میں اسے باہر پورچ میں گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔ سب باہر کی جانب دیکھنے لگے۔ سبھی کے ذہن میں یہ سوال بہرحال آیا ہوگا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے؟

چند لمحے گزرنے کے بعد ادھیڑ عمر بیگم ثروت اپنی نند فاخرہ کے ساتھ داخلی دروازے میں نمودار ہوئی۔ بیگم طلعت تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ بیگم ثروت سب کی جانب دیکھتی ہوئی لاؤنج میں آ چکی تھی۔ اس وقت تک بیگم طلعت اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

"اچھا ہوا تم آ گئی ہو۔ بس منگنی کی رسم کرنے ہی والے ہیں۔" بیگم طلعت نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ اس پر بیگم ثروت نے چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھا پھر شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

"مجھے تو جیسے ہی اطلاع ملی، میں تو فوراً چلی آئی۔ یہ بھی شکر ہے دیر نہیں ہوئی، تم لوگوں نے تو مجھے یوں بے خبر رکھا، پتہ ہی نہیں لگنے دیا اس منگنی کا۔"

ان کی باتوں کے دوران مراد علی ان کے قریب آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار واضح تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کر دے۔ تبھی بیگم طلعت نے اپنے شوہر مراد علی کی طرف خجالت سے دیکھا۔ پھر ثروت کی جانب دیکھ کر یوں شرمندہ سی بولی جیسے اپنے شوہر کو سنا رہی ہو۔

"میں اپنی بہن کو تھوڑا بھول سکتی ہوں، پر کیا بتاؤں ثروت اس منگنی کا، یوں سمجھو سب اتنا افراتفری میں ہوا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بس سارا کچھ جلدی میں ہوا ہے۔"

"تم نے یہ تک نہیں بتایا، کن لوگوں میں رشتہ کر رہی ہو؟ اتنی رازداری؟" بیگم ثروت نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو مراد علی کے چہرے پر خفگی پھیل گئی۔ ایسا سوال کرنا اسے بہت برا لگا تھا۔ بیگم طلعت نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، پھر گھبراتے ہوئے بولی۔

"ثروت، چل آ، منگنی کی رسم ادا کریں، پھر باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں بتا دوں گی تمہیں ساری تفصیل، چل آ، مہمان انتظار کر رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیگم ثروت کا ہاتھ پکڑ کر اسے لئے آگے بڑھ گئی۔

ان دونوں بہنوں کے درمیان جتنی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، مراد علی انتہائی ناپسندیدگی سے انہیں دیکھتا رہا۔ جبکہ پھوپھو فاخرہ بے نیاز بنی ان تینوں کو اپنی نگاہوں سے یوں تولتی رہی جیسے سب کے اندر تک کو ٹٹول لینا چاہتی ہو۔ وہاں پر فاخرہ اور مراد علی دونوں رہ گئے۔ فاخرہ نے لمحہ بھر اپنی تیز نگاہوں سے مراد علی کو یوں دیکھا جیسے اس کے دل میں چھپی انتہائی نفرت اور اس کا رویہ بھانپ رہی ہو۔ اس نے اپنی تذلیل محسوس کی۔ مراد علی کی نگاہوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔ اگلے لمحے فاخرہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے اندر غصہ ابل پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہیں مراد علی کو ذلیل کر کے رکھ

Digitized by Google

دے۔ وہ تو پہلے ہی مراد علی سے خار کھاتی تھی۔ وہ یہیں اس کی حقارت کا بدلہ چکا دینا چاہتی تھی۔ پھوپھو فاخرہ نے محسوس کیا تھا کہ طلعت نے اس سے بات نہیں کی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بیگم طلعت نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ وہ اپنے شوہر مراد علی کے باعث اس سے بات نہ کر سکی تھی۔ اسے مراد علی پہلے ہی اچھا نہیں لگتا تھا، اس بار تو اس کے دل میں نفرت ہی ابل پڑی تھی۔ وہ بھی وہاں پہنچ گئے جہاں سارے مہمان جمع ہو چکے تھے۔

ذیشان کے چہرے پر خوشی دمک رہی ہے۔ الماس بیگم نے اپنے پرس میں سے سرخ ڈبیہ نکال کر ذیشان کی جانب بڑھا دی۔ اس نے ڈبیہ پکڑ کر کھولی۔ اس میں چمکتی ہوئی ہیرا جڑی انگوٹھی نکالی اور ثانیہ کی جانب بڑھائی۔ وہ ایک دم سے گھبرا گئی، پھر حیا بار انداز میں نزاکت سے ہاتھ آگے کر دیا۔

ذیشان نے بڑے نازک سے انداز میں ثانیہ کا ہاتھ پکڑا اور وہ انگوٹھی ثانیہ کی انگلی میں پہنا دی۔ بیگم طلعت نے ثانیہ کے آگے ایک انگوٹھی کر دی۔ ثانیہ نے وہ انگوٹھی پکڑی اور ذیشان کو پہنا دی۔ سبھی ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ جب وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے چکے تو مہمانوں کو کھانے کی میز کی طرف جانے کا کہا گیا۔ وہ سب ادھر بڑھ گئے۔ تبھی مراد علی نے اپنی بیوی کے قریب جا کر غصے اور حقارت سے پوچھا۔

"ان لوگوں کو تم نے بلایا تھا؟"

اس کا واضح اشارہ فاخرہ اور بیگم ثروت کی طرف تھا۔ تبھی بیگم طلعت نے خفگی سے اپنے شوہر کو دیکھا، اور ایک طویل سانس لے کر انتہائی سنجیدگی سے یوں بولی جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

"ہاں، میں نے بلایا ہے اور یہ لوگ ہوں گے تمہارے لیے...... وہ میری بڑی بہن ہے۔ میری سگی بہن، میرے خون کا رشتہ ہے وہ...... سمجھے آپ۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے سے غصہ اور طنز چھپا نہ پائی تھی۔ مراد علی نے غصے میں دوسری جانب دیکھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی بیگم کو یہیں باتیں سنا دے۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر غصے بھرے لہجے میں بولا۔

"میں مہمانوں کے سامنے انہیں بے عزت نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بہت اچھا ہوگا کہ تم انہیں خود ہی جلدی جانے کا کہہ دو۔ تبھی تم......"

بیگم طلعت نے یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے اپنے اندر کے دکھ کو سہہ رہی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روک لئے۔ یہ دیکھے بنا مراد علی مہمانوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد سبھی میز پر بیٹھے ڈنر میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان خوشگوار انداز میں باتیں چل رہی تھیں۔ بیگم ثروت ایک جانب بیٹھ گئی تھی۔ بیگم طلعت کھانا لے کر اس کے پاس ہی آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن بیمار ہے اور پرہیزی کھانا کھاتی ہے۔ وہ چند منٹ اس کے پاس بیٹھی تھی کہ مہمانوں میں سے کسی نے اسے بلا لیا۔ بیگم ثروت نے جیسے تیسے تھوڑا بہت کھایا۔ فاخرہ نے کسی شے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ وہ اپنے غصے اور تذلیل پر ہی کڑھ رہی تھی۔ چند نوالے لینے کے بعد بیگم ثروت نے طلعت کو اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس آ گئی۔ اس نے کافی سارے نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لے، میری طرف سے ثانیہ کو کوئی تحفہ لے دینا، جو اسے پسند ہو۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا، اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"میں سمجھتی ہوں طلعت۔ اللہ تم پر رحم کرے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی فاخرہ پھوپھو بھی اٹھ کر جانے کو تیار ہو گئی۔ دونوں دھیرے دھیرے باہر کی جانب چل دیں۔

بیگم ثروت جتنی دیر بھی وہاں رکی، اسے اپنے سینے پر بوجھ ہی محسوس ہوا تھا۔ اس کے من میں کیا چل رہا تھا، یہ اس نے ذرا سا بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ دل پر پتھر رکھے وہ اپنی بہن اور اپنی بھانجی کی خوشی میں شامل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ اندر سے کس قدر لہولہو ہو رہی تھی۔ وہ جانے کے لئے پورچ میں آئی تو اس کے پیچھے ہی بیگم طلعت آ گئی۔ اس نے مٹھائی کی ٹوکری اور پھول دیتے ہوئے دکھی سے دل کے ساتھ کہا۔

"ثروت۔ دعا کرنا، میری ثانیہ کے لئے۔"

"وہ میری بھی بیٹی ہے، کیا ہوا جو وہ میری بہو نہ بن سکی۔ اللہ اسے خوشیاں نصیب کرے، میری تو یہی دعا ہے۔" بیگم طلعت نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دل پر کوئی بوجھ مت رکھنا، تم جانتی ہو کہ میری ایک نہیں چلتی۔ وہی ہوتا ہے جو باپ اور بیٹی چاہتے ہیں۔"

Digitized by Google

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولی تو پھوپھو فاخرہ نے کہا۔

"ویسے طلعت، یہ جو تیرا شوہر ہے نا مراد علی، اسے رشتوں کی قدر تو نہیں مگر....."

"چل چھوڑ فاخرہ، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔" بیگم ثروت نے اسے ٹوک دیا۔ "بس دعا کرنا۔" بیگم ثروت نے بھاری دل سے کہا۔

"اللہ سب کا بھلا کرے، چلتی ہوں۔" وہ سکون سے بولی اور کار میں بیٹھ گئی۔ فاخرہ اس کے بعد بیٹھ گئی۔ اُسے یہ سب فضول لگ رہا تھا۔ جیسے یہ سب اوپری دل سے کہا اور کیا جا رہا ہو۔

ایک ہی شہر میں رہنے والی دونوں بہنیں بیگم ثروت اور بیگم طلعت کے درمیان ایک ان دیکھا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ فاصلہ صرف اور صرف مراد علی کی نفرت نے پیدا کیا تھا۔ کوئی وقت تھا، جب بیگم ثروت کا شوہر زندہ تھا۔ اس کا شمار شہر کے بڑے کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ تب یہی مراد علی اس کے ہاں کام کرتا تھا۔ انہیں مراد علی پر اندھا اعتماد تھا۔ یہ اعتماد اس قدر بڑھا تھا کہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے شعیب کی منگنی ان کی بیٹی ثانیہ سے کر دی تھی۔ ظاہر ہے اس فیصلے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کا یہ تعلق آئندہ نسل تک بھی جاری رہے۔ بہت اچھے دن گزرتے چلے جا رہے تھے لیکن جیسے ہی اس کے شوہر ایک حادثہ میں اس جہاں سے چلے گئے، مراد علی نے نگاہیں پھیر لیں۔ شعیب ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اپنے باپ کا بزنس سنبھال سکے۔ یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ بزنس دنوں میں ختم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مراد علی نے اپنا بزنس شروع کر دیا۔ سبھی یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس نے کیا کھیل کھیلا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تاکہ اپنا بزنس جما سکے۔

بیگم ثروت کو مراد علی کی اس محسن کشی کا دکھ تو تھا ہی لیکن یہ امید نہیں تھی کہ وہ ان سے یوں نفرت کرے گا۔ وہ شاید سب کچھ بھول جاتی اگر مراد علی تھوڑا بہت رشتوں کا خیال کر لیتا۔ بیگم ثروت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا بیٹا شعیب پورے دل سے ثانیہ کو چاہتا ہے۔ یہ محبت اس لئے بھی بڑھ گئی تھی کہ ثانیہ اس کی منگیتر تھی۔ وہ اس سے جلد از جلد شادی کر لینا چاہتا تھا۔ گزرتے وقت اور حالات میں دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔ شعیب اور ثانیہ کی منگنی تو تھی لیکن کبھی اس کی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ بیگم ثروت لوگوں سے سنتی رہتی تھی کہ مراد علی نے ہر طرح کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ مراد علی کبھی اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے نہیں بیاہے گا۔ لیکن ایک دن وہ اپنے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر ثانیہ کی شادی بارے بات کرنے ان کے گھر جا پہنچی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اُسے اندیشہ تھا۔ اس کی بہن تو چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے مگر مراد علی نے انتہائی حقارت سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح رشتے ناتے کی جو تھوڑی بہت امید تھی، وہ بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ کبھی کبھار وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے مل لیا کرتی تھیں۔ بس یہی ان کے درمیان خون کا تعلق رہ گیا تھا۔ ورنہ اگلی نسل میں یہ تعلق بھی نہیں رہنے والا تھا۔ اس پر وہ دونوں بہنیں دکھی تھیں۔

بیگم ثروت جانتی تھی کہ شعیب اب تک ثانیہ کو نہیں بھول پایا تھا وہ اب بھی ثانیہ سے محبت کرتا تھا اور اسی ہی کو چاہتا تھا۔ مراد علی نے اسے طعنہ دیا تھا کہ وہ ہے کیا، جس کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دے۔ یہ کہتے ہوئے وہ وقت بھول گیا تھا جب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور وہ ان کے ہاں ایک تنخواہ دار ملازم تھا۔ لیکن وقت کی حقیقت یہی تھی کہ جب مراد علی نے یہ لفظ کہے تھے، تب شعیب اپنے بچے کھچے بزنس کو سنبھالنے کی کوشش میں تھا جبکہ مراد علی اپنا بزنس مضبوط کر چکا تھا۔

بیگم ثروت چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی تھی۔ وقت پھر بدل گیا تھا۔ بیگم ثروت اپنے اسی شاندار بنگلے میں تھی، جو اس کے شوہر نے بنایا تھا۔ شعیب نے دن رات محنت کے بعد اپنا بزنس بہت پھیلا لیا تھا۔ وہ سخت جدوجہد کے بعد اس قابل ہو گیا تھا کہ مراد علی کے بزنس کو بھی پیچھے چھوڑ دے۔ اس کے دل میں اب بھی ثانیہ کی محبت تھی۔ وہ اب بھی ناامید نہیں تھا۔ وہ اسی زعم میں تھا کہ ثانیہ اسی کی ہے لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی کہ ثانیہ کسی دوسرے کو پسند کر چکی ہے۔

تھکی ہوئی بیگم ثروت لاؤنج میں آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور میز پر مٹھائی کی ٹوکری اور پھول رکھ کر پلٹ گیا تھا۔ تبھی پھوپھو فاخرہ بھی دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی سامنے ہی دھرے صوفے پر آ بیٹھی۔ ان کے درمیان خاموشی رہی لیکن، پھوپھو فاخرہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی، اس لئے بڑبڑاتے ہوئے دکھ سے بولی

"اللہ قسم، تھک گئی آج تو، ویسے ایک بات کہوں ثروت،

Digitized by Google

برامت منانا، یہ جو تیری بہن ہے نا، اس کا رویہ تو ٹھیک تھا...... مگر وہ تیرا بہنوئی...... دیکھا تھا اسے، اللہ معاف کرے، کتنی رعونت آگئی ہے اس میں۔ کیسے گردن اکڑائے ہوئے تھا۔ بھول گیا سب کچھ، وہ وقت بھی اس کے دماغ میں نہیں جب......"

"ہاں فاخرہ، وہ واقعی ہی بھول گیا ہے، وہ کیا، پتہ نہیں کون کون بھول گیا ہمیں۔ یہ تو وقت وقت کی بات ہے نا، ہوتا ہے ایسا، دنیاداری ہے۔" بیگم ثروت نے ٹھنڈی سانس لے کر بے بسی سے کہا۔ اس پر پھوپھو فاخرہ تنک کر بولی

"یہ جو آج اتنا بڑا ابزنس مین بنا ہوا ہے نا، یہ جو کاریں بنگلے بنائے ہیں نا، سب میرے بھائی کی وجہ سے بنے ہیں، ورنہ آج بھی وہی معمولی ملازم ہی ہوتا۔ یہ دولت بھی رشتے ناطے تک بھلا دیتی ہے۔"

"چل چھوڑ، یہ تو میری بہن کے دل میں اب بھی میری محبت ہے، ورنہ کون کسی کو پوچھتا ہے۔ اپنے بھی پرائے بن جاتے ہیں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی

"پرایا پن تو دکھایا تمہاری بہن نے بھی، ارے ہوا تک نہیں لگنے دی منگنی کی۔ کہاں کر رہی ہے؟ کون لوگ ہیں؟ کیا ہم سے بھی اچھے ہیں وہ لوگ، ؟ خون کے رشتوں سے بھی اچھے؟" وہ غصے میں بولی تو بیگم ثروت آہ بھرتے ہوئے دکھ سے بولی

"بس میرے بیٹے کی قسمت میں نہیں تھا۔"

لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ شعیب داخلی دروازے سے اندر آگیا۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس نے سامنے صوفے پر بیٹھی اپنی ماما اور پھوپھو کو دیکھا تو ٹھٹک گیا، پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے عام سے خوشگوار لہجے میں پوچھا

"کیا قسمت میں نہیں تھا ماما؟ اور یہ آپ اتنی اداس کیوں بیٹھی ہیں، خیریت تو ہے نا؟" اس کے یوں پوچھنے پر دونوں ہی نے ایک دوسرے سے آنکھ چرائیں۔ جبکہ شعیب نے میز پر دھری مٹھائی اور پھولوں کو دیکھتے ہوئے پھر سے پوچھا

"آج کہیں گئی تھیں آپ؟"

"ہاں بیٹا، میں تیری آنٹی طلعت کے ہاں گئی تھی۔" بیگم ثروت نے دبے ہوئے سے لہجے میں بتایا تو پھوپھو فاخرہ نے تیزی سے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا

"ایسے کیوں نہیں بتاتی ہو بیٹے کو، مراد علی نے اپنی لاڈلی بیٹی ثانیہ کی منگنی کر دی ہے آج، یہ مٹھائی اس کی منگنی ہی کی تو ہے۔"

یہ لفظ تھے یا کوئی بم پھٹا تھا، شعیب یوں چونکا جیسے اسے شاک لگا ہو۔ یہ لفظ نہ ہوں بلکہ اسے موت کی سزا سنادی گئی ہو۔ وہ حیرت سے کبھی ماں کو اور کبھی مٹھائی کے ڈبے کو دیکھنے لگا۔ پھر غصے اور بے بسی بھرے لہجے میں بولا

"ماما، یہ کیا؟ آپ نے مجھے بتایا تک نہیں، ایسے کیسے منگنی کر لی انہوں نے؟ آپ کو بھی پتہ ہے ثانیہ میری منگیتر ہے۔ وہ کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی؟"

اس کے یوں پوچھنے پر بیگم ثروت چند لمحے خاموش رہی جیسے خود کو سمیٹ رہی ہو، پھر ہمت کر کے بڑے دکھی لہجے میں کہا

"منگیتر تھی بیٹا، وہ تب بھی نہیں رہی تھی جب انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہم کیا کریں بیٹا، ان کی بیٹی ہے۔"

"ماما...... وہ میرے بچپن کی منگیتر ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" شعیب نے ضدی لہجے میں کہا تو بیگم ثروت نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

"ارے بیٹا، بھول جا بچپن کے اس تعلق کو۔ تم خود بتاؤ، کتنی بار کہا ہے ان سے، اب نہ دیں رشتہ تو میں کیا کروں۔ آج کسی اور سے منگنی کر دی۔ اب بتاؤ کیا کروں میں۔ بیٹی ان کی ہے، دب یا......"

انہوں نے کہنا چاہا لیکن پھوپھو فاخرہ بات کاٹتے ہوئے کہا

"اے ہے ثروت، کیا کمی ہے، ہمارے بچے میں، ماشاءاللہ وجیہ ہے، اپنا بزنس کرتا ہے، ان لوگوں سے زیادہ دولت ہے اب اس کے پاس، رشتے دار ہے، مراد علی پر اسی کے باپ نے احسان کیے ہوئے ہیں۔ کیوں انکار کیا، کوئی وجہ تو ہو؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں، اللہ جانے ان کے دل میں کیا تھا۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو ہے۔" بیگم ثروت بے بسی میں بولی

"اصل میں یہ تیرا بہنوئی ہے نا، وہ نہیں چاہتا، وہ تو اسی وقت سے ہمارا دشمن ہے جب میرا بھائی زندہ تھا۔" پھوپھو فاخرہ نے نفرت سے کہا اس کے دل کی بھڑاس ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔

"بند کرو یہ سب، تم ہی اس کی طرف داری کر کے، اس کا

Digitized by Google

دماغ خراب کرتی ہو۔ لڑکیاں کیا کم پڑ گئی ہیں، اس سے کہیں اچھی لڑکیاں....." بیگم ثروت غصے اور بے بسی میں اسی سے الجھنے لگی

"ماما، بات دماغ خراب ہونے کی نہیں، میری انا کا سوال ہے، میں ثانیہ کو کسی اور کا ہو جانے دوں؟ ایسا ہو گا نہیں۔ ناممکن ہے یہ، میں دیکھتا ہوں کیسے ہو گی منگنی اور اب کیسے کرتے ہیں کہیں اور شادی۔" وہ پھرتے ہوئے بولا

"خبردار..... اگر تم نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو، بھول جاؤ اُسے، اگر مجھے پتہ چل گیا، تم نے کوئی ایسا ویسا کچھ کیا ہے..... تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے، میں مر جاؤں گی۔" بیگم ثروت نے گھبراتے ہوئے کہا وہ چند لمحے یونہی کھوئی رہی پھر روتے ہوئے اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ پھوپھو اور شعیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شعیب کی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے انہونی ہو گئی ہو۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھوپھو اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے قریب جا کر بولی

"بیٹا۔ او....."

"پھوپھو، یہ ماما کیا کر رہی ہیں؟ ایسا کیوں کہہ گئی ہیں؟" اس نے پھوپھو کی بات کاٹتے ہوئے دکھی لہجے میں پوچھا تو پھوپھو فاخرہ نے کہا

"تم بیٹا پریشان مت ہو، اپنے کمرے میں جاؤ، دیکھتی ہوں میں اسے سمجھاتی ہوں۔"

"دیکھیں پھوپھو، کہیں ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے، ہم پھر بات کر لیں گے۔" شعیب نے بے چارگی اور دکھ سے کہا

"دیکھتی ہوں۔" پھوپھو بولی اور اندر کی جانب چلی گئی۔

شعیب بہت زیادہ اذیت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماما نے ایسا کیوں کہا تھا، وہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ضد اور غصے میں آ کر وہ کچھ غلط کر بیٹھے۔ اُسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ ایک طرف اس کی پیار ماں اور دوسری جانب اس کی محبت، جواب ضد اور انا بن چکی تھی۔ وہ کسی طور بھی ثانیہ کو کسی دوسرے کی ہوتا دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے دماغ میں غصہ بھرا ہوا تھا لیکن دل اپنی ماما کے لئے دکھی ہو رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ ثانیہ کو کسی دوسرے کا ہوتا دیکھ یہ تو ممکن نہیں تھا مگر وہ اپنی ماما کی قیمت پر ثانیہ کو حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

روشن دن کی دھوپ لاؤنج کی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ ثانیہ علی ایک صوفے پر بیٹھی بظاہر ایک کتاب میں مگن تھی، لیکن اس کے ذہن میں رات ہونے والی منگنی چھائی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ اسے خوبصورت لگ رہا تھا، جسے یاد کرتے ہوئے وہ سرشار ہو رہی تھی۔ انگوٹھی پہناتے ہوئے جب ذیشان نے اس کی طرف دیکھا تھا، وہ نگاہوں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ نجانے اتنی حیا کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اسے نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھ پائی تھی۔ ورنہ عام حالات میں وہ تو پتہ نہیں کتنی کتنی دیر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بحث کرتے نہیں تھکتی تھی۔ اس وقت تو وہ ذیشان سے کوئی بات نہ کر پائی تھی لیکن جاتے ہی اس نے فون کیا تو ثانیہ کو لگا جیسے اس کے لہجے میں اتنا پیار گھلا ہوا ہے کہ وہ چھوئی موئی بن گئی تھی۔ اسے ایک ایک لفظ یاد تھا

"آج تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔" ذیشان نے بڑے ہی رومانوی لہجے میں کہا تھا۔ گویا اس کے کانوں میں رس گھل گیا۔ تبھی وہ اپنے سارے جذبے اور کیفیات کو چھپاتے ہوئے شوخی سے بولی تھی

"تو اس کا مطلب ہے، میں پہلے خوبصورت نہیں لگتی تھی، آج ہی تمہیں....."

"ارے، اسی معصوم حسن پر تو ہم فدا ہوئے ہیں۔ ہم تو اسی دن آپ پر مر مٹے تھے، جب پہلی بار یونیورسٹی میں آپ کو دیکھا تھا۔ یہ بھنورا آنکھیں، یہ گلاب کے جیسا کھلا کھلا چہرہ، یہ خوابوں....." ذیشان نے کہنا چاہا مگر وہ تاب نہ لا سکی فوراً ہنستے ہوئے بولی

"بس بس، تم نے تو شاعری ہی شروع کر دی۔"

"تمہارا حسن ہی ایسا ہے شاعری کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لئے تو اتنی کوشش کر کے پاپا کو منایا۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا

"ویسے یہ اتنی جلدی منگنی.....؟" اس نے پوچھا تو وہ بات کاٹ کر ہنستے ہوئے بولا

"ارے میرا تو دل کرتا ہے، کل ہی ہماری شادی ہو جائے، ابھی تو مجھے تمہارے آدھے حقوق ملے ہیں، سچ پوچھو نا ثانیہ

Digitized by Google

میں اب تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ بس اب جلدی سے شادی ہو جانی چاہئے۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے، میں ایسا نہیں چاہتی؟" وہ شرماتے ہوئے بولی

"تمہاری یہی ادائیں تو مار دیتی ہیں، اچھا یہ بتاؤ ہنی مون کے لئے کہاں کا پلان کیا جائے؟" اس نے پوچھا

"ابھی صرف منگنی ہوئی ہے، ہنی مون کے لئے شادی کے بعد جاتے ہیں۔ جب شادی ہوئی تو پلان بھی کر لیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا

"یار وہ دن کب آئے گا۔" وہ حسرت سے بولا تو ثانیہ نئے خوابوں میں جاگری لیکن جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

"وہ دن جب آئے گا سو آئے گا، اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے، میں سونے لگی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔ خدا حافظ۔"

ذیشان ہیلو ہیلو کرتا ہی رہ گیا اور اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ کتنی دیر اُن خوابوں جیسے لمحوں میں گھری رہی تھی۔ اسے وہ ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔ وہ یہ سارے لمحے سوچتے ہوئے انجانی کیفیات سے سرشار تھی۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ نجانے کب سو گئی تھی۔

ثانیہ ہاتھ میں کتاب پکڑے صوفے پر آلتی پالتی مارے سہانے خیالوں میں گم تھی۔ یوں جیسے اردگرد کا ہوش ہی نہ ہو۔ اسے ذیشان سے ایک ملاقات یاد آ رہی تھی

اس دن وہ دونوں ریستوران میں ملے تھے۔ جب وہ پہنچی تو ذیشان اس کے انتظار میں تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی تو وہ بولا۔

"مجھے یہاں آئے بیس منٹ ہو گئے ہیں۔ تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔"

"میں نے دیر نہیں لگائی، بلکہ رش میں پھنس گئی تھی۔ بڑی مشکل سے ڈرائیو کر کے یہاں آئی ہوں۔" اس نے وضاحت کر دی

"لیکن میں بہر حال منگنی میں دیر نہیں کرنے والا، جھٹ منگنی تو ہو جانے والی ہے، کاش پٹ بیاہ بھی ہو جائے۔" اس نے شرارت سے کہا

"مجھے تم پر یقین ہے ذیشان، تم جیسا چاہو۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ خمار آلود لہجے میں بولا

"بس انہی اداؤں نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ، جلدی آرڈر کرو، مجھے بھوک لگی ہے۔" ثانیہ نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

ثانیہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کب باہر پورچ میں کوئی گاڑی رکی ہے اور کب داخلی دروازے سے شعیب آ گیا۔ وہ اس کے قریب آیا تو ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ثانیہ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"ہائے ثانیہ، کیسی ہو؟" شعیب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ثانیہ کو اس کا آنا بہت برا لگا تھا۔ وہ اسے تحمل سے جواب دینے کی بجائے اکتائے ہوئے لہجے میں بولی

"تم یہاں کیا کر رہے ہو، تمہیں اس گھر میں آنے کس نے دیا؟"

"میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" شعیب نے سکون سے کہا

"کیوں، مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو تم؟" اس نے اجنبی لہجے میں سختی سے پوچھا

"صرف یہ بتانے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے بچپن سے تمہارے خواب دیکھے ہیں، بہت چاہتا ہوں تمہیں۔ تم کسی اور کی ہو جاؤ ایسا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی میں برداشت کر سکتا ہوں۔" اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے اپنا حال دل سنا دیا لیکن ثانیہ نے اجنبیت بھرے لہجے میں کہا

"یہ پاگل پن ہے شعیب، میرے والدین نے جہاں ٹھیک سمجھا، وہاں میرا رشتہ کر دیا۔ تم کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہے ہو۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں، تمہارے پاپا، تمہاری مرضی کے بغیر یہ رشتہ نہیں کر سکتے، اور....." اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولی

"تو پھر تمہیں سمجھ جانا چاہئے۔ تمہارا اس طرح یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"تمہارے بچھڑ جانے کا احساس مجھے پاگل کر رہا ہے، تم نہیں جانتی ہو محبت کیا ہوتی ہے، پلیز میرے جذبات سمجھنے کی کوشش کرو، چھوڑ دو اسے اور....." شعیب بے بس ہو کر بولا تو ثانیہ طنزیہ لہجے میں اُسے سمجھاتے ہوئے بولی

"جس طرح تم اپنی محبت جتانے کا حق رکھتے ہو، اسی طرح مجھے یہ حق کیوں نہیں دیتے ہو کہ میں تم سے شادی کروں

Digitized by Google

یا نہ کروں، یہ محبت ہے یا مذاق؟"

" یہ جو محبت ہے نا، جب یہ کھو جائے نا تو...... پلیز ثانیہ......" وہ سمجھاتے ہوئے کہنا چاہتا تھا لیکن بے بسی میں کچھ بھی نہیں کہہ پایا

" چلے جاؤ یہاں سے اور مجھے میری زندگی جینے دو۔ میرے والدین نے میرا نام ذیشان کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اب مجھے اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔" ثانیہ انتہائی غصے اور بے بسی میں بولی

" میری محبت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا نام پہلے مجھ سے جڑا ہے۔ اب میری منگیتر کسی کی ہو جائے، یہ تو میں نہیں ہونے دوں گا۔" وہ تیزی سے سخت لہجے میں بولا

" یہ کیا بات کر رہے ہو تم نان سینس، دفعہ ہو جاؤ، میرا دماغ مت خراب کرو۔ میں اب ذیشان کی ہوں اور......" اس نے کہنا چاہا تو وہ بھڑکتے ہوئے بولا۔

" اور اگر ذیشان ہی زندہ نہ رہا تو، اور تم...... تم کیا سمجھتی ہو، کیا میری زندگی برباد نہیں ہوگی، میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسی دوران بیگم طلعت لاؤنج کے اندر آ گئی۔ وہ یہ سب سن کر حیرت سے بت بن گئی۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی

" شعیب...... تم...... یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو، میرے ہی گھر میں میری بیٹی کو دھمکیاں دے رہے ہو؟"

" آنٹی آپ بھی جانتی ہیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ میں ثانیہ اور ذیشان کی شادی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میری منگیتر ہے۔" وہ ادب سے بولا تو بیگم طلعت انتہائی غصے میں بولی

" ہے نہیں، منگیتر تھی......" یہ کہتے ہوئے وہ تحمل سے بولی " شعیب، فوراً یہاں سے چلے جاؤ، ابھی اور اسی وقت، چلے جاؤ۔"

" آنٹی میں......" اس نے کہنا چاہا لیکن بیگم طلعت نے اس کی بات سنے بنا غصے میں کہا

" میں نے کہا نا فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی مت آنا۔ چلے جاؤ۔"

یہ توہین کی انتہا تھی۔ شعیب نے پہلے اپنی آنٹی کی طرف اور پھر ثانیہ کی جانب دیکھا۔ وہ یونہی کتاب پر دیکھنے لگی تھی۔ وہ یہی ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے شعیب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شعیب نے ایک طویل سانس لی اور پلٹ کر اس گھر سے نکلتا چلا گیا۔ اسے اپنا آپ سمیٹنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ توہین کا احساس اسے مار رہا تھا۔ اسے خود سے زیادہ اپنی محبت کی توہین پر دکھ ہو رہا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

اس وقت بیگم ثروت کاریڈور میں اخبار پڑھ رہی ہے۔ ایسے میں گیٹ سے کار اندر آ کر اس کے پاس رک گئی۔ اس میں سے بیگم طلعت اور مراد علی باہر آ گئے۔ بیگم ثروت خوشگوار حیرت سے دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔ کتنے عرصے بعد وہ ان کے گھر آئے تھے۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ دونوں میاں بیوی چلتے ہوئے اس کے قریب آئے تو بیگم ثروت خوشی بھرے لہجے میں کہا

" اوہ ہو، خیر سے آج کہاں راستہ بھول گئی ہو، بہرحال خوش آمدید، آؤ بیٹھو۔"

" سوری ثروت، میں یہاں بیٹھنے کے لئے نہیں آئی۔ صرف ایک بات سمجھانے آئی ہوں۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں اجنبیت سے کہا

" یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" ثروت نے حیرت سے پوچھا

" اپنے بیٹے کو سنبھال لو، ورنہ اس کے ساتھ بہت برا ہوگا، یہی بات کہنے آئی ہوں۔" بیگم طلعت نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے اجنبیت سے کہا تو بیگم ثروت بوکھلائے ہوئی بولی

" کیا ہو گیا، کیا کر دیا اس نے؟"

اس پر مراد علی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا

" وہ میرے گھر میں غنڈہ گردی کرے گا، ہمیں دھمکائے گا... مارنے کی دھمکیاں دے گا تو کیا میں یہ برداشت کر لوں گا۔ یہ بات میں فون پر بھی کہہ سکتا تھا، لیکن خود آیا ہوں سمجھانے، آئندہ اس نے کوئی ایسا کمینہ پن کیا، تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔"

" کیا ہو گیا ہے، ایسا کیا کر دیا شعیب نے؟" بیگم ثروت نے حیرت اور گھبراہٹ میں پوچھا

" اسی سے پوچھ لینا جو میرے گھر میں گھس کر مرنے مارنے کی دھمکیاں دے کر آیا ہے۔ میں گھر پر نہیں تھا، ورنہ بتاتا کیسے دھمکیاں دیتے ہیں۔"

" شعیب گیا تھا تمہارے گھر؟" اس نے حیرانگی سے

Digitized by Google

پوچھا

"تو اور کیا، میری بیٹی کو مارنے کی دھمکی دے کر آیا ہے۔" طلعت نے جذباتی لہجے میں کہا تو مراد علی نے نفرت سے کہا

"تم ماں بیٹا یاد رکھنا، میں اپنی بیٹی کی خوشیوں پر ایسے کسی بھی منحوس کا سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ یہ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔"

"معاف کردو بھائی، میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، اگر اس نے ایسا کچھ کیا ہے تو..... خدا کے لئے طلعت، میں اسے سمجھالوں گی۔" بیگم ثروت ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی

"ہم سے معافی مانگنے کی بجائے اسے سمجھاؤ، جو کچھ اس نے کیا، وہ کوئی بھی ماں باپ برداشت نہیں کرسکتا، میری جگہ تم بھی ہوتی نا تو بھی نہیں۔" بیگم طلعت نے منہ پھیرتے ہوئے کہا

"چلو طلعت، آخری بار سمجھالیا۔" مراد علی نے پلٹتے ہوئے کہا تو بیگم ثروت نے تیزی سے کہا

"طلعت، مراد علی بھائی، بات تو سنیں۔ میں....."

"بس، پہلے ہی تمہیں منگنی پر بلا کر میری بیوی نے غلطی کی، اب کچھ نہیں بچا۔ کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں بچا۔ اب میں اسے معاف کرنے والا نہیں، شوٹ کردوں گا اسے۔" مراد علی نے نخوت سے کہا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔ بیگم طلعت بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

انہی لمحات میں پھوپھو فاخرہ بھی اندر سے باہر آگئی۔ اس نے مراد علی کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی مراد علی پر بھری پڑی تھی، تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے حقارت بھرے لہجے میں بولی

"ہائے، کیا ہوگیا، کیا کردیا میرے بچے نے، کسے مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہو؟ تمہاری یہ جرأت ہے ہمارے بیٹے کو مرنے مارنے کی دھمکی دینے والے..... رُک ذرا، میں بتاؤں تمہیں چور کہیں کے..... ہمارے بچے کو دھمکیاں..... میں چیر کے رکھ دوں گی۔"

ان دونوں نے پھوپھو فاخرہ کی بات سنی ان سنی کردی جیسے وہ اسے اہمیت ہی نہ دے رہے ہوں لیکن پھوپھو کہتی چلی جا رہی تھی

"کسی نے شعیب کی طرف انگلی بھی اٹھائی نا تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گی۔ تم کل کے ہمارے ملازم آج تم ہمیں یہاں دھمکیاں دینے آجاؤ۔ کیسا زمانہ آگیا چور اچکے بھی شرفاء کو دھمکیاں دیں گے۔"

وہ دونوں کوئی جواب دیئے بنا کار میں بیٹھے اور وہاں سے چلے گئے۔

بیگم ثروت یوں کرسی پر بیٹھی، جیسے اسے اب تک سمجھ نہ آئی ہو کہ ہوا کیا ہے۔ اس نے دکھ سے آنکھیں بند کرلیں جن سے آنسو ٹپک پڑے۔ پھوپھو فاخرہ حیرت زدہ سی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑی رہی پھر اندر کی جانب پلٹ گئی۔

کافی دیر بعد جب پھوپھو فاخرہ ہاتھ میں ٹرے پکڑے دوبارہ باہر ایڈور میں آئی تو بیگم ثروت یونہی گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھوپھو فاخرہ نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولی

"ارے یوں کیسے بیٹھی ہو، مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے مراد علی کی بات دل کو ہی لگالی ہے۔ کچھ نہیں کرسکتا وہ۔ اب سوچنا چھوڑ بھی دو، بھول جاؤ۔ لو یہ تم اپنی دوا کھاؤ۔" اس نے ٹرے میں پڑی ہوئی دوا اٹھا کر دی۔

"کیسے بھول جاؤں فاخرہ، میں نے پوری زندگی میں کبھی کسی کی اتنی باتیں نہیں سنیں، جتنی مجھے شعیب کی وجہ سے سننی پڑی ہیں، مجھے ذرا سی بھی بھنک مل جاتی نا تو میں اسے وہاں جانے ہی نہ دیتی۔" بیگم ثروت نے دوا پکڑ کر کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دوا پھانک کر گلاس سے پانی پیا تو پھوپھو فاخرہ نے اسے چائے کا مگ تھماتے ہوئے کہا

"سچی بات تو یہ ہے ثروت، شعیب نے کچھ غلط نہیں کیا، آخر اس کے بچپن کی منگیتر ہے، وہ کیوں چھوڑے اسے، پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے انکار ہی کیوں کیا۔ یہ گڈی گڈے کا کھیل ہے بھلا۔ میں تو کہوں، شعیب نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میرا بس چلے تو میں ثانیہ کو شعیب کی دلہن بنادوں۔"

"لیکن اب تم یہ کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہی ہو، کیوں جلتی پر تیل ڈال رہی ہو، ثانیہ اب شعیب سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ تم شعیب کو یہ سمجھانے کی بجائے اپنی ہی رٹ لگائے ہوئے ہو۔" بیگم ثروت بھنا کر بولی

"میں تو سیدھی بات کرتی ہوں، بھلے کسی کو بری لگے۔ غلط کہہ رہی ہوں کیا؟" پھوپھو فاخرہ نے ٹرے سے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے سکون سے کہا

Digitized by Google

"خبردار فاخرہ، میرے گھر کے معاملات میں دخل دینا بند کردو۔ اگر تم نے یہاں رہنا ہے تو۔ خدا کی پناہ، کوئی سمجھتا ہی نہیں، کیا کروں میں۔" بیگم ثروت نے غصے میں کہا، ہاتھ میں پکڑا ہوا مگ واپس ٹرے میں رکھا اور غصے میں اٹھ کر اندر چلی گئی۔ پھوپھو فاخرہ چند لمحے بیٹھی رہی پھر طنزیہ انداز میں مسکرادی۔ مگ اٹھا کر چائے کا سپ لیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولی

"اونہہ، بڑی آئی دھمکی لگانے والی، اری بتو، اس گھر میں ہوگا وہی جو میں چاہوں گی۔ تم جو مرضی کرلو۔"

وہ مسکراتے ہوئے سکون سے چائے پینے لگی تھی۔

فاخرہ کی شادی ایک بڑے گھر میں ہوئی تھی۔ بھائی نے اسے بہت کچھ دیا تھا، کوٹھی کار اور وہ سب کچھ جو دیا جانا چاہئے تھا۔ جلد ہی وہ اپنے شوہر کے ساتھ الگ ہوگئی۔ اس کی خاندان سے نہیں بنی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی تھی اور خوش تھی۔ دس برس گزر گئے، اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کا شوہر اس سے مایوس ہوگیا۔ اس نے دوسری شادی کرلی، جس سے اسے اولاد ہوگئی۔ وہ اپنی زندگی میں خوش تھا۔ اس نے فاخرہ کو نہیں چھوڑا، اس کے ساتھ ہی رہا۔ کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اس کا کوئی پرسان نہیں تھا۔ یہ بیگم ثروت ہی تھیں جو اسے اپنے ہاں لے آئی۔ یہاں آکر وہ بڑے سکون سے تھی۔ اس نے اپنا گھر کرائے پر دے دیا تھا اور ان کے ہاں آکر سکون سے زندگی بسر کررہی تھی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

مراد علی سائیڈ ٹیبل کی روشنی میں بیڈ پر نیم دراز میگزین دیکھ رہا تھا۔ بیگم طلعت دھیمے قدموں سے آکر خاموشی سے بیڈ کے ایک طرف اپنے بال سنوارتے ہوئے لیٹ گئی۔ مراد علی نے میگزین ایک جانب رکھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"بیگم، میں دیکھ رہا ہوں، تم بہت ڈسٹرب ہو۔"

"اتنا کچھ ہوگیا، اب بھی مجھے ڈسٹرب بھی نہیں ہونا چاہئے۔" وہ دکھ سے بولی تو مراد علی نے غصے میں کہا

"اب کیا ہوگیا ہے؟"

"اس دنیا میں میری ایک ہی بہن ہے، اب اس سے بھی تعلق نہیں رہا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رو پڑی۔ مراد علی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر نرم سے لہجے میں بولا

"میں سمجھتا ہوں، میں ثروت آپا کی بہت عزت کرتا ہوں، کیا کروں، میں شعیب کو برداشت نہیں کرسکتا، وہ مجھے ویسے ہی بہت برا لگتا ہے۔"

"کیا یہ حقیقت نہیں؟ کیا ثانیہ اس کی منگیتر نہیں رہی؟ دونوں کی ہم نے منگنی کی تھی، اب ذیشان سے منگنی کا فیصلہ آپ نے کیا یا ثانیہ نے، یہ الگ بات ہے، لیکن شعیب سے منگنی توڑ... کا بھی کوئی جواز نہیں ہے آپ کے پاس، ہمیں حقیقت....." وہ دکھ سے کہتی چلی گئی لیکن مراد علی اس کی بات کاٹ کر بے پروائی سے بولا

"ہمیں اپنی بیٹی کی خوشیاں چاہئیں، میں نے یہ فیصلہ ثانیہ کی خواہش پر کیا۔ تم بھی جانتی ہو۔ یہ جواز کیا کم ہے؟ تمہیں اس قدر دکھی نہیں ہونا چاہئے۔"

"جس طرح ثانیہ ہماری اکلوتی ہے، شعیب بھی ایسا ہی اکلوتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا، میری بہن تو جیتے جی مرجائے گی، کیا کچھ نہیں کیا اس نے ہمارے لئے اور ہم اسے دکھ دیں گے۔ آپ نے ثروت کے ساتھ اس قدر اجنبیت دکھائی اور مجھے دکھ بھی نہ ہو۔" بیگم طلعت نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو مراد علی بولا

"دیکھو، اگر میں سختی نہ دکھاتا تو....."

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ثروت کو اذیت دیں؟ اور پھر شعیب، آپ اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں، وہ کس قدر سر پھرا لڑکا ہے، وہ ضد میں آکر کچھ بھی کرسکتا ہے، نقصان کسی کا بھی ہو، وہ نقصان تو ہمارا ہی ہے نا۔ وہ بھی اپنا ہی خون ہے۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی

"وہ خون ہوگا تمہارا، اور تم مجھے یہ جذباتی بلیک میل نہ کرو، تم کچھ زیادہ ہی اوٹ پٹانگ سوچ رہی ہو۔" وہ زچ ہوتے ہوئے اکتا کر بولا

"میں اپنی بہن کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔" وہ حتمی لہجے میں بولی تو مراد علی مفاہمانہ انداز میں بولا

"خیر، میں نے سوچ لیا ہے۔ اس معاملے کا کوئی بہتر حل نکالتا ہوں، تم فکر نہ کرو، سکون سے سوجاؤ۔"

"کسی کا نقصان نہیں ہونا چاہئے۔" بیگم طلعت نے یاد دہانی کے انداز میں کہا

"ٹرسٹ می، کچھ نہیں ہوتا، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اب تم سوجاؤ۔" مراد علی نے یہ کہتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کی لائیٹ

Digitized by Google

بجھادی۔ بیگم طلعت بھی سونے کیلئے پہلو میں لیٹ گئی لیکن اس کے آنسو رواں تھے جو اس کا شوہر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

اسی شام مراد علی اور بیگم طلعت نے چوہدری نذیر احمد کو اطلاع کر کے ان کے ہاں جا پہنچے۔ ان کا استقبال دونوں میاں بیوی نے کیا۔ کچھ دیر تک وہ سبھی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے، پھر مراد علی نے ہی بڑے سکون سے کہا

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

"جی، جی کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔" نذیر احمد نے تیزی سے کہا، وہ تب سے یہی سننے کو بے چین تھا۔ چند لمحے رک کر مراد علی بولا

"میں چاہتا ہوں کہ ثانیہ اور ذیشان کی شادی جلدی کر دی جائے، اس کی وجہ شعیب ہے۔ جس کے بارے، میں آپ کو تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا میرے ہاتھوں کچھ بھی ایسا ہو جائے، جس کا بہر حال نقصان ہمیں ہی ہوگا۔"

"اوہو!..... میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات، عقل مندی تو یہی ہے۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو کئی سارے طریقے ہیں، اسے ہر طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔" نذیر احمد نے معنی خیز انداز میں کہا تو بیگم طلعت یہ سب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولی

"نہیں بھائی، ایسا کرنے سے پرابلم بڑھیں گے۔ وہ میری بہن کا اکلوتا بیٹا ہے، اسے اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو سمجھیں ہمارا ہی نقصان ہے..... اگر ہم بچوں کی شادی ہی جلد کر دیں؟"

"ہاں مگر میں تو یہی کوئی نو دس دن ہوں یہاں پاکستان میں۔ مجھے لندن جانا ہے۔ اتنی جلدی اور ایسے میں کیا ہو سکتا ہے۔" نذیر احمد نے حیرت سے کہا

"ہم ابھی نو دس دنوں ہی میں یہ فرض ادا کر دیں" یہ کہتے ہوئے الماس کی طرف دیکھ کر بولی، "کیا خیال ہے الماس، تم بھی تو کچھ کہو۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، بس یہی ہوگا کہ شادی بھی سادگی سے ہوگی، ہماری اکلوتی اولاد ہے، کس طرح سے....." بیگم الماس کہتے کہتے رک گئی۔ اس پر نذیر احمد نے سوچتے ہوئے کہا

"اگر انہی چند دنوں میں شادی کر کے ہم سب کسی بھی حادثے سے بچ جائیں تو میرا خیال ہے، شادی کر دیں۔ کافی دن ہیں، ہم اپنے سب دوستوں کو بلا سکیں گے۔ ٹھیک ہے، میرے خیال میں یہی بہتر ہے، ورنہ لندن سے میری واپسی بھی کوئی دو ڈھائی ماہ بعد ہوگی۔"

"بہت شکریہ، بہت بڑا بوجھ اتر گیا میرے دماغ سے۔" مراد علی نے سکون بھرے لہجے میں کہا تو نذیر احمد نے الماس اور طلعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اب تو یہ ان دونوں خواتین پر ہے، کتنی جلدی شادی کی تیاریاں کرتی ہیں۔"

"باقی باتیں پھر کرتے ہیں، پہلے ڈنر لے لیں۔" بیگم الماس یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی تو وہ بھی اٹھنے لگے۔ کھانے کے دوران بہت ساری باتیں ہوتی رہیں۔

اسی رات ثانیہ اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ بیگم طلعت کمرے میں آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی پھر بڑے پیار سے بولی

"چھوڑ دو بیٹا، اب یہ کتابیں اور میری بات سنو۔"

اس کے یوں کہنے پر ثانیہ نے خوشگوار حیرت سے اپنے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی اہم بات ہے ماما؟"

"ہاں، تمہاری شادی آج سے آٹھ دن بعد ہو رہی ہے۔" بیگم طلعت نے لاڈ سے کہا تو ثانیہ ایک دم سے پریشان ہو کر بولی

"کیوں ماما، اتنی جلدی، یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نہیں کروں گی اتنی جلدی شادی، آٹھ دن بعد تو میرے امتحان ہو رہے ہیں، میں کیسے کر سکتی ہوں شادی؟ میری پڑھائی ادھوری رہ جائے گی۔"

"ہم یہ شادی طے کر چکے ہیں۔ اس لئے اب کوئی امتحان نہیں ہم ایسے کرو....." بیگم طلعت نے کہنا چاہا تو ثانیہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"نہیں ماما آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میرے امتحان ہیں اور میں اس کے بعد ہی....."

"دیکھو، یہ منگنی تمہاری مرضی سے ہوئی، تم نے کہا ہم نے فوراً کر دی، لیکن اب ہم تمہاری شادی چاہتے ہیں، اب یا تو شادی کر لو یا پھر امتحان دے لو؟" بیگم طلعت نے سختی سے کہا تو

Digitized by Google

اس نے سوچتے ہوئے پوچھا
"کیا آپ نے فیصلہ شعیب کی وجہ سے کیا ہے؟"
"ہاں، ہم نہیں چاہتے، کوئی بھی ایسی ویسی بات ہو جائے تمہیں اپنے پاپا کا تو پتہ ہی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن پاپا....." اس نے کہنا چاہا تو ماما نے ٹوکتے ہوئے سختی سے کہا
"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ اب یہ پڑھائی چھوڑو اور اپنی شادی کی شاپنگ کے بارے میں سوچو۔" بیگم طلعت نے کہا اور کچھ سنے بغیر کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔
ثانیہ حیران و پریشان سی جاتی ہوئی اپنی ماما کو دیکھتی رہی۔ ماما کا لہجہ، اس کا انداز، وہ ساری پریشانی ظاہر کر رہا تھا جسے وہ خود بھی سمجھتی تھی۔ کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے فون اٹھایا اور نمبر پش کرنے لگی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔
"ہیلو سویٹ ہارٹ، ذیشان حاضر ہے۔" ذیشان نے بڑے رومانوی انداز میں کہا تو ثانیہ منتشر لہجے میں بولی
"میں اتنی پریشان ہوں اور تمہیں رومانٹک ڈائیلاگ سوجھ رہے ہیں۔"
"میرے ہوتے ہوئے تم پریشان ہو، ایسا ہو تو نہیں سکتا۔" وہ سکون سے بولا
"یہ جو آٹھ دن بعد میری شادی رکھ دی گئی ہے، پتہ ہے انہی دنوں میرے امتحان شروع ہوں گے۔ میں کیسے....." اس نے کہا چاہا مگر ذیشان نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے سکون اور پیار سے کہا
"سنو! شادی صرف تمہاری نہیں، میری بھی ہو رہی ہے، تمہارے ساتھ، مجھے پتہ ہے کہ ایگزام ہوں گے، پر تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تم ایگزام دو گی، چاہے اس دن میری بارات ہو یا ولیمہ۔"
"مطلب شادی ہونی ہے چاہے ایگزام ہو، تم بھی یہی چاہتے ہو، سب کی طرح....." وہ پریشانی اور دبی دبی خوشی میں بولی
"جب حالات ہمیں اتنی جلدی ملا دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔" اس نے شوخی سے کہا
"تم بھی نا....." وہ حیا بار لہجے میں بولی
"اور ہاں..... سکون سے، جو تھوڑی بہت شاپنگ کر سکو تو کر لینا، باقی ہم ساری شاپنگ وہاں سے کریں گے جہاں ہنی مون کے لئے جائیں گے۔" اس نے پھر اسی شوخی میں کہا تو ثانیہ نے تیزی سے کہا
"اوکے، میں پھر بعد میں فون کرتی ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ پھر کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے خوشگوار خیالوں میں کھو گئی۔ اس کے خواب بھی رنگین ہو گئے تھے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ شعیب ابھی تک بیڈ کے ساتھ لگا سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور غصہ تھا۔ وہ نجانے کیا کچھ سوچ چکا تھا۔ اس کے لئے مراد علی سے ٹکر لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ کب سے وہ اپنے دل میں یہی خواہش لئے بیٹھا تھا۔ لیکن ہر بار اس کے سامنے ماما کا چہرہ آ جاتا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ کوئی ایسا راستہ سوچنا چاہتا تھا جس سے وہ مراد علی کو جھکا سکے۔ بزنس کی دنیا میں ایسا بہت کچھ ہوتا رہتا ہے کرنے کے لئے، مگر یہ ایک لمبا راستہ تھا۔ ممکن ہے وہ اس طرح ثانیہ کو کھو دیتا؟ اس کی سمجھ میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور پھوپھو فاخرہ اندر داخل آ گئی۔ اس نے شعیب کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا
"اے بیٹا! یوں کیسے پڑا ہوا ہے، آفس نہیں جانا کیا؟"
"نہیں پھوپھو، میرا دل نہیں کر رہا جانے کو۔" شعیب نے بیزاری سے کہا
"دیکھ بیٹا! تیری ماں تو مانتی نہیں، ماننا تو درکنار، وہ بات بھی نہیں کرنا چاہتی ثانیہ کے بارے میں۔ لیکن، اگر تجھے مجھ پر بھروسہ ہے نا تو پھر فکر مت کر..... میرے ہوتے ہوئے تیری ہار نہیں ہو سکتی۔" پھوپھو فاخرہ نے انکشاف کر دینے والے انداز میں کہا تو شعیب نے اس کی جانب دیکھا کر کہا
"میری تو یہ ضد ہے، میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن ماما....."
"وہی تو کہہ رہی ہوں، تم حوصلہ کیوں ہارتے ہو، میں تیرے ساتھ ہوں۔ میں....." لفظ ابھی پھوپھو فاخرہ کے منہ ہی میں تھے کہ بیگم ثروت نے کمرے میں داخل ہو کر خشمگیں نگاہوں سے پھوپھو فاخرہ کو دیکھا۔ اس نے یہ سب سن لیا تھا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں بولی
"اے فاخرہ، میرے بیٹے کو الٹی پٹیاں نہ پڑھا، اس کے

Digitized by Google

دماغ سے ثانیہ کا خیال کیوں نہیں نکلنے دے رہی ہو تم، کیوں ہماری دشمن بنی ہوئی ہے۔ جو بات اب ناممکن ہے، تم اسے کیسے ممکن بنادو گی؟"

"اپنے بیٹے کی حالت دیکھ۔ تم کیوں اس کی دشمن بنی ہوئی ہو۔ کم از کم ان لوگوں سے بات تو کریں، وہ کیوں....." پھوپھو فاخرہ نے بے چارگی سے کہا تو بیگم ثروت ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولی

"میں کیا کروں گی ان سے بات اور کیا دیکھوں اس کی حالت؟ تم دونوں سن لو، انہوں نے شادی کے دن طے کر دیئے ہیں۔ آج سے آٹھ دن بعد ثانیہ کی شادی ذیشان سے ہو رہی ہے۔"

یہ دھماکا خیز اطلاع تھی۔ اتنا مختصر وقت؟ یہ سن کر شعیب تڑپ کر اٹھتے ہوئے بولا

"شادی، میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے مجھے کسی کی جان بھی لینا پڑے۔"

وہ دونوں ششدر رہ گئیں۔ شعیب نے یوں کرب سے آنکھیں بند کرلیں جیسے اپنے خود پر قابو پانے میں بہت مشکل ہو رہی ہو۔ بیگم ثروت ماں تھی۔ وہ اندر تک دہل گئی۔ اس کے سامنے وہ سارے حالات آگئے جو وہ سوچتی رہتی تھی۔ سو اس نے وار نگ دیتے ہوئے کہا

"بکواس بند کرو، اور میری بات غور سے سنو، انہوں مجھے یہ پیغام خود بھیجا ہے۔ اگر تم نے کچھ بھی کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔"

"مجھے کسی انجام کی پروا نہیں ہے، میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے خود پیغام بھجوادیا۔ اب میں دیکھتا ہوں انہیں۔" شعیب غصے میں بولا

"تو پھر سن لو، جتنا میں ذلیل ہو چکی ہوں، اتنی ذلت میں نے کبھی نہیں دیکھی، اگر تم نے کچھ بھی کیا تو نہ میں انہیں کہہ سکتی ہوں اور نہ تمہیں کہوں گی، میں خود مر جاؤں گی، مجھ میں اب ذلتیں سہنے کی سکت نہیں ہے۔ نہیں ہے سکت....." یہ کہتے ہوئے بیگم ثروت رو پڑی۔ پھر اس نے حسرت آمیز نگاہوں سے شعیب کو دیکھا اور باہر کی طرف چلی گئی۔ شعیب اور پھوپھو اسے ہونقوں کی طرح دیکھتے رہے۔ شعیب بے چین ہو گیا۔ اس کے اندر لگی آگ اسے بے سکون کر رہی تھی۔ پھوپھو خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

پھوپھو فاخرہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ وہ اس قدر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے بیگم ثروت کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ کہیں جانے کو تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے قریب آکر پھوپھو فاخرہ سے پوچھا

"یہ ماسی رضیہ آج پھر نہیں آئی کیا؟"

"ابھی تک تو نہیں آئی، شاید آجائے ابھی تھوڑی دیر میں۔" پھوپھو فاخرہ نے چائے کا لمبا سا سپ لے کر کہا

"یہ بھی نا، آئے دن بہانے کام پر نہیں آتی۔" اس نے کافی حد تک اکتائے ہوئے لہجے میں کہا، پھر لہجہ بھرڑک کر ہلکے سے لہجے میں پوچھا، "شعیب نے ناشتہ کرلیا؟"

"وہ بے چارہ تو ابھی تک کمرے میں ہے۔" پھوپھو فاخرہ نے سارے جہان کا دکھ اپنے لہجے میں سمیٹتے ہوئے کہا تو بیگم ثروت نے اکتا کر بولی

"بے چارہ..... میں ذرا مسز فارحہ کے ہاں جا رہی ہوں، اسے ناشتہ کروا دینا، اور اسے کہو آفس چلا جائے، کب تک یوں گھر میں بیٹھا سوگ مناتا رہے گا۔ اسے سمجھاؤ۔"

"تم جاؤ خیر سے، میں کرادوں گی ناشتہ اور سمجھا بھی دوں گی۔" پھوپھو فاخرہ نے اطمینان سے جواب دیا اور خالی مگ ایک جانب میز پر رکھ دیا تو بیگم ثروت کو کچھ یاد آ گیا۔

"اور ہاں وہ ماسی رضیہ آجائے نا تو اسے کہنا....."

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے مجھے پتہ ہی نہیں گھر کے کاموں کا، تم جاؤ۔" وہ ایک جانب سر مارتے ہوئے بولی تو بیگم ثروت اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے باہر کی جانب چل دی۔ تبھی پھوپھو اٹھی جیسے اس کے جانے کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ شعیب کے کمرے کی جانب لپکی۔

وہ ہنوز بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، جن میں نمی تیر رہی تھی۔ گال بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ ایسے میں پھوپھو فاخرہ اس کے کمرے میں جا کر ٹھٹک گئی۔ اسے یوں دیکھ کر پھوپھو فاخرہ نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"واہ، واہ، واہ..... کیسے مرد ہو تم، بجائے کچھ کرنے کے یہاں بیٹھے آنسو بہا رہے ہو۔ ادھر تمہاری اماں کہہ رہی ہے، کب تک گھر میں بیٹھا سوگ مناتے گا۔ نہ تیری سمجھ آتی ہے اور نہ تیری اماں کی۔"

اس پر شعیب نے انتہائی غصے اور بے بسی میں دیکھتے

Digitized by Google

ہوئے کہا

"تو پھر اور کیا کروں پھوپھو، میری ماما نے جو اتنی قسمیں دے دی ہیں، خودکشی کی دھمکی دے کر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں، تو بولو کیا کروں میں؟"

"نہ مجھے یہ بتا، یہاں پڑے رہنے سے اور اس طرح آنسو بہانے سے کیا کچھ ہو جائے گا؟" پھوپھو فاخرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو شعیب انتہائی غصے میں اُکتا کر بولا

"میں اب اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا مجھے اپنی بے عزتی کا دکھ نہیں ہے، مگر ماما ہے کہ....." یہ کہتے ہوئے وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میں ان کا وہ حشر کر سکتا ہوں، پر کیا کروں یہ میری ماما....."

"ارے بیٹا، جب وہ ثانیہ ہی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی، اسے کیسے مناؤ گے؟ پھر وہ مراد علی، اس کا تو ویسے ہی دماغ ساتویں آسمان پر ہے۔" وہ نفرت سے بولی

"اس کے باپ نے ثانیہ کا دماغ خراب کیا ہوا ہے، اس کا باپ بچپن ہی میرے ساتھ دشمنی رکھتا ہے۔ جب پاپا تھے تو کس طرح آگے پیچھے پھرتا تھا۔" شعیب نے غصے میں کہا تو پھوپھو فاخرہ حتمی لہجے میں بولی

"اچھا میری ایک بات سنو غور سے۔!" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر رک کر تجسس بھرے لہجے میں بولی، "بھلے ثانیہ کی منگنی ہو گئی ہے، لیکن اگر میں تمہاری شادی اسی ثانیہ سے کروا دوں تو؟"

پھوپھو نے کچھ ایسے اعتماد سے کہا کہ شعیب نے حیرت سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"پھوپھو، کیا کہہ رہی ہو؟ کیسے ہو گا یہ؟"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے، میں جو کہوں گی، تم نے وہی کرتے جانا ہے، خود سے کچھ نہیں کرنا۔ میرا نام بھی فاخرہ نہیں اگر ثانیہ کو اس گھر کی بہو نہ بنایا تو۔ یہ مراد علی بھی کیا یاد کرے گا۔" آخر پھوپھو نے وہ زہر اگل دیا، جو اس کے من میں نجانے کب سے تھا۔ اس پر شعیب پرجوش انداز میں بولا

"اگر ایسا ہو جائے نا پھوپھو تو میں ساری عمر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔"

"نہ نہ میرا بیٹا۔ ایک تم ہی تو ہو میرے بھائی کی نشانی، ہماری اولاد ہو تم، مجھ نگوڑی کی تو اولاد نہ ہوئی، تجھے ہی تو بیٹا مانتی ہوں۔ تیرا غم مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ میں کراؤں گی تمہاری شادی ثانیہ کے ساتھ۔" اس نے پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"پھوپھو پھر تو کمال ہو جائے گا۔ ایسا کیا....." اس نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے پوچھا تو فاخرہ بولی۔

"تم یہ سب مجھ پہ چھوڑ دو۔ چل اب اٹھ کے تیار ہو جا، میں ناشتہ لگاتی ہوں، پھر آفس جاؤ۔ کسی کو احساس مت ہونے دو کہ تمہیں کوئی دکھ ہے۔ اٹھ جا میرا بیٹا۔" پھوپھو نے چاپلوسی سے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ شعیب چند ثانیے سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کچھ اور چلنے لگا تھا۔

❁ ❁ ❁

مین روڈ سے وہ سڑک اندر کی طرف ایک کالونی میں جاتی تھی۔ کالونی ختم ہوتے ہی سرے پر ایک بنگلہ نما دو منزلہ گھر بنا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ ایک اکیلا ہی لگتا تھا، تاہم اس کے ساتھ، پیچھلی طرف کافی کوارٹر نما گھر تھے۔ اس گھر کا بڑا سا آہنی گیٹ سیاہ رنگ کا تھا۔ جس کے اندر کی جانب ایک چوکیدار بیٹھا رہتا تھا۔ یہی کوئی سہ پہر کا وقت تھا، جب ایک ٹیکسی اسی گیٹ پر آن رُکی۔ اس میں سے فاخرہ باہر نکلی۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو وہ گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

اندر کی دنیا ہی نرالی تھی۔ ایک بڑا سا برآمدہ تھا، جہاں چند خواتین اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ جس کے ساتھ راستہ اندر کی جانب جاتا تھا۔ کافی بڑا سا صحن پار کرنے کے بعد پھر برآمدہ تھا۔ اس کے ساتھ کمرے تھے۔ اندر سے وہ گھر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پرانا قلعہ ہو۔ کچھ پرانا طرز تعمیر ہونے کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا اور کچھ جان بوجھ کر ایسا بنایا ہوا تھا کہ وہ پراسرار لگے۔ کیونکہ وہ شہر کے مشہور جادوگر، کالے علم کے ماہر بابا کرامت شاہ کا گھر تھا۔ برآمدے میں کھڑی ایک ادھیڑ عمر عورت آگے بڑھی، وہ فاخرہ سے یوں ملی جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔ اسے دیکھتے ہی بولی

"آجاؤ، تمہارے فون کرتے ہی میں نے وقت لے لیا تھا، جلدی آجاؤ، بابا کے پاس اس وقت کوئی نہیں ہے۔"

فاخرہ کچھ نہیں بولی بلکہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ ایک چھوٹی سی راہداری پار کرنے کے بعد سامنے والا کمرہ بابے کرامت شاہ کا تھا۔ وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔ بابے کرامت شاہ کا کمرہ ایسا تھا، جس کی

Digitized by Google

دیواریں سیاہ تھیں۔ مدہم سرخی مائل روشنی میں وہ آنکھیں بند کئے یوں بیٹھا تھا، جیسے گہرے مراقبے میں ہو۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا۔ گلے میں سرخ منکوں والا ہار تھا۔ ہاتھوں میں کئی ساری رنگ برنگی انگوٹھیاں، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں، جن میں گہرا کاجل ڈالا ہوا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال برف کی مانند سفید تھے۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی ہے۔ پھوپھو فاخرہ اندر آئی تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر گونج دار آواز میں بولا

"آؤ..... فاخرہ آؤ..... بیٹھو۔"

سلام کرتے ہوئے بیٹھ گئی تو وہ اس کے چہرے پر دیکھ کر طنزیہ سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا

"بڑی بے چارگی ٹپک رہی ہے تیرے چہرے پر، کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی ہو۔"

"کیا کہوں بابا جی۔ کوئی ایک پریشانی ہو تو بتاؤں۔ ایک بہت بڑی مہم آن پڑی ہے، اسی لئے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔" فاخرہ نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا

"اب کیا ہو گیا تجھے، کیا پریشانی ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟" بابے کرامت نے پوچھا تو فاخرہ دکھی لہجے میں بولی

"مجھ اکیلی جان کو بھلا کوئی ایک مسئلہ ہے۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔ یہ مسئلہ ہے میرا نہیں، میرے بھتیجے شعیب کا ہے۔ میں....."

"وہی۔! جسے تو نے اپنے قابو میں رکھنے کے لئے عمل کروایا تھا۔ کیا اب وہ قابو میں نہیں رہا؟" بابے کرامت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا

"نہیں بابا، وہ بے چارہ تو قابو میں ہے، اب بھلا آپ ہی بتائیں، میں اسے اگر قابو میں نہ رکھوں تو کہاں جاؤں، میں بیوہ عورت ہوں، اکیلی کہاں دھکے کھاتی پھروں۔ اس کی ماں کا بس چلے تو مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے۔ وہ ایک لمحہ برداشت نہ کرے مجھ کو۔" فاخرہ دیدے نچاتے ہوئے بولی تو بابا کرامت اکتاہٹ سے بولا

"یہ رونا دھونا بند کر، مسئلہ بتا کیا ہے؟"

تبھی فاخرہ نے انتہائی اختصار سے ساری روداد سنا دی۔ جب سارا کہہ چکی تو اپنی بات یہ کہتے ہوئے ختم کی

"..... بس ثانیہ کی منگنی ٹوٹ جائے اور اس کی شادی شعیب سے ہو جائے۔ اور یہ منگنی ختم ہو جانے والا کام تو فوراً ہو جائے نا، بس آناً فاناً ہتھیلی پر سرسوں جما دو بابا۔"

بابا کرامت ساری بات سن کر بڑا خوش ہوا، پھر ذرا جھوم کر، خوش کن لہجے میں بولا

"معاملے محبت کے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا، "مسئلہ تو بہت بڑا ہے لیکن..... ہو جائے گا، جتنی لمبی رقم دو گی، اتنی جلدی کام ہو جائے گا، ہتھیلی پہ سرسوں جما دیں گے۔"

"بابا جی، رقم کی تو آپ فکر نہ کریں۔ جتنی چاہیں لے لیں، جو لیں گے وہ کروں گی، بس یہ کام جھٹ پٹ میں ہو جائے۔ وقت نہ لگے ذرا بھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پرس سے نوٹوں کی گڈی نکال کر بابا کرامت کے سامنے رکھ دی۔ نوٹ دیکھ کر بابا کی آنکھیں کھل گئیں۔ بابا کرامت گڈی اٹھاتے ہوئے مخمور ہو کر بولا

"سمجھو ٹوٹ گئی منگنی..... جم گئی ہتھیلی پہ سرسوں..... جھٹ پٹ..... لو پھر....."

یہ کہہ کر اس نے ساتھ پڑا ہوا لکڑی کا سیاہ صندوق کھولا۔ اس میں نجانے کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے اس میں دیکھتا رہا پھر اس میں سے کپڑے کی بنی ایک گڑیا نکالی۔ وہ گڑیا بانشت بھر کی تھی۔ سیاہ رنگ کی ہونے کی وجہ سے بڑی خوف ناک لگ رہی تھی۔ بابا کرامت نے اس کپڑے کی بنی ہوئی گڑیا کو اپنے سامنے رکھا۔ پھر صندوق سے ایک سوئی نکال کر زیر لب پڑھتا چلا گیا۔ بابے کا چہرہ کبھی خوف ناک ہو جاتا، کبھی اس سے نفرت ٹپکنے لگتی اور کبھی خباثت ظاہر ہو جاتی۔ کچھ دیر پڑھنے کے بعد اس نے وہ سوئی گڑیا کے سر میں تھوڑی سی پیوست کر دی۔ وہ کافی دیر پڑھ چکا تو اس نے دھیرے دھیرے وہ پن سوئی گڑیا کے ماتھے میں ساری کی ساری پیوست کر دی۔ ایسے کرتے وقت اس کے چہرے پر انتہا درجے کی نفرت تھی۔ فاخرہ اس کے سامنے بیٹھی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنا جاپ مکمل کر چکا تو اس نے ماتھے میں سوئی لگی گڑیا کو اٹھایا، اس پر نگاہیں گاڑے رکھیں اور پھر فاخرہ کو دیتے ہوئے تیزی سے کہا

"اس کے ساتھ بھی وہی کر، جو پہلے گڈے کے ساتھ کیا تھا، جا، سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے کر، جا اب جلدی سے چلی جا۔"

فاخرہ نے لرزتے ہاتھوں سے وہ گڑیا پکڑی، اسے اپنے

Digitized by Google

پرس میں رکھا اور اٹھ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ پھوپھو قبرستان میں سہمی ہوئی ایک درخت پاس کھڑی تھی۔ وہ جگہ سنسان تھی۔ اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد اس نے پرس میں سے وہی گڑیا نکالی اور انتہائی تیزی سے وہ سیاہ گڑیا درخت پر پھندے کی صورت میں لٹکانے لگی۔ چند منٹ میں اس نے وہ سیاہ گڑیا لٹکا دی۔ پھر اسی سیاہ گڑیا کو پھندے پر لٹکتے ہوئے ایک گہری نگاہ سے دیکھا۔ وہ سیاہ گڑیا جھولنے لگی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی پھر تیز تیز قدموں کے ساتھ قبرستان سے نکلتی چلی گئی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

شام کا اندھیرا ابھی رات میں پوری طرح نہیں بدلا تھا۔ ثانیہ اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں تو کتاب پر تھیں مگر وہ حد درجہ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنا ماتھا بھی مسل رہی ہے۔ وہ بے چین ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ہونے لگے جیسے وہ درد سہہ رہی ہو۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں ہی میں درد کی لہر ٹیس بن کر اٹھی اور وہ اس کی شدت سے کراہتے ہوئے دہری ہوتی چلی گئی۔ اسے لگا جیسے اسے خود پر اختیار ہی نہ رہا ہو۔ اس نے بے بسی میں مدد کے لئے زور سے پکارا۔

”ماما...... ماما...... ماما......“

اس کی آواز گھر میں گونج کر رہ گئی۔ ثانیہ چند لمحوں ہی میں تڑپنے لگی تھی۔ بیگم طلعت اور نوکرانی آگے پیچھے ہی کمرے میں تیزی سے اندر آئی تھیں۔ بیگم طلعت نے اپنی بیٹی کو لوٹتے ہوئے دیکھا تو بدحواسی میں پوچھنے لگی

”ثانیہ...... ثانیہ کیا ہوا بیٹا۔ کیا ہوا تجھے؟“

”ماما...... میرا سر، بہت درد ہو رہا ہے۔ پھٹ رہا ہے۔“ ثانیہ نے اپنا ماتھا پکڑے درد کی شدت سے کراہتے ہوئے دھیمے سے یوں کہا جیسے اس سے بولا نہ جا رہا ہو۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ لمحوں میں بے ہوش ہوتی چلی گئی۔ تبھی بیگم طلعت نے چیختے ہوئے زور سے کہا

”ثانیہ، ہوش کرو۔ ہوش کرو بیٹا۔ کیا ہو گیا میری بچی کو آنکھیں کھولو ثانیہ۔ اللہ میری بیٹی کو کیا ہو گیا؟“ پھر بے بسی میں نوکرانی کی طرف دیکھ کر کہا، ”مراد علی کو فون کرو جلدی۔ یہ کیا ہو گیا میری بچی کو؟“

”بیگم صاحبہ میں ڈرائیور کو بلاتی ہوں، بی بی کو اسپتال لے......“

”جو کرنا ہے جلدی کرو۔“ بیگم طلعت نے کہا تو نوکرانی تیزی سے پلٹ گئی اور وہ ثانیہ کو سنبھالنے لگی۔

بے ہوش ثانیہ اسٹریچر پر پڑی تھی۔ نرس اور ڈاکٹرز اسے ٹریٹمنٹ دیتے ہوئے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر بیگم طلعت اور مراد علی انتہائی پریشانی میں کھڑے تھے۔ تبھی بیگم طلعت بے چینی سے بولی

”ڈاکٹر کیا ہوا ہے میری بیٹی کو...... خدارا، آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں۔“

تبھی سینئر ڈاکٹر نے سر اٹھا کر پاس کھڑے ڈاکٹر ظہیر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ظہیر اس کی نگاہوں کا مقصد سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹا، بیگم طلعت اور مراد علی کے پاس آ کر انہیں ایک طرف لے جا کے بولا

”آنٹی! میں فقط ایک ڈاکٹر ہی نہیں، ذیشان کا بہت قریبی دوست بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت بزنس میٹنگ کے لئے لاہور میں ہے۔ اسی نے مجھے ثانیہ کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم پوری ذمہ داری اور توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ پریشان مت ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا۔“ مراد علی نے اس کی بات سمجھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

”آپ میرے کمرے میں بیٹھیں، میں ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔ آپ پلیز جائیں۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو بیگم طلعت نے تڑپ کر پوچھا

”یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی ہے۔“

”ابھی...... ابھی آ جائے گی ہوش میں...... انکل پلیز۔“ اس نے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

مراد علی سر ہلاتے ہوئے اور آنکھوں کے اشارے سے اس کی بات سمجھ جانے کا عندیہ دیتے ہوئے اپنی بیوی کا ہاتھ نرمی سے پکڑا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باہر کی جانب مڑتی چلی گئی۔ ڈاکٹر ظہیر نے انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھا اور واپس اپنے سینئر ڈاکٹر کے

Digitized by Google

پاس چلا گیا۔
کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ڈاکٹر ظہیر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ وہ فون نکالتے ہوئے اپنی میز تک گیا۔ اپنا اسٹیتھو اسکوپ رکھا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

''ہاں ذیشان، سب ٹھیک ہے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں، ثانیہ ٹھیک ہے اب۔ انکل اور آنٹی اس کے پاس ہیں۔'' اس نے اطمینان سے بتایا

''ہوا کیا تھا؟ کیوں اسے ہاسپٹل آنا پڑا؟'' ذیشان نے پریشانی میں پوچھا تو وہ بولا

''سینئر ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ اس نے کوئی شدید قسم کی ٹینشن لے لی ہے۔ یہ اسی کا ری ایکشن تھا۔ ساری رپورٹس نارمل ہیں۔ ویسے خطرے والی کوئی بات نہیں۔''

''ہاں ٹینشن تو لی ہوگی اس نے لیکن اس قدر شدید؟ اب کیسی ہے وہ؟'' ذیشان نے پوچھا

''اب وہ نارمل ہے۔ اسے ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔ بس وہ ابھی گھر جانے کے لئے نکل جائیں گے۔'' اس نے بتایا

''چلو اچھا ہوا۔ میں آج رات کی فلائٹ سے واپس آ رہا ہوں۔ ملتے ہیں صبح، پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا تمہاری طرف۔ اب مجھے تھوڑا کام کرنا ہے اور تم بھی اپنے معاملات دیکھو۔ اللہ حافظ۔'' ڈاکٹر ظہیر نے کہا اور کال بند کر دی۔

......

دن کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ بیگم ثروت لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پاس تازہ اخبار دھرا ہوا تھا جسے وہ پڑھنے کو اٹھاتی اور پھر رکھ دیتی۔ ایسے میں فاخرہ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے اکتا کر بولی

''آئے ہائے۔ اب تو بازار جانا بھی مشکل ہو گیا۔ خدا کی پناہ، رستہ ہی نہیں ملتا کہیں سے۔ اتنی ٹریفک، اتنا شور، دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ توبہ توبہ۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ اس نے بیگم ثروت کا کوئی رسپانس نہ پا کر پوچھا، ''خیریت تو ہے نا ثروت، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''میں تو ٹھیک ہوں۔ پر ثانیہ ٹھیک نہیں ہے۔'' بیگم ثروت نے اداسی اور دکھ سے بتایا تو فاخرہ نے انتہائی تجسس سے پوچھا

''کیا ہوا اُسے؟''

''پتہ نہیں کیا ہوا، بس بیٹھے بٹھائے سر میں شدید درد ہوا، لوٹ پوٹ ہی ہو گئی بچی بے چاری۔ اسپتال لے جانا پڑا۔'' بیگم ثروت نے دکھی لہجے میں کہا تو فاخرہ ایک دم سے خوش ہو گئی، اتنی جلدی کام ہو جانے پر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ پھر اسی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا

''ہائے میری بچی، اسے تو نظر کھا گئی ہے لوگوں کی۔ منگنی والے دن کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟''

''طلعت بتا رہی تھی اب ٹھیک ہے۔ میری بہن کتنی پریشان ہوگی اس وقت۔ اس شعیب نے تو میری بہن ہی مجھ سے جدا کر دی۔ میں ثانیہ کو دیکھنے بھی نہیں جا سکتی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رو دی۔ تبھی فاخرہ نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''اس میں شعیب کا کیا قصور، وہ موا تیرا بہنوئی ہی پھوٹ ڈالتا ہے۔ وہی نفرت کرتا ہے۔ خیر تو مت رو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم چلیں گے اسے دیکھنے۔'' وہ بڑے سنجیدہ لہجے یوں بولی جیسے اسے ثانیہ کا سن کر بڑا دکھ ہوا ہو۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ پھوپھو اندر ہی اندر سے بے انتہا خوش تھی۔ اس کے من میں اپنی کامیابی کا احساس پھیل گیا تھا۔ پھوپھو اپنی کامیابی سے سرشار تھی۔ لیکن بیگم ثروت ایک ماں تھی، اس نے دکھی دل سے کہا

''شعیب کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ اب اس کے لئے کوئی لڑکی تلاش کرنا ہوگی ورنہ میرا بیٹا کہیں یہ بات اپنے دل کو ہی نہ لگا لے۔ اس طرح اس کا دھیان تو بٹ جائے گا۔''

''اس کا دل تو ثانیہ ہی میں ہے۔'' پھوپھو آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی تو بیگم ثروت نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

''اب کیا کروں، میرا بس چلے تو اپنے بیٹے کی خوشیاں خرید کر لے آؤں۔ ثانیہ میری بھانجی ہے۔ وہ مجھے بھی پیاری ہے۔ میری خواہش ہے وہ میری بہو بنے، لیکن تم نے ان کا رویہ دیکھا؟ میں کوشش کر بھی لوں، مگر ثانیہ کا من نہیں ہے شعیب کی طرف، پھر بعد میں وہی جھگڑے فساد ہونے ہیں۔''

''سچی بات تو یہ ہے ثروت، اگر تم نے اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رویہ ٹھیک رکھا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، جب

Digitized by Google

بھائی تھا تب تم بھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھیں۔" فاخرہ نے اسے یاد دلانے والے انداز میں کہا تو وہ بھڑک کر غصے میں بولی

"میں نے کیا کر دیا ان کے ساتھ، میں نے کبھی ان کا برا نہیں چاہا، جیسا وہ سلوک رکھتے تھے، ویسا میں ان کے ساتھ رکھتی تھی۔ میں نے ہمیشہ ان کی مدد ہی کی ہے۔ جو بھی طلعت نے مانگا، میں نے اُسے دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ مراد علی اسے آگے کر دیتا ہے۔ میں اپنی بہن کا مان رکھتی تھی۔"

"اب دیکھ لو، وہی تیرا کتنا مان رکھ رہی ہے۔ اب دیکھا، یہ مراد علی جو ہے، کیسی بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہا تھا، بھائی جب تھا تو اس کی جرات نہیں ہوتی تھی۔" فاخرہ نے پینترا بدلتے ہوئے کہا تو وہ دُکھ سے بولی۔

"کیا یاد دلا رہی ہو فاخرہ۔ آج وہ ہوتے تو یہ ہماری چوکھٹ نہ چھوڑتے، منہ سے بات نکالتے تو یہ..... چل چھوڑ، کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ چل جا، اب تُو بھی آرام کر۔"

"ہائے ہائے، کیا وقت آ گیا۔" فاخرہ نے اٹھتے ہوئے کہا، جس پر بیگم ثروت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے خیالوں میں کھو گئی۔ جاتے جاتے فاخرہ اسے ماضی میں دھکیل گئی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

دوپہر سے پہلے کا وقت تھا۔ ثانیہ بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ذیشان اس کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، سائیڈ ٹیبل پر پھول پڑے تھے۔ وہ اس کی عیادت کو آیا ہوا تھا۔ ثانیہ کے چہرے پر پیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے بیچ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ذیشان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بات کرے، بھی اس نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ثانیہ، اب تم ٹھیک ہو۔ ساری رپورٹس بالکل کلیئر ہیں، کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔"

"میں جس کرب سے گزری ہوں نا ذیشان، اس کا بس مجھے ہی پتہ ہے۔ یہ درد میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھے نہیں پتہ یہ اچانک کیوں ہو گیا۔" ثانیہ دھیمے لہجے میں بولی

"تم نے صرف ایگزام کی ٹینشن لی ہے۔ جب میں نے کہہ دیا تھا کہ تم پریشان نہ ہو تو پھر تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں تھی۔" اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو ثانیہ دبے دبے غصے میں بولی

"لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے، ایسا کیا ہو گیا۔ اتنی جلدی شادی؟ میرے ایگزام ہو جائیں تو..... کیا سارے لوگ شعیب سے اتنا ہی ڈر گئے ہیں؟"

اس پر ذیشان نے کچھ کہنا چاہا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی حالت کو سمجھتے ہوئے بڑے نرم سے لہجے میں بولا

"بات شعیب سے ڈرنے کی نہیں۔ ہماری والدین یہ چاہتے ہیں کہ یہ شادی....."

"کچھ بھی نہیں ہونے والا اور نہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور ہمارے والدین کا فیصلہ؟ تم نے بھی مجھ سے نہیں پوچھا، بس فیصلہ دے دیا؟ چاہے بارات یا ولیمہ ..... جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟" ثانیہ نے اس کی بات کاٹ کر غصے میں کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ہمارے والدین تو ہمارا اچھا ہی چاہیں گے اور پھر..... اتنی جلدی شادی کی خواہش تمہارے والدین کی طرف سے تھی، میرے والدین نے نہیں کی۔"

"میں کہاں ہوں؟ تم کہاں ہو؟ تمہاری اور میری کوئی اہمیت نہیں اس فیصلے میں؟ شادی ہم دونوں کی ہونی ہے نا؟" اس نے پوچھا

بھی ذیشان ایک دم سے چونک کر سمجھتے ہوئے بہلانے والے انداز میں بولا

"ریلیکس۔ اتم آرام کرو۔ ہم اس پر پھر بات کریں گے۔ ابھی میں آفس جا رہا ہوں، وہاں کچھ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ تم تیار رہنا۔ شاپنگ کے لئے جائیں گے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو صرف تم ہی پسند کر سکتی ہو۔"

"نہیں میں شاید کہیں نہ جا سکوں۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

"اوکے، اگر طبیعت چاہے تو مجھے فون کر دینا۔ اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس پر ثانیہ نے اسے رُکنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ذیشان نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور گہری سنجیدگی کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا۔ ثانیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے جیسے اسے کچھ اچھا محسوس نہ ہو رہا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر کے بیڈ سے ٹیک لگا لی۔

اسے ذیشان پر سب سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک

Digitized by Google

شعیب سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ سے یہ سب آنا فانا ہو رہا تھا۔ وہ کل کوئی اور دھمکی دے دے گا تو کیا ہوگا؟ اس ایک کی وجہ سے اتنے سب لوگ ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ کیا مسئلے کا حل یہی ہے؟ وہ کون ہوتا ہے ان کی زندگی زہر گھولنے والا، کیا وہ اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتے؟ پھر کیا فائدہ ایسا سب کرنے کا۔ یہی سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

سہ پہر کا وقت ہوگا۔ ثانیہ پرسکون سی کمرے سے باہر آ کر کاریڈور میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کافی فریش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی مگر وہ پڑھنے کی بجائے اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی سی اسے بیٹھے وہاں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس کے پاس ماما آ گئی۔ وہ اس کے قریب آ کر بڑے پیار سے بولی

"آج تو میری بیٹی بہت فریش لگ رہی ہے۔"

"ہاں ماما! اچھا محسوس کر رہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تبھی ماما نے اس کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے لاڈ سے کہا

"تو پھر چلو تیار ہو جاؤ، شاپنگ کے لئے چلتے ہیں۔"

"آں..... چلیں۔" ثانیہ سوچتے ہوئے بے دلی سے بولی تو ماما نے خوشگوار لہجے میں کہا

"باہر نکلو گی، تھوڑا ماحول بدلے گا تو اچھا لگے گا نا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے میں مان گئی تھی۔

"میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ گاڑی نکالے۔ تم جا کر تیار ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ بیگم طلعت نے اپنی ایک ملازمہ کو آواز دے کر رکھ گئی۔

اس وقت ثانیہ اور اس کی ماما شہر کے ایک مشہور شاپنگ مال کے سامنے آ کر رکے ہی تھے۔ ڈرائیور اس انتظار میں تھا کہ سامنے کی کاریں ایک طرف ہوں تو وہ پارکنگ میں چلا جائے۔ انہی لمحات میں ثانیہ کی نگاہ ذیشان پر پڑی، وہ بھی اپنی کار میں ان سے آگے تھا۔ وہ مسکرادی۔ اسی نے ماما سے کہا ہوگا شاپنگ کے لئے تو ماما اسے لے کر یہاں آ گئی۔ ابھی ان کے ڈرائیور نے کار پارکنگ میں نہیں لگائی تھی کہ ثانیہ نے دوبارہ ذیشان کو دیکھا، اس کے ساتھ لڑکی کو دیکھ کر چونک گئی، جو اسی کی کار سے اتری تھی۔ وہ عشناء تھی جو اسی کے آفس میں ملازم تو تھی لیکن ذیشان کی یونیورسٹی فیلو بھی تھی۔ وہ مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے اپنے لئے یہاں جاب کر لی۔ ذیشان اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ ثانیہ انہیں دیکھتی رہی، وہ دونوں بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ ثانیہ کو ان کا بے تکلف ہونا اچھا نہیں لگا۔ ان دونوں کا یہ رویہ باس اور ملازم والا نہیں تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر اپنا سیل فون نکال کے نمبر پش کر دیئے۔

وہ دیکھ رہی تھی۔ ذیشان کا فون بج اٹھا تو اس نے پاس کھڑی عشناء کو اپنے سیل فون کی اسکرین دکھائی۔ صاف ظاہر تھا کہ ذیشان اسے ثانیہ کے فون کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دونوں ہنس دیئے تھے۔ ذیشان نے کال ریسو کی اور شاپنگ مال کے اندر کی جانب چل دیا۔

"ہیلو ثانیہ۔" ذیشان کی آواز ابھری

"ذیشان کہاں ہو؟" اس نے پوچھا

"میں آفس میں ہوں، خیریت؟" اس نے کہا تو ثانیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"آفس میں کیا کر رہے ہو؟" اس نے تند لہجے میں پوچھا

"ظاہر ہے آفس میں کام ہی ہوتا ہے، خیر کوئی کام تھا؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا

"اوکے، کچھ نہیں، بعد میں فون کرتی ہوں۔" فون بند کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ خود کو سمیٹ رہی تھی کہ اس کی ماما نے پوچھا

"کیا بات ہے بیٹا، ذیشان ٹھیک تو ہے؟"

"ماما، واپس چلیں، میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔" وہ اس قدر شدت سے بولی کہ بیگم طلعت بری طرح گھبرا گئی۔ ثانیہ نے سیٹ کی پشت گاہ سے اپنا سر لگا لیا۔ تبھی بیگم طلعت نے تیزی سے ڈرائیور کو کہا

"ڈرائیور جلدی اسپتال چلو۔"

یہ سنتے اس نے کار پارکنگ سے نکالی اور باہر کی سمت چل پڑا۔ ثانیہ آنکھیں بند کیے سیٹ سے سر لگائے کراہ رہی تھی۔

اس کی نگاہ سے عشناء ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ اس پر دکھ یہ تھا کہ ذیشان نے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ اگر یہی بتا دیتا کہ میں شاپنگ مال میں عشناء کے ساتھ ہوں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ کم از کم سچ بولنے پر وہ دکھی تو نہ ہوتی۔ وہ ان کے ساتھ مل کر

Digitized by Google

شاپنگ کرتی تو اسے زیادہ اچھا لگتا۔ اسے ذیشان پر تو یقین تھا لیکن اسے عشناء پر بالکل بھی اعتبار نہیں تھا۔ ایسی لڑکیاں اونچے گھروں کے خواب دیکھتے ہوئے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ اسے لیے عشناء کسی رنگین سانپ کی مانند ذیشان سے لپٹی محسوس ہوئی۔ اس کی لپلپاتی ہوئی زبان کسی بھی وقت ذیشان کو ڈس سکتی تھی۔ وہ جس قدر سوچ رہی تھی، اس کا غصہ اتنا ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اتنی کی درد ہونے کے باعث وہ دہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جس وقت وہ اسپتال پہنچے، ثانیہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

اس وقت اسپتال میں ڈاکٹر ظہیر نہیں تھا۔ تاہم دوسرے ڈاکٹر اس کی کیس ہسٹری کے بارے میں جانتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اُسے ہوش میں لے آئے۔ آدھے گھنٹے میں وہ نارمل تو ہو گئی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد انہیں گھر بھیج دیا تھا۔

رات ڈھل چلی تھی۔ ثانیہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی بات گھوم رہی تھی کہ ذیشان نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ وہ عشناء کے ساتھ کیوں تھا؟ اتفاق ہی سے سہی، اگر وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی تو ذیشان کا کہا سچ ہی سمجھتی۔ وہ یہی سوچے چلے جا رہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر ذیشان کے نمبر جگمگا رہے تھے۔ اس نے فون کال ریسیو کرتے ہوئے کہا

"ہیلو....."

"اب کیسی طبیعت ہے؟" ذیشان نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا تو ثانیہ کو وہ زہر لگا۔ اس لئے اس نے کھردرے لہجے میں اتنا ہی کہا

"ٹھیک ہوں۔"

"مجھے پتہ چلا، پھر سے پین ہوا تھا؟" اس نے پوچھا

"لیکن یہ تو پتہ نہیں ہو گا نا، یہ پین ہوا کیوں؟"

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟ وہ تو ڈاکٹر ظہیر کے کولیگ نے بتایا مجھے کہ تم....." اس نے کہنا چاہا تو ثانیہ نے بات کاٹتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا

"مجھے سمجھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کوئی کام تھا؟"

"ثانیہ، یہ تم ہو، کیسی باتیں کر رہی ہو، اور کس انداز میں؟" ذیشان نے حیرت سے پوچھا تو وہ طنزیہ انداز میں بولی

"خود پر غور کرو، پتہ چل جائے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟" ذیشان نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں اور نہ مجھے تمہاری سمجھ آ رہی ہے۔ اس وقت میں بزی ہوں، پھر بات کرتے ہیں۔ بائے۔" ثانیہ نے خود اکتائے ہوئے انداز میں کہا

"اُو سنو....." ذیشان نے کہا لیکن اس نے کوئی مزید بات نہ کرنے کے لئے کال کاٹ دی۔ پھر سیل فون ایک طرف پھینک کر لیٹ گئی۔ اس کے اندر آگ لگ چکی تھی۔ وہ بس یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ ذیشان نے اس سے جھوٹ کیوں بولا؟

یہ جوشک کا زہر ہوتا ہے نا یہ انسانوں ہی کو نہیں مارتا بلکہ گھروں میں آگ لگا کر انہیں اجاڑ دیتا ہے۔ ثانیہ بھی شک کے بھنور میں پھنس چکی تھی۔ وہ بے چین ہو چکی تھی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ بیدار ہو کر اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ مکمل اندھیرے میں اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں پر ہے؟ اس کے بیدار ہونے کی وجہ اس کا وہ خواب تھا جو اب بھی اس کی آنکھوں سے چپکا ہوا تھا۔ اسے تھوڑا ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا پورا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔

اس نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ جس کا اثر ابھی تک اس پر طاری تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ خواب اسے پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک سبز باغ میں چہل قدمی کے سے انداز میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے اردگرد ہر طرح کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ کس کا انتظار تھا یہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جدھر بھی دیکھتی ہر جانب ہریالی تھی۔ سرسبز و شاداب درخت، جس میں قسم قسم کے پھل لگے ہوئے تھے۔ خوبصورت پودے، جن پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ خوبصورت سفید سنگ مرمر کی روشوں پر وہ دھیمے دھیمے سے قدم رکھتی چلی جا رہی تھی لیکن باغ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا سفید آنچل وہاں تک پھیلا ہوا ہے، جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا۔ وہ جتنا آگے بڑھتے اتنا ہی آنچل پھیل جاتا۔ یوں جیسے کہیں پیچھے محل میں کسی نے اس کا آنچل تھام رکھا ہو۔

Digitized by Google

وہ ایک فوارے کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے نکلتا ہوا پانی پھوار کی صورت ہر جانب پھیل رہا تھا۔ ایک رنگین دھنک اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اداس تھی، کوئی آنے والا تھا۔ جس کی وہ منتظر تھی، وہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کا احساس چاروں جانب پھیلا ہوا تھا۔ وہ جس فوارے کے پاس کھڑی تھی۔ اس سے چاروں جانب سفید سنگ مرمر کے راستے جا رہے تھے۔ وہ تنہا کھڑی تھی۔ تبھی اس نے دیکھا، ایک سیاہ گھوڑا دلکی چال چلتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ سوار کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ وہ سیاہ لبادے میں تھا۔ گھوڑے کے قدموں کی آواز پورے باغ میں پھیلنے لگی تھی۔ وہ اس طرف دیکھنے لگی۔ اس کا تجسس یہی تھا کہ وہ گھڑ سوار کون ہے جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آتا چلا جا رہا ہے؟

وہ گھڑ سوار اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کا چہرہ سیاہ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ اس کی جانب تجسس بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ دونوں چند لمحے آمنے سامنے رہے پھر گھڑ سوار نے اپنے چہرے سے لبادہ ہٹایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ انسان کے دھڑ پر کسی بھیانک جانور کا چہرہ تھا۔ اس کے باہر نکلے ہوئے دانت تھے جن میں سے رال ٹپک رہی تھی۔ اس کی شعلہ اگلتی سرخ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس کا تھوتھنی جیسا ناک پھنکار رہا تھا۔ وہ دہل گئی تھی۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ جتنا پیچھے جاتی، وہ گھوڑا اتنا ہی آگے لے آتا۔ وہ فوارے سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تبھی گھڑ سوار نے اپنے سیاہ لبادے میں سے ہاتھ نکالا تو وہ نری ہڈیاں ہی تھیں۔ سیاہ ہڈیاں، جن پر گوشت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھا تو وہ بھاگ اٹھی۔

وہ سفید سنگ مرمر کی روش پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا محل چند قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ وہ گھڑ سوار ایک دم سے غائب ہو گیا۔ ایک پر ہول سناٹا ہر طرف چھا گیا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ وہ پھر سے دہل گئی۔ اس کے سامنے ایک دھویں کا مرغولہ سا اٹھ رہا تھا۔ جس میں کئی رنگ برنگے سانپ اڑتے پھر رہے تھے۔ وہ دھویں کا مرغولہ اس کے محل کے اطراف میں پھیلنے لگا تھا، یہاں تک کہ سارے دروازے بند ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکارنا چاہتی تھی، مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس دھویں کے مرغولے نے اس کے محل کو یوں نگل لیا، جیسے وہ محل وہاں پر تھا ہی نہیں۔

وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اب وہ کدھر جائے گی۔ اس کے سامنے دھویں کا مرغولہ بھی اس کا محل نگل کر غائب ہو چکا تھا۔ وہ واپس پلٹی تو اس کا آنچل پھر سے بڑھنے لگا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی کو مدد کے لئے پکارنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک باغ ختم ہو گیا۔ اس نے دیکھا وہ ایک بے آب و گیا سڑی ہوئی مٹی والے ایک پہاڑ پر کھڑی ہے۔ اس کے سامنے ایک بڑی ساری کھائی ہے۔ جس میں کئی سارے ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ دہل گئی۔ اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ پلٹی تو اس کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی عورت کھڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نہیں تھا۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر ڈال کر دبانے لگی۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگی کہ اچانک اس کے آنچل نے اسے اس عورت سے بچا لیا۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

کرامت شاہ آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ جب فاخرہ بڑی مودب سی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کرامت شاہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس وقت تک دیکھتا رہا، جب تک وہ اس کے سامنے بیٹھ نہیں گئی۔ کرامت شاہ نے اسے پریشان دیکھ کر عام سے لہجے میں پوچھا

"کیا بات ہے فاخرہ، پریشان کیوں ہو، کام نہیں ہوا کیا؟"

"کام تو ہوا بابا جی، پر ایسے تو نہیں چاہا تھا، جیسے ہو گیا۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولی

"کیا ہو گیا، بتاؤ گی کچھ؟" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو فاخرہ حیران کن انداز میں بولی

اس بے چاری بچی کی تو جان پر بن گئی ہے، اسپتال جانا پڑا اسے، ایسا سر درد ہوا اس کے..... کہ کیا بتاؤں۔"

"ارے فاخرہ..... اسے کچھ نہیں ہوتا، یہ تو ابھی شروعات ہیں، ہم نے عمل ہی ایسا کیا ہے، دو چار دن صبر کرو، پھر دیکھنا ہوتا کیا ہے۔" کرامت شاہ نے بے پروائی سے کہا

"دیکھنا بابا بیچاری کہیں....." اس نے کہنا چاہا تھا کہ کرامت شاہ غصے میں بولا

Digitized by Google

"کہہ جو رہا ہوں، کچھ نہیں ہوتا۔"

"مان لیا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسے تو اپنی پڑ گئی، ہماری طرف کیسے مائل ہوگی؟" پھوپھو نے اپنا اصل مدعا بیان کیا تو بابا کرامت شاہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا

"ہاں، یہ ہے اصل بات۔" یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحے رکا پھر پاس پڑے اپنے صندوق میں سے ایک شیشے کی بوتل نکالی۔ اس میں چینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے وہ بوتل سامنے رکھی اور اس پر کچھ پڑھنے لگا۔ کچھ دیر پڑھتے رہنے کے بعد فاخرہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا

"یہ لو۔"

"یہ چینی.....؟" فاخرہ نے حیرت سے پوچھا تو کرامت شاہ مسکراتے ہوئے بولا

"میٹھی ہوتی نا..... کسی طرح کھلا دو اسے۔ تمہارے ساتھ اسی طرح میٹھی ہو جائے گی۔ پھر دیکھنا۔"

"جی، میں کھلا دوں گی۔" فاخرہ نے یوں سر ہلاتے ہوئے کہا، جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔ اس نے وہ بوتل اپنے پرس میں رکھی، پرس میں سے نوٹ نکال کر بابا کے سامنے رکھ دیئے۔ کرامت شاہ نے وہ نوٹ اٹھاتے ہوئے خوش کن لہجے میں کہا

"فاخرہ، یہ بات تم بہت اچھی طرح سمجھتی ہو، بس نوٹ دیتی جاؤ اور کام لیتی جاؤ۔"

اس پر فاخرہ ذرا سا مسکرائی اور اٹھ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ وہ وہاں سے پورے یقین کے ساتھ نکلی تھی۔

فاخرہ واپس آ کر صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی جب بیگم ثروت اندر سے آ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی

"کہاں گئی ہوئی تھی صبح سے؟"

"اے کیا بتاؤں، یہیں ساتھ والے پارک میں گئی تھی، تمہیں تو پتہ وہاں دوسری کئی آجاتی ہیں میرے جیسی۔ نہ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔ بس وہیں باتیں کرتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلا۔ اتنا دن چڑھ آیا۔"

"آج پھر طلعت کا فون آیا تھا، بتا رہی تھی ثانیہ بے چاری ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ کل پھر اسپتال جانا پڑا۔" بیگم ثروت نے انتہائی دکھ سے کہا

"ہائے ہائے..... کیا ہو گیا بے چاری کو۔" وہ واقعتاً حیرت زدہ ہوتے ہوئے بولی

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میرا تو بہت دل چاہتا ہے، میں اسے دیکھ کر آؤں، پتہ نہیں بے چاری کو کیا ہو گیا ہے۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی

"تو دیکھ آؤ نا، آج ہی چلتے ہیں، چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔" فاخرہ فوراً تیار ہو گئی تو بیگم ثروت نے ہچکچاتے ہوئے کہا

"وہ کہیں مراد علی ہی برا نہ مانے، ادھر شعیب ہے، وہ نجانے....."

"اے ہے، پھر کیا ہوا، اگر مراد علی نے ایک سنائی نا تو اب کے میں چار سناؤں گی۔ میں نہیں ڈرتی اس سے، کیا بگاڑ لے گا۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی، رشتے ناتے بھی ٹوٹ جائیں گے کیا؟ اور شعیب کو تو میں ہی سمجھا لوں۔"

"دیکھ لو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے یقین کر لینا چاہا تو اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی

"اس وقت اپنے آفس میں ہوں گے۔ ممکن ہے ان سے سامنا ہی نہ ہو، انہیں پتہ ہی نہ چلے، چل اٹھ ابھی چلتے ہیں۔"

"تو کیا ہمیں جانا چاہئے، دیکھ لو؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا تو پھوپھو فاخرہ نے تیزی سے کہا

"تم تو اپنی بہن کا دکھ بٹانے جا رہی ہو نا، ہم بے چاری پھول سی بچی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"فاخرہ، چل پھر چلتے ہیں۔" بیگم ثروت بے چارگی سے کہا تو پھوپھو فاخرہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی

"چلو، ابھی چلتے ہیں۔ تو آ، میں ڈرائیور سے کہتی ہوں۔"

وہ جانے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ان کے ہاں جا پہنچیں۔ انہیں طلعت کے پاس بیٹھے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ ثانیہ بھی وہیں آ گئی۔ وہ چاروں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ ثانیہ چند دنوں میں کملا گئی تھی۔

"بس کیا بتاؤں ثروت، شاپنگ کے لئے گئے ہیں، وہیں اس کی پھر طبیعت خراب ہو گئی، فوراً اسپتال گئے، وہاں سے پھر گھر واپس آئے۔ میرا تو بہت دل گھبرا رہا ہے۔"

یہ ری بیٹی کو کیا ہو گیا ہے۔ کس کی نظر کھا گئی۔ چند دن ہی میں کملا کر رہ گئی ہے۔" پھوپھو نے پیار جتاتے ہوئے کہا۔

"یہی سمجھ نہیں آ رہا کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا۔" بیگم طلعت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا

Digitized by Google

''اللہ کرم کرے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ثروت نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ثروت نے ثانیہ سے کہا

''وہ دیکھو بیٹی، کسی سے چائے کا تو کہو۔''

''میں خود چائے بھیجتی ہوں آپ کے لئے۔'' ثانیہ نے اٹھتے ہوئے کہا تو فاخرہ نے چونک گئی۔ اسے بڑا بہترین موقعہ مل گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی اور خود بھی حیرت زدہ ہو رہی تھی کہ کالا جادو اس قدر سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اسے یقین ہو رہا تھا کہ اگر آج وہ بابا کرامت کی دی ہوئی چینی انہیں کھلانے میں کامیاب ہو گئی تو پھر سمجھو کایا ہی پلٹ جائے گی۔ وہ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اس لئے جلدی سے بولی

''ارے بیٹا، تم لوگ بیٹھو، باتیں کرو، میں بنا کر لاتی ہوں۔ اپنی بیٹی کو میں اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھی اور کچن کی طرف چلی دی۔

فاخرہ نے بڑے دھیان سے چائے بنائی۔ ٹرے میں دھرے ایک کپ کو اٹھایا پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی کو نہ پا کر اس نے جلدی سے اپنے پرس میں سے پڑیا نکالی۔ اسے کھولا اور چینی چائے میں ملا دی۔ وہ کپ میں چمچ سے ہلاتے ہوئے مکاری سے مسکرا دی تھی۔

پھوپھو ٹرے میں چائے کے مگ رکھے آ گئی۔ جہاں وہ تینوں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سب کو چائے دینے کے بعد وہ آخر میں ثانیہ کی طرف کپ بڑھا دیا، سب کے ساتھ وہ بھی پینے لگی ہے۔ سپ لینے کے بعد ثانیہ بولی

''پھر پھوپھو چائے میں میٹھا کچھ زیادہ نہیں ہے؟''

اس پر فاخرہ پہلے تو گھبرا گئی پھر فوراً ہی خود کو نارمل کرتے ہوئے زبردستی مسکرا کر بولی

''اچھا! بیٹا مجھے پتہ ہی نہیں چلا، چل تو یہ سمجھ کر پی لے، اس چائے میں میرا پیار بھی شامل ہے۔ اس لئے زیادہ میٹھی بھی اچھی لگے گی۔''

''م مگر ایسا ہے تو پھر پی لیتی ہوں۔'' ثانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسرا سپ لے لیا۔ فاخرہ کی جیسے جان میں جان آ گئی۔

''کتنی اچھی ہے میری بچی، خدا کرے نظر بد سے بچی رہے۔'' فاخرہ نے پیار سے کہا تو بیگم ثروت حسرت سے بولی

''میری تو دعا ہے ثانیہ کی شادی ہو جائے تو میں بھی شعیب کی شادی کر دوں۔''

''کوئی لڑکی دیکھی ہے تم نے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟'' بیگم طلعت نے نگاہیں چراتے ہوئے پوچھا۔

''لڑکیاں تو کئی ساری ہیں میری نگاہ میں، پر شعیب بھی تو مانے۔ اب ثانیہ کی شادی ہو گئی نا، پھر خود ہی مان جائے گا۔ نہیں مانے گا تو ہم منا لیں گی۔'' بیگم ثروت نے حتمی انداز میں کہا۔

''اچھا، میں ایک بات خاص طور پر اپنی بیٹی ثانیہ سے کہنے آئی ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ شعیب دل کا بڑا اچھا ہے۔ ظاہر ہے اسے شاک لگا تو اس کا ری ایکشن دے رہا ہے۔ اس کی دھمکیوں کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ جب تک میں ہوں۔ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ مجھ پر یقین رکھو۔'' ثروت نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن یہ.....'' ثانیہ کہتے کہتے رک گئی

''یہ کیا.....؟'' ثروت نے پوچھا

''یہ ماما پاپا ہی اس کی دھمکیوں کو زیادہ سر پر سوار کر چکے ہیں، ورنہ میں بھی جانتی ہوں وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' ثانیہ نے کہا تو گویا وہاں ایک اطمینان سا پھیل گیا۔

چائے پیتے ہوئے وہ اسی موضوع پر بات کرنے لگی تھیں۔ فاخرہ کو ان کی کسی بات سے غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس یہی دیکھ رہی تھی کہ کسی طرح ثانیہ وہ چائے کا کپ خالی کر دے۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ چائے پی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے ختم کر چکی تھی۔

وہ چاروں بیٹھی کافی دیر سے باتیں کر رہی تھیں۔ ایک بار بیگم ثروت نے فاخرہ سے کہا بھی کہ واپس چلیں، وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ داخلی دروازے میں سے مراد علی اندر آ گیا۔ اس نے پہلے بیگم ثروت کو دیکھا، پھر پرنگاہ ڈالی۔ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے غصے اور طنزیہ انداز میں اپنی بیوی سے بولا

''انہیں یہاں کیوں بٹھایا ہوا ہے، جب میں نے منع کیا ہوا ہے ان لوگوں کو تو پھر یہ کیوں آئیں ہیں میرے گھر میں؟''

یہ سنتے ہی فاخرہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے چہرے پر غصہ امڈ آیا جبکہ بیگم ثروت کے چہرے پر ندامت چھا گئی۔ بیگم طلعت کے چہرے پہ بے چارگی در آئی اور ثانیہ نے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔ چند لمحے کسی نے بات تک نہ کی۔ پھر بیگم طلعت نے دبے دبے غصے میں کہا

Digitized by Google

"کیا کہہ رہے ہیں آپ، کیا قیامت آگئی ہے۔ یہ ثانیہ کی عیادت کو....."

"تمہارا کیا خیال مجھے میرے ہی گھر میں ہونے والی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ جس وقت یہاں آئیں میں اسی وقت اپنے آفس سے نکل پڑا تھا۔" اس نے حقارت سے کہا۔ وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ بیگم ثروت اپنی بے عزتی پر رُو پڑی۔ فاخرہ نے شعلہ بار نگاہوں سے مراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"اچھا نہیں کر رہے ہو مراد علی۔ ہم تو بچی کو دیکھنے آ گئے۔ تمہیں یہ بھی برا لگا۔ یہ گھر، جس سے تم آج ہمیں روک رہے ہو، کس نے دیا، میرے بھائی نے، جب میرا بھائی تھا تو....."

"چپ کر جا فاخرہ، ایک لفظ بھی مزید مت کہنا۔ آؤ چلیں۔" بیگم ثروت نے فاخرہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے کہا تو فاخرہ بے قابو ہوتے ہوئے بولی

"نہیں، میں ذرا اس سے بات کر ہی لوں۔ یہ کون ہوتا ہے ہمیں اس گھر سے روکنے والا۔ آج تک میں خاموش رہی ہوں۔ کبھی جتایا نہیں اسے۔ کم از کم اس عورت کی تو عزت کرو، جن کے تم پر اتنے احسان ہیں۔"

"لیکن میں اپنا گھر....." مراد علی نے کہا چاہا تو فاخرہ نے غصے میں کہا

"تم ہو ہی احسان فراموش، تم....."

"کون سا احسان جتا رہی ہو۔" مراد علی نے غصے میں کہا

"جب تم میرے بھائی کے در پر پڑے رہتے تھے۔ جس عورت کو اس گھر سے جانے کا کہہ رہے، اسی کے ملازم تھے تم۔ یہ گھر بھی انہیں کے پیسوں سے بنا ہے۔ اللہ کی شان دیکھو کل کا ملازم آج....."

"خدا کے لئے فاخرہ، چپ ہو جاؤ، چلو یہاں سے۔" بیگم ثروت نے روتے ہوئے اسے باہر کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔ فاخرہ اس کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ بیگم ثروت روتے ہوئے وہاں ہوئے نکلی تھی۔ فاخرہ نے جاتے ہوئے کہا

"مراد علی بہت پچھتاؤ گے، بتا رہی ہوں۔"

لاؤنج میں کھڑی ثانیہ اور بیگم طلعت بے بسی میں انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ مراد علی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر غصہ پھیلا ہوا تھا۔

"اپنا غصہ ختم کرو، چلی گئی ہیں وہ۔"

"مراد علی۔ امیری، بہن کس طرح رو کر یہاں سے گئی ہے۔ احساس ہے آپ کو، اگر میں آپ کے کسی لگتے کو یہاں سے اس طرح ذلیل کر کے نکالوں تو.....؟" بیگم طلعت نے دھیمی آواز میں کہا

"جب انہیں روکا گیا تھا، پھر کیا کرنے آئی تھیں وہ دونوں؟" مراد علی نے ہٹ دھرمی سے کہا

"وہ تو ثانیہ کی عیادت کو آئی تھیں، وہ میری بہن ہے، میں کیسے چھوڑ دوں اُسے.....؟ میں نہیں چھوڑ سکتی اسے۔" اس نے تلخی لہجے میں جواب دیا

"اس کا بیٹا جو یہاں دھمکیاں دے کر گیا، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، بولو؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا تو بیگم طلعت بولی

"اس میں میری بہن کا کیا قصور؟ کم از کم ثروت کے ساتھ آپ کو ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہئے تھا، بہت دکھ ہوا ہے مجھے۔"

"ہاں پاپا۔! آپ کو ثروت خالہ کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہمارے سوا ان کا آخر ہے کون؟" ثانیہ نے دُکھی لہجے میں کہا تو مراد علی نے یوں حیرت سے اس کی طرف دیکھا، جیسے اس نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔ وہ چند لمحے ان دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا، پھر غصے میں پلٹ کر باہر نکلتا چلا گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو ان سے نفرت کرنے سے روک کیوں نہیں پا رہا ہے۔ آج تو اس کی بیٹی نے بھی اسے غلط کہہ دیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

ذیشان کے آفس میں ڈاکٹر ظہیر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ عشناء بھی تھی۔ جب ڈاکٹر ظہیر آیا تو ذیشان نے عشناء کو بھی بلا لیا۔ ان تینوں کے چہروں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی کو ذیشان نے توڑتے ہوئے کہا

"یار مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی، آخر ثانیہ کو ہوا کیا ہے؟ وہ اب تک نارمل کیوں نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" ظہیر نے سنجیدگی سے پوچھا

"مطلب..... وہ بات بات پر غصہ کرتی ہے۔ جیسے وہ کچھ بھی برداشت نہیں کر پا رہی ہے۔ ذرا سی بات پر ہائپر ہو جاتی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ ہے یا تمہیں یقین ہے؟" عشناء نے

Digitized by Google

پوچھا

"مجھے یقین ہے۔" وہ بولا

"کیسے؟ یہ تو بتاؤ۔" ظہیر نے پوچھا

"یار میں نے اسے فون کیا، اسے کہا کہ ماما تمہاری طرف آنا چاہتی ہے۔ وہ شادی کی شاپنگ کرنا چاہتی، تم سے تمہاری پسند کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے، مگر اس نے بات تو کی لیکن اس قدر روکھے انداز میں جیسے میں اس کے لئے اجنبی ہو گیا ہوں۔" ذیشان نے دکھ سے کہا

"آنٹی کو بتایا؟" ظہیر نے پوچھا

"وہ تو، میں اب اسی الجھن میں ہوں، کیا کروں، ماما کو بتاؤں یا نہ بتاؤں؟" وہ پریشانی میں بولا

"بتانا تو پڑے گا، ورنہ آنٹی کیا سوچیں گی۔" عشناء نے سوچتے ہوئے کہا

"اسی لئے تو تم دونوں سے بات کر رہا ہوں۔" وہ بے بسی میں بولا

"مسئلہ وہی ہے، اتنی جلدی شادی ہو جانے پر وہ کمپرومائیز نہیں کر پا رہی۔ ہر لڑکی کے خواب ہوتے ہیں۔ اس نے بہت کچھ سوچا ہوتا ہے۔ کیوں عشناء؟" ظہیر نے اسی سکون سے وضاحت کرتے ہوئے رائے لی

"بالکل، وہ ان خوابوں کے ٹوٹ جانے پر ڈسٹرب ہوتی ہے۔ بلکہ خود ٹوٹ جاتی ہے۔ اس وقت ثانیہ کو بہت زیادہ محبت اور کیئر کی ضرورت ہے۔" عشناء نے کہا تو ذیشان اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا

"پھر تم ہی اس سے بات کرو، اسے سمجھاؤ۔ اگر وہ اتنی جلدی شادی پر کمپرومائیز نہیں کر پا رہی تو شادی لیٹ کر لیں گے۔"

"اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ ثانیہ جسمانی طور پر صحت مند ہے لیکن اس کا پرابلم نفسیاتی ہے۔ اس بات کا خیال رہے۔" ظہیر نے سمجھانے والے انداز میں کہا

"ٹھیک ہے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔ آج ہی جا کر اسے سمجھاتی ہوں۔" اس نے سر ہلا کر کہا جیسے وہ بات کو سمجھ رہی ہو۔

"اچھا یار، میں چلتا ہوں مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ تبھی ذیشان نے عشناء کی طرف دیکھ کر کہا

"تم ابھی چلی جاؤ ثانیہ کی طرف اور مجھے آ کر بتاؤ، تاکہ پھر ماما سے بات کی جا سکے۔"

"اوکے میں جاتی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی عشناء بھی آفس سے باہر نکل آئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ثانیہ کے گھر میں ان کے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی ثانیہ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب وہ لاؤنج میں آئی تو ثانیہ کا چہرہ کافی تنا ہوا تھا۔ اس نے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"بولو کیسے آئی ہو آپ؟"

"مجھے تمہاری طبیعت کے بارے میں پتہ چلتا رہا ہے، لیکن دفتر کے کام ہی اتنے تھے کہ آ ہی نہ سکی۔ آج وقت ملا تو پہلی فرصت میں آ گئی۔ سناؤ اب کیسی ہو؟" وہ خوشگوار لہجے میں بولی تو ثانیہ نے کافی حد تک طنزیہ لہجے میں کہا

"لیکن مجھے نہیں پتہ چلا تمہارے بارے میں؟ کیا کر رہی ہو تم، خیر اچھا کیا تم آ گئی۔"

"ماشاءاللہ، تم بالکل صحت مند ہو، ڈاکٹر ظہیر آج آفس ہی آ گیا تھا۔ میری اور ذیشان کی تمہارے بارے میں تفصیل سے بات ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا....." عشناء اس کی بات بالکل بھی نہ سمجھتے ہوئے اپنی رو میں کہتی چلی گئی تھی کہ ثانیہ اس کی بات کاٹ کر بولی

"تم اور ذیشان، دونوں۔" یہ کہہ کر وہ رکی جیسے اس وقفہ میں وہ برداشت کر رہی ہو، پھر طویل سانس لے کر بولی، "جب تمہیں ڈاکٹر ظہیر سے میرے ٹھیک ہو جانے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا، پھر تم نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟"

"میں سمجھی نہیں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" عشناء نے چونکتے ہوئے پوچھا تو طنزیہ لہجے میں بولی

"اب بھی سمجھ جاؤ تو اچھا ہے۔ میری بیماری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"

"جو تم سمجھ رہی ہو، وہ بالکل نہیں ہے۔ میں تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہی تھی کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔" عشناء مسکراتے ہوئے بولی اس پر ثانیہ نے چیختے ہوئے غصے میں بے قابو ہو کر کہا

"یہ تو مجھے پتہ ہے۔ تم کیا سمجھانا چاہتی ہو مجھے، میرے مر جانے کا انتظار کر رہی ہو۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔"

"ثانیہ، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" عشناء نے مسکراتے ہوئے کہا

"میں کہہ رہی ہوں، چلی جاؤ یہاں سے۔ میری حالت کا

Digitized by Google

تماشا کرنے آئی ہو۔ ہنستی ہو مجھ پر، نکل جاؤ۔" ثانیہ نے چیختے ہوئے کہا

اس کے ساتھ ہی اس کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کے زور زور سے دبانے لگی۔ شدید درد کے احساس سے وہ چکرا کر گر گئی۔ عشناء ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔

شاید نوکرانی نے ثانیہ کو چیختے ہوئے سنا تھا، اس لئے وہ تیزی سے لاؤنج میں آئی تھی۔ مگر جب اس نے ثانیہ کو صوفے پر گرے ہوئے دیکھا تو بھاگتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔ عشناء کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے کچھ سمجھائی نہ دیا تو وہ ذیشان کو کال کرنے لگی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

شعیب اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اس کا دوست صوفے پر بے ترتیب نیم دراز تھا۔ سامنے میز پر چائے پڑی ہوئی تھی، جس کے ساتھ کافی سارے لوازمات دھرے ہوئے تھے۔ شعیب بہت افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے درمیان خاموشی کافی طویل ہو گئی تو دوست نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"یار شعیب! تم کس طرح مایوس بیٹھے ہوئے ہو۔ ابھی تو ثانیہ کی ذیشان سے شادی میں بڑا وقت پڑا ہے، بلکہ کہاں ہونی ہے یہ شادی، ہم تو نہیں ہونے دیں گے۔ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے ہو تو پھر ہمیں بتا دو۔"

"کیا کرو گے تم؟" شعیب نے قدرے غصے میں پوچھا تو دوسرا دوست بڑی سنجیدگی سے بولا

"کچھ بھی۔ ثانیہ کو اغوا کر لیتے ہیں۔ اپنے فارم ہاؤس پر لا کر اس کی شادی تم سے کروا دیتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ مراد علی کیا کرتا ہے۔ اسے بھی دیکھ لیں گے لگے ہاتھوں۔ یا پھر...... ذیشان ہی کا پتہ صاف کر دیتے ہیں...... جب وہ ہی نہیں رہے گا تو ثانیہ بھابی کی شادی کس طرح ہو گی؟ یہ اپنے یار شعیب سے۔ سات دن تو بہت ہیں، ارے صرف دو دن...... صرف دو دن۔" دوست اپنی گردن پر انگلی پھیرتے ہوئے قتل کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔" شعیب نے سوچتے ہوئے کہا تو دوست نے حیرت سے پوچھا

"تو پھر تم کرنا کیا چاہتے ہو، یار ثانیہ بھابی تمہارے بچپن کی منگیتر ہے، اسے کیسے چھوڑ دو گے تم؟"

"چھوڑ نہیں رہا یار۔ میں اسے چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ وہ میری محبت ہے لیکن اب...... وہ میری انا بن گئی ہے۔" شعیب نے کہا

"مان لیا، لیکن کیسے حاصل کرو گے؟" دوست نے پوچھا

"میں ثانیہ کو اس کی مرضی سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا

"تو پھر تم خواب دیکھ رہے ہو۔ جھوٹا خواب۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ناممکن......" دوست نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا

"مجھے ایک بار کوشش کر لینے دو۔" شعیب نے کہا تو دوست نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

"باس، اب تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ کرنا کیا ہے، اور دن پر دن گزرتے جا رہے ہیں۔"

"یار، ایک تو میری ماما مجھے کچھ نہیں کرنے دے رہی ہیں۔ بات بات پر خودکشی کی دھمکی دے دیتی ہیں۔" وہ بے بسی سے بولا

"اور وہ جو تمہاری پھوپھو ہے، وہ کیا کہتی ہے۔" دوست نے پوچھا

"وہ تو حوصلہ دیتی ہے، کہتی ہے کہ کچھ دن صبر کرو۔" شعیب نے بتایا تو دوست نے مایوسی سے کہا

"تجھ سے کچھ نہیں ہو گا، یہ مجھ سے لکھوا لو۔"

"لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" شعیب نے کہا

"وہ کیا؟" اس نے پوچھا تو شعیب نے خیالوں میں کھو کر گہرے لہجے میں کہا

"یار یہ جو منگنی کے فوراً بعد ثانیہ اسپتال پہنچ گئی ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں ٹینشن لی ہے۔ مجھے لگتا ہے، یہ ٹینشن اس کا ایویں نہیں ہے، ثانیہ دل سے مجھے چاہتی ہے، محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مجھے یقین ہے وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

دوست اس کی طرف حیرت سے شعیب کی طرف دیکھتے مسکرا دیا پھر بولا

"دیکھ لے، کہیں دھوکا نہ کھا جانا۔"

"او نہیں یار، میرا دل کہتا ہے۔" شعیب یہ کہتے ہوئے ہنس دیا تو دوست نے کہا

Digitized by Google

"خیر، جو تم چاہو، ہم تو تمہارے لئے ہر طرح سے حاضر ہیں۔ ہمیں جو بھی کرنا پڑا، کر دیں گے، بس تم حکم کرنا باقی ہمارا کام ہے۔"

"تمہیں ہی کہوں گا۔" شعیب نے خیالوں میں کھو جاتے ہوئے کہا اور چائے کے کپ کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

سہ پہر کے بعد جب شعیب گھر پہنچا تو لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ دوسری طرف لان میں اس کی ماما کے ساتھ پھپھو فاخرہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ شعیب نے صاف دیکھ لیا کہ اس کی ماما رو رہی ہے۔ اسے دیکھتے ہی اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں

"آ گئے بیٹا۔" ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ شعیب نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دبے دبے غصے میں پوچھا

"مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" بیگم ثروت اس سے نگاہیں چراتے ہوئے بولی تو شعیب نے پھپھو فاخرہ کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر اس نے مراد علی کے رویے کے بارے میں ساری بات کہہ دی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر خود پر قابو پا کر بولا

"پلیز ماما مت روئیں۔ آپ کو جانا ہی نہیں چاہئے تھا، میں انکل مراد علی کو بڑا سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا لیکن اب مجھے لگتا ہے۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنا ہی پڑے گا۔ اسے دولت کا جو خمار ہے نا، وہ میں ہی اتاروں گا۔ اسے اس کی اوقات سمجھانا ہی پڑے گی۔"

"شٹ اپ شعیب، کیا تم تمیز سے بات کرنا بھول گئے ہو؟" بیگم ثروت روتے ہوئے کہا تو شعیب ہنسا کر بولا

"ماما! جب وہ شخص آپ کی تذلیل کر رہا تھا، تب اسے کسی رشتے ناتے کی شرم نہیں آئی۔ اب مجھے مت روکیں۔ صرف آپ کے کہنے پر میں نے اس بندے کو بہت برداشت کر لیا، اب نہیں چھوڑوں گا۔"

"مراد علی کے دیدوں میں تو پانی ہی نہیں رہا۔ کہتا ہے اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا، کوئی پوچھے، وہ گھر کس نے دیا اس ناہنجار کو۔ مجھے تو بہت غصہ آ رہا ہے اس پر۔" پھپھو فاخرہ تلملاتے ہوئے یوں بولی جیسے اس سے برداشت نہ ہو رہا ہو۔ تب بیگم ثروت نے بے بسی سے کہا

"بس کر فاخرہ، ختم کرو غلطی ہماری تھی۔ ہم کیوں گئے اس کے گھر۔ نہ جاتیں تو ایسا نہ ہوتا۔"

"لیکن اس مراد علی کو اب میں چھوڑنے والا نہیں، ماما جب تک اس نے آپ سے معافی نہ مانگی، تب تک، وہ بہت پچھتائے گا۔"

"تم کچھ نہیں کرو گے شعیب، میں کہہ رہی ہوں۔" بیگم ثروت نے خوف زدہ ہو کر کہا

"نہیں ماما، بہت مان لی آپ کی، اس معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں، میں اسے بتاتا....." شعیب نے غصے میں کہا تو پھپھو فاخرہ نے چونکتے ہوئے کہا

"نہیں بیٹا! صبر کرو۔ ابھی کچھ نہیں کرنا۔ میں نے پہلے بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

"مگر کیوں، اب میں آپ کی بھی نہیں مانوں گا۔ میں اس سے بدلہ....."

"پہلے بات تو سنو۔" ماما نے جھڑکتے ہوئے کہا

"سنائیں۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"ثانیہ پھر سے اسپتال جا پہنچی ہے۔ اس وقت وہ وہیں پر ہے، مجھے فون کیا تھا طلعت نے، معافی مانگ رہی تھی بے چاری۔" ماما نے کہا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ شعیب اس اطلاع پر چونکا اور کچھ کہے بنا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ دونوں خوف زدہ سے انداز میں اسے دیکھتی رہ گئیں۔

شعیب نے اپنی کار اسپتال کی پارکنگ میں روکی۔ سیٹ پر پڑا ہوا پھولوں کا بوکا اٹھایا۔ پھر اپنی جیب کو ٹٹولا، جس میں پسٹل پڑا ہوا تھا۔ وہ سوچ کر آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ کر کے جائے گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ وہ گاڑی سے اترا اور تنتے ہوئے دماغ کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ مراد علی اس کے ساتھ چاہے جیسا مرضی سلوک کر لے، وہ برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن اس کی ماما کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرے یہ اس سے برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں جو آیا تھا، وہ اسی سوچ کے تحت وہاں جا پہنچا، جہاں سامنے ثانیہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے گیسو تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ گیسوؤں کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ شعیب کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ بیگم طلعت نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ شعیب نے اس کی جانب نہیں دیکھا بلکہ ثانیہ پر نگاہیں ٹکائے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ ثانیہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے اسے دیکھتا

Digitized by Google

رہا۔ پھر اس کے پاس سائیڈ ٹیبل پر پھول رکھ دیے۔ چند لمحے کھڑا ثانیہ کے چہرے پر بہت جذباتی انداز میں دیکھتا رہا پھر واپس پلٹ گیا۔ پلٹتے ہی اس کا سامنا بیگم طلعت سے ہوگیا۔ شعیب اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ وہ چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بیگم طلعت کا تنا ہوا چہرہ نرم ہوگیا تو شعیب نے دھیمے سے لہجے میں کہا

"بتا دیں مراد علی کو، میں آیا تھا۔ یہ اس کی قسمت اچھی نکلی جو وہ یہاں نہیں ملا۔ اب اگر اس میں ہمت ہے تو میرا سامنا کرے۔ میں سب کچھ قربان کرسکتا ہوں لیکن اپنی ماما کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں۔ میں اپنی ماما کے ایک ایک آنسو کا حساب اس سے لینے والا ہوں۔ بتا دیجئے گا اسے۔"

یہ کہہ کر شعیب وہاں سے چلتا چلا گیا۔ بیگم طلعت ایک تبدیل ہوئے شعیب کو دیکھتی ہی رہ گئی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اسے کمرے سے گئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ ثانیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پھولوں کو دیکھا اور بڑی نرماہٹ سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگی، تبھی بیگم طلعت نے جھجکتے ہوئے بتایا

"وہ..... شعیب آیا تھا۔"

"پتہ ہے۔" ثانیہ مسکراتے ہوئے بولی تو بیگم طلعت حیران رہ گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑی رہی پھر باہر نکل گئی۔ ثانیہ نے پھول اپنے ساتھ رکھ لئے تھے اور وہ خیالوں میں کھو گئی تھی یوں جیسے ان لمحوں کو یاد کررہی ہو۔

پہلی محبت انسان کو کبھی نہیں بھولتی۔ پہلی بار جب شعیب کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا تھا، وہ پوری دنیا میں ایک الگ ہی مقام اختیار کرگیا تھا۔ لو کین تک۔ وہ اسی کا نام سنتی رہی تھی۔ پھر اس کے باپ کی نفرت نے اسے شعیب سے متنفر کردیا تھا۔ شاید وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شعیب کا نام مٹا نہیں پائی تھی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

فاخرہ بہت زیادہ ہی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ جیسے ہی شعیب گھر سے نکلا، وہ بھی بہانہ کرکے سڑک پر آ گئی۔ اس نے جلدی میں ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھی کرامت شاہ کے پاس جا پہنچی۔ اسے کرامت شاہ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ پھوپھو فاخرہ کمرے میں داخل ہو کر بیٹھ گئی تو اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ پھر خباثت سے مسکراتے ہوئے مزہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

"بول فاخرہ..... خوش خبری سنا ٹوٹ گئی منگنی کیا؟"

"نہیں بابا! منگنی کیا ٹوٹنی ہے اس بچی کا تو بہت برا حال ہوگیا ہے۔ بے چاری کو پھر اسپتال لے گئے ہیں۔ بابا، میرا مقصد اسے مارنا تو نہیں ہے۔ وہ پھول سی بچی....." فاخرہ نے ڈرتے، جھجکتے ہوئے بتایا۔

"ارے نہیں، میں کون سا اسے مار رہا ہوں، یہ کالا جادو ہے، اس کا اپنا طریقہ ہے، جس میں کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔ تم نے کہا منگنی ٹوٹ جائے تو وہ ٹوٹ جائے گی، فکر نہ کر۔" اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بابا، صرف منگنی ہی نہیں تڑوانی، اس بچی کی شادی شعیب سے کروانی ہے، بہو بنانا چاہتی ہوں میں اُسے، کہیں وہ پاگل ہوگئی تو؟ مرگئی تو؟ اور..... وہ شعیب....." اس نے کہنا چاہا تو کرامت شاہ اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے، کچھ نہیں ہوتا۔ ایک طرف جلدی بھی کررہی ہو، ایک طرف ڈر بھی رہی ہو، اب کچھ نہیں ہوتا اسے۔ ٹھیک ہوجائے گی۔"

"بابا بات تو سن نا، وہ شعیب تو مرنے مارنے پر اتر آیا ہے، وہ گیا ہے مراد علی سے جھگڑنے تبھی میں آئی ہوں اس وقت۔" فاخرہ نے تیزی سے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا، تم فکر نہیں کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا" اس بار وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں چاہتی ہوں شعیب سے اس کی شادی بھی ہوجائے وہ....." پھوپھو فاخرہ نے کہا تو کرامت شاہ بولا۔

"ہوجائے گی۔ بالکل ہوجائے گی۔ فکر نہ کر، لیکن..... اگر تو بہت جلد یہ سب کچھ کروانا چاہتی ہے تو پھر یہ عمل بڑا ہی بھاری ہے۔ اس لئے چڑھاوا بھی بڑا ہی دینا پڑتا ہے۔"

"پہلے میں نے بھی ایک روپیہ بھی کم دیا، چڑھاوا دوں گی جو بولو، میں کب انکار کررہی ہوں؟ پہلے بھی انکار کیا ہے۔ بولو۔" فاخرہ نے تیزی سے کہا۔

"تو سنو پھر! جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر اپنے

Digitized by Google

ہدف پر لگتا ہے نا، اسی طرح تمہاری خواہش کے مطابق کام ہوگا مگر چڑھاوا ذرا مختلف قسم کا ہے۔" وہ انتہائی خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ بولو تو بابا، کیسا ہے یہ چڑھاوا؟"

"چڑھاوے کی رقم تو ہوگی لیکن اس کے علاوہ ایک کنواری لڑکی کا بندوبست کرنا ہوگا۔" اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"کنواری لڑکی......؟" فاخرہ نے حیرت سے پوچھا تو کرامت شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کنواری لڑکی پر عمل کرنا ہوگا، پھر یہ دیکھنا، چند دن میں ہی تیرے بھتیجے کی شادی کیسے ہوتی ہے۔ جتنی جلدی لے آ، اتنی جلدی عمل کر دوں گا، پھر اتنی جلدی شادی بھی ہو جائے گی۔ ہتھیلی پر سرسوں جما دوں گا، آزمائش شرط ہے۔"

"یہ کنواری لڑکی، کیسے کروں گی۔ کہاں سے تلاش کروں۔ خیر ٹھیک ہے، میں کرتی ہوں بندوبست۔" وہ بے بسی سے بولی تو اس نے کہا۔

"جس دن یہ سب لے آؤ گی، اسی دن عمل شروع کر دوں گا۔ دن کے وقت اس لڑکی پر اور رات کے وقت دریا میں کھڑے ہو کر عمل کرنا ہے، تین دن میں کام، گارنٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں۔ پر وہ بچی بے چاری......" وہ منمناتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں ہوتا، کہا ہے نا۔" اس بار وہ رعب سے بولا تو فاخرہ نے کافی سارے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے۔ کرامت شاہ نے ان نوٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اٹھا لے یہ نوٹ، اب ایک بار ہی لوں گا۔ لے جا یہ۔"

فاخرہ نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ نوٹ پرس میں رکھ کر اٹھی اور واپس چلی گئی۔ کرامت شاہ کے چہرے پر یوں خباثت بھری مسکان بکھر گئی جیسے صیاد اپنے شکار کر دیکھ کر مسکراتا ہے۔

سورج ڈھلنے تک وہ واپس آ گئی۔ کوئی انہونی خبر نہ سننے پر وہ مطمئن ہو گئی۔ شعیب بھی اپنے کمرے میں تھا۔ رات کا کھانا کھاتے وہ سب اکٹھے ہوئے تب بھی کوئی بات نہ ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تھوڑی دیر بیگم ثروت کے پاس بیٹھ کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ بیڈ پر بیٹھی انتہائی پریشان تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لوں گی؟ شعیب سے مانگوں تو سب پتہ چل جائے گا۔ یہ میں وہیں سے لے لیتی ہوں، جہاں سے پہلے لیتی ہوں۔ یہ سوچ کر وہ کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔ اس سے چڑھاوا چڑھ جائے گا، جو بھی لینا ہوگا وہ خود ہی لے لے گا۔ پھر ایک دم سے پریشان ہو کر سوچنے لگی، لیکن یہ...... کنواری لڑکی...... یہ میں کہاں سے لاؤں گی؟ یہ کہیں رستے میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ تو ناممکن بات ہے، بابا سے بات کروں گی، خود ہی کر لے کہیں سے بندوبست، میں کہاں سے لاؤں کہیں وہ...... انکار نہ کر دے۔ بات کر کے دیکھتی ہوں اس سے۔ لیکن پہلے رقم کا تو بندوبست کر لوں۔ پیسہ پھینک کر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اطمینان سے اٹھی گئی۔

بیگم ثروت کے بیڈروم میں ملجگا اندھیرا تھا۔ فاخرہ یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ثروت رات جب دوا کھا لے تو گہری نیند سو جایا کرتی تھی۔ دوا کھلانے کی ذمہ داری اسی کی ہوتی تھی۔ ثروت گہری نیند سو رہی تھی۔ فاخرہ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ کچھ دیر کھڑی ثروت کی طرف دیکھتی رہی جو کروٹ لئے گہری نیند میں تھی۔ پورا اطمینان کر لینے کے بعد وہ ایک الماری کے پاس گئی۔ اسے بڑی احتیاط سے کھولا اور اس میں سے چابیاں نکال لیں۔ پھر اس چابی سے الماری کھول لی۔ سامنے نوٹوں کی گڈیاں پڑی ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ زیوارت کے ڈبے بھی پڑے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر صرف نوٹوں کی چند گڈیاں اٹھائیں۔ انہیں اپنے آنچل میں چھپا کر تیزی سے وہ الماری بند کر دی۔ چابیاں واپس اسی جگہ پر رکھ کر اطمینان سے واپس چلی گئی۔ چڑھاوے کے لئے رقم کا وہ بندوبست کر چکی تھی۔

اگلی صبح فاخرہ کاریڈور میں بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ بابا کرامت کے پاس جائے گی، اسے رقم دے کر کہے گی کہ کسی بھی کنواری لڑکی کا وہ خود بندوبست کر لے۔ وہ کہاں سے لائے گی۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر بابا اسے منع نہیں کر پائے گا۔ وہ مطمئن تھی اور تھوڑی دیر بعد بابا کے پاس جانے کے لئے نکلنے والی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک جوان سال لڑکی گیٹ کے اندر آ گئی۔

فاخرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اگرچہ وہ اپنے حلیے سے ایک غریب لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن وہ کافی نکھری ہوئی اور اٹھان اُگ رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے قریب آتی گئی، فاخرہ اس پر نگاہیں جمائے اسے دیکھتی رہی۔ اسے وہ لڑکی بلا کی حسین لگی

Digitized by Google

تھی۔ اس نے چشم تصور میں دیکھا تو ایک دم سے اس لڑکی کے کپڑے تبدیل ہو گئے۔ کچھ میک اپ کیا ہوا، بدلی ہوئی، جیسے بہت ماڈرن سی لڑکی ہو۔ یہ فاخرہ کی نگاہ کا کرشمہ تھا۔ اس نے تصور میں جو دیکھا تب فاخرہ کی آنکھیں چمک گئیں۔ وہ مسکرا اٹھی۔ اس کے چہرے پر مکاری آ گئی یہاں تک کہ اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

"کنواری لڑکی!"

وہ لڑکی آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی تھی۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے فاخرہ سے پوچھا۔

"جی، بیگم ثروت صاحبہ سے ملنا ہے۔"

"پر تم ہو کون؟" فاخرہ نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی بیگم ثروت اندر سے نکل آئی، اس کی نگاہ جیسے ہی لڑکی پر پڑی تو اس نے پوچھا۔

"خیر ہے، جو تیری اماں دو دن سے نہیں آئی؟ اور آج تجھے بھیج دیا، تم صفیہ کی بیٹی ہی ہو نا؟"

"جی میں انہی کی بیٹی ہوں فرزانہ۔ دو دن سے اماں بیمار ہے، اسی لئے وہ تو نہیں آئی...... ان کی جگہ میں آ گئی ہوں کام پر، ان سے اٹھا ہی نہیں جا رہا ہے۔" فرزانہ نے دھیمے لہجے میں جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گیا صفیہ کو، کہیں زیادہ بیمار تو نہیں ہے، ڈاکٹر کو دکھایا؟" بیگم ثروت نے تشویش سے پوچھا، وہ ایک دم سے پسیج گئی تھی۔

"بس ایویں چارپائی سے لگ گئی ہے۔ ہمارے محلے میں ڈاکٹر ہے، اس سے لی تھی دوائی۔" وہ منمناتے ہوئے بولی۔

"فرزانہ، سچ بتانا، وہ تیرا رشتہ جہاں ہو رہا تھا، کیا نام تھا اس کا، ہاں اسلم، اس کا کیا بنا، وہ ہو گیا؟" بیگم ثروت نے پوچھا، گویا وہ صفیہ کی بیماری تک پہنچ گئی تھی۔

"نہیں، اسی کا تو صدمہ لے کر بیٹھ گئی ہے اماں۔ وہ لوگ تو بڑا جہیز مانگتے ہیں۔" فرزانہ نے بتایا۔

"پتہ ہے مجھے، صفیہ نے بتایا تھا۔ میں نے تب بھی کہا تھا، اسلم کی ماں بڑی لالچی عورت ہے۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے والی۔ پر ماں تو ماں ہے نا، کیا کرے بے چاری۔ کچھ نہیں کر سکتی۔" بیگم ثروت نے بے بسی سے کہا۔

"اماں تو کام پہ آنا چاہتی تھی لیکن میں نے ہی نہیں آنے دیا۔ اب میں کر لوں گی گھروں کے کام۔" فرزانہ نے کہا اور بات ہی بدل دی۔

"اچھا چل جا، سارا کام پڑا ہے کرنے والا، دو دن سے۔" بیگم ثروت نے کہا۔

"جی، ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اندر چلی گئی۔

پھوپھو فاخرہ چائے پیتے ہوئے اسی لڑکی کے بارے سوچنے لگی۔

کیا بھرپور سراپا تھا اس لڑکی کا۔ اٹھتی ہوئی جوانی، بدن تراشیدہ تھا۔ اس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ وہ عورت ہونے کے ناتے جانتی تھی کہ یہ جو سادہ سے کپڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکی ہے کسی بھی مرد کو پاگل کر سکتی تھی۔ یہی لڑکی اگر بنی سنوری ہو اور اسے اپنے حسن کا احساس ہو تو مرد کو گھما سکتی ہے۔ جبکہ بابا کرامت شاہ جو اب ادھیڑ عمری میں تھا، وہ تو اس لڑکی کے لئے ویسے پاگل ہو جائے گا۔ صرف اسے یہ پتہ چل جائے کہ وہ کسی مرد کو اپنے حصار میں لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر یہ لڑکی میری بات مان جائے اور کسی طرح بابا کرامت شاہ تک پہنچ جائے تو پھر شعیب اور ثانیہ کی شادی ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ پھر میں دیکھوں گی مراد علی کو، اسے اپنے پیروں پر نہ گرایا تو میرا نام فاخرہ نہیں، اس کی ساری امیدیں اس لڑکی سے بندھ گئی تھیں۔ فاخرہ سوچتی ہوئی نجانے کن جہانوں کی سیر پر نکل گئی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

سورج ڈھل گیا تھا، جب فرزانہ اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں صفیہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ جس طرح وہ صبح اسے چھوڑ کر گئی تھی، اسی طرح اس کا سر بندھا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح حسرت بھری نگاہوں سے سے فرزانہ کو دیکھ رہی تھی۔ فرزانہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر بیگ ایک طرف رکھا اور بیٹھتے ہوئے اپنی ماں سے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کیسی طبیعت ہے اماں، کچھ کھایا، دوائی؟"

"میری چھوڑ۔ یہ بتا، کسی نے تجھے ڈانٹا تو نہیں؟ کسی نے کوئی دوسری ماسی تو نہیں رکھ لی؟ تو نے کچھ کھایا؟" صفیہ نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں سارے جہاں کا پیار اور بے بسی گھلی ہوئی تھی۔ آخر ماں تھی، بھلے غریب تھی۔ فرزانہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر اسے حوصلہ دیتے

Digitized by Google

ہوئے بولی

"نہیں اماں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب تم میری فکر کرنی چھوڑ دو۔ میں سب گھروں میں کام کر لیا کروں گی۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

اس کے یوں کہنے پر صفیہ رو دی، پھر بڑی بے بسی میں بولی

"ہائے میری پھول سی بچی..... میں نہیں چاہتی، تم لوگوں کے گھروں میں کام کرو۔ میں نے تجھے لاڈوں سے پالا۔ پر نصیب میں نجانے کیا لکھا ہے۔ کاش تیری شادی اسلم سے ہو جاتی اور تم اپنے گھر میں....."

"اماں اب چھوڑ بھی دے اُن کا خیال، جہاں میری شادی ہونا ہوگی، ہو جائے گی۔ نہیں تو نہ سہی۔" فرزانہ دکھ بھرے لہجے میں کہا

"رب غریبوں کے گھروں میں بیٹیاں نہ دے۔ اگر دے تو ان کا نصیب اچھا کر دے۔ یا پھر لڑکے والے اتنے لالچی نہ ہوں، منہ بھر کے جہیز مانگتے ہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی

"اماں مجھے لگتا ہے تُو سارا دن اکیلی پڑی یہی سوچتی رہی ہے۔ جب انہوں نے انکار کر دیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" فرزانہ نے تنگی سے کہا

"اسلم بے چارہ تو اچھا ہے، پر اس کی ماں کے دماغ میں اتنا لالچ بھرا ہوا ہے کہ خدا کی پناہ....." صفیہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی تو فرزانہ نے اٹھتے ہوئے کہا

"بس کر دے اماں، اب اٹھ کر کچھ کھا پی لے، میں لائی ہوں کھانا، پھر تمہیں دوا بھی دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلی گئی۔ صفیہ سوچ میں ڈوبی دیوار سے لگ گئی۔ اس کے چہرے پر بے چارگی بھری دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ غربت بھی کیا شے ہے، آنکھوں سے خواب چھیننے کے ساتھ ساتھ خوابوں کا خراج بھی لے جاتی ہے۔ اس نے غربت میں نہ صرف خود کو سنبھال کر رکھا تھا، بلکہ کوشش کی تھی کہ بیٹی کو وہ عذاب نہ دیکھنے پڑیں، جو اس نے دیکھے ہیں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا تھا۔ اسی صدمے نے اسے بستر پر ڈال دیا تھا۔

فرزانہ بچپن ہی سے اسلم کی منگیتر تھی۔ دونوں کو علم تھا کہ ان کی شادی ہو گی۔ یہ احساس ان کے ساتھ ہی پروان چڑھا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ قربت میں بدلتا گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا خواب دیکھتے ہوئے جوان ہوئے۔ اسلم ایک اچھا لڑکا تھا۔ اس نے خوب محنت کر کے تعلیم حاصل کی۔ کوئی بہت بڑا عہدہ تو نہیں ایک محکمے میں کلرک بھرتی ہو گیا تھا۔ اسلم اور اس کے گھر والوں کے دن پھرنے لگے۔ غربت میں جہاں تھوڑا بہت معاشی استحکام آتا ہے، وہاں خواب اور خواہشیں بھی سر اٹھانے لگتی ہیں۔ اسلم کی ماں کو تھوڑا سکھ نصیب ہوا تو اسے اپنے بیٹے کے لئے اردگرد کئی ایسی لڑکیاں دکھائی دینے لگیں جو اپنے ساتھ ڈھیروں جہیز لا سکتی تھیں۔ اس کی سوچ بھی بدلنے لگی اور اس نے فرزانہ کی ماں کو صاف جواب دے دیا۔ اس کی نگاہ میں ایک ایسی لڑکی بچ گئی تھی جو نہ صرف بڑا جہیز لانے والی تھی بلکہ ایک مکان بھی اس لڑکی کے نام تھا۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی کی شادی اسلم سے ہو جائے۔ سو اسلم کی ماں انہی کے قصیدے گانے لگی تھی۔ وہ یکسر بھول گئی کہ اسلم اور فرزانہ ایک دوسرے کے لئے کیا جذبات رکھتے ہیں۔

فرزانہ بھی اسی دنیا کی لڑکی تھی۔ جہاں اس نے اپنی مجبوریوں کو سمجھا، وہاں وہ اپنی متوقع ساس کے رویے کو بھی سمجھ چکی تھی۔ ساری زندگی اس کی ماں نے دوسروں کے گھروں میں کام کیا تھا۔ اس نے اپنی مجبوری کو کمزوری نہیں بنایا اور محنت کرتی رہی مگر اتنا نہ بنا سکی کہ اپنی بیٹی کو عزت کے ساتھ رخصت کر سکے۔ اسے اسلم سے تھوڑی بہت امید تھی کہ شاید وہ اپنی ماں کی خواہش کے برعکس فیصلہ کر کے اسے اپنا لے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسلم نے اپنی ماں کی خواہش کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی بات پکی ہو گئی تھی۔ چند دن بعد ہی اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ فرزانہ نے جب ہوش سنبھالا تھا، تب سے اپنے نام کے ساتھ اسلم ہی کا نام سنا تھا۔ بچپن کا یہ ساتھ جوانی میں آ کر محبت میں ڈھل چکا تھا۔ وہ پوری جان سے اسے محبت کرتی تھی۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی محبت میں جہیز، پیسہ اور لالچ بھی آڑے آ جائے گا۔ یہ سوال اسے مار کر رکھ دیتے تھے کہ کیا اسلم اس سے محبت نہیں کرتا؟ کیا وہ بھی لالچی ہے؟ فرزانہ نے یہ ساری صورت حال کو سمجھ کر اسے اپنی قسمت کا فیصلہ سمجھا اور پھر خود فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنی ماں کو سکون دینے کے لئے اس کی جگہ گھروں کے کام کرنے کو نکل پڑی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے آپ سے، اپنی غربت سے اور لالچ سے انتقام لینے نکل پڑی تھی۔ وہ اپنی بے بسی سے بھی لڑنا چاہتی تھی جس نے اسے مجبور محض بنا دیا تھا۔ اسے یہ دکھ نہیں تھا کہ وہ کام

Digitized by Google

کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ بلکہ اسے یہ غم تھا کہ اسلم نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ کیا یہ ہوتی ہے محبت؟

اس رات تھک کر چُور ہو جانے کے باوجود اس کی آنکھوں میں نیند نہیں اتر رہی تھی۔ اس نے جو بہت سارے خواب دیکھے تھے وہ سب چکنا چور ہو چکے تھے۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اندھیرے میں اس کی ماں اس کے آنسو نہیں دیکھ پائے گی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

اس صبح چوہدری نذیر لاؤنج میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں بیگم الماس چائے کے دو مگ لائی۔ ایک اس نے اپنے شوہر کو تھمایا اور دوسرا مگ پکڑ کر اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ چوہدری نذیر نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور مگ اٹھاتے ہوئے بولا

"بیگم کتنی شاپنگ کر لی، کیا کیا تیاریاں کر لی ہیں شادی کی؟ اب دن ہی کتنے رہ گئے محض پانچ دن؟"

اس پر بیگم الماس چند لمحے خاموش رہی جیسے کوئی بھی بات کرنے کے لئے مناسب لفظ تلاش کر رہی ہو۔ پھر بڑے دھیمے سے لہجے میں بولی

"کیا کرنی ہیں شادی کی تیاریاں۔ پتہ نہیں یہ ثانیہ کو ہو کیا گیا ہے۔ اس کا تو رویہ ہی بدل گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟" چوہدری نذیر نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

"میں نے آج جانا تھا ان کے ہاں، وہی ثانیہ کا ماپ لینے، میری خواہش تھی کہ اسے ساتھ لے جاؤں اور اس کی پسند کا خریدوں۔ ذیشان نے اسے فون کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اب اس بات کو کیا سمجھیں؟" بیگم الماس نے الجھتے ہوئے لہجے میں کہا تو چوہدری نذیر نے حیران ہو کر کہا

"اگر جلدی شادی کی خواہش تھی تو انہی کی طرف سے تھی، اب بیٹی منع کر رہی، اتنی ٹینشن لے رہی ہے، بیگم مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔ اس سارے معاملے میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے، جو یہ لوگ ہم سے چھپا رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں، فورا منگنی فورا شادی، اور اب جبکہ سارا کچھ طے ہو گیا تو شادی سے گریز، تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"مجھے تو خود یہی محسوس ہوتا ہے۔ اب ثانیہ دودھ پیتی بچی تو ہے نہیں، جو شتے داری معاملات کو نہ سمجھے۔ وقت اور حالات کی نزاکت کا خیال نہ کرے۔" بیگم الماس نے یوں کہا جیسے وہ اس معاملے پر کافی پریشان ہو رہی ہو

"مجھے نہیں لگتا وہ اتنی پاگل ہے، مگر اس کا رویہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ لوگ شعیب سے ڈر رہے ہیں۔ لیکن، جب سارا کچھ ہو گیا تو اب ان کا بلکہ ثانیہ کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔" چوہدری نذیر نے شک زدہ لہجے میں کہا تو بیگم الماس اکتاتے ہوئے بولی

"سچ پوچھیں تو مجھے بہت برا لگا ہے۔ جس لڑکی کے اتنے لچھن اب ہیں، وہ بعد میں کیا کرے گی۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے بیگم لیکن ایک بار اس کے ماں باپ سے تو بات کر لیں، وہ کیا کہتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور چائے کا سپ لے لیا

"بات چاہے کر لیں، مگر اب میرا دل اس لڑکی کو نہیں چاہتا۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں

"خیر ایسی بھی کیا بات ہو گئی، بات کر لیں، پھر دیکھتے ہیں۔ اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو ثانیہ اپنے ذیشان کی پسند ہے۔ یہ بات سمجھتی ہونا۔ اس لئے جلد بازی نہیں کرنی۔" چوہدری نذیر نے سمجھاتے ہوئے کہا تو بیگم الماس نے سوچتے ہوئے کہا

"یہی وہ وجہ ہے، جس کے باعث میں اب تک خاموش ہوں ورنہ مجھے وہ لوگ اور خاص طور پر یہ ثانیہ اچھی نہیں لگی تھی۔ میں تو کہہ رہی ہوں، اگر اس لڑکی نے ایسا رویہ دکھایا تو میں صاف انکار کر دوں گی۔ آپ کے بیٹے نے اس سے شادی کرنی ہو گی تو پھر کرتا رہے، میری طرف سے صاف انکار ہے۔"

"سمجھداری سے کام لیتے ہیں بیگم، خود انکار نہ کرو بلکہ ثانیہ کی بیماری ہی ایسا معاملہ ہے کہ وہ کچھ مزید وقت لیں گے، ایسا مجھے لگتا ہے۔ میں نے بھی لندن چلے جانا ہے۔ سو میرے واپس آنے تک یہ شادی ٹال دیتے ہیں۔ اس دوران سب پتہ چل جائے گا کہ اصل میں معاملہ کیا ہے۔" چوہدری نذیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو بیگم الماس سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی

"چلیں ٹھیک ہے۔ مجھے ان سے کسی قسم کی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں، ذیشان جیسے کہے گا، ویسے ہی کر لیں گے۔"

"ہاں، یہی بہتر رہے گا۔ اس شادی کو ٹالنے کے لئے

Digitized by Google

میرے پاس لندن جانے کا ایک معقول بہانہ ہے۔" چوہدری نذیر نے کہا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ بیگم الماس وہیں بیٹھے چائے پیتی رہی اور ساتھ میں سوچتی بھی رہی کہ اسے اب کیا کرنا ہوگا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

اس صبح پھوپھو ناشتہ کرتے ہی کاریڈور میں آبیٹھی تھی۔ وہ بڑی بے چین تھی۔ اس کی نگاہیں گیٹ پر لگی ہوئیں تھیں۔ شعیب اپنے آفس جا چکا تھا۔ بیگم ثروت لاؤنج میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ بے یقین تھی کہ کہیں وہ لڑکی آج آئے ہی نا۔ ہوسکتا ہے وہ کام کرنے سے انکاری ہوگئی ہو اور آج اس کی ماں رضیہ کام پر آجائے۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچتے ہوئے وہ بے چین ہوگئی۔ اسے بیٹھے بٹھائے ایک کنواری لڑکی مل گئی تھی۔ اب اگر وہ نہ ملی تو کہاں سے تلاش کرے گی؟ وہ انہیں سوچوں میں الجھی ہوئی تھی فرزانہ گیٹ پار کر کے اندر آگئی

اسے دیکھا تو پھوپھو کی جان میں جان آئی۔ معمولی سے کپڑوں میں ملبوس فرزانہ کی جوانی چھپ نہیں رہی تھی۔ یہی لڑکی اگر اچھے لباس میں ہوتو کیا غضب ڈھائے۔ پھوپھو نے پھر یہی سوچا۔ شاید اسکے اندر کوئی کشش تھی جو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ فرزانہ نے قریب آکر پھوپھو کو سلام کیا تو وہ جواب دیتے ہوئے بولی

"لگتا ہے تیری اماں ٹھیک نہیں ہوئی جو تم کام پر آگئی ہو؟"

"اب وہ ٹھیک ہو یا نہ ہو، اب میں ہی کام پر آیا کروں گی۔" فرزانہ نے حسرت سے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گئی۔

پھوپھو موقع کی تلاش میں تھی کہ کب فرزانہ سے بات کرے۔ وہ اسی تاک میں رہی۔ اس وقت فرزانہ کچن کا کام ختم کر کے ستانے کو وہیں بیٹھی ہوئی تھی کہ پھوپھو اس کے پاس چلی گئی۔

"فرزانہ، لگتا ہے تھک گئی ہو؟" پھوپھو فاخرہ اس کے پاس جا کر بیٹھتے ہوئے بولی

"ہاں بس ذرا ستانے کو بیٹھ گئی۔ کام بھی تو کوئی نہیں ہے؟" اس نے جلدی سے کہا اور اٹھنے لگی تو پھوپھو نے بڑے پیار سے کہا

"کہاں چلی، بیٹھ جا۔"

"جی،" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں بھی اکیلی ہوتی ہوں گھر میں، دل چاہتا ہے باتیں کرنے کو۔ تمہیں دیکھا تو تیرے پاس آگئی۔ میں بھی دکھوں کی ماری ہوں۔"

"ہاں جی، اس دنیا میں جسے دکھ ملتے ہیں تو پھر ملتے ہی چلے جاتے ہیں۔ شاید ان کا نصیب ایسا ہوتا ہے۔" فرزانہ نے دکھی لہجے میں کہا تبھی پھوپھو نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"میں نے جب تیرے بارے میں تفصیل کے ساتھ ثروت سے سنا تو مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ لوگ کتنے لالچی ہوتے ہیں۔ اپنے مفاد کے لئے پرانے رشتے تک بھول جاتے ہیں۔"

"پر کیا کریں۔ ہم غریب لوگ کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔" فرزانہ نے حسرت سے کہا تو پھوپھو سارے جہان کا درد اپنے لہجے میں سموتے ہوئے بولی

"ایسا بھی نہیں ہے، اگر بندہ تھوڑی سی ہمت کرے نا، تو اپنی تقدیر خود آپ بدل سکتا ہے۔"

"تقدیر تو تب بدلے نا، جب ہماری قسمت ہمارے ساتھ ہو، اس دنیا میں سب سے بڑا سچ دولت ہے، میرے پاس آج دولت ہوتو سارے رشتے میرے پاس ہوں۔ میں جو چاہوں کروں۔" وہ تنک کر بولی۔ اس کے لہجے میں بغاوت در آئی تھی۔

"دیکھ سارے رشتے ناطے دولت سے نہیں ملتے، میرے پاس بھی دولت ہے لیکن میں یہاں اپنے بھائی کے گھر میں رہنے پر مجبور ہوں۔ انہیں میری دولت سے کوئی غرض نہیں، بلکہ مجھے ان کی ضرورت ہے۔" پھوپھو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" فرزانہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ بنا دولت کے بعد بھی بہت سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔" پھوپھو نے تیزی سے کہا

"ایسا کیا طریقہ ہے، مجھے پتہ چلے تو میں فوری اس پر عمل نہ کرلوں۔" فرزانہ نے بیزاری سے کہا

"اگر ایسی بات ہے نا تو میرے پاس تیرے مسئلے کا حل

Digitized by Google

ہے۔" پھوپھو نے اپنے لہجے میں سارے جہان کا درد سموتے ہوئے کہا تو فرزانہ نے حیرت اور خوشی سے پوچھا

"کیا ہے وہ حل؟"

"بتا تو دوں تجھے لیکن اس میں سب سے بڑی شرط راز داری ہے۔" پھوپھو نے محتاط انداز میں کہا

"کیسی راز داری؟" فرزانہ نے حیرت سے پوچھا

"دیکھ میں ایک ایسے پہنچے ہوئے بزرگ کو جانتی ہوں جو پل بھر میں بگڑی سنوار دیتا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ اس کے پاس چلو تو جو چاہو سو کر سکتی ہو۔" پھوپھو نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"ایسا ہو جائے گا، وہ تو بہت رقم مانگے گا، مفت میں تو وہ کچھ کرنے سے رہا۔" فرزانہ نے اس کی بات سمجھتے ہوئے پوچھا

"اگر تھوڑے سے پیسوں میں تمہاری زندگی بن سکتی ہے تو خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں، میں دے دوں گی وہ ساری رقم جتنی بھی وہ مانگے گا۔ ایک بار آزما لینے میں کیا حرج ہے؟" پھوپھو نے کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے چہرے سے رضامند لگی تو پھوپھو نے مزید کہا، "تم ایسا کرو، جن گھروں میں کام کرنا ہے، کر لو، پھر شام ہونے سے پہلے چلتے ہیں۔"

"کام ہو نہ ہو لیکن میں آپ کو پیسے کیسے لوٹا سکوں گی؟"

"ارے نہیں، پیسے جائیں بھاڑ میں، اتنے تھوڑے سے پیسوں سے مجھے فرق نہیں پڑتا، لیکن دل میں حسرت تو نہیں رہے گی۔ لیکن مجھے یقین ہے، جو تم چاہو گی وہ ہو جائے گا۔ یہ پکی بات ہے۔" پھوپھو نے پر یقین لہجے میں کہا

"ٹھیک ہے۔" فرزانہ مان گئی تو پھوپھو نے اطمینان کا سانس لیا۔

سہ پہر کا وقت تھا، جب پھوپھو مین روڈ پر آ گئی۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا فرزانہ منتظر کھڑی تھی۔ اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ اگلے چند منٹ میں انہوں نے ٹیکسی لی اور کرامت شاہ کے گھر کی جانب چل دیں۔

کرامت شاہ کے گھر میں انتظار نہیں تھا لیکن پھوپھو نے پہلے ہی فون بھی کر دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی وہاں موجود عورت نے اسے اندر جانے کا کہہ دیا۔ پھوپھو فاخرہ نے فرزانہ کو ساتھ لیا اور کرامت شاہ کے اس پراسرار کمرے میں داخل ہو گئی۔ اگر بتیوں کی تیز بو نے فرزانہ کے حواس ایک لمحے کو مختل کر دیئے۔ کرامت شاہ کی نگاہ جیسے ہی فرزانہ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شیطانیت جاگ اٹھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی شکاری اپنے جال میں شکار پھنسے ہوئے دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ وہ اسی لمحے ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے کوئی منتر پڑھنے لگا۔ وہ پڑھ چکا تو بڑی مہیب آواز میں بولا

"بول کیا بات ہے، کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ بچی بے چاری بہت دکھی ہے، کنواری ہے، اس کی شادی کا مسئلہ ہے۔ بہت غریب ہے بے چاری۔" پھوپھو نے اس کا مسئلہ بتاتے ہوئے کرامت شاہ کو اشارہ دے دیا تو کرامت شاہ کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ اس نے فرزانہ کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا

"اچھا بیٹھو، مسئلہ بتاؤ؟" اس نے بارعب لہجے میں پوچھا تو پھوپھو نے فرزانہ کو پکڑ کر بٹھا دیا۔ اس نے بیٹھ کر بڑے اختصار سے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ کرامت شاہ بڑے غور سے فرزانہ کے جسم کے تشیب فراز دیکھتا رہا۔ اسے شاید اس کے مسئلے سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جب خاموش ہو گئی تو کرامت شاہ بولا

"آج ہی اس کو ایسا اشارہ ملے گا، جس سے یہ مطمئن ہو جائے گی کہ اس کا کام بن جائے گا۔ لیکن جب تک میرا عمل پورا نہیں ہو گا، اسے ہمارے پاس آتے جاتے رہنا پڑے گا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی، تب تک۔"

"کیوں نہیں، یہ آئے گی، ضرور آئے گی۔" پھوپھو فاخرہ نے کہتے ہوئے فرزانہ کو ٹہوکا دیا تو وہ بھی تیزی سے بولی

"جی میں آتی رہوں گی۔"

"اگر تجھے آج ہی اشارہ مل جائے تو کل تم اکیلی ہی میرے پاس آنا، یہ فاخرہ کو زحمت مت دینا۔" کرامت شاہ نے کہا تو پھوپھو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے کنواری لڑکی والی شرط پوری کر دی تھی۔

پھوپھو نے اسی وقت اپنے پرس میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کرامت شاہ کے سامنے رکھ دی۔ دونوں ہی سمجھ رہے تھے یہ کس مقصد کے لئے دی جا رہی ہے۔ کرامت شاہ نے نوٹوں کی گڈی کی جانب للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھا اور اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر اپنے قریب پڑے صندوق

Digitized by Google

کو کھولا، اس میں سے ایک پڑیا نکالی، جسے اس نے کھولا اور زور زور سے نجانے کس زبان میں منتر پڑھنے لگا۔ کافی دیر تک ہلکان ہو جانے والے انداز میں جاپ کرتا رہا۔ پھر خاموش ہو کر بولا

"اے لڑکی، یہ راکھ ہے، بڑی خاص قسم کی راکھ۔ اس کی ایک چٹکی سورج غروب ہونے سے پہلے جلتے ہوئے چولہے میں پھینک دینا۔ دیکھنا وہ آج رات ہی تم سے ملنے چلا آئے گا۔ مگر تم نے اس کی کوئی بات نہیں ماننی۔ اسی طرح روزانہ یہ راکھ ایک چٹکی جلتی ہوئی آگ میں پھینکتی رہنا۔ وہ تیرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہوتا رہے گا۔ اس وقت تک جب تک وہ تیری بات نہ مان لے، یہی عمل کرتی رہنا۔"

"جی بابا جی۔" فرزانہ نے اپنے اندر کے اضطراب کو چھپاتے ہوئے تیزی سے کہا تو کرامت شاہ رعب دار لہجے بولا

"لیکن کل یہاں آ کر بتانا مت بھولنا کہ وہ تمہیں ملنے آیا تھا یا نہیں؟ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کے ساتھ کیا عمل کرنا ہے۔"

"جی ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گی۔" فرزانہ نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو کرامت شاہ نے انہیں اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے باہر جانے لگیں تو اس نے پھپھو کو آواز دے کر روک لیا۔ فرزانہ دروازہ پار کر گئی تھی۔ پھپھو واپس پلٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تو اس نے کہا

"ٹھیک ہے، تم اسے میرے پاس لے آئی، تیرا اتنا ہی کام تھا، میں آج ہی عمل کرتا ہوں۔ کل شام تک وہی ہو جائے گا جو تم چاہتی ہو۔ بے فکر ہو جا، تو نے مجھے خوش کیا، میں تجھے خوش کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ خباثت سے ہنس دیا۔

"بس میرے شعیب کی خواہش پوری ہو جائے۔" پھپھو نے حسرت سے کہا تو وہ بولا

"ہو گئی سمجھو۔ جاؤ اب کل شام کو دیکھنا۔"

پھپھو اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

سورج غروب ہونے میں تھوڑا سا وقت رہتا تھا جب فرزانہ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں ہنوز کمرے میں بستر پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ یوں اٹھ بیٹھی جیسے اسی کے انتظار میں ہو۔

"آ گئی میری بچی، دیر کیوں ہو گئی تمہیں۔" ماں کو جیسے سکون سا آ گیا ہو تو فرزانہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا

"ہاں اماں، بس آج ویگن ملنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔"

"ہاں یہ ویگنیں بھی نا۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی

"اچھا اماں کھانا گرم کر دوں۔" اس نے کہا اور اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا گرم کرنے کے لئے چولہا جلا دیا۔ چولہے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ اگر بابا کرامت کے کہنے پر اسلم آج رات اس کے پاس آ گیا تو پھر .....؟ شاید اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے خود ہی سے سوال کرتی۔

"اگر آ گیا؟" اس نے سوچا۔

"آ گیا تو پھر جو بابا کہے گا وہی کروں گی۔ میں اس اسلم کو اس کی اوقات بتاؤں گی۔" اس نے انتہائی غصے میں کہا

"تو چل ڈال دے پھر راکھ۔" اس کے دماغ نے کہا

اس نے پڑیا کھول کر اس میں سے ایک چٹکی راکھ جلتی ہوئی آگ میں پھینک دی۔

فرزانہ چولہے میں راکھ کی چٹکی ڈال کر آگ کو تکتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر اٹھ گئی۔ اس نے اپنی ماں کے سامنے کھانا رکھا اور خود بھی پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سارے دن کی روداد اپنی ماں کو سناتے ہوئے کرامت شاہ کے ہاں جانے کا ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنی ماں سے کرامت شاہ کے پاس جانے کا ذکر کیا تو وہ سو طرح کے سوال کرے گی۔ جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کو ایک نئی طرح کی فکر نہیں دینا چاہتی تھی۔ کبھی کبھار اس کی ماں اکثر یہ خواہش کرتی رہتی تھی کہ کاش ایسا کوئی جادو ہو جائے کہ اس کی بیٹی کسی اچھے گھر کی بہو بن جائے۔ فرزانہ نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر کرامت شاہ کی کوئی کرامت اس کے سامنے آ گئی اور جو وہ چاہتی ہے ویسا ہو گیا تو اپنی ماں کو بتا دے گی۔ وقت سے پہلے بتا دینے کا کیا فائدہ؟ سورج غروب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کھانے دینے کے بعد دوا پلا کر بستر پر جا لیٹی تھی۔ آج اس کی تھکن کل کی نسبت کم تھی لیکن وہ ذہنی طور پر بہت بے چین تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جو کچھ کرامت شاہ نے کہا ہے کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ یہ کیسے ہو گا؟ یہی سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی آنکھ ماں کی آواز پر کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی

Digitized by Google

"کیا ہے اماں؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا

"باہر کوئی دروازے پر ہے، دیکھ کون ہے اس وقت۔" اماں نے اسے کہا تو ایسے میں دروزے پر دستک کی آواز اس نے بھی سنی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں لہرا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے تک گئی اور لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا

"کون ہے؟"

"میں ہوں اسلم، دروازہ کھولو۔" دوسری طرف سے دھیمی آواز میں جیسے ہی کہا گیا تو فرزانہ کی حیرت انتہا کو چھونے لگی۔ اس کا من خوشی سے بھر گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ اس کا سانس تیز ہو گیا گیا۔ یہ تو چمتکار ہو گیا؟ اس نے سوچا پھر اس نے لمحوں میں خود پر قابو پایا اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے اسلم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ تبھی فرزانہ نے پوچھا

"اسلم، اتنی رات گئے، خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں، ابھی اتنی رات بھی نہیں ہوئی، میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، کمرے میں سے اس کی ماں کی آواز ابھری

"کون ہے باہر؟"

"چل اندر چل۔" اسلم نے کہا اور دروازہ پار کر کے صحن میں آ گیا۔ وہ آگے آگے چلتا ہوا کمرہ میں چلا گیا۔ اس کی ماں اسلم کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ ایک دوسری چارپائی پر بیٹھ کر دھیمے سے بولا، "کیسی طبیعت ہے خالہ؟"

"بس ٹھیک ہوں پتر، تم سناؤ، تیرا کام ٹھیک چل رہا ہے؟"

"ہاں خالہ سب ٹھیک ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا

"کیسے آنا ہوا پتر؟" اماں نے پوچھا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا

"میں نے سنا ہے کہ یہ فرزانہ اب تمہاری جگہ لوگوں کے گھروں میں کام کرنے جا رہی ہے، کیا میں نے ٹھیک سنا ہے؟"

اس کے لہجے میں جیسے شرمندگی تھی۔ اس سے پہلے کہ اماں جواب دیتی، فرزانہ نے تیزی سے تلخ لہجے میں کہا

"ہاں، میں جاتی ہوں اب، میرا باپ یا بھائی نہیں ہے جو کما کر لائے۔ ہمیں اپنی روزی روٹی کے لئے خود کمانا ہے۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے نہیں دے کر جائے گا۔ میری ماں بیمار ہے، اس کی دوا کون لائے گا۔ اس لئے مجھے کام تو کرنا ہی پڑے گا نا۔"

"ٹھیک ہے میں مانتا ہوں، لیکن کل سے تم کام پر نہیں جاؤ گی۔ تم لوگوں کا جتنا ماہانہ خرچ ہے مجھے بتاؤ، وہ میں دوں گا۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا

"نا تم خیرات دو گے ہمیں؟" فرزانہ نے بھرے لہجے میں پوچھا

"نہیں خیرات کون کہہ رہا ہے، بس میں دوں گا۔" اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بات کرے۔

"لیکن کس ناطے سے؟" فرزانہ نے تلخ لہجے میں طنزیہ کہا

"کوئی ناطہ بھی سمجھ لو۔ مگر تم کام نہیں کرو گی۔" وہ سنجیدگی سے بولا

"اور جس دن تمہاری اماں کو پتہ چل گیا تو وہ ہمارا جینا حرام کر دے گی، اگلے پچھلے سارے پیسے نکلوا کر دم لے گی۔ نہیں ہمیں ایسے پیسے نہیں چاہئیں۔" فرزانہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا

"دیکھو، میں بہت سوچ کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے انکار مت کرو۔"

"اسلم، جب تیرا ہمارے ساتھ کوئی رشتہ نہیں، کوئی ناطہ نہیں تو ہم کیسے تمہاری یہ بھیک قبول کر لیں۔" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا

"ممکن ہے، ایسا بھی ہو جائے، مجھے کوئی موقعہ تو دو۔" اسلم نے آہستگی سے کہا تو اماں ایک دم سے پسیج گئی۔ اسے لگا کہ جیسے اسلم لوٹ آیا ہے۔ اس لئے وہ اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے بولی

"مان لو اسلم کی بات، وہ بے چارہ....."

"نہیں اماں، جس بندے کی اپنی کوئی رائے نہیں، جس کا اپنا کوئی فیصلہ نہیں، ہم اس کی بات کیسے مان لیں۔ ہاں اگر یہ کوئی ایسا تعلق جوڑتا ہے، جس سے کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ہمیں تو اپنی روٹی خود کما کر لانی ہے۔" فرزانہ نے دوٹوک انداز میں کہا تو اسلم کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھتے ہوئے بولا

"سوچ لو فرزانہ، ابھی ہمارے درمیان کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔"

"یہ فاصلہ بھی تم نے ہی ختم کرنا ہے، کیونکہ یہ فاصلہ تم

Digitized by Google

لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے۔ جس دن یہ فاصلہ ختم کردو گے میں تمہاری بات مان لوں گی۔" فرزانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

"ٹھیک ہے، بہت جلد یہ سب ہو جائے گا۔" اسلم نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ فرزانہ جب دروازہ لگانے گئی تو اسلم گلی میں جا چکا تھا۔ اس رات فرزانہ کے خواب پھر سے رنگین ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ اسے کرامت شاہ پر رشک آنے لگا تھا۔ جس نے انہونی کو ہونی بنا دیا تھا۔

اگلی صبح جب وہ بیگم ثروت کے ہاں گئی تو پھوپھو فاخرہ کار پورچ میں بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ فرزانہ اس کے پاس جا بیٹھی۔

"بتا کوئی بات بنی؟" پھوپھو نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے پوچھا

"بات کیا بنی پھوپھو، یہ تو چمتکار ہو گیا ہے، وہ رات آ گیا تھا ہمارے گھر۔" یہ کہہ کر فرزانہ نے حیرت زدہ انداز میں ساری روداد سنا دی۔ جسے سنتے ہوئے پھوپھو کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ سب کچھ سن لینے کے بعد پھوپھو نے فرزانہ کو ڈرا دینے والے انداز میں سمجھایا

"دیکھو، اب سارے گھروں میں اپنے کام ختم کرنے کے بعد سیدھی کرامت شاہ کے پاس چلی جانا۔ جس طرح تو نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ ویسے ہی کرنا، ورنہ سیدھا ہوتا ہوا کام کہیں الٹا ہی نہ پڑ جائے۔"

"ہاں، پھوپھو یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ چل ٹھیک ہے، میں وہیں مین روڈ پر آپ کا انتظار کروں گی۔" فرزانہ نے کہا تو پھوپھو بولیں

"نہ، نہ، میں نے اب تمہارے ساتھ نہیں جانا۔ کسی کو بھی شک پڑ سکتا ہے۔ سب کیا کرایا ختم ہو جائے گا۔ میں نے تجھے کرامت شاہ سے ملا دیا، یہی بہت ہے۔ ہاں، تجھے رکشے ٹیکسی کا کرایہ دے دیا کروں گی، وہ لے لینا مجھ سے۔ باقی تمہیں پتہ، تیرے سامنے میں نے اتنے نوٹ دے دیئے تھے اسے، اب وہ تم سے کچھ نہیں مانگے گا۔"

"ہاں پھوپھو، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں چلی جاؤں گی۔" فرزانہ نے جھٹ سے کہا تو پھوپھو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ جانے اور کرامت شاہ۔ اسے تو بس اب یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ذیشان اور ثانیہ کی شادی میں بس چار دن باقی رہ گئے تھے۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ ہو جاتا کہ ان کی شادی نہیں ہو رہی۔

فرزانہ نے سہ پہر ہونے تک سارے گھروں کے کام ختم کر لئے۔ وہ سیدھی مین روڈ پر آئی، وہاں سے اس نے رکشہ لیا اور سیدھی کرامت شاہ کے گھر جا پہنچی۔ فوراً ہی اسے اندر بلا لیا گیا۔ وہاں کرامت شاہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کرامت شاہ کے ہونٹوں پر خباثت پھیل گئی۔ اس نے بھوکی نگاہوں سے فرزانہ کو دیکھا اور اپنے سامنے بیٹھ جانے کو اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ جن نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا، فرزانہ اس کا مطلب خوب سمجھ گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ وہ بولا

"ہاں بولو، وہ آیا تھا؟"

"جی، بالکل، وہ آیا، مجھے تو یقین ہی نہیں ہوا۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی تو کرامت شاہ ایک قہقہہ لگا کر بولا

"وہ تم سے شادی کرے گا۔ جو چاہو گی وہی کرے گا۔ اس کی ماں اگر تیرے راستے کی رکاوٹ بنی تو اسے مار دیں گے۔ تو کسی قسم کی فکر نہ کر، بس ایک چھوٹا سا کام کر دے ہمارا۔ تیرا کام بھی ہو جائے گا اور ہمارا بھی۔"

"آپ کا کیا کام ہے بابا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"ایک عمل کرنا ہے۔ اس میں تجھے سامنے بٹھانا ہے۔ ہمارا کام تو ہو ہی جائے گا، لیکن تیری طاقت کتنی بڑھ جائے گی تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جو تم کہو گی، وہ سب مانتا چلا جائے گا۔ ہتھیلی پر سرسوں جما دوں گا۔" کرامت شاہ نے اس کی طرف بھوکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا

"یہ کب ہو گا عمل؟" اس نے پھر ڈرتے ہوئے پوچھا

"یہ اماوس کی راتیں ہیں۔ انہی دنوں میں ہو گا وہ عمل۔ تجھے ایک رات میرے پاس رہنا ہو گا۔ اسی رات عمل مکمل ہو جائے گا۔" اس نے اپنی سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا

"میں رات باہر کیسے رہ سکتی ہوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا

"اب یہ تمہارا کام ہے۔ کل اور پرسوں صرف دو راتیں ہیں تمہارے پاس، آ جاؤ، سب کچھ تمہاری مرضی کا ہو جائے گا۔" اس بار کرامت شاہ نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں۔" اس نے ڈرتے ہوئے

Digitized by Google

کہا تو کرامت شاہ نے اسے جانے کا اشارہ کردیا۔ وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ مراد علی گھر واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ ایزی ہو کر لاؤنج میں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ بیگم طلعت اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے پہلو بدلتے رہنے کے بعد وہ دھیمے سے لہجے میں بولی

"ثانیہ کی شادی کو صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ لیکن کوئی تیاری نہیں ہوئی۔ نہ کوئی کپڑا خریدا ہے، نہ کسی قسم کی کوئی چیز لائے ہیں جو ہم اپنی بیٹی کو دیں گے۔ شادی والے گھر میں اس قدر سناٹا ہے۔ میرا تو جی گھبرا رہا ہے۔ کیا ہوگا، کیسے ہوگا یہ سب ؟"

"بیگم، تمہیں بھی پتہ ہے ثانیہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی ۔ میں نے ڈاکٹر ظہیر سے کافی تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا یہی ہے کہ ثانیہ نے ذہنی طور پر اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا ہے۔ اگر یہ شادی ہو بھی جاتی ہے تو ثانیہ اسے بہت عرصہ تک قبول ہی نہیں کر پائے گی۔" مراد علی نے کہا تو بیگم طلعت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

"میری بیٹی نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے اسے، اچھی بھلی تھی، یہ کیا ہوگیا ہے اسے۔"

"جہاں تک نظر لگنے کی بات ہے، وہ تمہاری بہن ہی ہو سکتی ہے۔ جس کو ہماری خوشیاں ایک آنکھ نہیں بھاتی، اور اس کا بیٹا جو بات بات پر لڑنے مرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ بہت ممکن ہے ثانیہ نے اس کا بھی اثر لیا ہو۔ مجھے پتہ ہے تمہیں میری باتیں بہت بری لگ رہی ہوں گی لیکن حقیقت یہی ہے۔" مراد علی نے زہر خند لہجے میں کہا تو بیگم طلعت نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"میری بہن تو خود بے چاری اس کی صحت کے لئے دعائیں مانگ رہی ہے۔ اسے بالکل بھی اعتراض نہیں ہے کہ ہم ثانیہ کی شادی کہاں کر رہے ہیں، خیر چھوڑیں اس بات کو، کیا کیا ہے اب تک آپ نے کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔"

"دیکھو بیگم، میں نے شہر کے مشہور ہوٹل میں ہال بک کروا لیا ہے، جتنے بھی مہمان ہوں گے، وہیں آجائیں گے۔ کل بیگم الماس اپنے ساتھ ثانیہ لے جا کر اس کا جوڑا پسند کروا لائے گی، تم بھی ساتھ چلے جانا، جو بھی شاپنگ کرنا ہو کر لینا۔ باقی رہی جہیز کی بات تو میں نے ایک معقول رقم ثانیہ کے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہے۔ شادی کے بعد جو چاہے وہ خرید سکتی ہے۔" مراد علی نے سکون سے کہا تو بیگم طلعت کو کچھ ڈھارس بندھی۔ مگر اس کے چہرے پر سے پریشانی پھر بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی

"لیکن بیگم الماس نے تو آج آنا تھا، میں اس کا انتظار بھی کرتی رہی ہوں۔ انہوں نے کوئی فون بھی نہیں کیا مجھے، کیا آپ کو کال کر کے انہوں نے کل آنے کا بتایا؟"

"ہاں، مجھے چوہدری صاحب کا فون آیا تھا، آج ان کے کوئی مہمان آ گئے تھے۔ اس لئے وہ نہیں آ پائے ہیں۔ میں نے تمہیں بتانا تھا، لیکن بس مصروفیت میں یاد ہی نہیں رہا۔" مراد علی نے ٹی وی پر نگاہیں جمائے کہا

"مہمان کون کون سے ہوں گے، انہیں کیا بتا دیا آپ نے ؟" بیگم طلعت نے پوچھا تو مراد علی نے طنزیہ لہجے میں کہا

"بس تمہاری بہن صاحبہ کو نہیں بلایا، باقی میں نے اپنے بہت قریبی دوستوں کی لسٹ بنالی ہے، انہیں کل فون کروں گا ۔ تم چاہو تو اپنی بہن کو فون کر دینا تاکہ شادی میں کوئی نہ کوئی بدمزگی ضرور ہو جائے۔"

"مراد علی یہ آپ اچھا نہیں کر رہے، اس طرح....." بیگم طلعت نے کہنا چاہا مگر مراد علی نے بات کاٹتے ہوئے نفرت سے کہا

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ میں نے کہہ دیا، وہ مجھے وہاں دکھائی نہ دے۔ اور ہاں اس کے علاوہ جسے بھی بلانا چاہو، ثانیہ سے بھی پوچھ لو، اس کی کوئی قریب ترین سہیلی ہو تو اسے بھی بلا لو۔"

بیگم طلعت نے دکھی دل کے ساتھ اپنے شوہر کی ساری بات سنی۔ اس کے آنسو پلکوں پر آ گئے تو وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ بیڈروم میں جا کر کھل کے رو دی۔ ایک ہی بہن تھی، اس سے بھی ناطہ چھوٹ رہا تھا۔ اب یہ اس کی مجبوری تھی۔ وہ اپنے گھر بار، اپنے شوہر کے لئے بہن کو چھوڑ نا ہی تھا۔ کافی دیر بعد تک وہ خود کو سمجھا پائی تھی۔ اپنے آپ کو حوصلہ دینے کے بعد وہ ثانیہ کے کمرے کی جانب چل دی۔

ثانیہ بیڈ پر لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ طلعت بیگم کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے کتاب ایک طرف رکھتے مسکرا کر کہا

Digitized by Google

"آئیں ماما، ادھر میرے پاس بیٹھیں۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ بیگم طلعت اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ثانیہ نے اپنا سر ماما کے کاندھے سے لگا دیا۔ تبھی بیگم طلعت نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا
"بیٹی، تمہاری شادی کو چار دن رہ گئے ہیں۔ اپنی کسی سہیلی کو شادی پر بلایا ہے تم نے؟"
"ماما، میں نے کسی کو بھی نہیں بلانا۔ کوئی سہیلی نہیں ہے میری۔" ثانیہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی
"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ مانا کہ جیسے تمہیں رخصت کرنا چاہئے تھا، ویسا سب کچھ نہیں ہو رہا، لیکن اس میں ہم نے تو نہیں چاہا۔ تمہاری اور ذیشان کی مرضی تھی۔ اس لئے....." وہ کہہ رہی تھیں کہ ثانیہ نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا
"میرا دل نہیں چاہ رہا۔ شاید وہ سب وقتی اُبال تھا۔ شاید جذبات اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس کی سمجھ مجھے اب آ رہی ہے۔"
"لیکن بیٹی اب تو سب کچھ طے ہو گیا ہے۔ سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وہ ساری باتیں ثانیہ کو بتا دیں جو تھوڑی دیر پہلے مراد علی نے اس سے شادی کی تیاریوں کے بارے میں کہی تھیں۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یونہی باتیں کرتے رہنے کے بعد بیگم طلعت اسکے پاس سے اٹھ کر چل دیں۔ نجانے کیوں وہ اپنے دل پر بھاری بوجھ محسوس کر رہی تھی۔

اس وقت سورج ڈھلنے کو تھا جب فرزانہ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں کمرے سے اٹھ کر باہر صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف صحت مند دکھائی دے رہی تھی بلکہ نہا دھو کر کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے کھانا لے جا کر رکھا تو اس کی ماں نے کہا
"ادھر آ بیٹھ تجھے ایک بات بتاؤں۔"
"ایسی کیا بات ہے اماں۔" اس نے تجسس سے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو اس کی ماں نے خوشگوار لہجے میں بتایا
"تیرے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اسلم آیا تھا۔ اس نے مجھے کافی ساری رقم دی ہے اور منت کر کے کہا ہے کہ اب میں تجھے کام پر نہ بھیجوں۔"
"تو پھر کیا کہتی ہو تم؟" فرزانہ نے ماں سے پوچھا
"دیکھ اگر اب وہ تیری طرف مائل ہو رہا ہے تو اب تم بھی اس کی بات مان لو۔ کہیں وہ غصے میں آ کر اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔" اس کی ماں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ تب اس نے حتمی لہجے میں کہا
"اماں، میرا کام کرنا ہی اگر اسے برا لگتا ہے تو پھر اپنی ماں کو لے کر آ جائے۔ پہلے کی طرح منگنی کرے اور میں اسی دن سے کام چھوڑ دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر خاموش رہی پھر کھنکھارتے ہوئے بولی، "اماں شاید اسلم تو اب بھی مجھے چاہتا ہوگا لیکن اس کی ماں کا کیا کرو گی۔ میں کام کرتی رہوں گی نا تو وہ جلدی ہی اپنی مان کو راضی کر لے گا۔"
"چل بیٹی، جیسے تمہاری مرضی۔" اس کی ماں نے دھیمے سے لہجے کہا تو وہ چولہے میں آگ جلانے لگی۔ اسے جلتی ہوئی آگ میں راکھ پھینکنا تھی۔ اس نے ماں کو اندر جانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو کھانا گرم کرنے سے پہلے اس نے راکھ چولہے میں ڈال دی۔ فرزانہ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اگر کرامت شاہ کے عمل نے ایک ہی دن میں اپنا چمتکار دکھا دیا ہے تو اب اسلم اس کا ہو کر رہے گا۔ جیسے وہ چاہے گی ویسا ہی اب اسلم کرے گا۔ شاید اس سوچ کے پیچھے انتقام بھی تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اسے کرامت شاہ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اگر وہ آج ہی عمل کے لئے چلی جائے تو کیسا ہو؟ لیکن اپنی ماں سے بہانہ کیا کرے گی؟ کھانا گرم کرتے اور ماں کو کھلاتے ہوئے آخر بہانہ سوجھ ہی گیا۔ اس وقت فرزانہ دوا پلا چکی تھی جب اس نے اپنی ماں سے کہا
"اماں، وہ بیگم ثروت ہیں نا، وہ بڑی بیمار ہیں۔"
"اوہ کیا ہو گیا بیگم صاحبہ کو؟" ماں نے تشویش سے پوچھا
"پتہ نہیں کیا ہوا ہے انہیں، مجھے تو پھوپھو نے کہا تھا کہ اگر میں ۱۰ بجے ان کے پاس رک جاؤں تو انہیں تیمارداری میں سہولت ہو گی۔ مگر میں تو انہیں یہ کہہ کر آ گئی اگر اماں نے اجازت دی تو آ جاؤں گی۔"
"تو بیٹی تم وہاں رک جاتی۔ وہ بڑی اچھی خاتون ہے۔ ان کا خیال کرنا چاہئے تھا تمہیں۔" اماں نے تشویش سے کہا
فرزانہ کو اندازہ نہیں تھا کہ ماں اتنی جلدی مان جائے گی۔ اس نے چند لمحے سوچا اور اوپری دل سے بولی
"اگر تم کہتی ہو تو چلی جاتی ہوں۔"
"ہاں بیٹی اگر اب بھی تم جا سکتی ہو تو چلی جاؤ۔ اس عورت

Digitized by Google

کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ آج ان کے کام آؤ گی تو کل وہ تیرا خیال کریں گے۔" اماں نے سمجھایا تو وہ جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

اس وقت رات ڈھل چکی تھی جب فرزانہ ایک ٹیکسی لے کر کرامت شاہ کے گھر جا پہنچی۔ جیسے ہی اس کی آمد کے بارے میں کرامت شاہ کو بتایا گیا، اسے فوراً اندر بلا لیا گیا۔ کرامت شاہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے بھوکی نگاہوں سے اس کے بدن کو دیکھتے ہوئے پوچھا

"تم آج ہی میرے عمل میں میرا ساتھ دو گی؟"

"جی میں تیار ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا

"ٹھیک ہے، عمل کی تیاری کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے باہر کسی کو آواز دے دی۔

کرامت شاہ کی آواز دینے کی بازگشت میں وہاں کی خادمہ اندر آ گئی۔ اس نے پہلے فرزانہ کو دیکھا، پھر کرامت شاہ کی طرف دیکھ کر کہا

"جی باباجی حکم۔"

"یہ لڑکی آج کے عمل میں میرا ساتھ دے گی، جاؤ اسے تیار کر کے، عمل والے کمرے میں لے کر آؤ۔" اس نے حکم دیا تو ادھیڑ عمر عورت نے ذرا سا جھک کر کہا

"جیسے آپ کا حکم باباجی۔"

یہ کہہ کر اس نے فرزانہ کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ چل دی۔

وہ ادھیڑ عمر عورت اسے ایک ایسے کمرے میں لے گئی، جس کی چار دیواری تو کیا چھت بھی سیاہ تھی۔ کمرے میں اگر بتی سلگ رہی تھی، جس کی مہک سے اس کا دماغ خمار آلود ہونے لگا تھا۔ فرش پر ایک دری پڑی ہوئی تھی۔ فرزانہ کو اس پر بٹھا دیا گیا۔

"ایسے ہی بیٹھی رہنا میں ابھی آئی۔" ادھیڑ عمر عورت نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر عورت واپس پلٹ کر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چینی کا پیالہ تھا۔ اس نے گہرے عنابی رنگ کا سیال تھا۔ وہ اس نے فرزانہ کی جانب بڑھاتے ہوئے پی جانے کا اشارہ کیا۔ فرزانہ نے وہ پیالہ پکڑا اور اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ مشروب کافی مزیدار تھا۔ اس نے چند گھونٹوں میں وہ پیالہ ختم کر دیا۔ اس ادھیڑ عمر عورت نے پیالہ واپس لے کر ایک جانب رکھ دیا۔ ادھیڑ عمر عورت نے فرزانہ کے پاس بیٹھ کر اس کے بال کھول دیئے پھر آہستہ آہستہ ان میں کنگھی کرنے لگی۔ فرزانہ سکون محسوس کرنے لگی تھی وہ یونہی بیٹھی رہی تھی۔ کچھ دیر تک اس کے بال سنوارتے رہنے کے بعد بال چھوڑ دیئے۔ فرزانہ پر جیسے نشہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ اس کے اپنے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ اس ادھیڑ عمر عورت نے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ جس پر فرزانہ نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا بلکہ وہ مچلنے لگی تھی۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ کوئی اسے توڑ کر رکھ دے۔ وہ ادھیڑ عمر عورت سمجھ گئی کہ فرزانہ اب پوری طرح تیار ہو چکی ہے۔ اس نے فرزانہ کے بدن پر سے سارے کپڑے اتار دیئے۔ انہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ادھیڑ عمر عورت نے اس کے گرد ایک مختصر سی سیاہ چادر اوڑا دی گئی۔ وہ چادر میں لپٹی ہوئی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ادھیڑ عمر عورت اسے اس کمرے سے اٹھا کر عمل والے کمرے میں لے گئی۔

عمل والے کمرے کی دیواریں بھی سیاہ رنگ کی تھیں۔ ہلکی ہلکی سرخ روشنی نے اسے مزید خوفناک بنا دیا ہوا تھا۔

کرامت شاہ کمرے کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گرد بھی ایک چھوٹی سی سیاہ چادر تھی۔ اس کے آگے چھوٹے سے برتن میں آگ جل رہی تھی۔ وہ منہ میں تیزی سے کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کا وقفہ کر کے وہ آگ میں کئی چیزوں سے بنایا برادہ پھینکتا، جس سے ایک دم سے سڑاند اٹھتی تھی اور دھواں کمرے میں پھیل جاتا تھا۔ وہ اور زور زور سے منتر پڑھنے لگتا تھا۔ ایسے میں وہ ادھیڑ عمر عورت آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی فرزانہ کو لے کر آئی، اسے کمرے میں چھوڑ کر فوراً ہی پلٹ گئی۔

فرزانہ کے گرد ایک مختصر سی سیاہ چادر تھی۔ اس کے بال یوں کھلے ہوئے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے سانپوں نے اس کی گردن کو گھیرا ہوا ہو۔ وہ کرامت شاہ کو دیکھ کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو یا پھر کسی ربورٹ کی مانند بے حس ہو چکی ہو۔ اسے دیکھتے ہی کرامت شاہ نے زور زور سے منتر پڑھتے ہوئے آگ میں برادہ پھینکا تو دھوئیں کے ساتھ سڑاند اٹھی۔ کرامت شاہ کے پاس آتی ہوئی فرزانہ کو ابکائی آ گئی اور خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے قے کر

Digitized by Google

دی۔اس کے ساتھ ہی وہ دہری ہوتی چلی گئی۔سیاہ چادر پر اس کی قے بکھر گئی تھی۔تیز بدبو کمرے میں پھیل چکی تھی۔اس پر کرامت شاہ کی آنکھوں میں ایسی چمک در آئی جیسے اس کا عمل کامیاب ہو گیا ہو۔وہ زور زور سے منتر پڑھنے لگا۔فرزانہ اس کے سامنے دہری ہو کر فرش پر گر گئی تھی۔تیز سڑاند اور بدبو سے وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔کرامت شاہ نے اس بس نہیں کی۔وہ فرش پر گری ہوئی فرزانہ کے گرد چکر کاٹنے لگا۔اکی ہوس بھری شیطانی آنکھیں اس کے بدن پر پیوستہ تھیں۔جبکہ فرزانہ فرش پر بے بس پڑی ہوئی تھی۔کرامت شاہ نے اپنے بدن پر پڑی ہوئی سیاہ چادر اتار کر پرے پھینک دی تو کمرے میں شیطان پوری طرح ناچنے لگا تھا۔

❁.....❁.....❁

ناشتے کی میز پر چوہدری نذیر اخبار پڑھ رہا تھا۔ملازمہ ناشتہ لگا رہی تھی۔ایسے میں بیگم الماس آ گئی۔وہ میز پر بیٹھی ہی تھی کہ ذیشان بھی اپنا بیگ لئے آ گیا۔وہ ماں کے ساتھ بیٹھا تو چوہدری نذیر نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے ذیشان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

"میں ٹھیک ہوں پاپا۔" اس نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا

"وہ تو تمہاری شکل سے دکھائی دے رہا ہے کہ تم کتنے ٹھیک ہو، خیر، تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری شادی کو کتنے دن رہ گئے ہیں۔" پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا

"یہی تین دن۔" وہ انجان بنتے ہوئے بولا

"اور میرے لندن جانے میں چار دن باقی ہیں۔تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنا مصروف ہوں۔لیکن تم ماں بیٹے نے بھی شادی کی کوئی تیاری نہیں کی، نہ کوئی شاپنگ کی اور میرے خیال میں تو تم لوگ دوبارہ ثانیہ کے گھر بھی نہیں گئے۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟" پاپا نے پوچھا تو ذیشان نے بڑے تحمل سے اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا

"ایسی تو کوئی بات نہیں پاپا، بس آج جائیں گے ان کی طرف، شام تک شاپنگ ہو جائے گی جو بہت ضروری ہے۔میں اور ماما آج انہی کے گھر جا رہے ہیں۔"

"لیکن تم تو بیگ اٹھائے ہوئے ہو؟" پاپا نے کہا تو ذیشان ایک دم سے پریشان ہو گیا، وہ کچھ کہنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ پاپا نے کہا، "دیکھو بیٹا، والدین ہی وہ رشتہ ہے، جو بنا کسی لالچ کے اپنی اولاد سے پیار کرتا ہے۔ان کی جائز ناجائز سبھی مانتا ہے۔اور یہ بھی یاد رکھو وہ اپنی اولاد سے غافل نہیں رہتا۔تمہیں جو پریشانی ہے ہمیں بتاؤ۔"

"پریشانی کی ایسی کوئی بات تو نہیں ہے۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا

"نہیں بیٹا تم پریشان ہو۔ہم نے تمہارے کہنے پر ثانیہ سے تمہاری بات طے کر دی۔شادی کے اس کے والدین نے کہا، ہم نے وہ بھی مان لیا۔لیکن مجھے لگتا ہے اب ان کے رویئے میں کہیں سرد مہری ہے، جو تم ہم سے شیئر نہیں کر رہے ہو، جو بات بھی ہے بیٹا وہ ہم سے کہو۔اس طرح خاموش رہنے سے معاملہ حل نہیں ہو گا۔"

ذیشان نے اپنے پاپا کی بات بڑے سکون سے سنی۔پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد الجھے ہوئے لہجے میں بولا

"پاپا مسئلہ تک وہ بالکل ٹھیک تھی۔ہم میں انڈر سٹینڈنگ تھی۔جیسے ہی یہ شعیب والا معاملہ درمیان میں آیا، اسی وقت سے ثانیہ کا رویہ بدل گیا۔اس کی بیماری کی بھی کوئی سمجھ نہیں آ رہی۔میں ڈاکٹر ظہیر سے....."

"بیٹا، میں نے بھی اس سے تفصیل کے ساتھ بات کی تھی۔اسے بھی کسی بیماری کی سمجھ نہیں آ رہی۔سوائے نفسیاتی بیماری کے دوسرا کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔اچانک ایسی کسی نفسیاتی بیماری کا سامنے آ جانا، نارمل نہیں ہے۔اسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔" پاپا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس کی ماما بولیں

"دیکھو بیٹا، میں کوئی ثانیہ پر الزام تراشی نہیں کر رہی ہوں بلکہ عورت کی ایک نفسیات بتانا چاہتی ہوں، اور وہ یہ ہے کہ جس مرد کے ساتھ عورت کا نام جڑ جائے وہ اسی کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟ مطلب شعیب سے وہ اب بھی....." اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اس کے رویے سے، اس کے اچانک بیمار ہو جانے سے، اندازہ تو یہی لگایا جا سکتا ہے۔ورنہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" ماما نے سکون سے کہا

"ایک بات اور بھی ممکن ہے، وہ شاید شعیب سے ڈر گئے ہوں؟" ذیشان نے کہا تو پاپا نے بولے

Digitized by Google

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو، لیکن مراد علی کے پاس ایسے بہت سارے حل ہیں جن سے وہ استفادہ کرسکتا ہے۔ میں نے بھی اسے آفر کی تھی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ ڈر گئے ہیں۔ اصل معاملہ صرف اور صرف ثانیہ ہی کا ہے۔"

"میرے خیال میں آج ہم ان سے حتمی بات کرلیں۔" ماما نے دوٹوک انداز میں کہا تو پاپا نے پوچھا

"مثلاً کیا کریں گی یہ بات؟"

"یہی کہ شاپنگ کے لئے جانا ہے، چلیں ہمارے ساتھ۔ خوش خوش ہمارے ساتھ چل دیں تو ٹھیک۔ ورنہ سیدھی سی بات ہے، وہیں پتہ چل جائے گا کہ ان کے دل میں کیا ہے۔" ماما نے کہا

"اور اگر وہ خوش خوش نہ گئیں تو؟" پاپا نے پوچھا

"میرا خیال ہے پھر ہمیں ان سے وقت لے لینا چاہئے کیا خیال ہے بیٹا؟" پاپا نے پوچھا حالانکہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ پہلے ہی طے کرچکا تھا کہ کرنا کیا ہے۔ اس پر ذیشان خاموش رہا۔ کچھ لمحوں بعد بولا

"پاپا جیسا آپ اور ماما چاہیں۔ میرا بھی وہی فیصلہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، تم یہ بیگ واپس رکھو، ہم کچھ دیر بعد تینوں ہی ان کے ہاں جاتے ہیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" ذیشان نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مراد علی اور بیگم طلعت دونوں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان خاموشی طاری تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے انہیں چوہدری نذیر کا فون آیا تھا کہ وہ تینوں ان سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ دونوں ہی کو معلوم تھا کہ وہ کس مقصد کے لئے آرہے ہیں۔ مگر ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے سوچ رہے تھے کہ وہ تینوں لاؤنج میں آگئے۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ سکون سے بیٹھ جانے پر بیگم طلعت نے پوچھا

"کیا لیں گے آپ، کافی چائے یا ٹھنڈا؟"

"کچھ بھی نہیں، ابھی ناشتہ کیا ہے، کچھ دیر بعد چائے پی لیں گے۔" چوہدری نذیر نے سنجیدگی سے کہا تو بیگم الماس نے پوچھا

"یہ ثانیہ دکھائی نہیں دے رہی، کہاں ہے؟ اسے ہماری آمد کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔ میں نے سوچا آپ آجائیں تو بتاتی ہوں۔"

"اوہ، ہم نے تو اسے اپنے ساتھ لے کر جانا تھا، کیا شاپنگ نہیں کرنی، شادی میں بھلا دن کتنے رہ گئے ہیں۔" بیگم الماس نے حیرت سے کہا

"میں بلاتی ہوں اسے۔" یہ کہتے ہوئے بیگم طلعت اٹھ گئیں۔ بھی چوہدری نذیر نے اپنا رُخ مراد علی کی جانب موڑتے ہوئے پوچھا

"بچوں کی خوشی کے لئے انتہائی جلدی میں منگنی کرلی، پھر فوراً شادی کا بھی کہہ دیا، دن بھی طے کرلئے لیکن اب آپ کی طرف سے سرد مہری کیوں؟"

"دراصل، وہ ثانیہ اچانک بیمار ہوگئی، اس لئے کوئی سمجھ ہی نہیں آرہی ہے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ انتہائی پریشانی میں یہ دن گزر رہے ہیں۔ ورنہ سرد مہری والی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" مراد علی نے تحمل سے کہا

"تو پھر کیا کہتے ہیں آپ؟ شادی اسی دن ہونا ہے، جس دن ہم نے طے کی ہے یا آپ کا کوئی خیال بدل گیا ہے؟" چوہدری نذیر نے بھی سکون سے پوچھا تو مراد علی نے جھجکتے ہوئے کہا

"اب دیکھیں، ثانیہ کی حالت ایسی نہیں ہے، آپ کو بھی پتہ ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، کیا کروں اور کیا نہ کروں۔"

"بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے، میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو میری حالت بھی آپ کے جیسی ہوتا تھی۔ خیر، ثانیہ سے بھی مشورہ کرلیں۔ اگر وہ خود کو ٹھیک سمجھتی ہے تو شادی میں کوئی تاخیر بھلا کیوں کریں۔" چوہدری نذیر نے کہا تو مراد علی خاموش ہوگیا

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بیگم طلعت کے ساتھ ثانیہ آگئی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کئی دنوں کی بیمار ہو۔ اس نے سب کو سلام کیا اور اپنی ماما کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی ذیشان کی طرف نہیں دیکھا۔ بیگم الماس نے یہ رویہ بہت غور سے نوٹ کیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹی؟" چوہدری نذیر نے ثانیہ سے پوچھا

"ٹھیک ہوں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے

Digitized by Google

میں کہا

"شاپنگ کے لئے کچھ سوچا، کہاں جانا ہے، کب جانا ہے، کیا کچھ لینا ہے؟" بیگم الیاس نے پوچھا تو ثانیہ کے چہرے پر ہلکی سی ناگواریت پھیل گئی۔

"نہیں آنٹی میں نے تو کچھ بھی نہیں سوچا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، مجھے سمجھ نہیں آرہی، کیا کروں کیا نہ کروں۔" چند لمحوں بعد وہ الجھتے ہوئے بولی

یہ کہہ کر وہ چند لمحے بے چین سی وہاں بیٹھی پہلو بدلتی رہی اور پھر اٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔ گویا اس نے یہ بتادیا تھا کہ اسے وہاں بیٹھنا، اس موضوع پر بات کرنا یا سننا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سب اس کی طرف دیکھتے رہے، پھر چوہدری نذیر نے مراد علی کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں پوچھا

"مطلب، ثانیہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے؟"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

"تو چلیں ٹھیک ہے، ہم ثانیہ کے بالکل تندرست ہو جانے کا انتظار کر لیتے ہیں۔ میں لندن سے واپس آجاؤں تو پھر پورے چاؤ سے یہ شادی کر لیں گے، کیا خیال ہے آپ کا۔" چوہدری نذیر نے دبے دبے غصے میں کہا اور ذیشان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ مراد علی یا کوئی جواب دیتا، وہ جھجکتے ہوئے بولا

"میں اگر ایک منٹ ثانیہ سے بات کرلوں تو....."

"جاؤ، جا کر بات کرلو۔" بیگم طلعت نے جلدی سے کہا تو وہ اٹھ کر ثانیہ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ثانیہ اپنے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہلکی سی دستک دے کر ذیشان اندر آگیا تو ثانیہ نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

"تمہیں یوں وہاں سے اٹھ کر نہیں آجانا چاہئے تھا۔" وہ ہولے شکوہ بھرے لہجے میں سے بولا

"میں جانتی ہوں، تم لوگ اپنے گھر ہی سے یہ سوچ کر آئے تھے کہ اس شادی سے انکار کرنا ہے۔ تمہارے پاپا نے بات ہی اس طرح کی ہے۔ پھر میں وہاں کیا کرنے بیٹھی رہتی؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سکون سے کہا

"ایسا نہیں ہے، میں اور ماما تو آج شاپنگ....."

"غلط کہہ رہے ہو تم، جھوٹ بولتے ہو۔ میں کسی جھوٹے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" اس نے انکار میں سر مارتے ہوئے کہا

"ثانیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو، شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی۔ مجھے بتاؤ، بات کیا ہے۔" ذیشان نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سکون سے پوچھا

"میں کچھ نہیں جانتی، مجھے بس اکیلا چھوڑ دو۔" اس نے انتہائی غصے میں کہا تو ذیشان اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس قدر وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ جتنا تحمل اور سکون سے بات کر رہا تھا، وہ اسی قدر غصے میں آتی چلی جارہی تھی۔ تبھی ذیشان کو خیال آیا کہ معاملہ کافی سیریس ہے۔ ان دنوں میں اگر ان کی شادی ہو بھی گئی تو ان کے درمیان ذرا سی بھی خوشگواریت نہیں ہوگی۔ جس طرح پاپا نے کہا کہ کچھ دیر انتظار کر لینا چاہئے تو ویسا ہی ٹھیک ہے۔ ممکن ہے اچھا ہونے کی بجائے بالکل ہی غلط ہو جائے۔ اس نے اپنے تئیں فیصلہ کرتے ہوئے دھیمے سے کہا

"ثانیہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ یہ تمہیں بھی پتہ ہے۔ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم کیسے یہ سوچ سکتی ہو کہ میں تمہارا خیال نہیں کرتا۔ خیر، اب جو بھی تمہارا فیصلہ ہو میں اسے مان لوں گا۔ ہم اس شادی کو موخر کرتے ہیں۔ پاپا جب واپس آجائیں گے تو پھر ہو جائے گی یہ شادی بھی۔ تم پر سکون ہو جاؤ۔ اب خوش ہو؟"

"ہاں، میں خوش ہوں۔ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو ذیشان فوراً ہی اٹھ گیا۔ وہ اپنے تئیں مسئلہ سمجھ چکا تھا کہ کیا ہو سکتا ہے۔

وہ واپس لاؤنج میں آیا تو وہ سب چائے پی رہے تھے۔ وہ سکون سے صوفے پر آبیٹھا۔ سب کی نگاہیں اس پر تھیں۔ اس لئے وہ بولا

"میرا خیال ہے، پاپا لندن سے واپس آجائیں تو ہی شادی کرنا بہتر ہوگا۔"

اس کے یوں کہنے پر ان سب کے درمیان جیسے ماحول ساکت ہو گیا ہو۔ کچھ دیر انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر چوہدری نذیر ہی نے کہا

"چلیں اچھا ہوا، ہمیں شادی کی تیاری کے لئے کافی

Digitized by Google

وقت مل جائے گا۔ دھوم دھام سے کریں گے شادی۔"

"ہاں ایسا ہی ہونا چاہئے۔" مراد علی نے بے دلی سے کہا تو ذیشان اٹھتے ہوئے بولا

"پاپا، میں آفس جاتا ہوں، آپ ماما کے ساتھ گھر چلے جائیں۔"

"چائے تو پی لو بیٹا۔ کچھ لیا بھی نہیں تم نے....." بیگم طلعت نے دکھی لہجے میں کہا تو وہ سنی ان سنی کرتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ اب اس کے لئے وہاں رکھا ہی کیا تھا۔

❀.....❀.....❀

اس وقت بیگم ثروت اور پھوپھو، باہر کاریڈور میں بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے ہی شعیب آفس کے لئے نکلا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے یوں چائے پیتی چلی جارہی تھیں جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہ ہو۔ چائے پینے کے بعد بیگم ثروت نے اٹھتے ہوئے کہا

"میں تو چلی اندر، تھوڑا آرام کرلوں۔ پھر مجھے مارکیٹ بھی جانا ہے۔"

اس پر پھوپھو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ فرزانہ گیٹ پار کر کے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ معمول سے کچھ پہلے ہی آگئی تھی۔ وہ سیدھی پھوپھو کے پاس آکر فرش پر بیٹھ گئی۔

"آج اتنی جلدی آگئی ہو؟" پھوپھو نے شک بھرے لہجے میں پوچھا

"میں گھر سے نہیں آئی۔" اس نے افسردگی سے کہا

"تو پھر کہاں سے آئی ہو؟" پھوپھو نے تیزی سے پوچھا

"میں کرامت شاہ کے گھر سے آئی ہوں، رات وہیں تھی عمل کے لئے۔" اس نے دکھی لہجے میں منہ پھیرتے ہوئے کہا تو پھوپھو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جلدی سے سیدھی ہوتے ہوئے ارد گرد دیکھا، پھر ہولے سے پوچھا

"کیسے کیا عمل؟"

اس پر فرزانہ کچھ نہیں بولی، بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ لمحوں میں نڈھال دکھائی دینے لگی تھی۔ پھوپھو نے سب کچھ سمجھتے ہوئے فقط تصدیق کے لئے اپنا سوال دہرایا تو وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی

"میرا سب کچھ لٹ گیا ہے پھوپھو۔ انہوں نے مجھے نشہ پلا دیا تھا۔ پھر پتہ نہیں میرے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آئی۔ تین گھنٹے پہلے مجھے ہوش آیا تو میں گندگی میں لپٹی ہوئی تھی۔"

"اوہ....." پھوپھو کے منہ سے سرسراتے ہوئے بس یہی نکلا، پھر چند لمحوں بعد تجسس سے پوچھا، "رات، اپنی ماں کو کیا بتایا؟"

اس پر فرزانہ نے ساری روداد پھوپھو کو سنا دی۔ یہاں تک کہ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی پھوپھو کے سامنے پھینکتے ہوئے بولی

"یہ دیئے ہیں انہوں نے مجھے اور ساتھ میں دھمکیاں بھی دی ہیں۔ کہا ہے کہ میں دوبارہ آتی جاتی رہوں ورنہ وہ میرا سب کچھ ختم کردیں گے اور میں کسی کو بتاؤں بھی نہ۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

"اچھا، صبر کر، میں بات کروں گی ان سے۔ میں کہوں گی ان سے کہ تیری شادی جلد از جلد اسلم سے ہو جائے۔ اب اگر ہم یہ بات منہ سے نکالتے ہیں تو ہماری کوئی نہیں مانے گا۔ اب میں ہی بات کروں گی ان کے ساتھ، عقل مندی یہی ہے کہ بس خاموش رہا جائے، واویلا کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اس کی نگاہ نوٹوں پر پڑی۔ وہ اٹھا کر اس نے فرزانہ کو دیتے ہوئے کہا، "یہ رکھ لے اپنے پاس، کام آئیں گے۔"

"اپنے پاس ہی رکھ لو، میں لے لوں گی پھر۔" فرزانہ نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔ پھوپھو چند لمحے سوچتی رہی، پھر اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رینگ گئی۔ پھوپھو کو اسی لمحے یہ بے چینی ہونے لگی کہ ثانیہ کے بارے میں پتہ کرے۔ وہاں کوئی نہ کوئی خبر ضرور ہوگی۔

دن کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ پھوپھو کچن میں جا کر فرزانہ کو زبردستی دودھ پلا کر نکلی تھی۔ بیگم ثروت مارکیٹ جانے کے لئے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی ہوئی تھیں۔ وہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر انتظار میں تھی۔ انہی لمحات میں بیگم ثروت کا فون بج اٹھا۔ وہ دوسری طرف سے سنتی رہی۔ وہ کچھ دیر تک فون سنتی رہی۔ پھر فون بند کرتے ہوئے پھوپھو کو آواز دے ڈالی۔ پھوپھو اس کے پاس جا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے، بڑی پریشان لگ رہی ہو؟"

"بات ہی ایسی ہے۔" وہ افسردگی میں بولی

"بتاؤ تو۔" پھوپھو کا تجسس عروج پر تھا

Digitized by Google

"وہ ثانیہ اور ذیشان کی شادی ہو رہی تھی چار دن بعد، اب نہیں ہو رہی۔" بیگم ثروت نے بتایا تو پھوپھو کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہی ثانیہ کی بیماری، انہوں نے سوچا ٹھیک ہو جائے تو پھر دیکھتے ہیں۔ ثانیہ کا سسر بھی تو لندن جا رہا ہے نا۔" یہ کہہ کر اس نے نمبر پش کرتے ہوئے کہا

"میں شعیب کو بتا دوں۔"

پھوپھو اپنی کامیابی پر جھوم گئی تھی۔

دور کھڑی فرزانہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ ان کی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھی۔ پھوپھو فاخرہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی آسودگی نے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ نجانے اسے یہ احساس کیوں ہونے لگا کہ اس اطلاع کے ساتھ اس کا بھی کچھ نہ کچھ جڑا ہوا ہے۔ فرزانہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر وہ سمجھ گئی کہ وہ استعمال ہو گئی ہے۔ پھوپھو فاخرہ نے اسے بابا کرامت کے سامنے چارے کی مانند پھینکا تھا۔

اسلم سے شادی کرنے کی خواہش اُسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ جس کی اُسے بہت بڑی قیمت چکانا پڑی تھی۔ دکھ تھا کہ اس کے پورے وجود میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ وہ پھوپھو فاخرہ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس نے سوچا وہی لالچ میں آ گئی تھی۔ اگر وہ اپنا فائدہ نہ سوچتی تو شاید وہ اس کے چنگل میں نہ پھنستی۔ وہ کچن میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سوچ اپنی محور پر گھومنے لگی۔ اسلم کو پانے کے لئے وہ اپنی عزت کھو چکی تھی۔ اگر وہ غریب نہ ہوتی تو شاید اس کے ساتھ یہ ظلم نہ ہوتا۔ پھوپھو فاخرہ نے اپنے بھتیجے کی شادی کا مقصد حل کرنے کے لئے اسے بھینٹ چڑھا دیا۔ اس کے اندر غصہ سر اٹھانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پھوپھو فاخرہ کا گلا دبا دے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے دماغ میں یہ سوچ ابھری، پھر کیا ہوگا؟ کیا اس طرح اس کی عزت واپس آ جائے گی؟ ابھی تک تو سوائے چند لوگوں کے کسی کو معلوم نہیں، پھوپھو فاخرہ کے قتل کے بعد تو سب کو پتہ چل جائے گا؟ کیا پھر وہ زندہ رہ پائے گی؟ کیا موت صرف اسی کا مقدر ہے؟ ان سب کو موت کیوں نہ آئے، جنہوں نے اس پر ظلم کیا ہے؟ اس میں پھوپھو فاخرہ، کرامت شاہ، اسلم اور اسلم کی ماں کے ساتھ اس کی اپنی غربت بھی شامل تھی۔ ایک کو اگر قتل کر بھی دے گی تو باقی بچ جائیں گے، کوئی اور فرزانہ ان کے بھینٹ چڑھے گی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اس کے اندر کی کیفیات پل پل بدلتی چلی جا رہی تھیں۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے احساس اس وقت ہوا جب اسے اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنے گال پونچھے اور اٹھ گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا، جو کچھ وقت نے، اس زمانے نے اسے دیا ہے، وہ وہی کچھ وقت اور زمانے کو لوٹائے گی، کیسے؟ یہ اس نے وقت پر ہی چھوڑ دیا۔

شعیب اس وقت اپنے آفس میں تھا۔ اس کے پاس اس کا دوست بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں میں خاموشی تھی۔ خاموشی کا یہ وقفہ کافی طویل ہو گیا تو دوست نے کہا

"مجھے نہیں پتہ تم کیا سوچ رہے ہو، کیا کر رہے ہو، کیوں اس کام میں اتنی دیر لگا رہے ہو۔ لیکن میں ہر وقت حاضر ہوں، میں نکاح ہونے سے پہلے تک سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بس تم ایک بار ہاں کر دو۔"

"یار میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی، مجھے ایک بار، صرف ایک بار ثانیہ کی ہاں مل جائے، چاہے معمولی سا اشارہ ہی کیوں نہ ہو۔"

"شادی کو دن کتنے رہ گئے ہیں، محض چار دن کے بعد شادی ہے۔ کب ملے گا تمہیں اشارہ؟"

اس سے پہلے کہ شعیب جواب دیتا، اس کا سیل فون بجا۔ اس نے اسکرین پر پھوپھو فاخرہ کے نمبر دیکھے تو کال ریسیو کر لی۔ پھوپھو نے کسی تمہید کے بنا تیزی سے کہا

"لو بیٹا، دو اپنی پھوپھو کو دعائیں، تمہارا آدھے سے زیادہ کام ہو گیا۔"

"مطلب، میں سمجھا نہیں۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا

"ارے مبارک ہو، ثانیہ کی شادی رُک گئی ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ اب ہوگی ہی نہیں۔" پھوپھو فاخرہ نے جوشیلے انداز میں کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا

"کیسے پھوپھو، یہ کیسے ہوا، اطلاع ٹھیک تو ہے نا؟"

"بالکل درست اطلاع ہے، یقین نہ آئے تو اپنی ماں سے پوچھ لو۔ ایک طرح سے جواب ہو گیا ہے۔" پھوپھو نے کہا

"پوری بات بتائیں۔" اس نے تجسس سے کہا

پھوپھو نے اپنے انداز میں ساری بات اسے بتا دی۔ وہ خوشگوار حیرت میں سب سنتا رہا۔ ساری بات سن کر بولا

Digitized by Google

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔" فون بند کر دینے کے بعد اس نے اپنے دوست سے کہا، "وہی ہوا نا، جس کے بارے میں تجھے کہہ رہا تھا۔"

"کیا ہوا؟"

اس پر اس نے وہ سب بتا دیا جو ابھی پھپھو نے اسے فون پر بتایا تھا۔ اس کا دوست حیرت سے ساری بات سنتا رہا، پھر سمجھ آجانے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا

"یار، اب اس سے بڑی کیا ہاں کیا ہوگی۔ مجھے تو یہی سمجھ آیا ہے کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ بس کوئی وجہ تھی جو یہ سب ہوا، میری صلاح یہی ہے کہ تم خود اس کی طرف بڑھو، اسے اپنی محبت جتاؤ، یہی وقت ہے۔"

"ہاں، یہی وقت ہے۔" شعیب نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنا سیل فون اٹھا لیا۔ پھر ثانیہ کے نمبر پش کرنے کے بعد رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ثانیہ کی منمناتی ہوئی آواز آئی تو شعیب نے کہا

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کیسی ہو؟ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ کوئی دکھ کوئی سوگ منانے کی بجائے، گھر سے نکلو، کسی پرسکون اور خوشگوار جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔ جس میں آج کے کسی واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہوگا۔"

"میں خود بہت ڈسٹرب ہوں، مجھے یہاں اکیلے میں بہت وحشت ہو رہی ہے۔ میں خود کسی کھلی جگہ جانا چاہتی ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ بہت پریشان بیٹھی ہوئی ہو

"ایسا کرو، تیار ہو جاؤ، میں تمہیں لینے کے لئے آرہا ہوں۔" شعیب نے تیزی سے کہا

"ہاں، پاپا، آفس چلے گئے ہیں، تم آجاؤ۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی

"میں اندر نہیں آؤں گا، بلکہ گیٹ ہی سے پک کر لوں گا۔ بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شعیب یوں خاموش ہو کر بیٹھ گیا جیسے یہ سب خواب میں ہو رہا ہو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ثانیہ یوں اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے گی یا پھر اس قدر اچھے انداز میں بات ہی کرے گی۔ وہ کچھ دیر ساکت سا بیٹھا رہا، پھر اس نے عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے لگا جیسے اس نے ثانیہ کو جیت لیا ہو۔

"کیا ہوا؟" اس کے دوست نے حیرت سے پوچھا

"یار، وہ میرے ساتھ کہیں باہر جانے پر راضی ہوگئی ہے۔ وہ میری کمپنی چاہ رہی ہے۔" شعیب نے یوں کہا جیسے ایک جہان فتح کر لیا ہو۔

"اب دیر مت کرو، جاؤ اسے لے لو جا کر۔" اس نے کہا تو شعیب اٹھتا چلا گیا۔

شعیب نے ثانیہ کے گھر کے قریب پہنچ کر اسے کال کی کہ میں پہنچ گیا ہوں، آجاؤ۔ وہ کچھ دیر بعد گیٹ پر آگئی۔ ثانیہ نے ہلکے کاسنی رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی گیسو ہوا سے اڑ رہے تھے۔ اس نے سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا، وہ آئی تو شعیب نے تیزی سے اتر کر اس کے لئے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا تو وہ بڑے سکون سے بیٹھ گئی۔ شعیب نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"کہاں چلیں؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے کار بڑھا دی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے کہا

"جہاں تمہارا دل چاہے۔"

"میرا دل بھی وہی چاہے گا، جو تمہارا دل چاہتا ہے۔" شعیب نے کچھ اس طرح دل سے کہا کہ ثانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بڑے مان سے بولی

"چلو، آج کا دن تمہارے نام، جو تم چاہو۔"

"اوکے۔" اس نے کہا اور سامنے دیکھتے ہوئے رفتار بڑھا دی۔ شعیب کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سب خواب میں دیکھ رہا ہے۔

وہ ریزارٹ میں موجود خوبصورت لان کے پرسکون گوشے میں آمنے سامنے سفید کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ثانیہ کا چہرہ گلابی گلابی لگ رہا تھا۔ ویسا بالکل نہیں تھا، جیسے چند دن پہلے اس نے ہسپتال میں دیکھا تھا۔ ابھی تک ان کے درمیان ذیشان کے شادی موخر ہو جانے کی بات نہیں ہوئی تھی۔ شعیب خود بھی ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی نہیں بات کرنا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان موسم، پرسکون جگہ اور خوشگوار ماحول بارے باتیں چلتی رہیں جو بلاشبہ بہت پھیکی اور اوپری اوپری سی تھیں۔ تبھی فریش جوس کا ایک سپ لے کر گلاس رکھتے ہوئے ثانیہ نے کہا

"مجھے یہ آزادی کے لمحے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

Digitized by Google

"آزادی؟ مطلب تمہیں کسی نے قید کیا ہوا تھا؟" شعیب نے ساری بات سمجھتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی

"پتہ نہیں کیوں، ذیشان سے منگنی ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں قید کرلی گئی ہوں۔ کوئی میرے اندر بیٹھا، مجھے مسلسل یہ باور کرا رہا ہے کہ میں قید ہونے جارہی ہوں۔ ذیشان ایسا نہیں ہے جیسا وہ دکھائی دے رہا ہے۔"

"کیا تم اسی لئے پریشان تھی؟ یہی وجہ تھی کہ تم ہسپتال جا پہنچی ہو؟" اس نے پوچھا

"میں کچھ نہیں جانتی، شاید میں نے بہت سوچا، یا جو کچھ بھی تھا، میں پاگل ہوگئی تھی۔" وہ الجھتے ہوئے بولی

"اب تو پرسکون ہو نا؟" اس نے پوچھا

"ہاں، بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی، تب شعیب نے سنجیدگی سے کہا

"دیکھو ثانیہ، ایسی بات نہیں ہے کہ ذیشان سے تمہاری منگنی ختم ہونا یا نہ ہونا میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مجھے یہ سب قبول ہی نہیں تھا۔ اور اب اگر تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں، تو اس کی وجہ یہ حالات نہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے اور اب دہرا رہا ہوں کہ مجھے تمہاری خوشی چاہئے۔ جیسے تم خوش رہو۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"یہ محبت بھی نہ جانے کیا چیز ہے؟" اس نے کہا اور طویل سانس لے کر رہ گئی

"میرے نزدیک محبت دوسرے کی خوشی میں خوش رہنے کا نام ہے اور بس۔" شعیب نے مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی

"یہ محبت زندگی بھی دیتی ہے اور مار بھی جاتی ہے۔"

"اچھا، چھوڑو ان باتوں کو، اب تم نے خود کو بالکل پرسکون رکھنا ہے۔ تم جو کرنا چاہو کرو۔ تم شاید امتحان دینا چاہتی تھی، سکون سے دو۔ بس صحت مند ہو جاؤ۔ باقی سارے مسئلے، سارے معاملے بعد کے ہیں۔" شعیب نے بہت جذباتی لہجے میں کہا تو وہ دھیرے سے مسکرادی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہنستے ہوئے بولی

"اتنے دن ہو گئے مجھے یوں پرہیزی کھانے کھاتے ہوئے، کوئی اچھا سا مصالحے دار کھانا نہیں کھلاؤ گے یا باتوں سے ٹرخاتے رہو گے۔"

شعیب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آؤ چلیں۔"

وہ دونوں اٹھ کر چل دیئے۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ فرزانہ اپنے بستر پر پڑی سوچوں میں گم تھی۔ اسے یہ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ ان چند ہی دنوں میں اس کے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔ کیا دنیا اس قدر ظالم ہے کہ جیسے ہی اس نے گھر سے قدم نکالا، وہ ظلم کا شکار ہوگئی۔ کس طرح اس کی خواہشوں اور محبوبیوں کو استعمال کیا گیا۔ ایک جھٹکے ہی میں اس سے سب کچھ چھین لیا گیا۔ کیا کبھی وہ اپنا بدلہ لے پائے گی یا یونہی سسک سسک کر اس دنیا سے چلی جائے گی؟ کیا کبھی یہ معاشرہ اسے عزت دے گا؟ یا یونہی کیڑے مکوڑوں کی مانند زندگی بسر کر کے مر جائے گی؟ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اسے کس طرح استعمال کرلیا گیا تھا۔ وہ اگر احتجاج بھی کرے گی تو اس کی آواز دبا دی جائے گی۔ اور اگر کسی نے اس کی کسی نے آواز سن بھی لی تو کوئی کان نہیں دھرے گا۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی۔ شاید اب وہ معاشرہ نہیں رہا، جس میں رحم دلی، ہمدردی یا بے غرض ہو کر دوسروں کی مدد کی جاتی ہے۔ وہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اس مخصوص دستک کو جانتی تھی۔ ایسی دستک صرف اسلم دیتا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ فرزانہ نے دیکھا کہ ایک بار تو ماں نے بھی دستک سنی لیکن پھر یوں سوئی ہوئی بن گئی، جیسے اس نے دستک سنی ہی نہ ہو۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ فرزانہ باہر جا کر اسلم سے بات کرے۔ اس نے تلخی سے سوچا، غربت کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔ عام حالات میں اگر کوئی لڑکا یوں رات گئے دروازے پر دستک دیتا، وہ چاہے اسلم ہی کیوں نہ ہوتا تو اس کی ماں شیرنی کی طرح گرج پڑتی۔ دوسری دستک پر وہ اٹھی اور دروازے تک گئی۔ تب تک اسلم نے تیسری بار دستک دے دی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اسلم ہی کھڑا تھا۔ وہ فوراً اندر آگیا۔ اس نے آتے ہی ہولے سے پوچھا

"خالہ کہاں ہے؟"

"وہ اندر سو رہی ہے۔" فرزانہ نے خمار آلود لہجے میں کہا تو اسلم نے کھسیانے سے انداز میں کہا

"وہ میں خالہ ہی کا پتہ کرنے آیا تھا۔ کیسی ہے وہ؟"

Digitized by Google

"ٹھیک ہے۔" اس نے مختصر سے کہا

"میں دراصل تمہارے لئے ایک چیز لایا تھا، سوچا ابھی تمہیں دے آؤں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سستا سا سیل فون نکال کر اس کی جانب بڑھا کر بولا، "یہ لو، میں تم سے باتیں کرلیا کروں گا۔"

وہ چند لمحے سیل فون کی طرف دیکھتی رہی پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولی

"کس لئے اسلم، ہم کس لئے باتیں کریں گے۔ ان باتوں کا انجام کیا ہے؟"

"دیکھو فرزانہ، میں نے اپنی امی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں وہ میری منگنی کرنا چاہتی ہے۔ میں وہاں نہیں کرنا چاہتا۔ وہ رُک گئی ہے۔ اب وہاں میری منگنی نہیں ہوگی۔ کچھ دنوں تک میں امی سے بات کرلوں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" اس نے تیز تیز انداز میں کہا

"اسلم، میں نے کہا ہے نا کہ جب تمہاری ماں مان جائے تب مجھ سے بات کرنا۔ میری شادی اب مسئلہ نہیں رہی۔ میں اب خود کمانے لگی ہوں۔ اور یاد رکھنا، جس جہیز کی وجہ سے تمہاری ماں نے مجھے حقارت سے دیکھا تھا، وہ میں چند ماہ میں بنا کر دکھاؤں گی۔" فرزانہ نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا

"تم ناراض ہو رہی ہو۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا نا، میں آ گیا ہوں نا تمہارے لئے۔ تم جو کہو گی وہی ہوگا۔" اسلم نے اسے منانے والے انداز میں کہا

"یہ راتوں کو چھپ چھپ کر ملنا، کیا یہ ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا تو وہ کھسیانے لہجے میں بولا

"ٹھیک تو نہیں ہے پر کیا کروں، مجھ سے رہا نہیں جاتا، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"تو جاؤ، اسی دن آنا، جب تمہاری اور میری منگنی ہو جائے۔" اس نے پھر اکتائے ہوئے انداز میں کہا

"نہیں فرزانہ، ایسے نہ کہو، میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بے چارگی سے بولا

"دیکھو، میں پھر کہہ رہی ہوں، اب شادی میرا مسئلہ نہیں ہے، کوئی بھی مجھ سے شادی کرلے گا۔ اب اگر میں تم سے شادی کرتی ہوں تو عزت کے لئے۔ احترام کے لئے، اس گھر میں مان کے لئے۔ کیونکہ تمہاری ماں نے مجھے ٹھکرایا ہوا ہے، میں کس منہ سے وہاں پر جاؤں گی؟" وہ پھر جذباتی انداز میں بولی تو اسلم نے تڑپ کر کہا

"میں دوں گا تمہیں عزت۔"

"ہاں تم ہی دے سکتے ہو۔ مجھے اب تم سے محبت نہیں، عزت چاہئے، وہ اگر دے سکتے ہو تو۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو اسلم نے محبت بھرے لہجے میں کہا

"دیکھو، اگر میری ماں نہ مانی تو میں تم سے کورٹ میرج کرلوں گا۔ لیکن شادی میں نے تم ہی سے کرنی ہے۔" اسلم نے جذباتی لہجے میں کہا

"نہیں اسلم، اس طرح عزت نہیں ملتی۔ جس طرح ہمارے معاشرے کا چلن ہے ویسے تم مجھے بیاہ کر لے جاؤ تب، تمہاری ماں آئے، مجھے دوبارہ مانگے، تم بارات لاؤ تب۔ فکر نہ کرو، میں بہت جہیز لاؤں گی۔" اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز تو کسی دوسری وجہ سے بھرائی تھی لیکن اسلم تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا

"تم بس میرا انتظار کرنا، میں تمہیں پورے مان کے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اب تم میری محبت ہی نہیں، میرا فرض بھی ہو۔"

"میں انتظار کرلوں گی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"یہ لو یہ فون لے لو، بات....." اسلم نے کہا

"نہیں، ابھی نہیں۔ اس دن لوں گی، جب تیری اور میری منگنی ہو گئی۔ اب تم جاؤ، کسی نے دیکھ لیا تو بہت باتیں بنیں گی۔" فرزانہ نے کہا تو اسلم اس کے چہرے پر دیکھتا ہوا واپس مڑا اور دروازہ پار کر کے چلا گیا۔ فرزانہ نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور کمرے میں آ گئی۔ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ یونہی سو رہی تھی، وہ بھی لیٹ گئی۔ اس نے جو سوچا تھا، اس کی ابتدا کر دی تھی۔ وہ اب اس دنیا کو بخشنے والی نہیں تھی۔

اس صبح جب وہ بیگم ثروت کے ہاں کام پر گئی تو اس کا من بوجھل تھا۔ رات اسلم سے کی ہوئی باتیں اس کے ذہن پر سوار تھیں۔ وہ ہی سوچتے ہوئے معمول کے کام کرتی رہی۔ اس وقت وہ بیگم ثروت اور پھپھو کو چائے دینے باہر کاریڈ کی طرف جا رہی تھی۔ تبھی دونوں کی باتیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ وہ ثانیہ کے ہاں جانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ بیگم ثروت الجھے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی

Digitized by Google

"مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا بہانہ کرکے جائیں گی اور انہیں کیا پوچھیں گی، کہیں وہ برا ہی نہ منا جائیں۔"

"بہانہ کیا کرنا، سیدھے جائیں گی اور ان سے پوچھ لیں گی کہ بھئی منگنی کیوں ٹوٹی، اس میں سمجھ نہ آنے والی کون سی بات ہے۔" پھوپھو نے تیز لہجے میں کہا

"کچی پوچھو نا فاخرہ، میرا تو دل کررہا ہے آج ہی طلعت سے کہہ دوں کہ ثانیہ مجھے دے دو۔" بیگم ثروت نے پرشوق لہجے میں کہا

"تو کیا ہوا کہہ دینا۔" پھوپھو سکون سے بولی

"نہیں اچھا نہیں لگتا۔ لیکن باتوں باتوں میں اسے احساس ضرور دلا دوں گی۔" اس نے کہا

فرزانہ کے قدم چند لمحے ہی رکے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سارا کھیل کیا کھیلا جارہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر جانے کو قدم اٹھاتی، اس نے فیصلہ کرلیا۔ تبھی اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکان پھیل گئی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

بیگم ثروت تیار ہونے کے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ پھوپھو وہیں باہر کاریڈور میں بیٹھی نجانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ فرزانہ پڑی، وہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پھوپھو کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ پھوپھو نے پھر اسے بیٹھنے کا شارہ کیا تو وہ فرش پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تبھی پھوپھو نے منمناتے ہوئے لہجے سے کہا

"فرزانہ وہ جو تو نے مجھے رقم دی تھی، وہ آج واپس لے جا، سنبھال کر رکھ لے اپنے پاس۔"

"میں کہاں رکھوں گی اسے، میری ماں نے کبھی اتنی رقم نہیں دیکھی، اگر اسے پتہ چل گیا تو مجھے بتانا پڑے گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔" فرزانہ یوں سکون سے بولی، جیسے اس نے یہ سب پہلے ہی سے سوچ رکھا ہو۔ پھوپھو نے درزیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، اس کے اندر خوف بھر آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فرزانہ کی کہی ہوئی ایک بات بھی سارا کھیل ختم کرسکتی ہے۔ انہی لمحوں میں پھوپھو کو احساس ہوگیا کہ اب اسے فرزانہ کو اہمیت دینا ہوگی۔ نجانے کیوں اسے فرزانہ انتہائی خطرناک لگی۔

پھوپھو نے چند لمحے فرزانہ کے چہرے پر دیکھا، پھر خوشگوار انداز میں رسان سے بولی

"ایک کام کرتی ہوں، میں یہ رقم صفیہ کو خود دے آتی ہوں، اسے کہوں گی کہ یہ تمہارے جہیز کے لئے رکھ لے۔"

"نہیں، سیدھے رقم مت دو، بلکہ ایک بڑا صندوق لو تھوڑے مزید پیسے ڈال کر اس میں چیزیں رکھو اور میری ماں کو دے کر آؤ۔ مزید یہ کہنا کہ اس میں فرزانہ کے جہیز کی چیزیں رکھتی چلی جانا۔" فرزانہ نے اسے سمجھایا تو ایک پھوپھو ایک لمحہ میں سمجھ گئی۔ وہ جانتی تھی، جب تک شعیب کی شادی نہیں ہو جاتی فرزانہ کو قابو کرکے رکھنا ہوگا۔ اس لئے ہنستے ہوئے بڑے پیار سے بولی

"چلی ٹھیک ہے، میں کل ہی جاکر یہ سب لیتی ہوں، اور پھر تمہارے گھر خود لے جاتی ہوں۔"

"بس یہی بات تھی؟" فرزانہ نے پوچھا

"ہاں، یہی بات تھی۔ مجھے اور ثروت کو ابھی کچھ دیر میں جانا ہے ادھر ثانیہ کے گھر، مجھے لگا شاید مجھے بعد میں وقت نہ ملے۔" پھوپھو نے وجہ سمجھائی

"ٹھیک ہے، جیسے پھوپھو آپ کہتی ہو، ویسے ہی کرلینا، میں اندر جاتی ہوں۔" یہ کہتے ہے وہ اٹھی اور اندر کی جانب چل دی۔ پھر یوں واپس پلٹی جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے پھوپھو سے مسکراتے ہوئے کہا، "اور ہاں، مجھے ایک سیل فون لے دیں، آپ سے بات کرنا پڑتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، آج ہی منگوا دیتی ہوں۔" پھوپھو نے کہا تو مڑ کر جانے لگی۔ پھوپھو اسے جاتا ہوا دیکھ کر بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس بار پھوپھو کو یقین ہوگیا تھا کہ فرزانہ خطرناک ہوگئی ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

اس وقت ثانیہ اپنے کمرے میں تھی۔ طلعت بیگم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر پورچ میں کار رکی اور کچھ ہی دیر بعد پھوپھو فاخرہ اور بیگم ثروت اندر آگئیں۔ طلعت بیگم انہیں دیکھتے ہی کھل گئی۔ وہ صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران ثانیہ بھی وہیں آگئی۔ وہ بھی ان سے بڑی خوشی کے ساتھ ملی۔ طلعت بیگم اپنی بیٹی کی خوشی دیکھ رہی تھی۔ تبھی اسے خیال آیا کہ چائے کے لئے کہہ دے۔ وہ اٹھنے لگی تو بیگم ثروت نے پوچھا

"کہاں جارہی ہو؟"

Digitized by Google

"ارے کسی کو کہوں، چائے لائے۔" وہ تیزی سے بولی
"ماما میں نے کہہ دیا ہے، ابھی لاتی ہے وہ۔" ثانیہ نے کہا اور اپنی ماما کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر مزید باتیں کرتے رہنے کے بعد پھوپھو ہی نے ہمت کر کے پوچھا
"اچھا طلعت مجھے یہ بتا، اپنی ثانیہ کی منگنی کیوں ٹوٹی؟"
طلعت بیگم اس پر کچھ دیر سوچتی رہی، پھر ثانیہ کی طرف دیکھ بولی
"شاید میری بیٹی کو وہ رشتہ پسند نہیں تھا۔"
"یہ تو نہ کہو تم، منگنی تو پسند سے کی تھی لیکن بات کیا ہوئی؟"
پھوپھو نے اپنی عادت سے مجبور طنزیہ انداز میں پوچھ لیا
"میں بتاتی ہوں پھوپھو۔" ثانیہ نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی، "منگنی میری ہی پسند سے ہوئی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے ذیشان سے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے شادی کے بعد وہ مجھے مار دے گا۔ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"
ثانیہ کے لہجے میں خوف تھا۔ اس پر سبھی خاموش ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ثروت بیگم نے کہا
"طلعت، پتہ نہیں تم میری بات کو کس انداز سے لو، مگر ثانیہ میرا خون ہے، مجھے اس کا دکھ ہے۔ کیوں نا ہم اسی تعلق کو پھر سے بحال کر لیں۔"
"سچی بات تو یہی ہے ثروت، میرا بھی یہی من چاہتا ہے۔ ہم دونوں بہنیں بھی ملتی رہیں گی اور میری بیٹی بھی تمہارے گھر میں رہے گی تو مجھے سکون رہے گا۔ لیکن......" وہ کہتے کہتے رک گئی
"میں جانتی ہوں، یہ مراد علی نہیں مان رہا۔ ہم دونوں گھروں میں وہی ہے نا جو اس رشتے سے انکار کر رہا ہے، باقی ثانیہ تو راضی ہے نا، کیوں بیٹی؟" ثروت بیگم نے براہ راست ثانیہ سے پوچھ لیا تو وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی
"ہاں، میں راضی ہوں۔"
اس کے یوں کہنے پر پھوپھو فاخرہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ثروت بیگم کو اس ناطے پر حقیقی خوشی ہوئی۔ اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔
"اب مسئلہ صرف مراد علی کا ہے۔ اسے کیسے منایا جائے؟" طلعت بیگم نے کہا تو پھوپھو بولی
"اری طلعت، جب سارے مان گئے ہیں تو وہ بھی مان جائے گا۔ تم اس سے بات کرو۔ اور جتنی جلدی ہو سکے، ہم یہ معاملہ نمٹا لیں۔"
"میں کرتی ہوں بات۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا، پھر ثانیہ کی طرف دیکھ کر بولی، "ثانیہ بیٹی پھر سوچ لو، اچھی طرح سوچ لو، مجھے پتہ ہے تمہارے پاپا کو قائل کرتے ہوئے مجھے کتنی مشکل ہو گی۔" طلعت نے کہا تو ثانیہ یوں بولی، جیسے پہلے ہی اس کے ذہن میں یہ بات ہو۔ اس نے کہا
"ماما، آپ بات کریں۔ میں شعیب ہی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"
ثانیہ کے یوں صاف لفظوں میں کہہ دینے کے بعد ان تینوں خواتین کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔

☆......☆......☆

شام ڈھلے جب فرزانہ گھر پہنچی تو اس کی ماں کمرے سے باہر صحن میں خوشی سے نہال بیٹھی ہوئی تھی۔ فرزانہ کو گھر میں کہیں سامان دکھائی نہیں دیا۔ اس نے لایا ہوا کھانا ایک طرف رکھا اور اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر خوشگوار لہجے میں بولی
"اماں آج تم بڑی خوش لگ رہی ہوں۔ لگتا ہے آج طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔"
"بیٹی، میری جو بیماری ہے نا، جب اس کا علاج ہو جائے تو میں صحت مند ہوں۔" اماں نے خوشی سے کہا
"ہوا کیا ہے؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا
"آج نا، وہ فاخرہ آئی تھی، وہی جو بیگم ثروت کی نند ہے۔" اماں نے کہا تو وہ خاموش رہی تب وہ کہتی چلی گئی، "وہ آج آئی تھی میرے پاس، اس بے چاری کی کوئی اولاد نہیں ہے نا۔ اس لئے مجھ سے مشورہ کرنے آئی تھی کہ میں کسی بچی کا جہیز دینا چاہتی ہوں۔ فرزانہ کو دے دوں؟ میں نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی کہ کیا کیا دینا چاہتی ہوں۔"
"پھر کیا کہا تم نے؟" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا تو اماں خوشی سے بولی
"یہی جو بچیوں کے دیتے ہیں۔ اب وہ کل صبح آئے گی میرے پاس، کہہ رہی تھی سارا سامان لے آؤں گی۔ چل تو کھانا لا۔"
یہ سب سن کر فرزانہ اٹھ گئی۔

✿......✿......✿

مراد علی سونے کے لئے اپنے بیڈ پر آ گیا تھا۔ وہ حسب

معمول بیڈ کی ایک جانب لیٹا میگزین دیکھ رہا تھا کہ طلعت بیگم آکر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا

"مراد، یہ میگزین چھوڑیں اور میری بات سنیں۔"

"خیر تو ہے نا بیگم؟" اس نے میگزین ایک جانب رکھتے ہوئے پوچھا

"خیر ہی ہے، میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔" طلعت بیگم نے پھر اسی لہجے میں کہا تو متجسس لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا

"بات کرو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"آپ نے یہ سوچا کہ اپنی ثانیہ ایک دم سے بیمار ہوگئی اور پھر اسی طرح اچانک ٹھیک بھی ہوگئی۔ یوں کس طرح ہوسکتا ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا

"بات تو تمہاری سوچنے والی ہے، میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر متفکر لہجے میں بولا، "تم کیا کہتی ہو؟"

"شاید مجھے بھی اس بات کا خیال نہ آتا، لیکن آج ثروت اور فاخرہ آئیں تھیں....." اس نے کہنا چاہا تو مراد علی نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"وہ پھر آگئیں، بیگم تم انہیں....." اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بات قطع کردی تو وہ غصے میں بولی

"پہلے بات سن لیا کریں۔"

"اچھا سناؤ۔" اس نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر کہا تو وہ بولی

"ان سے مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ اپنی ثانیہ اور شعیب کہیں ملے ہیں۔"

"وہ دونوں ملے ہیں؟" مراد علی نے حیرت سے پوچھا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو تو طلعت بیگم نے بتایا

"ہاں، میں نے ثانیہ سے بھی اس کی تصدیق کرلی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم، ایسا کیسے کرلیا اس نے؟" اس نے حیرت بھرے دکھ سے کہا تو وہ بولی

"بات یہ نہیں ہے کہ وہ ملے، مسئلہ یہ ہے کہ وہ کیوں ملے؟ آپ بھی یہی سوچ رہے ہیں، میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن میرے خیال میں اصل بات کچھ اور ہے؟"

"ہاں یہ تو ہے؟ سامنے کی بات ہے۔" اس نے کہا

"میرے خیال میں ثانیہ کے دل سے شعیب کبھی نکلا ہی نہیں تھا، یہ جو ذیشان کے ساتھ اس نے منگنی کی۔ یہ صرف ایک دکھاوا تھا۔ وہ اب تک شعیب ہی کے بارے میں سوچتی ہے۔" طلعت بیگم نے کہا تو مراد علی بے بس انداز میں بولا

"ایسا کیوں کیا اس نے وہ ہمیں پہلے ہی بتا دیتی۔ اتنا کچھ تو نہ ہوتا۔"

"ہماری تو دشمنی چل رہی ہے نا، شعیب لوگوں کے ساتھ، پھر وہ بے چاری کیا کرتی، اس نے ہماری خوشی دیکھی، لیکن ہمارا یہی دعویٰ رہا کہ ہم ثانیہ کی خوشی چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس نے ہمیں احساس دلایا ہے۔ اس میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی تو مراد علی نے دکھ سے کہا

"ایک بار تو کہتی، ہم اتنا آگے تک نہ جاتے..... خیر، اب کیا کہتی ہے وہ؟"

"میری اس معاملے میں اس سے ابھی کوئی بات نہیں ہوئی، میں پہلے آپ سے بات کرنا چاہتی تھی، تاکہ آپ کی رائے لے سکوں۔" اس نے کہا

"میری رائے کیا خاک حیثیت رکھتی ہے۔" اس نے ناراضگی سے کہا

"ویسے میرے خیال میں ثانیہ نے شعیب سے مل کر ہمیں ایک پیغام دے دیا ہے، ہمیں اسی پر سوچنا چاہئے۔" وہ بولی

"کیا سوچنا چاہئے، وہ بھی بتا دو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا

"دیکھیں اس میں غصے اور ناراضگی سے زیادہ ٹھنڈے دماغ سے سوچنے والی بات ہے۔ اگر ہم ثانیہ کی خوشی چاہتے ہیں تو اس کی خوشی شعیب ہی ہے۔ یہاں پر اگر ہم نے منفی سوچا تو بات بگڑ جائے گی۔" بیگم طلعت نے سمجھاتے ہوئے کہا

"بیگم مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھے ایک دو دن دو سوچنے کے لئے۔ اس دوران تم بھی ثانیہ سے اچھی طرح تصدیق کرلو۔ ہم پھر بات کریں گے اس پر۔" مراد علی نے حتمی لہجے میں کہا اور لیٹ گیا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے یہ سب سن کر بے حد افسوس ہوا ہو۔ طلعت بیگم کچھ دیر بیٹھی رہی پھر وہ بھی لیٹ گئی۔ ان کے لئے ایک نیا امتحان در پیش تھا۔

Digitized by Google

❁ ..... ❁ ..... ❁

اس وقت بیگم ثروت اور پھوپھو فاخرہ لاؤنج میں تھیں۔ ابھی تک فرزانہ کام پر نہیں آئی تھی۔ شعیب تیار ہو کر آفس جا چکا تھا

"ارے یہ فرزانہ ابھی تک نہیں پہنچی، خیر ہے اُسے؟" بیگم ثروت نے یونہی عام سے لہجے میں پوچھا تو پھوپھو بولی

"آتی ہوگی کہیں نہ کہیں۔ ویسے ہے بڑی شوقین مزاج، تنخواہ کیا ملنے لگی، فوراً فون لے لیا ہے اس لڑکی نے۔"

"ارے واہ۔ نوجوان ہے نا، اس کا بھی دل کرتا ہوگا نئی نئی چیزیں لینے کو۔" بیگم ثروت نے کہا تو پھوپھو فاخرہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر بولی

"آج آتی ہے نا تو اس سے لیتی ہوں نمبر، یہ کہتے ہوئے وہ سوچ کر بولی، "ارے ثروت، فون سے یاد آیا، تم ذرا فون تو کروا اپنی طلعت کو، پوچھو تو سہی اس نے مراد علی سے بات کی بھی یا نہیں؟"

"ہاں، ابھی کرتی ہوں۔" بیگم ثروت نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر اس نے نمبر پش کیے۔ کچھ دیر بعد ان کا رابطہ ہو گیا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

"ہاں طلعت، کیا تمہاری بات ہوئی مراد علی سے، کیا کہا اس نے؟"

"ہاں بات تو ہو گئی، مگر یہی کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا۔" طلعت نے بتایا تو ثروت بولی

"ہاں، سوچنا تو ہوگا، ایک بار تو اسے شاک ہی لگا ہوگا نا۔"

"ہاں، ایسا ہی تھا کچھ، جو بھی کوئی بات ہوتی ہے نا تو میں بتاؤں گی۔ ویسے میں ایک بار ثانیہ سے بھی حتمی بات کروں گی۔ یہ کوئی گڈے گڈی کا کھیل تھوڑی ہے۔" اس نے کہا تو ثروت نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا

"بالکل، ہر طرح سے تصدیق کرنا۔ پھر ہی کچھ بھی طے ہوگا۔"

وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں، پھر فون بند کر دیا۔ وہ دونوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ فرزانہ بھی آ گئی۔ اس نے اپنے معمول کے کام شروع کر دیئے۔ پھوپھو فاخرہ اس کے پاس جا کر کام بتاتی رہی۔ پھر دھیمے سے پوچھا

"تمہیں سامان پسند آیا؟"

"ہاں، سب اچھا ہے۔ لیکن ابھی تھوڑا ہے، اب اسے پورا تو کرنا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو پھوپھو کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

"ہاں، دھیرے دھیرے سب ہو جائے گا۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔"

"نہیں میں نے اب فکر کرنا چھوڑ دیا ہے، اب اگر فکر ہو گی تو دوسروں کو۔" اس نے دبے دبے لفظوں میں اپنی بات کہہ دی۔ پھوپھو فاخرہ نے چند لمحے سوچا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھوپھو فاخرہ جب سے ثانیہ کے گھر سے آئی تھی، اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب ثانیہ کی شادی شعیب سے ہو جائے گی۔ اب صرف مراد علی کا مسئلہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک بار بابا کرامت شاہ کے پاس جائے گی اور یہ معاملہ بھی حل ہو جائے گا۔ وہ تو اسی وقت جانے کو بے تاب ہو گئی تھی لیکن اسے وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ آج وہ ہر حال میں جانے والی تھی۔ شادی ہو جانے میں یہی ایک رکاوٹ ہے۔ وہی دور ہو گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کچھ دیر ادھر اُدھر پھرتی رہی پھر بابا کرامت شاہ کے گھر کی جانب چل دی۔

ٹیکسی سے اتر کر وہ سیدھے بابا کرامت کے گھر میں گھس گئی۔ اس دن وہاں پر کافی رش تھا۔ لیکن اسے ایسے کسی رش کی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہاں کے امور دیکھنے والی خاتون کی نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی۔ وہ اس کے پاس آ گئی۔ دونوں اس وقت تک باتیں کرتی رہیں، جب تک اندر گئی عورت باہر نہیں آ گئی۔ کچھ دیر بعد پھوپھو فاخرہ بڑے اہتمام سے بابا کرامت شاہ کے سامنے بیٹھی تھی۔

"ارے آؤ فاخرہ، کچھ زیادہ دنوں بعد نہیں آئی ہو کیا؟"

"بابا جی، بس اسی اُلجھن میں پھنسی ہوئی ہوں۔ ایسا ہے کہ کوئی معاملہ سرے لگ ہی نہیں رہا۔" پھوپھو نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

"اب کیا ہو گیا، اس لڑکی کی منگنی تو ٹوٹ گئی، اب کیا ہے؟" بابا کرامت نے پوچھا تو وہ بولی

"بات تو تب ختم ہو گی نا، جب شادی ہو گی۔ ہم رشتہ مانگ رہے ہیں، لڑکی کا باپ مان نہیں رہا۔ اسی اُلجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب تو بس جلدی سے ان کی شادی کروا دے، سارا اُلجھاؤ ختم ہو۔" پھوپھو فاخرہ نے رسان سے کہا

Digitized by Google

"کر دیتے ہیں یہ بھی کام..... جما دیتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں۔" بابا نے کہا

"مجھے بابا جی فیس بتاؤ، جو مانگو گے دوں گی، بولو۔" پھوپھو نے کہا تو بابا نے اپنے لبوں پر خباثت لاتے ہوئے کہا

"وہی لڑکی ایک بار لے آؤ، تیرا کام ہو جائے گا۔"

"نا بابا، اس سے تو مجھے بڑا ڈر لگنے لگا ہے۔ بڑا گھور کے دیکھتی ہے۔" پھوپھو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"ارے اس سے کیا ڈرتی ہے، میرا پیغام دینا بغور آ جائے گی، تجھے نہیں پتہ، وہ بڑی جلالی ہو گئی ہے۔ میری موکل جو رہ چکی ہے۔" بابا نے ہنستے ہوئے کہا

"اسے کیا لانا ضروری ہے بابا؟" اس نے پوچھا

"ارے ہاں فاخرہ، اس پر عمل ہوتا ہے نا، تو کام فوری ہو جاتا ہے، دیکھا نہیں ہے تم نے، ہتھیلی پر سرسوں جمی تھی، ہتھیلی پر....." بابا کرامت نے آنکھیں گھماتے ہوئے جلالی انداز میں کہا

"دیکھیں بابا جی میں کوشش کرتی ہوں، اگر مان گئی تو....." اس نے ڈرتے ڈرتے ہوئے کہا

"کہا نا تم میرا پیغام پہنچا دو۔ وہ خود ہی آ جائے گی۔ اب جاؤ، باہر بڑا رش لگا ہوا ہے۔" بابا کرامت نے خالص کاروباری انداز میں کہا تو وہ اٹھ گئی۔

پھوپھو فاخرہ کے لئے سب سے مشکل مرحلہ، فرزانہ سے بات کرنے کا تھا۔ وہ واپس آ کر بہت دیر تک اس سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ سہ پہر کے بعد اس کا آمنا سامنا ہو گا۔

"فرزانہ، تمہیں مزید کون سا سامان چاہئے۔" پھوپھو فاخرہ نے ملائمیت بھرے لہجے میں پوچھا

"وہ میں بتا دوں گی، ابھی پہلے والا تو ٹھکانے لگا لوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی

"اچھا، وہ تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔" پھوپھو نے ہچکچاتے ہوئے کہا

"کون سا پیغام، اور کس کا؟" اس نے پوچھا تو پھوپھو فاخرہ نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیمے سے کہا

"وہ بابا کرامت شاہ، تمہیں بلا رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ اس کا عمل بڑا جلالی ہے۔"

"کب جانا ہے؟" فرزانہ نے سوچتے ہوئے کہا

"چاہئے آج چلی جاؤ۔" پھوپھو فاخرہ نے تیزی سے کہا

"نہیں آج تو نہیں، کل رات چلی جاؤں گی۔ کل اماں کو وہی بتا آؤں گی کہ پھوپھو فاخرہ نے روک لیا تھا۔"

"ہاں، یہی کہہ دینا۔" وہ تیزی سے بولی

"اب میں جاؤں۔" فرزانہ نے پوچھا

"ہاں ہاں، جاؤ۔" پھوپھو فاخرہ نے کہا تو فرزانہ اپنے گھر جانے کے لئے تیاری کرنے لگی۔ پھوپھو فاخرہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ بلاشبہ وہ اس کی کمزوری سمجھ چکی ہے۔ اب تو شادی کے بعد بھی اس کا منہ بند رکھنا ہو گا۔ خیر، ایک بار شادی ہو جائے، اس کا بھی میں کام کر ہی دوں گی۔ یہ کیا جانے کس سے پالا پڑا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

ذیشان اپنے گھر میں کے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی کرسی پر ڈاکٹر ظہیر براجمان تھا۔ دونوں فریش جوش پی رہے تھے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا

"اچھا یار وہ ثانیہ والی مسٹری سمجھ میں آئی ہے یا نہیں؟"

"نہیں، بالکل بھی نہیں سمجھ میں نہیں آئی، میں آج تک حیران ہوں، میرے ساتھ ہوا کیا؟" ذیشان نے یوں کہا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا

"حیرت تو مجھے بھی ہے۔ دیکھو، جب وہ پہلی بار ہسپتال لائی گئی تھی تو بلاشبہ وہ بے ہوش تھی، میں اسے قطعاً اداکارہ نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی وہ اداکارہ تھی۔ وہ جب بھی آئی تھی، اس کی حالت خراب ہوتی تھی۔ لیکن میرے لئے حیرت والی بات یہی تھی کہ اس کے تمام ٹیسٹ بالکل نارمل ہوتے تھے، یہاں تک کہ اس کا بلڈ پریشر بھی نارمل تھا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ بالکل نارمل تھی، اور اب بھی وہ نارمل ہی ہے۔" ڈاکٹر ظہیر نے یقین بھرے لہجے میں کہا

"میں جانتا ہوں ظہیر، تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ثانیہ کے سارے ٹیسٹ نارمل تھے۔ لیکن بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی؟ کہاں ایسا کچھ ہوا کہ ثانیہ بالکل ہی بدل کر رہ گئی۔ مجھے سے کوئی غلطی ہوئی، کسی دوسرے نے کچھ کہا، کیا ہوا؟" اس نے متفکر لہجے میں کہا

"بالکل ٹھیک، وہی پوائنٹ تلاش کرنے کی ضرورت ہے، جہاں ثانیہ بدلی۔" ڈاکٹر ظہیر نے سر ہلاتے ہوئے کہا

Digitized by Google

"دیکھو، میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرے ساتھ محبت نہیں کرتی تھی یا میں یہ سمجھ لوں کہ وہ اب تک میرے ساتھ ڈرامہ کرتی آ ئی ہے۔ وہ بڑی معصوم اور سادہ سی لڑکی ہے۔ یونیورسٹی کا پورا دور ہم نے ساتھ گزارا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو بندے کو پتہ چل جاتا ہے، ورنہ احساس ہی ہو جاتا ہے۔ ایسا قطعاً نہیں تھا۔" وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا

"جہاں تک میرا خیال ہے، جو کچھ بھی ہوا۔ چاہے وہ ڈرامہ تھا، ڈر خوف یا جو بھی تھا، وہ منگنی کے بعد ہوا۔ اس سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔" ڈاکٹر ظہیر دنیا سے متوجہ کرتے ہوئے کہا

"بالکل، یہ ٹھیک ہے، کیا ہمیں پتہ نہیں کرنا چاہئے کہ آخر اس کے ساتھ کیا ہوا؟" ذیشان نے سوچتے ہوئے پوچھا

"میرے خیال میں تم اسے بھول جاؤ اب، وہ تمہارے ہاتھ آنے والی نہیں، ورنہ اتنا سب کچھ نہ ہوتا۔" ڈاکٹر ظہیر نے اپنا خیال ظاہر کیا

"ظہیر یار مان لیا وہ بے وفا ہے، لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ فرض کریں وہ بے وفا ہی سہی لیکن مجھے اس سے محبت ہے۔ میں اس کا کبھی بھی برا نہیں چاہوں گا۔ ہمیں کم از کم اس کی وجہ تو معلوم کرنی چاہئے۔" اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا

"دیکھو، اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ دے، کہیں بھی وہ مدد کی طلبگار ہو، تو بلاشبہ اس کے بارے تحقیق کی جائے، پتہ چلایا جائے کہ آخر وجہ کیا ہے؟ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اب اسے فون بھی کرو گے تو وہ تمہارا فون نہیں سنے گی اور اگر سنے گی تو تمہیں ٹال جائے گی۔" ڈاکٹر ظہیر نے اعتماد سے کہا

"اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" ذیشان نے پوچھا

"یار مجھے لگتا ہے وہ اندر سے بدلی ہے، اس کا تمہارے ساتھ رویہ بدلا ہے، تم سے ہی تمہارے ساتھ جڑے سبھی لوگوں سے۔" اس نے اپنی دلیل دی

"لیکن ظہیر، اچانک، یہ اچانک ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے انکار کرتے ہوئے کہا

"اچھا پھر کرو اسے فون۔" ڈاکٹر ظہیر نے کہا

"وہ میں کر لیتا ہوں۔ لیکن ٹال جانے کی وجہ تو کوئی نہ کوئی ہو گی نا۔" اس نے دلیل دی

"تم یہ مان کیوں نہیں لیتے کہ وہ اپنے کزن کو چاہتی تھی، بس انجانے میں تمہارے قریب آ گئی یا پھر یہی وجہ ہو کہ گھر والے....." اس نے کہنا چاہا تو ذیشان نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا

"نہیں، میں یہ وجہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی میرے اتنے قریب نہ آتی۔"

"خیر تم فون کرو۔ اسے کہیں بلاؤ، اس سے بات کرتے ہیں، شاید کوئی وجہ مل جائے، کوئی اشارہ، کوئی اندازہ ہو جائے۔" ڈاکٹر ظہیر نے صلاح دی۔

"میں کرتا ہوں اس سے بات۔" یہ کہہ کر اس نے ثانیہ کا نمبر پش کر دیا۔ کچھ دیر تک کال جاتی رہی پھر اس نے کال رسید کر لی تو ذیشان نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا

"ہیلو ثانیہ کیسی ہو؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔" اس نے عام سے انداز میں کہا

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ بہت دن ہو گئے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے؟" ذیشان نے پوچھا تو بیزار لہجے میں بولی

"بس میں اپنے امتحان میں بزی ہوں۔ صرف دو پیپرز رہ گئے ہیں۔"

"اچھا، کسی دن آؤ، بیٹھ کر گپ شپ لگائیں، کہیں کھانا کھائیں۔" اس نے کہا

"یہ میں پیپرز دے دوں پھر فراغت ہی ہو گی۔ پھر بیٹھتے ہیں کسی دن۔" اس نے بڑے سکون سے بہانہ بنا دیا۔

"چلیں ایسا کر لیتے ہیں۔ ویسے تم تھوڑا سا وقت نکال کر مجھے گھر بھی بلا سکتی ہو۔" اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو ہنستے ہوئے بولی

"وہ تو کوئی بات نہیں اب جب چاہیں آ جائیں۔ آپ کو منع تو نہیں کیا۔"

"اوکے، میں پھر کرتا ہوں تمہیں فون۔" اس نے کہا

"اوکے۔" یہ کہتے ہی ثانیہ نے کال بھی بند کر دی۔ ذیشان چند لمحے خود پر قابو پاتا رہا، پھر روہانسا ہوتے ہوئے بولا

"یار تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ میرا دل نہیں مان رہا؟"

"میں تمہاری صورت حال کو سمجھتا ہوں۔ میرے پاس ایک اور ذریعہ بھی ہے، میں کروں گا پتہ۔" ڈاکٹر ظہیر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا

"وہ کون سا؟" ذیشان نے اشتیاق سے پوچھا

"میں تمہیں بتاؤں گا، فی الحال اٹھو، میرے ساتھ چلو

Digitized by Google

۔" یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ذیشان متجسس سا اس کے ساتھ چل دیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

شہر پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھر روشن ہونے لگے تھے۔ مغربی افق نارنجی ہو رہا تھا۔ ایسے میں بابا کرامت کے گھر کے سامنے رکشہ رکا اور اس میں سے فرزانہ باہر آ گئی۔ وہ ایک کالی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ باقی آدھا گلابی چہرہ اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ اس وقت برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ آگے بڑے سارے صحن میں چند نشئی قسم کے لوگ وائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان آگ جل رہی تھی۔ وہ اپنی مستی میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ برآمدے سے آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا اس کی جانب لپکا۔ اس نے قریب آ کر پوچھا

"کون ہو آپ؟ کدھر جا رہی ہو؟"

"مجھے بابا جی سے ملنا ہے۔" اس نے دھیمے سے کہا

"وہ تو ابھی آرام کر رہے ہیں، آپ ان سے صبح ملنا۔" اس نوجوان نے کہا، اتنے میں اندر کمرے سے وہی ادھیڑ عمر عورت باہر آ کر گھمبیر لہجے میں بولی

"آنے دے آنے دے۔"

اس نوجوان نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت اسے لے کر ایک سجے ہوئے کمرے میں لے گئی۔ جہاں ایک صوفے پر بابا کرامت نیم دراز تھا۔

"ارے واہ، تم آ بھی گئی ہو۔ دیر نہیں کر دی ذرا۔" بابا نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو وہ بولی

"بس گھر سے نکلتے ہوئے دیر ہو گئی۔"

"چلو کوئی بات نہیں ہے۔ جاؤ، جلدی سے عمل کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اس نے شاہانہ انداز میں کہا تو فرزانہ بولی

"جی میں ابھی چلی جاتی ہوں، ایک بات کرنا تھی آپ سے؟"

"بولو، بولو، کیا بات ہے؟" اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"میری شادی اسلم سے کب ہو گی، ان کی طرف سے کوئی نہیں آیا، آپ نے جو را کھ دی تھی، وہ تو کب کی ختم بھی ہو چکی۔" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا

"ایسا ہوا، ایسا ہو نہیں سکتا۔" اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"اس کی طرف سے اب تک کوئی نہیں آیا۔" اس نے دوبارہ دہرا دیا

"ہونے کو تو اسی ہفتے میں تمہاری منگنی ہو جائے، لیکن تمہیں جلدی کیا ہے؟ ابھی کچھ عرصہ عیش کر لو۔" بابا کرامت نے پوری طرح خباثت سے کہا

"بابا، جب ذہن میں ہی سکون نہ ہو تو کاہے کی عیش۔" اس نے بیزاری سے کہا

"ہاں، بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے، بس آج رات کے عمل میں یہ کام بھی ہو ہی جائے گا؟" اس نے پھر شاہانہ انداز میں کہا۔ لگتا تھا، اس رات وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا یا پھر فرزانہ کو دیکھ کر اس کا موڈ بن گیا تھا۔

اس رات بابا کرامت شاہ نے سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ایک ہال نما لمبے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اُپلوں کا ڈھیر سامنے پڑا ہوا تھا، جس میں سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد فرش پر سیاہ رنگ کا ایک دائرہ بنایا ہوا تھا۔ دھواں روشن دانوں سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اونچی اونچی آواز میں یوں بے سروپا آوازیں نکالنا شروع کر دیں جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ ایسے میں مدہوش سی فرزانہ کمرے میں دھکیل دی گئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔ اس کے بدن پر صرف ایک سیاہ چادر تھی، جس نے اس کے بدن کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ وحشت ناک انداز میں دیکھتی ہوئی دائرے میں آ گئی۔ بابے کرامت نے اسے تھام لیا اور وہ جھولتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بابا زور زور سے منتر پڑھنے لگا تبھی اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا، دوسرے ہاتھ میں چھری اٹھا کر لہرانے لگا۔ فرزانہ مدہوش سی اس کے سامنے بیٹھی ایک ٹک اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ بابا کرامت دونوں ہاتھ آمنے سامنے کرتے ہوئے لہراتا رہا، ساتھ میں زور زور سے منتر پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ہتھیلی پر چھری پھیر دی۔ سرخ سرخ لہو بہنے لگا تو اس نے اپنی ہتھیلی فرزانہ پر چھڑک دی۔ لہو کے قطرے جیسے ہی اس پر گرے وہ یوں چیخ اٹھی جیسے کسی

Digitized by Google

نے اس پر انگارے پھینک دیئے ہوں۔ دونوں چیخ رہے تھے۔ فرزانہ تڑپ رہی تھی۔ تبھی بابے کرامت نے منتر پڑھنا بند کر دیا۔ فرزانہ پرسکون ہونے لگی۔ بابے کرامت نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ فرزانہ جب تڑپ رہی تھی، تب اس کی سیاہ چادر سرک گئی تھی۔ دھویں کے بادل گہرے ہونے لگے اور اس ہال نما کمرے میں خباثت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔

❁ ❁ ❁

طلعت بیگم صبح صبح لان میں ٹہل رہی تھی۔ سورج کی روشنی ابھی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ وہ لان کے ایک سرے سے چلتی ہوئی دوسرے سرے تک پہنچ جاتی، پھر پلٹ کر پہلے سرے تک آجاتی۔ موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ ایسے میں اسے مراد علی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ تبھی بیگم طلعت نے خوش گوار لہجے میں کہا

"مراد، آج موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے نا۔"

"ہاں، اچھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لی، پھر بولا، "میں تم سے رات بات نہیں کر سکا۔"

"کون سی بات؟" اس نے عام سے لہجے میں پوچھا

"وہ ثانیہ کے بارے میں جو تم نے مجھے کہا تھا۔" اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا تو بیگم طلعت نے سنجیدگی سے پوچھا

"ہاں، پھر کیا سوچا آپ نے؟"

"میں نے تو جو سوچنا تھا، وہ سوچ لیا ہے، لیکن پہلے ایک بات بتاؤ، کیا تم نے ثانیہ سے اچھی طرح بات کر لی ہے، وہ اس رشتے پر راضی ہے؟"

"میرے لئے زیادہ اہم یہ ہے کہ آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔ آپ دونوں باپ بیٹی نے فیصلہ کیا اور صرف مجھے بتایا۔ میں نے آپ دونوں کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اب بھی نہیں کروں گی۔ میرے خیال میں یہ بات خود ثانیہ سے کرنی چاہئے۔" بیگم طلعت نے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ دھیمے سے بولا

"نہیں تب صورت حال کچھ اور تھی، اب معاملہ دوسرا ہے۔"

"اس سے تو میں بات کر لوں گی، مجھے آپ بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا

"یہی کہ اگر ثانیہ چاہتی ہے کہ اس کی شادی شعیب سے ہو جائے تو اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" مراد علی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا

"کیا آپ اس رشتے پر خوش نہیں ہیں؟" اس نے پوچھا

"سچی بات تو یہ ہے طلعت، میرا دل نہیں مانتا، وہ شخص جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا، وہ میرا داماد بن جائے۔ جنہیں میں اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، وہ میرے سمدھی بن جائیں۔" اس نے صاف لفظوں میں کہا

"میری بہن کے بارے میں آپ کی یہ نفرت میری سمجھ سے بالاتر ہے، حالانکہ یہ وہی عورت ہے، جس نے آپ کی ہر طرح سے مدد کی۔ اس کے شوہر نے آپ کو....." وہ کہہ رہی تھی کہ مراد علی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

"انہوں نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا، میں وہاں کام کرتا تھا، میں نے یہ سب اپنی محنت سے بنایا، لیکن یہ وقت اب ان باتوں کا نہیں ہے۔ مسئلہ ثانیہ کے مستقبل کا ہے، کیا وہ اس گھر میں رہ پائے گی؟" اس نے پوچھا

"کیا کمی ہے ان کے ہاں، ایک اکلوتا بیٹا ہے۔ جو خود اپنے پیروں پر یوں کھڑا ہوا کہ اب آپ سے کہیں زیادہ اثاثے رکھتا ہے۔ ثروت خود اتنی جائیداد والی ہے کہ اسے شعیب کے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑنی۔ اب یہ ثانیہ کا کام ہوگا نا کہ وہ اپنے گھر کو کس طرح بناتی ہے۔ میرے خیال میں سوائے آپ کی نفرت کے اس گھرانے میں کوئی کمی نہیں۔" بیگم طلعت نے سچ بات کہی تو وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تک یونہی خاموش رہنے کے بعد بولا

"تم ثانیہ کی مرضی اچھی طرح معلوم کرو، پھر حتمی فیصلہ کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں بات کر لیتی ہوں، لیکن آپ نے تو اپنا ارادہ بتایا ہی نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی

"میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ جو ثانیہ کی مرضی، وہی میں چاہتا ہوں۔" اس نے کہا تو وہ بولی

"چلیں ٹھیک ہے، میں آج ہی بات کرتی ہوں۔ شام تک آپ کو بتا دوں گی۔ اب تو اس کے پیپر بھی بس ختم ہی ہو گئے ہیں۔ ایک آدھ دن رہتا ہے شاید۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کہا اور ٹہلتا ہوا واپس اندر

Digitized by Google

کی جانب بڑھ گیا۔ بیگم طلعت بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

دن کا چڑھ آیا تھا۔ بیگم طلعت لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے میں ثانیہ چائے کا مگ تھامے وہیں آگئی۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تب ماما نے اس کی متورم آنکھیں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"اب جاگی ہو؟"

"نہیں، میں تو صبح سویرے اٹھ گئی تھی۔ تب سے پڑھ رہی تھی۔ کل میرا آخری پیپر ہے نا۔" اس نے بتایا پھر ایک سپ لے کر بولی، "میں نے دیکھا تھا، آپ اور پاپا لان میں ٹہل رہے تھے۔"

"ٹہل کیا رہے تھے، تیرے بارے ہی بات کر رہے تھے۔" بیگم طلعت نے کہا اور پھر ساری بات اسے بتادی۔

"ماما، میں تو شادی شعیب ہی سے کروں گی۔ ذیشان میرے دل ہی سے اتر گیا ہے۔" ثانیہ سوچتے ہوئے دکھی لہجے میں بولی

"مجھے تو نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ وہ تمہارے دل سے اترا کیوں؟" اس نے تیزی سے پوچھا

"ذیشان جو سامنے ہے، وہ ویسا نہیں ہے۔ خیر آپ اس کا ذکر ہی مت کریں۔ آپ پاپا کو بتادیں، میرا یہی فیصلہ ہے کہ میں شعیب ہی سے شادی کروں گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا اور چائے کا ایک لمبا سپ لے لیا۔

"ٹھیک ہے بیٹی جیسا تم چاہو۔" طلعت بیگم نے کہا اور سوچ میں پڑ گئی۔ اب اس پر بہت بھاری ذمہ داری پڑنے والی تھی۔

شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ مراد علی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ طلعت بیگم اس کے پاس جا بیٹھی اور پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے ثانیہ سے بات ہونے اور اس کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ مراد علی نے سنا اور کافی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا

"بس پھر اب سوچنا کیا ہے۔ شعیب کے ساتھ ہی کر دیتے ہیں شادی، تم کہو ثروت سے وہ باقاعدہ رشتہ مانگنے آ جائے۔"

"میں کہہ دیتی ہوں۔" طلعت بیگم نے کہا۔

ان دنوں میں خاموشی چھا گئی۔ بیٹی کی مرضی سے شادی کر دینے کا فیصلہ شاید ایسا تھا، جس پر نہ انہیں خوشی ہوئی اور نہ ہی دکھ۔ بس ایک عجیب سی گومگو کی کیفیت تھی، جسے وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

فرزانہ شام کے وقت گھر میں داخل ہوئی تو رضیہ صحن میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا اپنی ماں کو تھمایا اور سلام کر کے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ رضیہ نے کھانا ایک طرف رکھ کر اپنی بیٹی سے کہا

"آج آئی تھی، اسلم کی ماں اور سارا سامان دیکھ کر گئی ہے۔"

"اچھا کب آئی تھی؟" فرزانہ نے بے دلی سے پوچھا

"یہی تیرے جاتے ہی آ گئی۔ کسی نے بتا دیا تھا اسے کہ اتنا سامان آیا ہے، اس تو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک سارا سامان دیکھ نہیں لیا۔ اس کی تو آنکھیں ہی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔" رضیہ نے بڑے جوش سے بتایا

"پوچھا نہیں کہ یہ سامان کہاں سے آیا؟" فرزانہ نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ بولی

"کوئی ایک بار پوچھا، میں نے اسے یہی بتایا کہ جہاں پر پہلے میں کام کرتی تھی، انہی جگہوں پر کام کرتے جاتی ہے فرزانہ، ان میں ایک گھر تو اتنا اچھا ہے کہ مجھے کہہ دیا کہ وہ انہی کے ہاں کام کرے کی کسی دوسرے گھر میں نہیں۔ وہ اتنے دریا دل لوگ ہیں کہ فرزانہ کے جہیز کا سامان بھی دے رہے ہیں۔ ابھی تو آدھا سامان دیا ہے صاحب لوگوں نے، ابھی مزید دینے کا کہا ہے۔"

"اور کیا کہا اس نے؟" فرزانہ نے پوچھا

"کہنا کیا تھا، یہی ایک جہیز کی کمی تھی، تب اس کا چہرہ دیکھنے والا تھا جب میں نے اسے جتایا۔ کہنے لگی غلطی ہو گئی میں نے منگنی توڑی۔ فرزانہ اتنی اچھی ہے کہ میرا تو دل چاہتا ہے اسے ہی اپنی بہو بنا دوں۔" رضیہ نے بتایا

"اسے میرا نہیں سامان دیکھ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔" فرزانہ نے کہا تو رضیہ نے جلدی سے بتایا

"ہاں یہی تو، کہنے لگی، فرزانہ سے بات کر لو، اگر وہ اب بھی راضی ہے تو میں ادھر سے منگنی توڑ دوں، اسلم بھی کئی بار اسے کہہ چکا ہے کہ وہ فرزانہ کے ساتھ ہی شادی کرے گا۔ اب بیٹی، جیسے تم چاہو گی، ہونا تو ویسے ہے۔ اگر تمہیں اسلم پسند ہے تو

Digitized by Google

بات آگے بڑھا لیتے ہیں ورنہ اسے جواب دے دیں گے۔"
رضیہ نے کہا
"ابھی تو اماں تم یہ کھانا کھاؤ نا، سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔"
فرزانہ نے کہا اور اٹھ گئی۔ اسے اپنی ماں کی بات سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ایک دُکھ کا احساس اس کے رگ وپے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کی اپنی ذات، کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی بلکہ یہ ساز و سامان ہی اہم تھا۔ کیا زندگی کی خوشیاں انہی چیزوں کے ساتھ ہے؟ کیا اس طرح اسلم کی ماں کے بارے میں محبت یا احترام ہوگا؟ جو اس کی ذات سے زیادہ اس کے ساتھ آنے والے سامان کو اہمیت دیتی تھی۔ اسی لمحے اس نے اپنے دماغ سے یہ سب جھٹک دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ جیسا معاشرہ ہے اور اس کے ساتھ اسی طرح رہنا ہے۔
اس وقت وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی، جب اسلم کا پیغام اسے فون پر ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ باہر گلی میں آ گیا ہے۔ دروازہ کھولو تا کہ میں اندر آ جاؤں۔ وہ اٹھی اور دروازے تک گئی۔ باہر اسلم کھڑا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ وہ اسے تھماتے ہوئے بڑے اشتیاق سے بولا
"آج تو میری امی نے خود ہی مجھ سے پوچھ لیا کہ اگر میں فرزانہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ راضی ہے۔"
"ہاں، میری امی نے مجھے یہ بتایا ہے کہ وہ آج یہاں آئی تھی۔" فرزانہ نے اپنی دلی نفرت چھپاتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا
"تو پھر کیا خیال ہے، میں دوں انہیں جواب؟" اسلم نے پوچھا
"اسلم میں نے کتنی بار تمہیں کہا ہے کہ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے، سوائے ایک بات کے، تمہاری امی آئے، جس طرح اس نے منگنی توڑی تھی، اسی طرح انہی لوگوں کے ساتھ دوبارہ آئے۔ عزت کے ساتھ منگنی کرے۔ پھر جب چاہے شادی ہو جائے۔ اس میں میری بھی عزت ہے اور آپ لوگوں کی بھی۔"
فرزانہ نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا
"یہ تو میں جانتا ہوں۔" اس نے جوش بھرے انداز میں کہا کہا
"تو بس پھر، اس کے سوا، میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔" وہ سکون سے بولی
"لیکن ایک بات میری تم بھی مانو گی؟" اس نے کہا
"بولو، کون سی بات؟" اس نے پوچھا
"شادی کے بعد، تم یہ کام نہیں کرو گی۔ کسی صورت میں بھی نہیں۔" اس نے کہا تو فرزانہ بھی مسکان کے ساتھ بولی
"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں لوگوں کے برتن مانجھوں۔ میں اپنے گھر میں رہوں گی سکون سے۔"
"بس پھر ٹھیک ہے۔ ایک دو دن میں اماں جائے گی ان کے گھر اور انہیں جواب دے آئے گی۔ وہ بھی میری سرد مہری سے خوش نہیں ہیں۔" اسلم رسان سے بولا تو فرزانہ نے کہا
"میں تو آج بھی تمہاری ہوں، کل بھی تمہاری، بس تیرا انتظار کر رہی ہوں تم کیا کرتے ہو۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو اسلم سرشار ہو گیا۔
"اچھا جاؤ، جا کر سو جاؤ۔ میں بھی چلتا ہوں۔" اس نے کہا اور واپس جانے کے مڑ گیا۔ وہ بھی اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ اب سمجھ گئی تھی کہ اسلم کو کس طرح اپنے حصار میں رکھنا ہے۔
اگلی صبح وہ اپنے معمول کے مطابق بیگم ثروت کے ہاں جا پہنچی۔ شعیب اپنے آفس چلا گیا تھا، بیگم ثروت ابھی اپنے کمرے ہی میں تھی، جبکہ پھوپھو فاخرہ کاریڈور میں بیٹھی مزے سے چائے پی رہی تھی۔ اسے آتا ہوا دیکھ کر بولی
"سناؤ تیری اماں نے تو نہیں پوچھا کہ رات کدھر رہی تھی؟"
"پوچھا تو تھا لیکن میں نے آپ کا نام لے دیا تھا کہ انہوں نے مجھے روک لیا تھا۔" فرزانہ نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا
"تو پھر؟" اس نے تشویش سے پوچھا
"پھر کیا، میں نے بتا دیا کہ آپ کی طبیعت خراب تھی۔ اب آپ بھی نہ پوچھنا، کہیں شک ہی نہ پڑ جائے۔" یہ کہہ کر وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ پھوپھو فاخرہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت کچھ سوچنے لگی۔
اس دن شعیب بہت خوش تھا۔ اس کی منگنی ثانیہ سے ہونے جا رہی تھی۔ وہ تیار ہو چکا تھا۔ ثروت بیگم کے ساتھ لاؤنج میں چند مہمان بیٹھے تھے جنہوں نے ان کے ساتھ مراد علی کے گھر جانا تھا۔ پھوپھو فاخرہ بولائی بولائی سی پھر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وقت جلدی سے سرک جائے اور شعیب کی ثانیہ کے ساتھ منگنی ہو جائے۔ وہ سب تیار ہو کر پورچ میں آ گئے۔ ایک کے بعد ایک کار بڑھتی گئی۔ چار کاروں

Digitized by Google

کا یہ قافلہ گیٹ سے پار ہو گیا۔ فرزانہ نے انہیں کچن کی کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھا تو ایک لمبی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سارا چسکار کیسے ہوا تھا۔ آخری کار میں پھوپھو فاخرہ تھی۔ اس نے دیکھ لیا کہ فرزانہ بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے۔ وہ کار میں بیٹھنے کی بجائے اس کی جانب چلی گئی۔

"تم کیوں نہیں تیار ہوئی بھلا؟" پھوپھو فاخرہ نے پوچھا

"مجھے کہا ہی نہیں کسی نے؟" اس نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے کہا

"چل جلدی سے تیار ہو جا، چلو میرے ساتھ۔" پھوپھو نے اسے کہا تو وہ بولی

"کوئی بات نہیں آپ جائیں، میں بارات والے دن چلی جاؤں گی۔" اس نے کہا تو پھوپھو جلدی سے بولی

"دیکھ لو، میں تمہارے لئے رُکی ہوں۔"

"نہیں آپ جاؤ، اگر مہمانوں کے لئے کچھ پکانا ہو تو مجھے پہلے فون کر دیں۔" اس نے کہا تو پھوپھو فاخرہ سر ہلاتی ہوئی پلٹ کر کار کی جانب چل دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ثانیہ کے گھر پہنچ گئے۔ لاؤنج میں مراد علی کے ساتھ چند اپنی فیملی کے ساتھ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بیگم طلعت آگے بڑھی۔ ان کے استقبال سے یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا داری ہی نبھائی جا رہی ہے ورنہ اس میں کوئی جذبہ و جوش نہیں تھا۔ شعیب کے ساتھ مراد علی نہیں بیٹھا بلکہ وہ اپنے ہاں آئے لوگوں کے ساتھ مصروف رہا۔ جبکہ طلعت بیگم اپنی بہن اور اس کے مہمانوں کے پاس رہی۔ مہمانوں کی تواضع کے بعد خواتین ہی نے منگنی کی رسموں بارے کہنا شروع کیا۔ ایسے میں ثانیہ بھی تیار ہو کر اندر سے آ گئی۔

اس نے سرخ رنگ کا عروسی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے اس نے دلہن والے ملبوس میں ہے۔ اس کا بھاری میک اپ تھا۔ بڑے بڑے جھمکے، ناک میں بڑا چمکتا ہوا لونگ۔ کاندھوں کے ساتھ بڑا سارا آنچل، گلے میں سونے کا ہار، وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی صوفے کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

اس نے شعیب کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جانب صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ گھر والوں میں سے کسی نے یہ احساس ہی نہیں کیا تھا۔ ایسے میں پھوپھو فاخرہ آگے بڑھی۔ اس نے شعیب کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ثانیہ کے پہلو میں لا کھڑا کیا۔ سبھی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بیگم طلعت اپنی بیٹی ثانیہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ایسے میں بیگم ثروت بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑی انگوٹھی نکالنے لگی۔ اس نے ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور شعیب کو تھما دی۔ شعیب نے وہ انگوٹھی پکڑی، ثانیہ کے چہرے پر دیکھا، جہاں دھیمی دھیمی سی مسکان مچل رہی تھی۔ اس نے ثانیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے انگوٹھی پہنا دی۔ یہ وہ لمحے تھے، جس کے لئے شعیب بے حد تڑپا تھا۔ یہی ثانیے اس کی زندگی کا حاصل بن گئے تھے۔ وہ اس وقت آسودگی کی انتہا پر تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" ثانیہ نے دھیرے سے کہا تو وہ چونک گیا۔ ثانیہ اپنے ہاتھ میں انگوٹھی تھامے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا

"ثانیہ، مجھے یقین نہیں آ رہا، تم میری ہو گئی ہو۔"

"ہاں، میں تمہاری ہوں شعیب۔" اس نے یوں کہا جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو۔

"لیکن یہ یاد رکھیں، منگنی آدھی شادی ہوتی ہے، پوری تو اس وقت ہوتی ہے جب نکاح ہو جائے۔" وہیں قریب کھڑی ایک خاتون نے کہا تو ثانیہ نے ایک بار شعیب کے چہرے پر دیکھا، جہاں خوشی دمکنے لگی تھی۔ تبھی پھوپھو فاخرہ نے کہا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Digitized by Google

اعتراف

سلیم اختر

کچھ لوگ کہ تپش میں بھی سوتے ہیں چین سے
اک میں جسے سرد ہوا بھی نہ سلا سکے
یہی حال اس بد بخت کا ہے، وہ آج پشیمان اور
موت کی دعائیں مانگ رہا ہے کیا وہ قابل معافی ہے؟
ایک سیاسی بازی گر کا سبق آموز اعتراف

''جناب والا'' میں ملزم بنارس عرف چھوٹا سردار کے خلاف اس کے ساتھی نواز کو بطور سلطانی گواہ عدالت میں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔ سرکاری وکیل کی زبان سے نواز کو بطور سلطانی گواہ بننے کا سن کر مجھے جھرجھری سی آگئی

''اجازت ہے۔'' جج نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد میرا جگری یار ہم نوالہ ہم پیالہ سلطانی گواہ بن کر کٹہرے میں آ کھڑا ہوا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ نواز میرے ہی خلاف سلطانی گواہ بن جائے گا۔ نواز ہی نے تو مجھے ''چھوٹا سردار'' کا لقب دے رکھا تھا۔ میں نے قہر آلود نظروں سے نواز کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی مجرم ہوں۔ میں دولت اور اقتدار کے نشے میں کھو کر نہ صرف اپنے رب کو بلکہ اپنی حیثیت بھی بھول گیا تھا۔ اب احساس ہوا تھا کہ زمین کی مٹی چاہے جتنی ہی اوپر اٹھے اسے گرنا تو زمین پر ہی ہوتا ہے۔

O☆O

ملک کے ایک صوبے کے دارالحکومت سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں میں میرا جنم ہوا۔ اس دور میں وہ ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ میرا باپ ایک معمولی سا زمیندار تھا، معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا اس لئے اسے اپنی اولاد کو پڑھانے اور بڑا آدمی بنانے کا بہت شوق تھا۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل کی خاطر اس نے مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کرادیا، مگر نہ جانے کیوں مجھے پڑھنے سے ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ مجھے بچپن ہی سے کھیل کود اور لڑائی جھگڑا کرنے سے دلچسپی تھی۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا ہی میرا مشغلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں ماں اور باپ کو اکثر لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ میرا باپ میری ماں کی اکثر پٹائی بھی کرتا تھا۔

میں نے گاؤں کے اسکول سے پانچویں کا امتحان پاس کیا تو میرے باپ نے مجھے ہائی اسکول میں داخل کرادیا۔ وہ اسکول ہمارے گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اس اسکول میں جا کر مجھے اپنے ہی جیسے چند ساتھی اور مل گئے۔ جلد ہی میں ان میں گھل مل گیا۔ ان میں سے ایک ساتھی سے میری دوستی بہت گہری ہوگئی۔ اس کا نام نواز تھا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جہاں اسکول واقع تھا۔ پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہ تھی۔ ہمارے ماسٹر ریاست سخت انسان تھے۔ وہ اکثر ہم دونوں کو بے دردی سے پیٹتے تھے مگر ہم دونوں اتنے ڈھیٹ تھے کہ مار کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوتا، بلکہ ہم اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ مار کھانے کے بعد آسودہ سے ہو جاتے تھے۔

ہم بلاوجہ دوسرے لڑکوں سے جھگڑا کرتے اور اپنے سے بڑے لڑکوں کو بھی نہ بخشتے۔ ماسٹر ریاست نے سختی کر کے دیکھ لی تھی۔ پھر انہوں نے ہمیں پیار سے سمجھانا شروع کر دیا کہ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے اسکول کا ماحول اور خراب ہوتا ہے۔ تم دونوں کا مستقبل بھی تاریک ہو سکتا ہے مگر ہم نے ان کی نصیحتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیں۔

جب ہم دونوں کی شکایتیں ہمارے والدین تک پہنچتیں تو گھر میں بھی خوب مار پڑتی۔ پھر یہ معمول بن گیا، گھر میں

Digitized by Google

مجھے باپ سے مار پڑتی اور اسکول میں ماسٹر ریاست سے۔

ایک روز میرے باپ نے مجھے اس قدر پیٹا کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے۔ نواز کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ مار پیٹ تو اب گویا ہماری روزمرہ کی خوراک بن گئی تھی۔ کبھی کبھی اسکول کے بڑے لڑکے بھی ہماری دھنائی کر دیتے تھے۔

ماسٹر ریاست نے کئی بار ہمیں اسکول سے نکالنے کی بھی دھمکی دی مگر ہم نے اس پر بھی کان نہ دھرے۔ یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ ان دنوں ہم آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہمارا شمار اسکول کے نالائق ترین طالب علموں میں ہوتا تھا کیونکہ ہمیں پڑھائی سے کوئی غرض اور دلچسپی ہی نہ تھی۔ ماں باپ کی آپس کی لڑائی اور باپ کی بے جا مار پیٹ نے ہمیں ایک طرح سے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ ہم میں تشدد پسندی اور انتقامی رویہ پیدا ہو گیا تھا۔

ہمارے اسکول میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی عذرا ہماری کلاس فیلو تھی۔ نمبردار کی لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی نخریلی تھی اور ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ خوب صورت بھی بہت تھی۔ ہر آدمی اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتا تھا۔ اس کا باپ بہت بڑا جاگیردار تھا اس لئے دوسرے جاگیرداروں کی طرح وہ بھی بہت ظالم تھا۔ گاؤں کا ہر فرد اس سے خوف کھاتا تھا۔ اسی وجہ سے اسکول میں بھی کوئی لڑکا عذرا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ ہر لڑکا یہی کہتا تھا۔ ”یہ نمبردار کی بیٹی ہے۔ اس سے بات بھی نہ کرنا۔“

اسکول کے ماسٹر بھی عذرا کو وی آئی پی کا درجہ دیتے تھے اس وجہ سے عذرا کا غرور آسمان کو چھونے لگا تھا۔ ایک روز نہ جانے میرے من میں کیا سمائی کہ میں نے عذرا سے ایک بے ہودہ قسم کا مذاق کر ڈالا۔ عذرا نے ذرا بھر بھی میرا لحاظ نہ کیا۔ اس نے اسکول کے لڑکوں کے سامنے مجھے خوب کھری کھری سنائیں اور میرے چہرے پر تھوک دیا۔

میں کچھ بھی نہ کر سکا، خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میری

Digitized by Google

خوب جگ ہنسائی ہوئی اور یہ بات کئی ماہ تک اسکول اور گاؤں میں پھیلتی اور گونجتی رہی۔ میرے خاموش ہونے کی وجہ سے صرف یہی تھی کہ وہ لڑکی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو میں مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتا۔

ابھی میں اسی تضحیک کو ہی نہ بھولا تھا کہ ایک اور پریشانی آن پڑی۔ میں اور نواز دونوں ہی آٹھویں میں فیل ہو گئے۔ ہمیں فیل ہونے کا تو بالکل افسوس نہیں تھا مگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ ماسٹر ریاست نے ہمیں جان بوجھ کر فیل کیا ہے۔ ہم نے ماسٹر کا دماغ درست کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر نہ جانے کیوں خود ہی اپنا ارادہ ملتوی بھی کر دیا۔ شاید پہلی دفعہ ہم نے حقیقت پسندی سے کام لیا تھا۔ جب ہم نے پڑھا ہی نہیں تھا تو پاس ہونے کا کیا سوال! اس میں ماسٹر ریاست کا بھی کیا قصور تھا؟

اس کے گاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک وارداتیا موجود تھا۔ اس علاقے میں رسہ گیروں، راہزنوں اور چوروں کی بہتات تھی۔ ہمیں بھی انہی جیسا بننا تھا اس لئے ہم پڑھ لکھ کر کیا کرتے۔

ہم دونوں نے ہی خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ اب تو ہم نے باقاعدہ "بدمعاشی" شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں چھوٹے دکانداروں اور راہ گیروں کو لوٹتے رہے، پھر پلان بنا کر جرائم کرنے لگے۔ ہم دونوں کی جوڑی پورے علاقے میں بدنام ہو گئی۔ شریف لوگ ہم سے ڈرنے لگے۔ شریف آدمی کی بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے۔ وہ ڈر ڈر کر رہتا ہے اور ہر روز مرتا ہے۔ جو جتنا شریف ہوتا ہے، اسے اسی قدر دبایا جاتا ہے اس لئے ہم دونوں سر اٹھا کر چلتے تھے۔ باپ اور استاد کے جارحانہ رویوں کی وجہ سے ہمارے اندر کا انسان مر گیا تھا اور ہمارے اندر ایک وحشی درندہ بیدار ہو گیا تھا۔

پھر ہم نے ایک گروہ بنا لیا جس میں ہمارے جیسے چور اچکے اور ڈکیت اکٹھے ہو گئے۔ اس گروہ کے سربراہ ہم دونوں تھے۔ ہمارا شمار کرائے کے غنڈوں میں ہونے لگا تھا۔ ہم پیسے لے کر ہر غلط کام کرنے لگے۔ ابھی ہم نے کوئی بہت بڑی واردات نہیں کی تھی پھر بھی ہر طرف ہماری دہشت پھیل گئی تھی۔ اس دوران میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جو کسی اور نے کیں مگر ان کا الزام ہم پر لگ گیا۔ بات پولیس تک پہنچی تو انہوں نے ہم دونوں کو کئی وارداتوں میں تفتیش کے سلسلے میں گرفتار کر لیا لیکن ہماری خوش قسمتی کی ہمارے خلاف کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ مجبور ہو کر پولیس والوں نے ہمیں بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

ہماری بے گناہی اور رہائی نے ہمارے حوصلے مزید بڑھا دیئے اور ہم دیدہ دلیری سے غیر قانونی کام کرنے لگے۔ ہم پیسے لے کر کسی کو مار کے ادھ موا کر دیتے، کسی کے مویشی چوری کروا دیتے۔ کسی کی کھڑی فصلوں کو آگ لگا دیتے۔

ہم اپنا بھی ہر کام ڈھوس دھاندلی سے کرانے لگے۔ ہال کٹواتے تو حجام کو پیسے نہ دیتے۔ اپنی تھوڑی بہت زمین میں ٹریکٹر چلاتے تو ٹریکٹر والے کو معاوضہ نہ دیتے۔ دکانوں سے چیزیں بلا قیمت اٹھا لیتے۔ کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ہم سے رقم کا مطالبہ کرتا۔

O☆O

پھر ہماری یہ شہرت علاقے کے ایم پی اے ملک دلاور خان تک جا پہنچی۔ وہ اس وقت صوبائی وزیر تھا اور وزیر اعلیٰ کا خاص آدمی مشہور تھا۔ کسی زمانے میں وہ خود بھی بہت بڑا بد معاش تھا۔ اپنی اسی بدمعاشی کی بنا پر وہ الیکشن جیتا تھا۔ اس کے خوف اور دہشت کی وجہ سے لوگوں نے مجبوراً اسے ووٹ دیے تھے۔

ان جیسے لوگوں کو ہم جیسے بندوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بوقت ضرورت مخالفین کو ڈرا دھمکا سکیں، ان کا جلسہ جلوس خراب کریں، کسی مخالف کو ہمیشہ کے لئے غائب کر دیں۔ مخالفوں کی زمینوں پر قبضہ کرنے اور ہر میدان میں انہیں نیچا دکھانے کے لئے ہمیں لوگ کام آتے ہیں۔ صوبائی وزیر نے اپنا بندہ بھیج کر ہمیں اپنے ڈیرے پر بلایا اور ہمیں اپنے خاص بندوں میں عارضی طور پر یہ کہہ کر شامل کیا کہ پہلے وہ ہماری کارروائی دیکھے گا۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوئے اور اس کی مرضی کے مطابق کام کیا تو ہم اس کے خاص بندوں میں شامل ہو جائیں گے۔ میں اور نواز تو پیدا ہی بدمعاشی کے لئے ہوئے تھے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم ایم پی اے کے خاص بندوں میں ہونے لگا کیونکہ ہم نے ایسی کارروائیاں کیں جو ملک دلاور کی نظروں میں بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن تھیں۔

ہم سب کچھ ملک دلاور کی مرضی سے کر رہے تھے۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ علاقے کی پولیس ہمیں سلام

Digitized by Google

کرتی تھی، اب ہماری جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں اور ہر وقت مسلح رہنے لگے تھے۔ ہم پر ایک عجیب سا نشہ طاری رہنے لگا۔ وہ نشہ طاقت کا تھا، غرور کا تھا۔ ہمارے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ غریب اور چھوٹے لوگ ہمیں چیونٹیوں کی مانند محسوس ہوتے تھے جنہیں ہم پاؤں تلے روند دیتے تھے۔

میں نے اور نواز نے کچھ وارداتیں الگ الگ بھی کیں اور مخالف گروپوں کو شدید قسم کا نقصان پہنچایا۔ میں نے مخالف پارٹی کے ایک احتجاجی جلسے میں ہینڈ گرنیڈ پھینک کر افراتفری مچادی جس میں کئی افراد زخمی ہو گئے اور لیڈر تقریر کیے بغیر ہی بھاگ گئے۔ اس جلسے کی ناکامی کا سارا کریڈٹ مجھے ملا۔ اس واردات کے بعد میری اہمیت مزید بڑھ گئی۔ میری بہادری اور دلیری کی خبر پارٹی کی ایک انتہائی اہم شخصیت سردار سکندر تک پہنچی تو انہوں نے مجھے بلایا۔ میرے کام کی بہت تعریف کی اور مجھ سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ میں بھلا کیسے انکار کرتا۔ سردار سکندر پارٹی کے اہم ترین آدمی تھے۔ بڑے بڑے فیصلے ان کے اشارے پر ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ رہنا تو میری خوش قسمتی تھی۔ نواز ابھی تک ملک دلاور کے ساتھ تھا۔ وہ نواز کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا مگر نواز سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ملک دلاور کبھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے آتا یا سردار صاحب سے ملاقات کرتا تو نواز اس کے ساتھ ضرور ہوتا۔ اب ہم دونوں ہی صوبائی حکومت کے انتہائی اہم آدمی تھے۔ ہماری شان ہی نرالی ہو گئی تھی۔ ہم اپنے آپ کو آسمان سے اتری ہوئی مخلوق سمجھنے لگے تھے۔ ہمارے اندر رحم اور ہمدردی کا جذبہ ختم ہو گیا تھا۔

O☆O

میرے اور نواز کے گاؤں سے شہر جانے والی سڑک کا فاصلہ صرف دو میل تھا۔ درمیان میں ایک نالہ بھی پڑتا تھا۔ علاقے کے لوگ عرصے سے اس پر پل بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ووٹ مانگنے والوں نے ہمیشہ وعدوں پر ہی ٹرخایا تھا۔ ایک روز میں نے اس سلسلے میں سردار صاحب سے بات کی تو انہوں نے فوری طور پر نالے پر پل بنانے کی منظوری دلوادی۔ چھے ماہ کے عرصے میں وہ پل مکمل ہو گیا جس کا افتتاح ہمارے علاقے کے ایم پی اے ملک دلاور نے کیا تھا۔ علاقے کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ پل میں نے بنوایا ہے تو وہ میرے بہت ہی ممنون ہوئے۔ ہر فرد میری عزت کرنے لگا۔ اسی پل کے افتتاح والے دن نواز نے جہاں سردار سکندر اور ملک دلاور زندہ باد کے نعرے لگوائے، وہاں اس نے میرے نام کی بجائے مجھے "چھوٹے سردار" کہہ کر بھی نعرے لگوائے۔ یوں میرا نام بنارس کی بجائے چھوٹا سردار مشہور ہو گیا۔ لوگ اپنے مسائل لے کر میرے پاس آنے لگے مگر مجھے اب ان کے مسائل حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ میری پتنگ تو نہایت ہی اونچی اڑنے لگی تھی۔ میرے اندر تکبر اور غرور کا پودا پرورش پا کر تنومند درخت کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ میرا شمار پارٹی کے اہم ورکروں میں ہونے لگا تھا۔ سردار سکندر مجھ پر نہ صرف اعتماد کرتا تھا بلکہ مجھ پر فخر بھی کرتا تھا۔ میں گاؤں کم ہی جاتا تھا۔ مجھے اب کسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ میں اپنی ہی دنیا میں مگن تھا۔ مجھ پر اب جائز اور ناجائز ہر طریقے سے مال کمانے اور جائیداد بنانے کی دھن سوار تھی۔ پارٹی کے سبھی لوگ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے تو بھلا میں کیوں پیچھے رہتا۔ میں ہمیشہ گاڑی میں گاؤں جاتا تھا۔ ماں کے انتقال پر میں گاؤں گیا تو وہاں تین چار دن رہنا پڑ گیا۔ میں اس عرصے میں نواز کے گھر گیا تو وہاں مجھے عذرا نظر آ گئی۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی، اس پر اس کا قیامت خیز حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کے بلا خیز حسن نے میرے دل و دماغ میں ہل چل سی مچا دی۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب اس نے غصے سے میرے منہ پر تھوک دیا تھا۔ میرے اندر نفرت کا آتش فشاں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ سوئے ہوئے زخم ہرے ہو گئے۔ میں نے اس روز یہ عہد کر لیا کہ میں عذرا سے اس رسوائی کا بدلہ ضرور لوں گا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک کر کہا۔ "عذرا! مجھے پہچانا؟"

"تم بنارس بدمعاش ہو ناں۔" اس نے پہچاننے میں دیر نہ لگائی۔

"لوگ مجھے چھوٹا سردار بھی کہتے ہیں"۔ میں نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔

"کہتے ہوں گے۔ میری جوتی سے!" عذرا نے بپھر کر کہا اور زمین پر تھوک کر آگے بڑھ گئی۔

اپنی اس توہین کے احساس سے میں تلملا اٹھا۔ یہ میری مردانگی کی توہین تھی، جی چاہا کہ اسے اٹھا کر لے جاؤں مگر نہ

Digitized by Google

جانے میں کیسے برداشت کر گیا پھر میں شہر کے بکھیڑوں میں الجھ کر وقتی طور پر عذرا کو بھول گیا۔

کچھ عرصے بعد سردار سکندر نے میری ڈیوٹی ایک ایسے ضلع میں لگا دی جہاں ہماری پارٹی کی پوزیشن کمزور تھی۔ وہاں مجھے مخالف پارٹی کے ورکروں کو ڈرا، دھمکا کر توڑنا تھا اور اپنی پارٹی کی پوزیشن مضبوط بنانا تھی۔ وہاں آزادانہ کام کرنے کے لئے سردار صاحب نے مجھے ہر طرح سے چھوٹ دے رکھی تھی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک طرح سے میری مٹھی میں تھے۔ سردار صاحب نے مجھے پارٹی فنڈ سے خاصی خطیر رقم بھی دی تھی۔ جب پیسا بھی ہو اور طاقت بھی تو دنیا کا تقریباً ہر کام ممکن ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس وقت میرا ایہی خیال تھا۔

میں نے اس رقم کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کا ایک بڑا حصہ میں نے مخالف پارٹی کے ورکروں کو خریدنے پر خرچ کیا۔ بقیہ رقم میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادی۔ سردار صاحب کی وساطت سے میں نے اسی شہر میں ایک وسیع و عریض سرکاری پلاٹ کوڑیوں کے مول خرید لیا۔ نہ صرف پلاٹ خریدا بلکہ اس پر ایک کمرشل بلڈنگ بھی تعمیر کر ڈالی۔ میں جانتا تھا کہ کل سردار صاحب کی پارٹی حکومت میں نہیں ہوگی اس لئے جتنا پیسا بٹور سکتا ہوں، بٹور لوں۔ میں نے اس بہتی گنگا میں خوب خوب ہاتھ دھوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں لاکھوں کی جائیداد کا مالک بن گیا مگر میری ہوس تو بڑھتی جارہی تھی۔

میں اونچے اونچے خواب دیکھنے لگا۔ میری بلڈنگ کے ساتھ کسی بڑھیا کی زمین تھی جس کا رقبہ ایک کنال سے بھی زیادہ تھا۔ بڑھیا نے وہاں چار دیواری بنا کر وہ پلاٹ کسی ٹرانسپورٹر کو کرائے پر دے رکھا تھا اور وہاں ویگنوں کا اڈا بنا ہوا تھا۔ اس موقع کے پلاٹ پر بھی میری نظریں تھی۔ میں نے اسے ہتھیانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر میں وہاں بھی شاپنگ سینٹر بنا لیتا تو میری کمرشل بلڈنگ کی ویلیو کئی گنا بڑھ جاتی۔ میں نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ اس بڑھیا کا سوائے دو پوتیوں کے کوئی نہیں کرائے کی مد میں حاصل ہونے والی رقم سے وہ اپنا اور پوتیوں کا پیٹ پال رہی تھی اور ان کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی تھی۔ وہ خود چھوٹے سے ایک کچے مکان میں رہتی تھی۔ گویا اس کی گزر بسر کا انحصار صرف اور صرف پلاٹ کے کرائے پر تھا، کئی دوسری پارٹیاں بھی اس سے زمین خریدنا چاہتی تھیں مگر وہ کسی صورت میں زمین فروخت کرنے کو تیار نہ تھی۔ کئی لوگوں نے اسے مارکیٹ ریٹ سے کہیں زیادہ رقم کی بھی پیش کش کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس بڑھیا کو ایک پائی بھی نہ دوں گا اور زمین پر قبضہ بھی کرلوں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں اس بڑھیا کے پاس جا پہنچا اور لگی لپٹی رکھے بغیر اس سے کہا کہ تمہاری زمین میری بلڈنگ کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا پلاٹ خرید کر اس پر شاپنگ سینٹر بناؤں۔ تمہاری زمین مجھے بہت پسند آگئی ہے اس لئے میں اسے ہر قیمت پر خریدوں گا۔

”وہ زمین میری پوتیوں کا واحد سہارا ہے بیٹا!“ بڑھیا نے کہا۔ ”وہ دونوں یتیم ہیں اس لئے ان کی پرورش میری ذمے داری ہے۔ یہ زمین دونوں بچیوں کے مستقبل کا سہارا ہے، اس لئے میں اسے فروخت نہیں کر سکتی۔“

میں نے بڑھیا کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ اس کے انکار سے میں غضب ناک ہو گیا۔ اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اتنی بات بھی نہ کرتا۔ میں غصے میں پیر پٹختا وہاں سے چلا آیا پھر علاقے کے پٹواری اور تحصیل دار سے بات کی اور اس بڑھیا کی زمین پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ میں نے اوپر سے محکمہ مال کے ایک بڑے افسر کو فون کرادیا اور پھر ان سے ملنے ان کے دفتر جا پہنچا۔ میں نے اس افسر کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ نہایت ایماندار ہونے کا دعوے دار ہے اور کوئی ناجائز کام نہیں کرتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔ اس نے مجھے چائے پلائی اور بہت مہذب انداز سے بولا۔ ”جی فرمایئے، کیسے زحمت کی آپ نے؟“

میں نے اسے بتایا کہ مجھے بڑھیا کی زمین چاہئے۔

”یہ نہ صرف ناجائز اور غیر قانونی ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی لحاظ سے بھی غلط ہے۔ میں اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا۔“ اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

”شاید آپ کو ایم پی اے صاحب کا فون موصول نہیں ہوا۔“ میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے مجھے فون کیا تھا مگر انہیں بھی میں نے یہی

Digitized by Google

جواب دیا ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

میں بغیر کچھ کہے وہاں سے آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس علاقے کا ایم پی اے ڈھیلا ہے اس لئے اس افسر نے اس کے ٹیلی فون کو اہمیت نہیں دی۔ میں نے ایک صوبائی وزیر سے بھی کہلوایا مگر افسر نے وزیر کی بات بھی نہ مانی۔ میں نے وزیر اعلیٰ سے کہلوایا اور یقین ہو گیا کہ اب تو وہ کسی بھی طور پر انکار نہیں کرے گا۔ پھر میں بہت طمطراق سے اس افسر کے پاس جا پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''سی ایم صاحب نے تمہارے کام کے سلسلے میں فون کیا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا یہ غلط کام نہیں کر سکوں گا۔ میں جانتا ہوں تمہاری پہنچ اوپر تک ہے مگر ان سب سے اوپر بھی ایک ذات ہے جو ان سب سے برتر ہے۔ میں اس کا بندہ ہوں، اور اسی کو جواب دہ ہوں۔''

غصے سے میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں اور میں بپھر کر بولا۔ ''تم میری ہی نہیں بلکہ سی ایم صاحب کی بھی توہین کر رہے ہو۔''

''اگر میری فرض شناسی اور خدا خوفی سے کسی کی توہین ہوتی ہے تو بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اب وزیر اعظم سے بات کروں گا۔'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہاری اتنی ہی پہنچ ہے تو پلیز، یہاں سے میرا تبادلہ کرا دو تاکہ میں غلط کام کرنے سے بچ جاؤں۔ میری ملازمت کے دو سال باقی رہ گئے ہیں۔ میں وہ بھی ایمانداری سے گزارنا چاہتا ہوں۔ تم مجھ سے یہ ظلم نہ کراؤ۔ میں روز حشر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''تم دو ٹکے کے افسر مجھے اکڑفوں دکھا رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارا صرف ٹرانسفر کراؤں گا۔ میں دھکے دے کر تمہیں اس ڈیپارٹمنٹ سے نکلوا دوں گا۔ تمہیں ابھی میری طاقت اور پہنچ کا اندازہ نہیں ہے۔ تمہاری فرض شناسی اور ایمانداری سمیت تمہیں دفن کر دوں گا۔'' میں نے اسے خوب جی بھر کر سنائیں اور غصے سے پیر پٹختا ہوا باہر نکلا آیا۔ مجھے اب کسی طور چین نہیں آ رہا تھا۔ یہ پہلا کام تھا جو میری مرضی کے مطابق نہیں ہوا تھا۔ ناکامی کا احساس مجھے کچوکے لگانے لگا۔ میں اگلی پارٹی میٹنگ کا انتظار کرنے لگا۔

میٹنگ ہوئی تو میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے سردار صاحب اور صوبائی وزیروں سے کہا۔ ''آپ لوگوں کی حکومت صرف نام کی ہے۔ ایسی بے اختیار اور اپاہج حکومت کا کیا فائدہ، دو ٹکے کا ایک افسر بھی آپ کی بات نہیں مانتا۔ وہ افسر جو صرف آپ کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو ہم ورکر آپ کی خاطر آئندہ نہ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں گے، نہ جلوس نکالیں گے اور نہ جیل جائیں گے۔''

میری باتیں سردار صاحب کے دل پر اثر کر گئیں۔ انہوں نے اسی وقت حکم دیا کہ محکمہ مال کے اس افسر کو فوری طور پر برطرف کیا جائے۔

اس افسر کو فوری طور پر برطرف کر دیا گیا۔ اس کی جگہ جو نیا افسر آیا، اس نے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی اور تمام کام میری مرضی کے مطابق کر دیا۔ بڑھیا کی زمین میرے نام ہو گئی۔ میں اب اس زمین کا قانونی مالک بن گیا۔ محکمہ مال کے بر طرف افسر نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، قانون کی مدد لینے کی کوشش کی، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس کی کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی کیونکہ حکومت ہماری پارٹی کی تھی۔ پولیس، قانون سب کچھ ہمارے تابع تھا۔

جس دن زمین میرے نام منتقل ہوئی، اسی دن وہاں سے جھگیوں کا اڈا ختم کر دیا گیا اور میں نے فوری طور پر وہاں فلیٹ کی تعمیر شروع کرا دی۔

بڑھیا نے بہت واویلا کیا، میری منتیں کیں، تھانے اور کچہری تک گئی، مگر ناکامی اس کا مقدر بن گئی۔ اس کی منتیں اور آہیں میرے پتھر دل کو موم نہ کر سکیں۔ ہر طرف سے ناکامی کے بعد اس نے جی کھول کر مجھے بددعائیں دیں۔ مجھے برا بھلا کہا مگر میں نے اس کی ہر بات اور ہر بددعا ان سنی کر دی۔ زمین اور مستقبل کا آسرا کھو جانے کے غم نے بالآخر بڑھیا کی جان لے لی۔ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ میں اس کی بددعاؤں سے تو بچا رہوں گا۔

ایک دو بار اس کی پوتیاں بھی روتی ہوئی میرے پاس فریاد لے کر آئیں مگر میں نے انہیں بھی دھتکار دیا۔ اس کے بعد نا معلوم وہ کہاں چلی گئیں۔ میں بھی انہیں بھول گیا۔ اب میں کروڑوں کی جائیداد کا مالک تھا۔ کمرشل بلڈنگ کے

Digitized by Google

دفتروں اور شاپنگ سینٹر سے ہر ماہ کرائے کی مد میں مجھے لاکھوں روپے ملتے تھے۔ نہ میں اس رقم پر انکم ٹیکس ادا کرتا تھا، نہ پراپرٹی اور دولت ٹیکس۔ اب میرا شمار بھی شہر کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ اس جائیداد کے علاوہ میں زرعی زمین بھی خرید رہا تھا۔ اصل میں مجھے عذرا سے اپنی توہین کا انتقام لینا تھا۔ اس کا توہین آمیز رویہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا اور بھلائے نہیں بھولتا تھا۔

میں مالی طور پر عذرا کے باپ سے بھی کئی گنا زیادہ ہو گیا تو دن رات عذرا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنی توہین سے زیادہ اس کے قیامت خیز حسن نے میرے دل پر چرکے لگائے تھے۔ اس کا حسین سراپا مجھے چین نہ لینے دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے شادی کروں گا۔

جب دل بہت بے قرار ہوا تو میں گاؤں روانہ ہو گیا۔ نواز بھی میرے ہمراہ تھا۔ میں اور نواز دونوں ہی بڑے رعب سے نمبردار کی حویلی جا پہنچے۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے باول ناخواستہ ہمیں اپنی بیٹھک میں بٹھایا اور آنے کا مقصد پوچھا۔

"نمبردار جی!" نواز بارعب انداز میں بولا۔ "میں گھما پھرا کر بات کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ میرا دوست تمہاری بیٹی عذرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" نواز نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

یہ سن کر نمبردار غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور چیخ کر بولا۔ "تم لوگوں نے سوچا بھی کیسے۔ جو لوگ تمہیں نہیں جانتے ہیں، انہیں اپنی جھوٹی شان سے مرعوب کرو۔ میں تو تمہاری اصلیت جانتا ہوں۔ چار پیسے ہاتھ آ گئے تو دماغ ہی خراب ہو گیا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

نمبردار کی آواز سن کر اس کے دو بیٹے وہاں آ گئے۔ جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو وہ بھی غصے سے بے قابو ہو گئے۔ نمبردار کا بڑا بیٹا سرور دہاڑا۔ "تم نے میری بہن کا نام لینے کی جرات کیسے کی؟ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔"

وہ دونوں غصے میں بپھرے ہوئے ہماری طرف بڑھے اور ہماری پٹائی شروع کر دی۔ میں نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہاں ہمارے ساتھ یہ سلوک ہو گا۔ ہم دونوں ذہنی طور پر لڑائی جھگڑے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے ان سے مار کھا گئے۔ سرور نے اچانک پستول نکال لیا تو ہم دونوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ توہین کے احساس سے ہم دونوں پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ گاؤں میں بدنامی الگ ہوئی تھی۔ ہم نے اس واقعے کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا مگر یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ نمبردار اور اس کے بیٹوں سے ایسا انتقام لیں گے کہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں گے۔

O☆O

دو ہی دن بعد میں اور نواز کچھ جرائم پیشہ افراد کو لے کر رات کے وقت گاؤں پہنچ گئے۔ ان کے پاس پیٹرول سے بھرے ہوئے بہت سے کین تھے۔ ان میں کچھ آدمی دیوار پھاند کر اندر پہنچے اور حویلی کے تمام کمروں کو باہر سے لاک کر دیا۔ پھر انہوں نے نہ صرف حویلی کے اندر پیٹرول چھڑکا بلکہ باہر کا بھی پیٹرول کا اچھی طرح چھڑکاؤ کر دیا، بقیہ پیٹرول کمروں کے دروازے کے نیچے سے کمروں میں انڈیل دیا۔ میں اور نواز اس کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ میرے اشارے پر حویلی ایک دھماکے سے جل اٹھی اور لمحوں میں آگ چاروں طرف پھیل گئی۔

ہمارے سینوں میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ میں نے عذرا سے اپنی توہین کا انتقام لے لیا تھا۔ آگ کے شعلے اور جلنے والوں کی آہ و بکا سن کر گاؤں کے لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ وہ نمبردار کی حویلی اور اس کے مکینوں کو بچانے کی خاطر دوڑے ہوئے آئے لیکن اسلحے سے لیس غنڈوں کو دیکھ کر کسی نے آگے بڑھنے کی جرات نہیں کی تھی۔ وہ دور کھڑے بے بسی سے نمبردار کے خاندان کو جلتا دیکھتے رہے تھے۔

دوسرے روز اخبارات میں خبر چھپی۔ "ایک ہی خاندان کے سات افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ہلاک ہونے والوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔"

ان سات افراد میں عذرا بھی تھی۔ اس کارروائی سے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ جس نے بھی وہ خبر سنی، وہ لرز کر رہ گیا۔

گاؤں کے لوگوں نے مجھے اور نواز کو پہچان لیا تھا لیکن کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ہمارے خلاف گواہی دیتا۔ کوئی گواہی دے بھی دیتا تو مجھے یقین تھا کہ سردار صاحب اور ملک دلاور ہم پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ انہی کے بل بوتے پر ہم نے اتنا سفاک قدم اٹھایا تھا۔

Digitized by Google

پولیس نے تفتیش شروع کی تو ہماری توقع کے خلاف گاؤں کے کئی افراد نے ہم دونوں کا نام لے دیا۔ ان کا یہ اقدام اس بات کا ثبوت تھا کہ انہیں نمبردار سے بہت محبت تھی۔ گواہی دینے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے خلاف گواہی دے کر وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہے ہیں۔ گواہوں کے بیانات کی روشنی میں پولیس ہمیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوگی۔

میں نے اور نواز نے ڈھٹائی سے کہا اس واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے مگر پولیس نے ہمارا چودہ دن کا ریمانڈ لے لیا۔

چند دن بعد پولیس نے ان غنڈوں کو بھی گرفتار کرلیا جنہوں نے عملی طور پر اس واردات میں حصہ لیا۔ پھر مقدمہ چلنے لگا۔ پولیس ریمانڈ پر ریمانڈ لے رہی تھی ابھی تک اسے ہمارے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا۔

صوبائی وزیر تک بات پہنچی تو سردار صاحب تک بھی پہنچ گئی لیکن انہوں نے ہماری کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ مجھے اور نواز کو اس انکار سے بہت دکھ ہوا۔ سردار صاحب نے یہ پیغام بھجوایا کہ فوری طور پر کچھ بھی کرنا ممکن نہیں ہے۔ صوبے بلکہ ملک بھر کے لوگ مشتعل ہیں۔ تم دونوں کچھ عرصے جیل میں رہو۔ حالات سازگار ہوتے ہی تمہیں وہاں سے نکال لیا جائے گا۔

چونکہ نمبردار کے خاندان کا کوئی بھی فرد زندہ نہ بچا۔ اس لئے اس مقدمے کی پیروی کے لئے سرکاری وکیل کا تقرر کیا گیا تھا۔ سرکاری وکیل نے بہت محنت کی۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے بھی اس کی معاونت کی۔ گاؤں والے یوں بھی مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ ہمیں پھانسی سے کم سزا نہ ہو مگر سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے ہم دونوں کو معمولی سزا ہوئی اور ہم دونوں چند ماہ بعد ہی رہا ہو گئے۔ سرکاری وکیل نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کردی تھی مگر ہم آزاد پھر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پھر وہ اپیل خارج ہوگئی کیونکہ جن لوگوں نے آگ لگائی تھی، وہ اقبال جرم کر چکے تھے اور عدالت انہیں موت کی سزا بھی سنا چکی تھی۔

رہائی کے بعد ہم نے اپنے گاؤں کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ اب میں اپنی پارٹی کا ضلعی صدر بن گیا تھا۔ ضلعی انتظامیہ کے تمام افسر میرا احترام کرتے اور میری ہر بات

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ نئے اُفق کراچی
بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ:
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
6000 روپے
میڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے
5000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد
ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216
موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242
رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز
کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: 35620771/2-922+
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
Info@aanchal@com.pk

Digitized by Google

مانتے تھے۔ کوئی بندہ ذرا بھی افسری دکھانے کی کوشش کرتا، میں راتوں رات اس کا ٹرانسفر کرادیتا۔

جوں جوں وقت گزرتا رہا تھا، میں ناجائز طریقے اختیار کر کے پانی دولت اور جائیداد میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ میں لاکھوں نہیں، کروڑوں میں کھیلنے لگا۔ میرے لئے ہر دن عید اور ہر رات شب برات بن گئی۔ شراب، کباب، اور شباب میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ ہر طرف میری واہ واہ ہونے لگی۔ حکومتی حلقوں میں میری ایک پہچان بن گئی۔ میں نے اپنے ضلع میں پارٹی کو اتنے بہترین طریقے سے منظم کیا کہ دوسری جگہ میری مثال دی جانے لگی۔ بہت پارٹی کے کئی لوگ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ کسی نے ذرا بھی خودسری دکھائی تو اس کا ہم نے وہ حشر کیا کہ پھر کبھی اس کی خبر ہی نہ ملی۔ میرے لئے اپوزیشن کا وجود ہی ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اس ضلع کو اپنی پارٹی کا گڑھ بنا دیا۔ اب وہاں سے ہماری پارٹی کے ایک ایم این اے اور تین ایم پی اے کی سیٹیں پکی تھیں۔ سردار صاحب میرے کام سے بہت خوش تھے اسی لئے وہ میرے خلاف ملنے والی شکایتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے میرا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ اب گویا میں فرعون بن گیا تھا۔ ضلعی انتظامیہ کے ایک افسر کو میں نے صرف اس وجہ سے او ایس ڈی بنوا دیا کہ جب میں اس کے دفتر گیا تو وہ میری تعظیم میں اٹھا نہیں تھا۔

میں اقتدار کی طاقت سے ہر کھیل، کھیل رہا تھا۔ اقتدار کی ہوس کے ساتھ ساتھ مجھے دولت کی بھی ہوس تھی۔ ہر طرح کی دولت نظر تو ایک جیسی ہی آتی ہے مگر اس کے اثرات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایک دولت وہ ہے جس سے خدا اپنے بندے کو نوازتا ہے۔ وہ دولت عزت و کریم کا ذریعہ اور مسرت و شادمانی کا وسیلہ ہوتی ہے مگر جو دولت شیطان کی خوشنودی سے حاصل کی جاتی ہے، وہ اپنے جلو میں تباہی اور بربادی لے کر آتی ہے، ہلاکت و بے سکونی کا سبب بنتی ہے لیکن مجھے اس حقیقت کا ادراک نہ تھا۔ میں صرف مادی دولت کا طلب گار تھا اور اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہی وطن کو لوٹنا شروع کر دیا۔ میں نے سرکاری ملازمین کا ٹرانسفر من پسند سیٹوں پر کرایا اور ان سے بھاری معاوضہ وصول کیا۔ مختلف سرکاری ٹھیکوں میں کمیشن حاصل کیا۔ ٹھیکے دار کو اس وقت تک ٹھیکہ ہی نہ ملتا تھا جب تک وہ میرے گھر نذر نیاز نہ لے کر آئے۔ میں اب ایک امیر ترین شخص تھا جسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔

اس عرصے میں میرے والد کا انتقال بھی ہو گیا اور میں نے اپنے گاؤں کو مکمل طور پر بھلا دیا۔ یوں بھی میں اور نواز اب وہاں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ لوگوں کو ہماری صورت ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن ہمیں کسی کی بھی پروا نہیں تھی کیونکہ اب میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہاں اگر کمی تھی تو ایک جیون ساتھی کی، میں کبھی اس طرف دھیان ہی نہ دے سکا تھا مگر جب میں نے اسے کالج کے گیٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ انتہائی معصوم مگر بلا کی حسین تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں میرے دل میں کھب سی گئی۔ سرو قد، تیکھے نقوش، گوری رنگت! سفید یونیفارم میں وہ آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کا چہرہ شبنم سے دھلے ہوئے گلاب کی مانند دمک رہا تھا۔ اس میں اتنی کشش تھی کہ میں اسے پہلی ہی نظر میں دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔

''تم صرف میری ہو، صرف میری!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

جلد ہی میں اس کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا نام فریحہ تھا اور وہ کسی فیکٹری میں کام کرنے والے ایک مزدور کی لاڈلی بیٹی تھی۔ تمام معلومات حاصل کر لینے کے بعد میں نے اس کے لئے اپنا رشتہ بھیج دیا۔ میں یہ جانتا تھا کہ میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ اتنی کم سن تھی کہ میں اس کا باپ لگتا تھا مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ میرے دل کو بھا گئی تھی اور میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر نہ صرف اس کے والدین اور بہنوں نے انکار کیا بلکہ فریحہ نے بھی مجھے بری طرح سے دھتکار دیا۔ میں نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے فریحہ کے باپ کو اٹھوالیا، اور اس وقت تک اسے آزاد نہ کیا، جب تک اس نے ہاں نہ کر دی۔ اس کی بیوی بھی مان گئی مگر فریحہ نے اقرار نہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا انکار کرنا درست ہے مگر میرے نزدیک جائز ناجائز میں کوئی تفریق نہ تھی۔

میں نے اس کے والدین کو ایک ماہ کی مہلت دی اور ساتھ کچھ رقم بھی۔ فریحہ نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ سارا دن روتی رہتی ہے اور ماں باپ کو برا بھلا کہتی

Digitized by Google

رہتی ہے۔ ماں باپ بھی بھلا کیا کرتے۔ وہ بے بس اور مجبور تھے۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے مگر فریحہ نے بھی قسم کھائی تھی کہ وہ مجھ جیسے غنڈے اور بدمعاش سے شادی نہیں کرے گی۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے فریحہ نے خودکشی کرلی۔ وہ جیت گئی اور میں ہار گیا۔ مجھے اس کی موت کا کوئی دکھ نہ تھا۔ دکھ تو صرف یہ تھا کہ میں اسے حاصل نہ کرسکتا تھا۔ میں نے تو تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ اتنا بڑا اقدام اٹھالے گی۔

میں نے فریحہ کے ماں باپ کو بری طرح پھٹکارا، ان کی بے عزتی کی کہ ان کی بے پروائی کی وجہ سے فریحہ نے خودکشی کی ہے۔ اگر وہ اس کا خیال رکھتے تو وہ اتنا بڑا اقدام نہ اٹھاتی۔

اب میری ہوس ناک نظریں ان کی چھوٹی بیٹی راحیلہ پر تھیں۔ وہ بھی فریحہ کی طرح حسین تھی اور میٹرک میں زیر تعلیم تھی۔ میں نے اس کے والدین سے کہہ دیا کہ میں اب راحیلہ سے شادی کروں گا۔ اسی تاریخ کو میں بارات لے کر آؤں گا۔ اور خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ اس کے والدین نے بہت منتیں کیں، ہاتھ جوڑے کہ میں انہیں رسوا نہ کروں، مزید تماشا نہ بناؤں مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی مگر خدا نے ان کی فریاد سن لی۔

اچانک ہماری پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی۔ ہم سب کی طاقت اور زور چھن گیا۔ سردار صاحب اور پارٹی کے بہت سے اعلیٰ عہدے دار بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کرلئے گئے۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ احتساب بیورو قائم ہوا اور انہوں نے ہر ایک کا احتساب کرنا شروع کردیا، میں اور نواز دونوں فکر مند تھے اور چھپتے پھر رہے تھے مگر کب تک! ایک روز میں بھی گرفتار ہوگیا۔ نیب والوں نے تمام معلومات اور ثبوت اکٹھے کرنے کے بعد مجھے گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے آئینہ دکھایا کہ میں کتنا بڑا مجرم ہوں۔ میں نے کرپشن کر کے کروڑوں کے اثاثے بنائے ہیں۔ میں نے انکار کرنا چاہا تو میرا کیس عدالت میں بھیج دیا گیا جہاں نواز ہی میری خلاف سلطانی گواہ بن گیا۔ اس نے نیب والوں سے بھی نہ چھپایا۔ میں نے یہ صورت حال دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔

میری تمام جائیداد اور دولت ضبط کرلی گئی۔ ساتھ ہی قید کی سزا بھی سنائی گئی۔ جیل میں رہنے کے بعد جب میں رہا ہوا تو میرے استقبال کے لئے ایک بھی شخص موجود نہ تھا۔ میں بے بس اور بے سہارا تھا۔ ندامت اور پچھتاوے مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میرے وجود کا رواں رواں دہائی دے رہا تھا کہ میں ظالم ہوں، قاتل ہوں، وحشی ہوں، درندہ ہوں، لیکن پل پل اس الاؤ پر جلنے کے باوجود میرے پاس نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ بڑھیا، اس کی پوتیوں، محکمہ مال کے افسر، عذرا اور فریحہ ہر ایک کی نفرتوں کی آگ میری روح تک کو جھلسائے دے رہی تھی۔ میں اپنے ہی جہنم میں جلنے لگا۔

ایک دن میں بھٹکتا ہوا اس قبرستان میں جا پہنچا جہاں فریحہ دفن تھی۔ اس کی قبر سے لپٹ کر میں زار و قطار روتا بھی جا رہا تھا۔ اب میں بہت کمزور ہوگیا تھا۔ میں نے طاقت کے نشے میں خلق خدا پر بہت ستم توڑے تھے۔

"کون ہو تم؟" ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ راحیلہ تھی، فریحہ کی چھوٹی بہن۔

"ذلیل انسان...... تم اور یہاں...... کیا لینے آئے ہو؟"

"میں فریحہ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں اس کا مجرم ہوں۔ قاتل ہوں اور اس کے ارمانوں کا۔"

"تم بھی بہت بھولے ہو" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"کیا اس طرح فریحہ کے مصائب اور تمہارے جرائم کی تلافی ہوجائے گی۔ تلافی کرنے والا اوپر بیٹھا ہے اور تم زمین پر معافی مانگ رہے ہو۔ جاؤ اس سے معافی مانگو۔ معافی دینا بندے کے نہیں، اس کے اختیار میں ہے۔"

میں راحیلہ کی بات کا جواب نہ دے سکا اور خاموش ہوگیا۔ ہوا بھی ساکن ہوگئی۔ پودوں کے پتے بھی ساکت ہو گئے۔ شہر خموشاں خاموش تر ہوگیا۔ میں وہاں سے اٹھا اور قبرستان سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ اب اس قبرستان کی طرف تھا جہاں عذرا اور اس کا خاندان تھا۔ اب زندگی یونہی بسر ہوگی، یونہی تمام ہوگی۔

URDU TUBE

Digitized by Google

چال باز

ریاض بٹ

انسان کتنا بھی عقل مند کیوں نہ ہوجائے لیکن قدرت کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے، وہ اپنی چالبازیوں ہوشیاری سے دنیا کو تو دھوکا دے سکتا ہے لیکن قدرت کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

سابق انسپکٹر خالد کی ڈائری کا ایک ورق

ایک سنسنی خیز تفتیشی کہانی

وہ سردیوں کی ابتدا تھی۔ ماہ اکتوبر آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ ان دنوں ہمارے تھانے کی حدود میں رسہ گری اور راہ زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں نے روٹ کے گشت میں اضافہ کردیا تھا۔ بیس پولیس اہلکار دو دو کی ٹولیوں میں رات کو گشت کرتے تھے۔ جس سے وارداتوں میں نمایاں کمی تو ہوگئی تھی، لیکن جو وارداتیں ہوچکی تھیں، ہمیں ان کا کھوج تو لگانا تھا۔ گاؤں اختر آباد کا نمبردار ایک دن میرے پاس آیا۔

اس کا نام نصیر تھا..... ملک نصیر ایک ناٹے قد کا ہوشیار بندہ تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر پوچھا۔

"ملک صاحب..... خیر ہے۔ آج فوجوں نے تھانے کی طرف چڑھائی کیوں کی ہے؟"

"تھانیدار صاحب۔ بس گاؤں کے لوگوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے ناں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے، نمبرداری کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ میں نے اس کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آگے بڑھنے سے پہلے اس نمبردار کے متعلق تھوڑا سا بتادوں۔ یہ کچھ زیادہ ہی چاپلوس قسم کا نمبردار تھا..... پولیس کا مخبر بھی تھا اور بعض کیسوں میں پولیس کو گمراہ کرنے کا کام بھی سرانجام دے دیتا تھا۔ میرے تھانے کے اے ایس آئی جاوید خان نے مجھے اس کے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"سر..... ذرا اس سے ہوشیار رہیے گا۔"

اور وہی نمبردار آج میرے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"تھانیدار صاحب۔ اب تک ہمارے گاؤں سے پانچ بھینسیں، چار گائے چوری ہوچکی ہیں۔ لوگوں میں بڑی تشویش ہے۔ اب تو لوگ ڈنگروں (مال مویشی) کے پاس ہی سونے لگے ہیں۔"

"دیکھو۔ ملک نصیر....." میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"صاف صاف بات کرو۔ کیا تم ہمیں یہ بتانے آئے ہو کہ ہم ناکام ہوچکے ہیں رسہ گیروں کا سراغ لگانے میں۔ کیونکہ اعداد و شمار تم ہمیں بتانے آئے ہو۔ اس کی رپورٹ تو ہمارے پاس پہلے ہی درج ہے۔"

"تھانیدار صاحب..... میں ایسی گستاخی کیسے کرسکتا ہوں؟ میں تو صرف گاؤں کے مکینوں کی تشویش سے آپ کو آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

"تمہارا بھی کچھ فرض ہے۔ ملک نصیر..... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو یہ رسہ گیر تمہارے گاؤں کے ہی لگتے ہیں۔ تم ان کو گرفتار کروانے میں ہماری مدد کرو۔" میں نے اس کے دل میں نقب لگاتے ہوئے کہا۔

Digitized by Google

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے حاضر ہوں۔" اس نے اپنی فطرت کے مطابق کہا۔ تمہارے گاؤں میں کتنے جرائم پیشہ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھ سے زیادہ تو آپ جانتے ہیں۔" اس نے کنی کتراتے ہوئے کہا۔

خیر..... میں نے اس سے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھتے ہوئے اسے چائے پلا کر رخصت کردیا۔ ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ وہ ایک بائیس سالہ جوان کے ساتھ پھر تھانے میں آ گیا۔

"تھانیدار صاحب۔ وہی ہو گیا جس کا خدشہ تھا۔" اس نے آتے ہی ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہو گیا؟ نمبردار صاحب؟"

"جناب وزیر کی والدہ کو رات کوئی قتل کر گیا۔ اس نے ساتھ آئے ہوئے جوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں آرام سے بیٹھو اور تفصیل سے سب کچھ بتاؤ۔" ان دونوں کی زبانی جو حالات مجھے معلوم ہوئے وہ میں اپنی زبان میں آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔

جوان جس کا نام وزیر تھا۔ وہ دوسرے شہر اپنے کسی دوست کے پاس گیا ہوا تھا۔ گھر میں اس کی والدہ اور چھوٹا بھائی کبیر تھے..... جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ وہ گلابی جاڑے کا موسم تھا۔ رات کو خنکی بڑھ جاتی تھی۔ دونوں ماں بیٹا برآمدے میں سوئے تھے۔ دونوں کی چارپائیاں زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ صبح جب کبیر کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنی والدہ کو جگانے کے لیے جونہی چارپائی کی طرف دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ شاید اس کی ماں تو جگانے کے مرحلے سے گزر کر ہمیشہ کے لیے سو گئی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے پڑوس کے دروازے پر جا کر دستک دی۔

اس کے پڑوسی راحت علی نے دروازہ کھولا اور کبیر کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہواؤں کو دیکھ کر بے ساختہ پوچھا۔

"کبیر..... خیر تو ہے۔ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو.....؟"

"چاچا..... خیر نہیں ہے۔ آپ چاچی کو لے کر ہمارے گھر آئیں..... پانچ منٹ کے اندر راحت علی اور اس کی بیوی مسکینہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں تھے۔

کبیر کی والدہ واقعی اس جہاں سے اس جہاں میں پہنچ چکی تھیں۔ اجہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

راحت علی اور اس کی بیوی نے اندازہ لگا لیا کہ کبیر کی ماں کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہے۔

کبیر نے رونا شروع کر دیا۔ اتنی دیر میں محلے والوں کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ محلے میں کیا واردات ہو چکی ہے۔ بہرحال ابھی وہ تھانے میں آنے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ قدیم آ گیا۔

اسے جب صورت حال کے متعلق پتہ چلا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی کبیر کو گلے لگا کر تسلی دی اور محلے والوں کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر نمبردار کے دروازے پر پہنچ گیا اور ساری صورت حال اس کے گوش گزار کر دی۔

"خیر..... قصہ مختصر..... نمبردار اسے لے کر میرے

Digitized by Google

پاس آ گیا۔ یہ حالات جان کر بہت سے سوالات سر اٹھا کر سامنے آ کھڑے ہوئے لیکن حالت کا تقاضہ یہ تھا کہ میں جلد از جلد قدیر کے گھر پہنچ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

میرے ساتھ کانسٹیبل آفتاب اور سپاہی قاسم تھے۔ قدیر کا مکان گاؤں کے وسط میں تھا۔ سات مرلے پر بنا ہوا یہ مکان ویسا ہی تھا۔ جیسا گاؤں دیہات میں ہوتا ہے۔ دو کمرے مغرب کی طرف بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے برآمدہ تھا۔ بیرونی دروازے (جس کا رخ سورج کی طرف تھا) کے بائیں طرف ایک کچا کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں ڈور ڈنگر (مویشی) تھے۔ بظاہر صورت حال یہی بنتی تھی کہ رسہ گیر دیوار پھاند کر آئے۔ ان کا ارادہ دونوں بھینسوں کو کھول کر لے جانے کا تھا لیکن اچانک قدیر کی ماں کی آنکھ کھل گئی ہوگی..... چوروں نے اس کا گلہ گھونٹ کر بھاگ نکلنے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی لیکن اس سارے سیٹ اپ میں ایک بات بالکل فٹ نہیں بیٹھ رہی تھی کہ بارہ سالہ کبیر کی آنکھ اس سارے ہنگامے یا دھینگا مشتی میں کیوں نہیں کھلی..... میں نے سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا۔ گردن پر گلا گھونٹنے کے نشان بڑے واضح تھے آنکھیں بھی حلقوں سے باہر آئی ہوئی تھیں۔ وہ عورت ذات تھی۔ میں اس کے کپڑوں کے نیچے تو کوئی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جہاں جہاں میری نظریں جا رہی تھیں، یعنی ہاتھوں پر، پاؤں پر، سر کے اوپر، ماتھے پر، وہاں کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بہر حال صحیح صورت حال تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے واضح کرنی تھی۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد کانسٹیبل آفتاب کی نگرانی میں لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور خود نمبردار کے مکان کے حجرے میں ڈیرہ جما لیا۔

نمبردار کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا..... مکان کیا تھا۔ ایک حویلی سی تھی۔ حویلی کے ماتھے پر سنگ مرمر کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ جس پر تحریر تھا نمبردار، ملک نصیر.....

میں نے سپاہی قاسم کو حجرے کے باہر کھڑا کر دیا اور جو بندے میں نے سوال و جواب کے لیے منتخب کیے تھے۔ اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ انہیں باری باری بھیجے..... آگے بڑھنے سے پہلے چند باتیں آپ کے گوش گزار کر دوں۔

میں نے کھروں کی تلاش میں قدیر کے گھر میں کافی باریک بینی سے کام لیا تھا۔ لیکن..... ایک تو صحن اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ دوسرے لوگوں نے کھروں کا ستیاناس مار دیا تھا۔ مویشی والے کمرے میں..... کیونکہ وہاں کی زمین کچی تھی..... البتہ بیرونی دیوار پر مجھے کسی کے چڑھنے کے واضح نشان ملے تھے..... یہ کم از کم دو بندوں کے جوتوں کے نشان تھے اور میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ پہلے انہوں نے دیوار کے پاس بیٹھ کر چرس سے بھرے سگریٹ پیے تھے جو ٹوٹے مجھے ملے تھے۔ ان سے چرس کی مخصوص بو آ رہی تھی..... پاس ہی بگلہ مار کہ (جو ان دونوں ایک مشہور سگریٹ تھا) کی خالی ڈبی بھی پڑی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں میں نے سپاہی کے پاس محفوظ کروا دی تھیں۔ دیوار کم از کم دو فٹ اونچی تھی۔ دراز قامت شخص بھی دیوار پر کسی سہارے کے بغیر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ آپ کو کہانی پڑھتے ہوئے کی الجھن سے بچانے کے لیے یہ بتا دیتا ہوں کہ چور ڈاکو اور رسہ گیر یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ایک بندہ دیوار کی ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے کاندھوں کے اوپر ایک بندہ چڑھ جاتا ہے۔ پھر نیچے بیٹھا ہوا آدمی آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لے کر اوپر اٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ اوپر والے آدمی کے ہاتھ دیوار کی منڈیر کو چھو لیتے ہیں۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اس طریقے پر اس لیے مجھے یقین تھا۔ کیونکہ رگڑ کے نشان تقریباً زمین سے آٹھ فٹ اوپر تھے۔ اس طرح اس واردات میں کم از کم تین بندے ملوث تھے۔ ان میں ایک بندہ باہر ہی بیٹھا رہا ہوگا۔

اصل صورت حال تو اس وقت پتا چلتی جب وہ میرے ہتھے چڑھتے۔ ویسے گلی میں بھی لوگوں نے کھروں کا کباڑا کر دیا تھا۔ اب مجھے اپنی عقل پر بھروسہ کرنا تھا اور تفتیش کی چکی میں ہر اس شخص (مرد و زن) کو ڈالنا تھا۔ جس سے کچھ معلومات ملنے کی توقع تھی۔ سب سے پہلے سپاہی نے راحت علی کو میرے پاس بھیجا۔

راحت علی پچاس سالہ ایک دھان پان گورے رنگ کا ایک صلح جو بندہ لگتا تھا۔ اسے میں نے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا سلسلہ کو شروع کرتے ہوئے کہا۔

"راحت علی..... کچھ اپنے پڑوسیوں کے متعلق تو

Digitized by Google

بتاؤ۔"

"تھانیدار صاحب..... ہر شخص نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ قدیر کا باپ نذیر اچھا بندہ تھا۔ ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ یہ گھرانہ خوشحال ہے۔ ان کی دس ایکڑز زرعی زمین ہے۔ اچانک اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ زمینوں پر کام کی نگرانی کرتے ہوئے نذیر کو سانپ نے ڈس لیا۔ سانپ اتنا زہریلا تھا کہ اسپتال پہنچانے کی نوبت ہی نہیں آئی..... اس کے بعد زمینوں کا سارا نظام نذیر کی بیوہ نے سنبھال لیا۔ کیونکہ دونوں بڑے بیٹے قدیر اور منظور آوارہ ہو گئے تھے..... اس سے آگے والی کہانی میں ابھی نہیں سناؤں گا۔ راحت علی کی بیوی نے جو باتیں بتائی تھیں وہ بھی تقریباً وہی تھیں۔ ابھی قدیر اور کبیر سے سوال و جواب کرنے کا موقع نہیں تھا۔ دوسرے وہ کہاں بھاگے جا رہے تھے؟ اس کے بعد نمبردار آیا تو..... میں نے نمبردار کو اپنے سامنے بٹھالیا اور راحت علی اور اس کی بیوی کی سنائی ہوئی کہانی اس کے سامنے رکھ دی..... نمبردار نے چند لمحے غور کیا۔ پھر بولا۔

"جناب..... یہ ساری کہانی سچی ہے۔"

"پھر..... تمہارے خیال میں قاتل کون ہو سکتا ہے.....؟"

"تھانے دار صاحب..... میں اس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"نہیں..... نصیر..... تم کوئی خیال ظاہر کرو گے تو بات آگے بڑھے گی۔ ورنہ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی تو ہے نہیں۔ جو میں اس کے زور پر قاتل تک پہنچ جاؤں۔" میں نے اس کے دل کی باتیں نکالنے کے لیے کہا۔

"میری عقل کی سوئی تو ایک ہی نقطے پر آ کر رک جاتی ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کھل کر بات کرو..... نصیر....."

"میرا ذہن تو رسہ گیروں پر ہی اٹک رہا ہے۔ وہ آئے تو ڈنگر چوری کرنے کے لیے ہی ہوں گے۔ لیکن وزیر بیگم (قدیر وغیرہ کی ماں) کی آنکھ کھل جانے کی وجہ سے اس کا گلا گھونٹ کر چلتے بنے....."

"تمہاری بات میں وزن تو ہے لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے کہ چور ڈاکو ایسے مواقع پر بھاگنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ قاتل بننا پسند نہیں کرتے۔"

"ہو سکتا ہے..... وزیر بیگم نے کسی کو پہچان لیا ہو.....؟" نمبردار نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"اب تم نے حقیقت کے قریب بات کی ہے۔ لیکن.....؟" میں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لیکن..... کیا.....؟ تھانیدار صاحب؟"

"لیکن..... یہ ملک نصیر کہ پاس لیٹے ہوئے کبیر کی آنکھ کیوں نہیں کھلی۔ میری سوئی جس نقطے پر آ کر اٹک گئی تھی وہ نقطہ میں نے بڑے طریقے سلیقے سے اس کے ذہن میں اتار دیا۔

قارئین میرے ذہن میں اے ایس آئی جاوید خان کی باتیں بھی گردش کر رہی تھیں۔ ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

"ہاں یہ بات بھی قابل غور ہے۔"

"ٹھیک ہے..... نصیر..... اب میں تھانے چلتا ہوں۔ تم اردگرد کے جرائم پیشہ لوگوں پر نظر رکھو۔"

"اوہ..... تھانیدار صاحب، اس سارے گورکھ دھندے میں، میں آپ کی خاطر تواضع تو بھول ہی گیا۔" نمبردار نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"پھر کبھی موقع ملا تو تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیں گے۔" یار زندہ صحبت باقی..... میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد میں نے سپاہی قاسم کو ساتھ لیا اور تھانے میں واپس آ گیا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر جب اپنے کوارٹر سے نکلا..... تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

ابھی میں تھانے سے تھوڑی دور ہی تھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی، بہر حال غنیمت یہ ہوا کہ یہ بوندا باندی تیز بارش میں تبدیل نہیں ہوئی۔ البتہ آثار یہی بتا رہے تھے کہ بارش موسلا دھار ہو گی اور سردی بڑھ جائے گی۔

موسم جیسا بھی ہو۔ تھانے کے کام تو چلتے رہتے ہیں۔

تقریباً دس بجے تک واقعی موسلا دھار بارش ہوتی رہی..... پھر نہ صرف بارش رک گئی بلکہ آسمان کہیں کہیں سے نیلا نظر آنے لگا۔ یہ نظارا میں نے تھانے کے برآمدے میں آ کر کیا تھا۔ تھانے کے صحن میں نیم کا ایک گھنا پیڑ بھی

Digitized by Google

تھا۔ جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا تھا۔

چیز کڑوی ہے مگر دھوپ سے بچنے کے لیے
نیم کا پیڑ بھی آنگن میں اگا لیتے ہیں

یہ شعر اپنی جگہ پر..... لیکن ایک اور سین نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ بارش تو رک چکی تھی لیکن نیم کے پتوں سے پانی یوں ٹپک رہا تھا جیسے کسی حسینہ نے بارش میں نہا کر بال کھلے چھوڑ دیئے ہوں..... پتہ نہیں میں کتنی دیر اور اس حسین منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا کہ سپاہی قمر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لاش آ گئی ہے۔''

''اوہ..... قمر کیا مقتولہ کے لواحقین لاش لینے آ گئے ہیں۔'' میں نے سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک کوئی نہیں آیا سر.....''

''ٹھیک ہے..... تم پوسٹ مارٹ کی رپورٹ میرے کمرے میں رکھ دو۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''آدھا گھنٹہ انتظار کر لو۔ اس کے بعد جا کر لاش کی آمد کی اطلاع مقتولہ کے لواحقین کو دے آنا۔ میرا مطب ہے اگر وہ آدھے گھنٹے میں بھی نہ آئیں۔''

''او کے..... سر.....'' سپاہی نے ایڑی بجا کر مجھے سلیوٹ کیا اور میرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد میں رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

رپورٹ میں کچھ باتیں تو وہی تھیں، یعنی مقتولہ کا گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا..... البتہ ایک بات نے مجھے چونکا دیا۔ لکھا تھا۔ جب مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا تو وہ کسی بے ہوش کر دینے والی دوا کے زیر اثر تھی۔ بلکہ ڈاکٹر نے کلیئر لکھا تھا کہ وہ کلوروفام کے زیر اثر تھی۔ رپورٹ نے میری اس تھیوری پر لائن پھیر دی کہ مجرم مونٹی چوری کرنے آئے تھے اور اب مجھے اس بات کا جواب بھی مل گیا تھا کہ پاس سویا ہوا کبیر کیوں نہیں جاگا تھا؟

البتہ جس طرح کہتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے۔ رپورٹ سے یہ بات بھی نکل آئی تھی کہ اگر مجرم یعنی قاتل ڈنگر چوری کا ڈرامہ اسٹیج کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے مقتولہ کو کلوروفام کیوں سنگھایا۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ قاتلوں سے کوئی حماقت سرزد ہو چکی ہے۔ انہوں نے معاملے کو سلجھانے کے چکر میں معاملے کو بالکل کلیئر کر دیا تھا۔ بعض اوقات ایسے بھی ہو جاتا تھا۔ کواجب ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی بھی بھول جاتا ہے۔

ای میں رپورٹ پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے اپنے کمرے کے دروازے میں ایک بار پھر سپاہی قمر کی شکل نظر آئی..... پھر اس کے لب ہلے اور اس کی تصویر کے ساتھ اس کی آواز بھی سنائی دی۔

''سر..... مقتولہ کے لواحقین آ گئے ہیں۔ لاش لینے۔''

''ٹھیک ہے..... تم محرر سے کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیے کہو۔'' کچھ ہی دیر بعد یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

اسی شام میں نے کانسٹیبل آفتاب کو ساتھ لیا اور قدیر کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت تک مقتولہ کو منوں مٹی تلے پہنچا دیا گیا تھا۔ گھر میں مہمانوں اور محلے والوں کا جم غفیر تھا۔ مردوں میں نمبردار بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اور کانسٹیبل نے پہلے وہاں بیٹھ کر مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کی..... پھر میرے کہنے پر نمبردار مجھے اپنے حجرے میں لے گیا۔ کانسٹیبل آفتاب کو میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

''تھانیدار صاحب..... موسم کچھ سرد اور خشک ہے۔ اب تو آپ کو میری دعوت قبول کرنی پڑے گی۔'' اس نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''نمبردار..... کام کرنا ہے۔ میں یہاں دعوتیں اڑانے نہیں آیا۔'' میرے خشک لہجے کو محسوس کر کے اس کے جذبات برف ہو گئے۔ اور وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ جو حکم کریں..... میں حاضر ہوں۔''

''دیکھو..... میں اپنے فرض سے مجبور ہوں..... تم قدیر اور کبیر کو میرے پاس لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے..... تھانیدار صاحب..... میں ابھی لے کر آتا ہوں..... وہ نکلنے لگا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے کبیر کو اندر بھیجنا..... اور قدیر کو باہر اپنے پاس رکھنا۔'' وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

یہ کیس ایسا تھا جو مجھے لوہے کے چنے چبوا سکتا تھا.....

Digitized by Google

میرے ذہن میں راحت علی کی بیان کردہ کہانی بھی گھوم رہی تھی..... آپ ذرا صبر کریں۔ وہ کہانی بھی، جہاں سے میں نے چھوڑی تھی آپ کو سنا دوں گا۔

دس منٹ بعد کبیر میرے سامنے تھا..... وہ بارہ سالہ گورے چٹے رنگ کا لڑکا تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں..... رو رو کر اس کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ میرے اظہار ہمدردی کرنے سے وہ رونے لگ گیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا..... اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو میں نے اسے کہا..... کبیر میں تمہاری والدہ کو واپس تو نہیں لا سکتا، البتہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہاری والدہ کے قاتل یا قاتلوں کو عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔'' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں تو خود حیران ہوں۔ حالانکہ ذرا سے کھٹکے سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔''

''کیا تم صبح معمول کے مطابق اٹھے تھے؟''

''اوہ..... تھانیدار صاحب..... چند لمحے وہ رکا پھر بولا..... اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو انکل کہہ لوں۔''

اس کی اس معصومانہ خواہش پر میری آنکھوں میں نمی آ گئی..... اور میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''بالکل..... بیٹا..... تم مجھے بلا جھجک انکل کہہ سکتے ہو۔''

''انکل..... میں صبح معمول سے کم از کم ایک گھنٹہ بعد میں بیدار ہوا تھا۔''

''ٹھیک..... تم اس بات کی زیادہ ٹینشن نہ لو..... یہ بتاؤ..... تمہارے خیال میں کیا مجرم تمہارے ڈنگر چرانے آئے تھے یا؟''

کبیر کا جواب سنانے سے پہلے ایک بات آپ کو بتا دوں یہ بات بتانا میں پہلے بھول گیا تھا کہ قاتل جاتے ہوئے بیرونی دروازے کے راستے سے گئے تھے۔ انہوں نے باہر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ صرف کواڑوں کو آپس میں ملا کر بند کیا تھا۔

''انکل لگتا تو یہ ہے کہ وہ میری ماں کو قتل کرنے آئے تھے، اس بارہ سالہ لڑکے نے اچانک ایسی بات کہہ دی تھی کہ میرے جیسا گرگ باراں دیدہ بھی حیران رہ گیا تھا۔

''بیٹا..... کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''نہیں..... میں کسی پر شک ظاہر نہیں کر سکتا۔''

تمہارے والد صاحب کے مرنے کے بعد تمہارے دونوں بڑے بھائی آوارہ ہو گئے تھے..... اور یہی آوارگی اور بے راہ روی تمہارے بھائی منظور کو کھا گئی۔ کیا تمہارا شک اس طرف نہیں جاتا۔''

''انکل..... آج کل ان کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔'' میرے خیال میں ان کو کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے..... بیٹا۔ اب تم اپنے گھر جاؤ..... میں ایک دفعہ پھر اپنا وعدہ دہراتا ہوں۔''

''انکل..... خدا آپ کو اس کا اجر دے گا.....'' وہ چلا گیا..... اور میرے ذہن میں ایک گرہ سی ڈال گیا۔

قارئین اتنا عرصہ گزر جانے کے باجود مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھا کہہ رہا ہو۔ انکل خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ یہ باتیں، یہ دعائیں اور جذبات ہی تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اس کے جانے کے بعد قدیر میرے پاس آ گیا۔

قدیر کے ساتھ بھی میں نے اظہار ہمدردی کیا اور کہا۔

''قدیر..... یہ وقت ایسا تو نہیں کہ میں تم سے سوال و جواب کروں لیکن.....'' میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے فرض سے مجبور ہوں..... میں جلد از جلد قاتلوں کو قانون کے کٹہرے میں لانا چاہتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب..... میں سب سمجھتا ہوں..... کاش میں اپنے دوست عارف کے پاس نہ جاتا.....'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

''تمہارا دوست کہاں رہتا ہے.....؟''

''قریبی شہر میں.....''

''اس نے شہر کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں یہاں شہر کا نام لکھنے کی بجائے صرف اتنا لکھوں گا کہ یہ قریبی شہر ہمارے تھانے سے صرف پچیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

''کیا اس سے تمہیں کوئی ضروری کام تھا.....''

''دراصل والدہ نے مجھے اس سے پیسے لینے بھیجا تھا۔

Digitized by Google

اس کی شہر میں بہت بڑی آڑھت کی دکان ہے۔"

"کیا تم پیسے لے کر آئے ہو۔"

"جی اس نے تین ہزار دیا ہے۔ باقی تین ہزار دینے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے۔"

"مجھے پتہ چلا ہے کہ تم آوارہ ہو گئے ہو۔ جوا بھی کھیلتے ہو۔ شہر کے بازارِ حسن میں جاتے ہو اور....." میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر مجھے امید تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔

"بس تھانیدار صاحب..... میں بہت غلط، گندا اور گناہگار آدمی ہوں۔ جب ماں نہیں رہی تو مجھے احساس ہوا ہے کہ میں سب کچھ غلط کرتا رہا ہوں..... اب میں صرف اپنے گھر اور بھائی پر توجہ دوں گا۔" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آنا چاہتا ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات قدیر، توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ لیکن قدیر، مجھے ایک بات الجھن میں ڈال رہی ہے۔"

"کونسی بات؟" وہ یوں چونک کر بولا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو.....

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس وقت اپنے دوست سے ملنے گئے تھے؟"

"تقریباً دو بجے۔"

"جس شہر میں تم گئے تھے وہاں بس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر تمہاری واپسی اگلی صبح نو بجے کے قریب کیوں ہوئی۔"

"تھانیدار صاحب..... کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟"

"تم اس بات کو چھوڑو۔ ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے ہی چلتی ہے۔ میرے سوال کا سچا اور کھرا جواب دو۔"

"اگر آپ اس بابت نہ پوچھیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی....." اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

میں چونک گیا..... مجھے اس قسم کا کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔ لیکن..... اس کے جواب نے ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں چور سا ضرور گھسا دیا تھا۔

"دیکھو..... قدیر..... سب کچھ سچ سچ بتا دو، ورنہ پروں سے کوا بھی بن سکتا ہے۔" میں نے ذومعنی جملے کہہ کر اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

وہاں بدحواسی کے آثار نمایاں تھے۔

"تھانیدار صاحب۔ اس بات کو پردۂ راز میں ہی رہنے دیں۔ میں قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا تعلق میری والدہ کے قتل کے ساتھ نہیں ہے۔"

"پھر تم خوامخواہ سسپنس کیوں پھیلا رہے ہو۔ یہاں کوئی جاسوسی ناول اسٹیج نہیں ہو سکتا۔ برخوردار..... قتل کی تفتیش ہو رہی ہے۔" میں نے لہجے کو ذرا سخت کرتے ہوئے کہا۔

"وہ میں ذرا فریدہ بائی کے کوٹھے پر رک گیا تھا....." اس نے نظریں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ میں یہاں بیٹھے بیٹھے تمہاری ہر بات کا یقین کر لوں گا۔"

"آپ بے شک جہاں مرضی اپنا بندہ بھیج کر اپنا شک رفع کریں لیکن میری آپ سے ایک التجا ہے کہ میری والدہ کے قاتلوں کو قانون کے شکنجے میں ضرور لیں۔

"میں اسی لیے یہ سارے پاپڑ بیل رہا ہوں..... لیکن میں کوئی شرلاک ہومز جیسا کردار نہیں ہوں۔ بلکہ میرا تعلق جیتی جاگتی دنیا سے ہے۔ اس لیے تم کوئی شک وغیرہ ظاہر کرو گے تو بات آگے بڑھ سکے گی۔ میں نے صاف کوئی کا امر بتا۔ اس کے کانوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو شک نورین پر ہے۔ یہ ڈائن پہلے میرا بڑا بھائی منظور کھا چکی ہے۔"

"چلو..... ٹھیک ہے۔ تم گھر جاؤ۔ لیکن تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جانا۔"

اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔" اس نے کہا۔

"شاباش جاؤ اپنے ذہن کو نہ الجھاؤ....." وہ چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے نمبردار آ گیا..... آتے ہی کہنے لگا۔

"یہ لونڈا کیا کہتا ہے؟"

"مجھے یہ مشتبہ لگتا ہے۔ کافی باتیں وضاحت طلب ہیں..... اور ان کی تصدیق لازمی ہے۔"

Digitized by Google

''میں حاضر ہوں.....'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

''جب تمہاری کسی خدمت کی ضرورت پیش آئے گی تو تمہیں ضرور زحمت دی جائے گی۔ فی الحال تم میت والے گھر جا کر بیٹھو..... اور کانسٹیبل آفتاب کو بھیج دو۔''

.....☆☆.....

تھانے کا فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ میں اور آفتاب پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ ویسے بھی گاڑی میں نے واپس بھجوا دی تھی۔ میرے خیال میں ذہنی جمناسٹک کے بعد پیدل چلنے سے نہ صرف ذہن فریش ہو جاتا ہے بلکہ ٹانگوں کے سوئے ہوئے مسل بھی چاک و چوبند ہو جاتے ہیں۔ راستے میں، میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''کیوں بھئی..... اس قتل کے بارے میں خلق خدا کیا کہتی ہے؟''

''سر..... ایک بات بہت افسوس ناک ہے۔ میت والے گھر میں بھی لوگ ایک دوسرے کی چغلی کرنے سے نہیں چوکتے۔ گھر میں رونا دھونا پڑا ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ اپنی علیحدہ منڈلی لگائے بھانت بھانت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی سر..... ایسی ہی ایک منڈلی میں بیٹھ گیا تھا۔

''پھر..... ایسے لوگوں کی باتوں سے کیا گل کھلا؟''

''لوگ کہتے ہیں کہ اپنی ماں کا قاتل قدیر ہی ہے۔ پھر اس کی وجہ بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔''

''یہ سب کہانی مجھ تک پہنچ چکی ہے لیکن اس کیس کی کچھ کڑیاں ابھی گم ہیں۔''

پھر میں نے نہایت تفصیل سے سارے حالات اس کے سامنے رکھ دیئے۔

''سر..... ہر کوئی اپنی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے۔ کبیر کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ قاتل اس کی والدہ کو قتل کرنے آئے تھے اور قتل کر کے چلتے بنے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ورنہ کلوروفارم میں ڈوبا ہوا رومال اپنے پاس رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ نمبردار اور میت کے گھر میں بیٹھے لوگ شک قدیر پر ظاہر کر رہے ہیں اور حالات بھی اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔''

ان باتوں کے یہاں تک پہنچتے ہی تھانہ آ گیا اس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

''اگلی صبح میں نے تین سپاہیوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ قاسم، قمر اور ریحان تھے۔ قاسم کو میں نے بازار حسن میں فریدہ بائی کے کوٹھے پر بھیج دیا۔ قمر کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ آڑھت منڈی میں عارف آڑھتی کے پاس جائے اور قدیر کے بیان کی تصدیق کر آئے اور ریحان کو یہ حکم دیا کہ وہ مخبر آپا شاہین کو بلا لائے اور میرے کوارٹر میں بٹھا دے۔ دراصل ہمیں مخبروں کو خفیہ رکھنا پڑتا تھا۔ سہ پہر تک سارے کام ہو گئے۔

آڑھتی عارف نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ اس نے قدیر کو تین ہزار روپے دے دیئے تھے۔ اور وہ شام ڈھلے اس کے پاس سے رخصت ہو گیا تھا۔

لیکن فریدہ بائی نے میرے دل میں موجود شک کو تقویت دے دی تھی۔ اس کے بقول بات تو پوری رات کی ہوئی تھی۔ لیکن رات دو بجے اچانک قدیر یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ نہ جانے اس کے دل کو کیا ہو رہا ہے۔ اس نے قدیر کے میڑھیاں اترتے ہی کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تھا۔

قدیر ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

بہرحال جو بات جواب طلب تھی، وہ یہ تھی کہ اگر قدیر بازار حسن سے رات دو بجے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا تو اسے زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین بجے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

''اور یہ بات بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق وزیر بیگم کی موت تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔

حالات و واقعات ہیر پھیر کر قدیر کی طرف اشارہ کر رہے تھے لیکن کچھ سوال ہنوز جواب طلب تھے؟ اور یہ معاملہ ہنوز دلی دور است والا تھا.....

''آپا شاہین جیسے کردار ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ انہیں گھر گھر کی خبریں ہوتی ہیں چار دیواری کے اندر کے راز، ایسی ایسی باتیں انہیں معلوم ہوتی ہیں کہ عام مرد و زن کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی اور اگر ایسی عورتیں مخبری کا کام کریں تو تھانیداروں کے لیے پیچیدہ کیس حل

Digitized by Google

کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں..... ویسے تو کہتے ہیں کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں، لیکن اگر یہ عورتیں مخبر ہوں تو بڑی رازداری کے ساتھ سارے کام کرتی ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں کئی بار آپا شاہین کو آزمایا تھا اور یہ سب آپ پچھلی کہانیوں میں پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے اس کیس کی ساری روداد میں نے اس کے گوش گزار کردی۔

نورین کے متعلق اس نے بتایا کہ غریب مگر خوب صورت عورت ہے۔ خاوند ایک سال سے بستر کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس پر ایک سال پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا۔ نورین دو تین گھروں میں کام کرتی ہے۔ وہاں سے اسے روٹی بھی مل جاتی ہے۔ کپڑے بھی اسے دے دیئے جاتے ہیں اور جو پیسے اسے ملتے ہیں، اس سے بیمار خاوند کا علاج کروا رہی ہے۔ صحیح معنوں میں وفا کی دیوی ہے۔

''اس کے کردار پر کچھ لوگوں نے انگلیاں اٹھائی ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب..... میرا دل کرتا ہے کہ میں ایسے لوگوں کا منہ نوچ لوں..... یہ لوگ خود من کے گندے ہوتے ہیں.....'' اس نے غصے سے کہا۔

''تم بھی ایک عورت ہو شاہین، زیادہ جوان بھی نہیں ہو۔ نورین کا خاوند بستر مرگ پر پڑا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ جوان بھی ہے اور حسین بھی.....''

''بس یہ سمجھ لیں..... کہ اس نے اپنے جذبات کو حالات کی بھاری بریلی سل میں دبا دیا ہے۔''

''دیکھو..... شاہین..... رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے، کچھ تو بات ہے چاہے وہ منفی ہو مثبت.....''

''میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں..... آپ بالکل فکر نہ کریں، میں جلد ہی زمین کی تہہ میں چھپی بات بھی آپ تک پہنچا دوں گی۔''

اس کو رخصت کرنے کے بعد میں تھانے میں واپس آ گیا۔

اب مجھے تھانے کے ریکارڈ میں موجود جرائم پیشہ افراد کو تفتیش کی چکی میں پھنسنا تھا۔ ایسے افراد بڑے کایاں ہوتے ہیں۔ قانون کو سمجھتے بھی ہیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی دکھتی رگیں ہمارے پاس ہوتی ہیں۔ جن کو چھیڑ کر ہم اپنے مطلب کی باتیں ان کے پیٹ سے نکلوا لیتے تھے۔

''شام تک کل سات افراد ہمارے قابو میں آ گئے تھے۔

سب کے ساتھ جو سوال و جواب ہوئے تھے۔ وہ اگر سارے لکھتے جاؤ تو کہانی کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

''بہر حال وو بندوں سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں انہیں حوصلہ افزا کہا جا سکتا تھا۔

''ان میں ایک کا نام صفدر جب کہ دوسرا فیروز عرف چترا کملا تھا اس کے چہرے پر برص کے نشان تھے۔

میں نے پہلے دونوں سے الگ الگ سوال و جواب کیے تھے۔ پھر دونوں کو اکٹھا بٹھا لیا تھا۔

''دیکھو..... صفدر اور چترا تم اس تھانے سے باہر نہیں جا سکو گے۔''

''آپ ہمیں خوامخواہ ایک ایسے جرم میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہم نے کیا ہی نہیں ہے۔ یہ ہمیں قدیر کی کارستانی لگتی ہے۔ فیروز عرف چترا نے کہا۔

''دیکھو..... یہ واردات کم از کم تین بندوں نے کی ہے۔ اگر قدیر اس میں شامل ہے تو باقی دو بندے تم ہی ہو سکتے ہو.....''

وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر قسمیں کھانے لگے۔ جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ میں نے صفدر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

تم سگریٹ کونسی پیتے ہو؟

''دونوں نے اپنے اپنے برانڈ نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے..... ایک برانڈ وڈبائن تھا، جب کہ دوسرا بگلا تھا۔

''چترا صاحب، تو آپ بگلا برانڈ سگریٹ پیتے ہیں۔''

''تھانیدار صاحب..... تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔''

میں نے ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر سونگھا..... وہ سادہ تھا۔ میں نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

''چرس کونسی جیب میں رکھی ہوئی ہے؟''

''چرس.....'' اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

پھر وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب..... میں کبھی کبھی اس سے شغل

Digitized by Google

کر لیتا ہوں۔ لیکن ہر وقت اپنے پاس نہیں رکھتا۔"

"اور تم....." میں نے صفدر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی کبھی کبھی ہی پیتا ہوں۔" اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ بے شک تلاشی لے لیں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں دراز سے جائے واردات سے ملنے والی ڈبی نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈبی تم لوگوں نے ہی قدیر کے مکان کی دیوار کے ساتھ پھینکی تھی۔"

"بالکل نہیں..... ہم تو وہاں گئے ہی نہیں۔ تھانیدار صاحب اگر معاملہ چرس اور بگلا برانڈ سگریٹ کا ہے تو آپ دارے کو ٹٹول لیں۔" صفدر نے کہا۔

یہ لوگ ایسے تھے..... جب اپنے اوپر کوئی الزام آتا تھا..... تو ادھر ادھر کی باتیں، اور معلومات اگل دیتے تھے۔

"یہ دارا کون ہے.....؟"

"یہ ڈنگر چور ہے۔ لیکن ابھی تک آپ کے ہتھے نہیں چڑھا۔ ورنہ اب تک سلاخوں کے پیچھے ہوتا....." صفدر نے مجھے مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے مجھے بھٹکانے کی کوشش کی تو..... مجھے اچھی طرح جانتے ہو..... چار پانچ سال کے لیے تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہمیں حوالات میں بند کر دیں، جب آپ کی تشفی ہو جائے تو چھوڑ دیجئے گا۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ لیکن میں نے انہیں اس تاکید کے ساتھ رخصت کر دیا کہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں۔ اور..... اسے ایس آئی جاوید خان کو بلا لیا۔ جاوید خان مضبوط جسم کا ایک لمبا تڑنگا بندہ تھا۔ تعلق صوبہ سرحد (آج کل خیبر پختونخواہ) کے ساتھ تھا۔ جیدار اور ذہین تھا۔ عمر کی کم از کم پچاس بہاریں دیکھ چکا تھا۔

"جاوید خان..... دارا کے متعلق کچھ پتہ ہے۔"

"سر..... یہ منگھیری (موجودہ ساہیوال) کا رہنے والا ہے۔ وہاں ایک دفعہ ڈنگر چوری میں پکڑا گیا تھا۔ تین سال قید کاٹ کر آیا ہے۔ سر دراصل میں یہاں آنے سے پہلے وہاں کے ایک تھانے میں تھا۔"

"اوہ..... یہ تو اندھے کے ہاتھ بٹیر آنے والی بات ہے۔ آج کل سنا ہے وہ یہاں آ گیا ہے۔" میں نے صفدر اور چترا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔

"یہاں آ گیا ہے تو پھر ہمارے تھانے کی حدود میں رسہ گیری کی وارداتوں میں وہی ملوث ہو سکتا ہے اور سر..... یہ بات بھی آپ کو بتا دوں کہ وہاں میں نے ہی اسے گرفتار کیا تھا.....

اور اب بھی لگتا ہے کہ تمہارے ہاتھوں ہی اپنے انجام کو پہنچے گا۔

"سر..... آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں مخبروں کا جال پھیلا دیتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ چترا اور صفدر اس کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھے۔

اس کے بعد میں نے قدیر کو ایک دفعہ پھر بلا لیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنا پڑے گا۔"

"جناب..... آپ میرے اوپر وقت ضائع کرنے کی بجائے ادھر ادھر بھی تفتیش کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اپنی ماں کو قتل نہیں کیا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"میں نے فریدہ بائی سے معلومات حاصل کر لی ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر..... وہ سراسیمہ نظر آنے لگا۔

"تم وہاں سے دو بجے رات ہی نکل آئے تھے۔ فریدہ بائی نے تمہیں خود بازار میں کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری والدہ کو تین اور چار بجے کے دوران موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

"اوہ..... کاش میں، سیدھا گھر پہنچ جاتا....." وہ اپنے بال نوچنے لگا۔ اس دوران وہ کہتا جاتا تھا، تبھی تو میرے دل کو اس رات دو بجے ہی کچھ ہونے لگا تھا۔ کاش میں فریدہ بائی کے کوٹھے پر نہ جاتا..... سیدھا گھر آ جاتا..... ہائے میری ماں..... یہ کیا ہو گیا؟ واقعی سیانے صحیح کہتے ہیں کہ برائی کی راہوں پر چلنے والے اس وقت خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں۔ جب ان کا ایسا نقصان ہو چکا ہوتا

Digitized by Google

ہے، جس کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔ پھر جو وہ رویا ہے تو مجھ سے اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ میں نے اپنی مدد کے لیے سپاہی قمر کو بھی بلالیا۔

میں حیران تھا کیونکہ وہ اداکاری نہیں تھی۔ حقیقت تھی۔ بڑے سے بڑا مجرم بھی ایسی اداکاری نہیں کرسکتا تھا۔ وہ قاتل نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر قاتل کون تھے؟ اس کیس میں تو مجھے صحیح معنوں میں دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ یہ کہیں لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا۔

ماں بیٹے کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اگر دکھ میں ہو تکلیف برداشت کررہا ہو تو دوسرا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب وہ یعنی قدیر سنبھل گیا تو اس نے بتایا کہ اس کا ارادہ فریدہ بائی کے کوٹھے پر رات بھر رہنے کا تھا۔ لیکن دو بجے کے قریب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل کوئی مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو اور اندر سے آواز آرہی تھی۔ جلدی گھر پہنچو..... اسی لیے وہ دو بجے فریدہ بائی کے کوٹھے کی سیڑھیاں اتر آیا خوش قسمتی سے بازار میں اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ڈرائیور کو اپنے گاؤں کا پتہ بتایا اور ٹیکسی میں گر سا گیا۔

لیکن ابھی ٹیکسی نے آدھی مسافت بھی طے نہیں کی تھی کہ اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کی جیب میں پیسے تھے..... اس نے ڈرائیور کو قریبی اسپتال میں چلنے کے لیے کہا۔

''قصہ مختصر..... کہ صبح آٹھ بجے تک اسے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس لیے وہ گھر نو بجے پہنچا اور وہاں جو حالات تھے اس کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہاں تک سنا کر اچانک وہ جوش میں آ گیا اور ذرا اونچی آواز میں بولا۔

تھانیدار صاحب۔ بعض والدین بھی ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ اپنا ہر فیصلہ بچوں پر ٹھونستے ہیں۔ یہ نہ کرو، وہاں نہ جاؤ، اس سے نہ ملو، کہیں تفریح کرنے دور نہ جاؤ، یہ ہوجائے گا وہ ہوجائے گا۔ ہمارے والد صاحب ایسے ہی تھے۔ بچپن سے ہمارے دل میں خوف اور احساس کمتری بیٹھ گیا تھا۔ ہماری والدہ کے ساتھ ہمارے والد صاحب کی لڑائی ہی رہتی تھی..... ہماری والدہ صبر شکر کرنے والی خاتون تھیں..... لیکن ہم سے یہ نہ ہوسکا۔ ہم باغی ہوگئے گھر کے ماحول سے، جب ہم جیسے گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے باہر نکلتے ہیں تو ہماری اڑان، ہمارے قدم وہاں تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ مجھے ایک ہی جھٹکے نے واپس پھینک دیا ہے۔ لیکن آہ میرا بھائی..... منظور..... وہ ان راہوں میں گم ہوگیا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا.....'' آخر میں وہ بولا۔

'' تھانیدار صاحب..... اب میرا ذہن روشن ہوگیا ہے۔ آپ ہمارے آستین کے سانپ کو پکڑیں۔ سب کچھ اگل دے گا۔

میرا ذہن پہلے اس طرف کیوں نہ گیا۔ خیر دیر آید درست آید..... میں نے اسے آرام سے پیار سے نفسیاتی طریقے سے سمجھایا..... کہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کے متعلق بالکل نہ سوچے سب مجھ پر چھوڑ دے۔ اس کے بعد میں نے اسے رخصت کردیا۔

دو دن بعد دارا اور اس کے دو ساتھی ہماری گرفت میں تھے۔ دارے نے چار نمبر..... کی آٹھ خوراکیں کھانے کے بعد سب کچھ اگل دیا۔

''یہ بے حسی لالچ، دیدۂ دلیری اور چوری اور سینہ زوری کی داستان ہے۔

قارئین میں کہانی وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے چھوڑی تھی..... یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد دونوں بیٹے باغی ہوگئے تھے، لیکن یہ بات آدھی صحیح ہے۔ دراصل گھر کے ماحول نے والد کی زندگی میں ہی انہیں گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے فرار حاصل کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد وہ بالکل آزاد ہوگئے۔

آوارگی کا جو زہر وہ اپنے اندر اتار چکے تھے۔ وہ رنگ لے آیا تھا۔ منظور کی دوستی چوہدری فرزند علی کے بیٹے تیمور کے ساتھ کافی عرصے سے تھی، وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ اکٹھے شباب و کباب کی محفلیں سجاتے تھے لوگ انہیں یک جان دو قالب کہتے تھے۔ لیکن اچانک نورین ان کے درمیان آ گئی۔

یہاں یہ بات واضح کردوں کہ آپا شاہین نے اس دوران نورین کے متعلق باقی معلومات مجھ تک پہنچادی تھیں۔

Digitized by Google

نورین پہلے چوہدری فرزند علی کی کوٹھی میں ملازمت کرتی تھی۔ لیکن اس کے لخت جگر تیمور کی آنکھوں میں اپنے لیے ہوس کے بادل منڈلاتے دیکھ کر وہاں سے کام چھوڑ دیا تھا۔ نورین کے کردار کے متعلق تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ ایک دن نورین کو راستے میں روک کر چھوٹے چوہدری تیمور نے کہا۔

"دیکھو..... بلبل..... لاکھ آہ وزاری کرلے۔ لاکھ انکار کرلے لیکن آخر ہمارے پنجرے میں ہی آنا ہے۔" نورین نے کمال جرأت سے کہا۔

دیکھو..... ہر عورت بکنے والی نہیں ہوتی..... میں اپنی عزت کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں..... تم منہ دھو رکھو....." پھر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے گھر آ گئی تھی۔

پھر..... ایک دن اس نے منظور کو راستے میں روک کر کہا۔ منظور تم ایک شریف باپ کے بیٹے ہو۔ چوہدری تیمور میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں بے یار و مددگار ہوں۔ میرا شوہر بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔ لیکن عزت نہیں دوں گی۔ اگر میری جگہ تمہاری کوئی بہن ہوتی تو تم کیا کرتے؟"

منظور گھر میں سب سے بڑا تھا..... ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ کچھ ہی عرصے پہلے (اس وقت) ان کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ منظور، نورین کی باتیں سن کر اندر باہر سے ہل گیا۔ اچانک اس نے جوش سے کہا۔

"آج سے تم میری بہن ہو، تم بالکل بے فکر ہو جاؤ..... جن کے بھائی زندہ ہوں، انہیں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ نورین اپنے گھر چلی گئی..... اور مطمئن ہو گئی۔

اس دن تیمور کے باغ والے ڈیرے پر محفل جمی ہوئی تھی..... منظور بھی وہاں پہنچ گیا۔

اس نے تیمور سے کہا۔

"آؤ یار ذرا جنگل کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا سیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ڈیرے سے کچھ ہی دور ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ جس کے سرے پر ایک چھوٹی سی جھیل تھی..... جہاں مرغابیاں بھی پانی پینے اور نہانے آتی تھیں۔

تیمور نے شکاری بندوق بھی ساتھ لے لی تھی۔ اس نے ایک دو بندوق بردار بھی ساتھ لے جانا چاہا تھا۔ لیکن منظور نے منع کر دیا تھا۔ یہاں یہ بات بتا دوں کہ چوہدری فرزند علی کا گاؤں چھ سات میل دور تھا۔ اور میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا..... اس کو ایک اور تھانہ لگتا تھا۔

دونوں نے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر مرغابیوں کے انتظار میں دونوں بیٹھ گئے۔ دراصل جس کام نے ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ موت گھیر کر منظور کو وہاں لے گئی تھی۔

باتوں کے دوران منظور نے کہا۔

"یار..... ایک بات پوچھوں..... مانو گے....."

"میں تو جان بھی دے سکتا ہوں..... آج تم کیسی تکلف والی باتیں کر رہے ہو..... مجھے یہ تعلق اپنے درمیان زہر لگتا ہے۔"

"تم..... نورین کا پیچھا چھوڑ دو۔ بڑی عزت دار اور حالات کی ماری ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب.....؟" تیمور نے حیران نگاہوں سے اپنے جگری یار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مطلب..... وہی ہے۔ جو میں نے بتایا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ تم اس کی زلف کے اسیر ہو چکے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ تم عورت کو صرف ایک ہی مقصد سے دیکھتے ہو۔" میں نے اسے بہن کہا ہے۔

"اچھا..... تو میرے دوست نے گناہوں کی نوکری کو سر پر رکھ لیا ہے۔" تیمور نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"دیکھو..... تیمور منہ سنبھال کر بات کرو۔ وہ پاکباز مجبور اور بے سہارا ہے۔"

"تو اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لو۔ اس کے اپاہج شوہر کو کہو کہ وہ اسے طلاق دے دے۔" تیمور کا لہجہ غصہ دلانے والا تھا۔

"لگتا ہے میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی..... میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے بہن کہہ دیا ہے اور جب کوئی غیرت مند بھائی کسی کو بہن کہہ دے تو پھر اس کی حفاظت کے لیے جان کی پروا نہیں کرتا۔" منظور نے جوش سے کہا۔

"لگتا ہے تم نے پنجابی فلمیں کثرت سے دیکھ رکھی ہیں۔"

Digitized by Google

''بس میری بات کو پلے باندھ کر رکھنا۔''

''تم بھی کان کھول کر سن لو..... نورین نے میری توہین کی تھی..... اس لیے میں ہر صورت میں اسے خراب کروں گا۔''

منظور کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ وہ تو اس لیے تیمور کو یہاں اس ویرانے میں لے کر آیا تھا کہ راز داری سے ساری بات اس سے کرے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہوگیا تھا..... اچانک اس نے رائفل اٹھالی..... اور تیمور کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں یہاں ختم کر کے دفن کردوں گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔''

''اچانک تیمور ہنس پڑا.....'' اور بولا۔

''تم بھی سب بدھو ہی ہو..... میں تو تمہیں آزما رہا تھا۔

منظور نے رائفل رکھ کر تیمور کو گلے لگالیا۔

لیکن..... چند ہی لمحوں بعد تیمور نے رائفل کے تین کارتوس منظور پر فائر کردیئے تھے۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ کارتوس کے چھروں نے اس کا دل جگر اور پھیپھڑے تباہ و برباد کردیے تھے (یہ باتیں مجھے دوسرے تھانے میں جا کر معلوم ہوئی تھیں..... جب میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور کیس کی فائل کا مطالعہ کیا تھا)

منظور کے آخری الفاظ یہ تھے۔ تم نے مجھے دھوکے سے مارا ہے۔ اپنے بھیانک انجام سے بچ نہ سکو گے۔

منظور کی لاش کو وہیں چھوڑ کر تیمور گھر آ گیا تھا۔ اور ڈیرے پر موجود سب بندوں کو سمجھا دیا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا کہ منظور میرے ساتھ جنگل کی طرف گیا تھا۔

جب منظور شام کو گھر نہ آیا تو کہرام مچ گیا۔ قدیر جونہی باہر نکلا اسے ایک ایسا آدمی مل گیا جس نے اسے بتایا کہ دوپہر کے وقت اس نے منظور کو چھوٹے چوہدری کے ڈیرے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ بندہ وہاں اپنی خالہ سے ملنے گیا تھا۔

قدیر نے اسکوٹر نکالا اور ڈیرے پر پہنچ گیا۔ وہاں پر تیمور نہیں تھا اس کے حواریوں نے بتایا کہ منظور آج ادھر نہیں آیا..... وہ اس بندے کی بات کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔

وہ سیدھا تھانے میں چلا گیا۔ اور ساری بات بتادی۔

وہاں کے تھانے دار نے غور سے اس کی بات سنی اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں تیمور بھی موجود تھا۔ تھانیدار تیمور کو اور وہاں موجود چار حواریوں کو لے کر تھانے میں آ گیا۔

ملاقات پر میں نے اسے ایک کرخت، ایماندار اور ثابت قدم تھانے دار پایا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے حواریوں اور چھوٹے چوہدری سے سب کچھ اگلوالیا۔ حواریوں نے یہ بتادیا تھا کہ منظور دوپہر کو ڈیرے پر آیا تھا۔ اور چوہدری تیمور کے ساتھ جنگل کی طرف گیا تھا۔ تیمور کی نشاندہی پر لاش بھی برآمد ہوگئی تھی۔ کچھ جگہوں سے گدھوں نے لاش کو نوچ کھایا تھا۔ بہر حال، بڑے چوہدری کے تعلقات، پیسہ اور رعب و دبدبہ کسی کام نہ آیا تھا۔

تیمور جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ وزیر بیگم نے زمین کا ایک ٹکڑا بیچ دیا تھا اور ایک چوٹی کا وکیل کر کے مقدمہ لڑا تھا۔ اس دوران فصل کے پیسے بھی آ گئے تھے۔ نورین نے بھی عدالت میں اس بات کی گواہی دی تھی کہ منظور نے اسے بہن کہا تھا اور وہ بہن کی عزت پر قربان ہوگیا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ لوگوں نے اسے عشق معشوق کا چکر مشہور کروادیا تھا بعد میں۔ بہر حال حقیقت صرف نورین کو پتہ تھی۔ یا یہ رشتہ صرف منظور جانتا تھا۔ بعض اوقات برے آدمی بھی اس قسم کے کارنامے انجام دے ڈالتے ہیں..... شاید یہ نورین اور وزیر بیگم کی دل سے نکلی دعاؤں کا اثر تھا کہ وکیل کے کہنے کے باوجود تیمور اپنے اقرار جرم سے منحرف نہیں ہوا تھا۔ اور جج نے اسے بیس سال کی قید کی سزا سنادی تھی اور آجکل جیل میں تیمور اپنی سزا کاٹ رہا تھا۔

اب وزیر بیگم کے قتل کے متعلق بتادوں۔ یہ بات تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ بد سے بدنام برا..... جب دادن خان عرف دارا اپنی سزا کاٹ کر واپس آیا تو اس کا نام تھانے کے ریکارڈ پر چڑھ چکا تھا۔ اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے۔ یہ ہم تھانے داروں کی مجبوری ہوتی ہے۔ کیونکہ تقریباً ننانوے پرسنٹ مجرم توبہ تائب نہیں

Digitized by Google

کرتے۔ اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ بہر حال دارا وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا۔ وہ اب صرف چھوٹے موٹے جرم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں اس سے ایک بڑا جرم کروادیا گیا۔ جس علاقے سے دارا آیا تھا وہاں چوہدری فرزند علی کا دوست راجہ فراست علی رہتا تھا اور چھوٹے موٹے جرم میں دارا کی مدد لیتا رہتا تھا۔ دارا نے اسے کہا یہاں کی زمین میرے اوپر تنگ ہوگئی ہے۔ مجھے کسی دور دراز علاقے میں بھیج دیں۔ اس طرح وہ چوہدری فرزند علی کے زیر سایہ آ گیا۔

چوہدری فرزند علی یہ چاہتا تھا کہ وزیر بیگم اور قدیر راضی نامہ کرلیں اور اس کا لخت جگر باہر آ جائے۔ اس نے وزیر بیگم کو پیغام بھجوایا کہ وہ خون بہالے لے اور راضی نامہ کرلے لیکن۔ وزیر بیگم نے بڑا سخت جواب دیا۔ اس نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

''اپنے چوہدری سے کہو..... کہ اس جیسے ذلیل چوہدری خون بہالیا کرتے ہیں۔ اس کے بیٹے کو کم سزا ہوئی ہے۔ میں تو بڑی عدالت میں اپیل کروں گی اور اسے پھانسی کی سزا دلواؤں گی۔ جس طرح میرے بیٹے کی لاش میری دہلیز پر آئی تھی۔ اس طرح اس کے بیٹے کی بھی لاش پھانسی لگ کر آئے گی۔ تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔ میں سب کچھ بیچ دوں گی..... جب اس قسم کا سودا ذہن میں سما جائے تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

سودا بازی کرنے میں، اور اس قسم کے معاملات چلانے میں نمبر دار صاحب آگے آگے رہتے تھے۔ اور چوہدری فرزند علی کا تو وہ دستِ راست تھا۔ یہ ساری ڈیلنگ اس نے کی تھی۔ اور وزیر بیگم سے بات چیت اسی نے کی تھی اور چوہدری کے تن بدن میں آگ لگانے والا جواب بھی ظاہر ہے۔ وہ ہی لے کر گیا تھا۔ اب اتنے عرصے بعد بڑی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا تھا یا نہیں۔ یہ ایک الگ مسئلہ تھا۔ اور اب اس پر بحث کرنا بے سود تھا۔ لیکن..... وزیر بیگم کے لہجے اور جواب نے چوہدری کو گرم توے پر بٹھا دیا تھا۔ دوسرے نمبر دار نے بھی گرم مصالحہ لگا کر چوہدری کے غصے کو مہمیز دی تھی۔ نمبر دار نے چوہدری کو یہ مشورہ دیا تھا کہ قدیر کو دنیا کے تختے سے اٹھا دیتے ہیں لیکن چوہدری نے کہا تھا ہم نے اپنا مقصد بھی حاصل کرنا ہے..... ہوسکتا ہے وہ سارا ملبہ ہم پر ڈال دے۔ اس کے مرنے کے بعد (وزیر بیگم کے) ہم وزیر سے ڈیل کرلیں گے۔ بہر حال وزیر بیگم کو قتل کرنے پر اتفاق ہوگیا۔ اس کے لیے دارا اور اس کے دو ساتھیوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ اسے رسہ گیروں کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے پہلے اس سے رسہ گیری کی کچھ وارداتیں کروائی گئیں۔ دارا کوئی پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ پہلی بار یہ مہم سر کر رہا تھا۔ اس سے کلور وفام میں بسا رومال وزیر بیگم پر بھی استعمال کرنے کی حماقت سرزد ہوگئی۔ جس کی وجہ سے سارا ڈرامہ فیل ہوگیا۔ جب میں نے نمبر دار پر یہ بات واضح کردی کہ یہ کام رسہ گیروں کا نہیں تو اس نے بڑی سرعت کے ساتھ پینترا بدلا اور کہہ دیا۔ قتل قدیر نے کیا ہوگا۔ اس سے بھی کافی حماقتیں سرزد ہوئیں۔ جس کی وجہ سے کئی بار میرا شک اس کی طرف گیا۔ راضی نامے کا سلسلہ انہوں نے بڑے خفیہ طریقے سے انجام دیا تھا۔ لیکن..... یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی..... اور نتیجہ سب کی توقع کے برخلاف نکلا۔ دارا اور اس کے ساتھیوں کو سزا ہوگئی تھی۔ لیکن چوہدری اور نمبر دار سزا سے بچ گئے تھے..... وہ عدالت میں جا کر مکر گئے تھے۔ انہوں نے سارا ملبہ دارا اور اس کے ساتھیوں پر ڈال دیا تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت دارا کے پاس نہیں تھا کہ نمبر دار اور چوہدری نے انہیں وزیر بیگم کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ دونوں چال باز تھے اور ان کی چال کامیاب ہوگئی تھی لیکن مکافاتِ عمل سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک روز ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے تھے۔ اور چہرے اتنے مسخ ہوگئے تھے کہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔

Digitized by Google

عورت نامہ

نفیسہ سعید

عورت ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنا اور سمجھنا عام آدمی تو کیا کسی ماہر نفسیات کے بس میں بھی نہیں ہوتا وہ اپنے اندر شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی لیکن کب وہ شعلہ بنتی ہے اور کس وقت شبنم اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ایک ایسی عورت کی روداد جس نے جاہل ہوتے ہوئے بھی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا

ناظمہ ایک بنگالن تھی جو میرے گھر پچھلے پانچ سالوں سے کام کر رہی تھی بظاہر دیکھنے میں وہ ایک صاف ستھری عورت تھی یہ ہی وجہ تھی کہ میں اسی سے اکثر آٹا اور روٹی بھی پکوالیا کرتی' ناظمہ کی تین بیٹیاں تھیں جو بالترتیب بارہ دس اور دو سال کی تھیں سب سے چھوٹی بیٹی اس کی تقریباً درمیان والی فاطمہ سے آٹھ سال چھوٹی تھی اور اپنی چھوٹی بیٹی صبا سے اسے دیگر دونوں بیٹیوں کے مقابلے میں محبت بھی زیادہ تھی ناظمہ کا شوہر سعد خان ایک کباڑیا تھا جو گلی گلی پھیری لگا کر کباڑ کا سامان اکٹھا کرتا ایک دن میں نے گھر کی صفائی کے دوران کافی پرانا سامان نکال کر ناظمہ کو دیا جو وہ گھر جاتے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے رکھ گئی کہ صبح سعد کو اپنے ساتھ لے آئے گی جو یہ سامان لے جائے گا اور اگلی صبح وہ پہلا دن تھا جب مجھے اس کے شوہر سعد خان عرف سعدی کا دیدار نصیب ہوا جسے دیکھتے ہی میں تو ہکا بکا رہ گئی گورا چٹا اونچا لمبا مرد تقریباً اٹھائیس سے تیس سال کے درمیان ہوگا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس نہایت صاف ستھرا جس کے مقابل کھڑی ناظمہ اس کی نصف بہتر دکھائی نہ دے رہی تھی اور یہی بات میرے لیے اس قدر حیرت کا باعث بنی سعدی کے وہاں سے جاتے ہی میں نے ناظمہ کو گھیر لیا۔

"ارے تمہارا میاں تو بڑا ہینڈسم ہے پٹھان ہے کیا۔"

"نہیں جی میاں والی کا رہنے والا ہے ہمارے ساتھ تو شروع دن سے اردو ہی بولتا آرہا ہے شاید پنجابی ہے۔" میں نے محسوس کیا اپنے میاں کی تعریف سن کر اس کے سانولے چہرے پر خاصی رونق آگئی تھی۔

"تمہیں کہاں سے ملا؟" یہی وہ اصل سوال تھا جس کے لیے میں نے یہ ساری تمہید باندھی تھی۔ "اور تم تو بنگالی ہو پھر یہ شادی پنجابیوں میں کیسے کرلی؟"

"کیا بتاؤں باجی عشق وعاشقی کا کھیل تھا سارا' ہماری اماں کے مکان میں کرایہ دار تھا مکان کیا گھر کے باہر کی جانب بنا ایک کمرہ تھا جہاں سے آتے جاتے ہم ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اپنی بھی جوانی تھی جو گدھی پر آئے تو وہ بھی خوب صورت دکھنے لگتی ہے ایسے ہی پتہ نہیں کسی لمحہ میں سعدی کے دل میں اتر گئی کہتا تھا کسی دفتر میں سرکاری ملازم ہوں۔" یہاں تک پہنچ کر ناظمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جب ہی پل اس کا فون بج اٹھا جسے گریبان سے نکال کر اس نے دیکھا اور چہرے پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

میری سہیلی شفاء ہے ذرا بات کرلوں پھر آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔"

شفا کے متعلق میں یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ اور ناظمہ ایک جان دو قالب ہیں جب کہ شفاء دس جماعتیں پاس لڑکی تھی جو کسی کال سینٹر پر جاب کرتی تھی اور اپنی تنخواہ میں سے اکثر ناظمہ کی چھوٹی بیٹی صبا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور خرید لاتی اسی کے علاوہ وہ ناظمہ کی مالی مدد بھی کردیا کرتی تھی اس لیے میں اسے شفاء سے باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں آگئی تاکہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرسکوں جب وہ مسکراتی ہوئی میرے پیچھے ہی کچن میں آگئی۔

Digitized by Google

آج صبا کی دوسری سالگرہ ہے اس لیے شفاء کا فون آیا تھا کہہ رہی ہے رات کا کھانا اور کیک میری طرف سے ہوگا جب کہ صبا کے کپڑے بھی وہ لے آئی ہے۔"

"اچھا۔" مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اکثر و بیشتر وہ اسے ہی فون کیا کرتی تھی کبھی مچھلی خرید کر ناظمہ کے گھر لے جاتی جہاں اسے وہ خود ہی فرائی کرتی اور ناظمہ کسی بیگم صاحبہ کی طرح اسے کھا کر انجوائے کرتی۔ کبھی گھر کا راشن ناظمہ کے گھر پہنچا دیتی۔ اکثر وہ ناظمہ کے میاں کی تمام ضروریات زندگی کا ایسے خیال رکھتی جیسے اس کی بیوی ناظمہ نہیں وہ ہو اور یہ سب سن کر مجھے حیرت ہوتی آج کے اس مادیت پرست دور میں کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے جو بنا کسی بدلے کی امید لیے دوسرے کی مدد کیے جائے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ایسا لگا جیسے اس کی نظر ناظمہ کے میاں پر ہو۔ اللہ جانے میں یہاں غلط تھی یا درست بہرحال اس وقت تو میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ سعد اور ناظمہ کا رشتہ کیسے طے ہوا اسی لیے شفاء کی باتوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ناظمہ سے استفسار کیا۔

"اچھا پھر تم سعد کو پسند آ گئیں تو کیا اس کی فیملی میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کریں گے۔"

مجھے اعتراض ناظمہ کی ظاہری شخصیت پر تھا جس کا اظہار میں کھلے عام نہ کرسکتی تھی اس لیے بات گھما پھرا کر ایک بار پھر سے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی۔

"ارے باجی کونسا خاندان یہ تو ہم تھے جو پھنس گئے ظاہری شکل دیکھ لی یہ نہ جانا کہ مہاراجہ کرتا کیا ہے۔" اب ناظمہ کا لہجہ پہلے سے خاصا تبدیل ہوگیا تھا۔

"ہم سے کہتا تھا سرکاری ملازم ہوں تجھے اپنے گھر مہارانی بنا کر رکھوں گا اب یہ مہارانی آپ کے سامنے کھڑی ہے لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچا اور برتن دھوتے زندگی گزر گئی ایک نمبر کا جھوٹا اور نکما مرد ہے جب سے شادی ہوئی ہے بمشکل ایک ماہ کے دس دن گھر سے باہر نکل کر کام کرتا ہے باقی بیس دن میری کمائی پر عیاشی کر کے گھر کی چارپائیاں توڑتا ہے جانے کہاں سے ایک پرانا وی سی آر لے آیا ہے اسی پر بیٹھا فلمیں دیکھتا رہتا ہے شفا روز ایک نئی کیسٹ لے آتی ہے اس حرام خور کے لیے اور یہ فلم دیکھ کر خود کو کوئی ہیرو سمجھتا ہے پھر شام کو ٹپ ٹاپ ہو کر محلے میں نکل جاتا ہے جہاں دکان والوں سے ادھار لے کر سگریٹ پی لیتا ہے اور قرض میں اتارتی ہوں۔" ناظمہ کی زندگی کا یہ پہلو آج پہلی بار میرے سامنے آیا تھا اور اس کی تمام تر گفتگو میں ایک جملہ ایسا تھا جس نے مجھے چونکا دیا اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"تمہاری دوست شفا بھی تمہارے میاں کے ساتھ بیٹھ کر انڈین موویز دیکھتی ہے؟"

"جی وہ کیسٹ ہی اس لیے لاتی ہے کہ خود بھی فلمیں دیکھنے کی شوقین ہے اور گھر میں باپ بھائی دیکھنے نہیں دیتے بڑا سخت ماحول ہے ان کے گھر کا لہذا اپنا یہ شوق میرے ہی گھر آ کر پورا کرتی ہے اور مجھے بھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

"آفرین ہے بھائی تم یہ کیسے برداشت کرتی ہو کہ تمہاری غیر موجودگی میں کوئی عورت گھر آ کر تمہارے میاں کے پاس بیٹھے۔"

"برداشت کرنا پڑتا ہے اکثر اپنے بھلے کے لیے ایسا بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے ورنہ سعادی کا سارا خرچہ بھی میرے

Digitized by Google

سر آن پڑے جو میں پورا نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھنے سے میرا کون سا نقصان ہو رہا ہے الٹا فائدہ ہی ملتا ہے اب آج بھی دیکھ لو رات کو اچھا کیک اور کھانا مفت میں گھر بیٹھے مل جائے تو کیا برا ہے۔"

"اور اگر ایسے ہی بے خبری میں وہ تمہارا میاں لے اڑی تو....."

"وہ کوئی کبوتری تھوڑا ہے جو کبوتر لے کر اڑ جائے گی اچھی بھلی بھینس جیسی لڑکی ہے جو چلتی ہی بمشکل ہے ایسے میں بھلا اڑے گی کیسے۔" میری بات کا مطلب سمجھنے کے باوجود وہ انجوائے کرتے ہوئے مزے سے بولی ساتھ ہی اس نے شفاء کا نقشہ بھی واضح کر دیا اس کا حدود اربعہ بھی بتا دیا کہ وہ کسی بھینس کی مانند موٹی سی لڑکی ہے۔ دراصل باجی شفا کا موٹاپا ہی اس کا دشمن ہے بے چاری کا کہیں رشتہ طے ہونے میں نہیں آ رہا اوپر سے باپ بھائی بھی یہ سوچ کر خاموش ہیں کہ کھاتی کماتی لڑکی ہے مفت کی کمائی گھر آ رہی ہے تو کیا برا ہے ایسے میں اگر سادی سے بات کر کے اس کے دکھی دل کو تسلی ملتی ہے تو بھلا میرا کیا جا رہا ہے الٹا ثواب ہی ہے بیچاری کے دو بول یہ سوچ کر گزر جاتے ہیں کہ شاید سادی کو وہ پسند ہے۔" اتنا کہہ کر ناظمہ ہنس دی اور میں جو آج تک اسے ایک سیدھی سادی عورت سمجھتی تھی اب پتہ چلا وہ کتنی چالاک تھی اور ایسے میں مجھے شفاء پر افسوس ہوا جو اپنی احساس محرومی کے ہاتھوں کس طرح ناظمہ کے لیے کھلونا بنی ہوئی تھی اور میں نے بھی سادی کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ بس جب وہ آیا کرے اس کی تعریف کر دیا کرے غریب اسی میں خوش ہو جاتی ہے۔"

آج پرت در پرت وہ میرے سامنے کھل رہی تھی اور جیسے جیسے کھل رہی تھی اس کا ہر چھپا گوشہ میرے سامنے آ کر مجھے ورطہ حیرت میں ڈالتا جا رہا تھا دنیا کیسی بھی ہوتی ہے جہاں ایک عورت دوسری عورت کے جذبات سے محض اس لیے کھیل رہی تھی کہ وہ اس کی ضروریات زندگی پوری کرنے میں مدد دے رہی تھی صرف پیسے کے لیے ناظمہ نے اپنا شوہر بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور ان حالات میں اسے اپنے شوہر پر بلا کا اعتماد تھا بقول اس کے سادی صرف میری خاطر شفاء کو برداشت کرتا ہے ورنہ تو اسے موٹی اور بھدی لڑکیاں کبھی اچھی نہیں لگیں۔

مجھ سے باتیں کرتے کرتے وہ جلدی جلدی برتن بھی دھو رہی تھی تاکہ کام ختم کر کے گھر واپس جا سکے۔ جہاں اس کی بچیاں چھوٹی بہن کی سالگرہ کی خوشی اپنی ماں کے ساتھ منانے کو بیتاب تھیں پھر اگلے دن ناظمہ نے مجھے بتایا کہ شفاء نے رات بہت اچھا اہتمام کیا۔ نہ صرف بہترین کھانا بلکہ گھر میں غبارے اور جھنڈیاں بھی لگا دی تھیں تاکہ صبا خوش ہو سکے اور پھر اس نے اپنے موبائل سے سالگرہ کی تصویریں بھی کھینچیں یہ سب بتاتے ہوئے وہ اتنی خوش تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی اسے نہ ٹوک سکی اور کوشش کی کہ کوئی ایسی منفی بات نہ کروں جو اس کی دل آزاری کا سبب بنے اسی لیے خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتی گئی۔

❁.....❁.....❁.....❁

آج ناظمہ پورے چار دن بعد کام پر آئی تھی وجہ سادی کی طبیعت کی خرابی تھی جسے اچانک ہی ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا اور پھر نہایت خوشی کے ساتھ مجھے یہ بتاتے ہوئے اسے کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی کہ شفاء نے بیماری کی مد میں ہونے والے تمام اخراجات اپنے سر لے کر ان دونوں میاں بیوی کو اپنا بے مول غلام بنا لیا ہے مزید یہ کہ شفاء تین راتیں اس کے گھر رہی تاکہ وہ دونوں مل کر باری باری مریض کی دیکھ بھال کر سکیں اب میں چاہ کر بھی خود کو بولنے سے باز نہ رکھ سکی اور بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

"تم نے تو بتایا تھا کہ شفاء کے گھر والے بہت سخت ہیں ایسے میں کس طرح انہوں نے اپنی جوان بیٹی تین دن اور رات تمہارے گھر چھوڑ دی۔"

"کیونکہ انہیں سادی پر پورا اعتبار ہے جسے شفاء کے والد نے اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے ویسے بھی باجی جب بیٹی اپنی کمائی گھر کے اخراجات میں شامل کرنے لگے تو سوال کرنے والوں کی زبان پر تالے لگ جاتے ہیں خواہ وہ باپ ہو یا بھائی اسی طرح جب عورت اپنی کمائی سے میاں کی ضرورت پوری کرے تو وہ بھی گونگا بہرہ ہو جاتا ہے کبھی یہ سوال نہیں کرتا کہ مجھ پر خرچ کیا جانے والا تمہارا پیسہ حلال ہے یا حرام۔"

ناظمہ کی باتوں نے مجھے خاموش کروا دیا وہ ایک جاہل مگر زمانہ شناس عورت تھی جس نے زندگی کے تمام رنگ اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں دیکھ لیے تھے کیونکہ اس کا اپنا شوہر نہ صرف حد حرام بلکہ بیک وقت دو عورتوں کی کمائی پر عیاشی کر رہا تھا جو وہ دونوں اپنے اپنے مفاد کی خاطر اسی جیسے مرد پر ضائع کر رہی تھیں جسے عورت کی نہ کوئی قدر تھی اور نہ ہی اس کی نظروں میں اپنی بیوی کی کوئی اہمیت تھی اگر وہ ذرا بھی اپنی بیوی

Digitized by Google

اور بیٹیوں کا ہمدرد ہوتا تو یقیناً صورت حال اس سے قدرے مختلف ہوتی بہرحال یہ ان کے گھر کا اپنا ذاتی مسئلہ تھا جس پر اب مزید درس دینے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا اس لیے میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

❁.....❁.....❁.....❁

میں محسوس کر رہی تھی کہ پچھلے کچھ دنوں سے ناظمہ پریشان ہے لیکن اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کی تیاریوں میں میں خود اتنی مصروف تھی کہ اس سے پوچھنا ہی بھول جاتی تھی اور وہ روز بڑی خاموشی سے جلدی جلدی کام نمٹا کر نکل جایا کرتی۔ میں نے دیکھا اب اس کے فون کی گھنٹی بجتی رہتی جسے قطعی نظر انداز کر کے وہ اپنے کام میں مصروف رہتی لیکن ایک دن جانے کس کا فون آیا جو فاطمہ کے بدن میں بجلی سی بھر گئی میرے آدھے ادھورے برتن سنک میں چھوڑ وہ برقعہ ہاتھ میں لیے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"باجی مجھے ابھی گھر جانا ہے چھوٹی کا فون آیا ہے کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔" میں نے دیکھا اس کا سانولا چہرہ لال ہو رہا تھا اور آنکھیں بھرائی ہوئی سی دکھائی دیں جنہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ اب وہ میرے روکے نہ رکے گی۔ بہتر یہ ہی ہے کہ اسے چھٹی دے دی جائے اور پھر میری طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے جلدی جلدی اپنا برقعہ پہنا اور گھر کی راہ لی اور میں پیچھے بیٹھی سوچتی رہ گئی کہ ایسا کیا ہوا جو ناظمہ کو یوں بھاگم بھاگ اپنے گھر واپس جانا پڑا اور یہ تھی اگلے دن ناظمہ نے آتے ہی سمجھا دی جب وہ میرے سامنے نیچے فرش پر بیٹھ کر رونے لگی ساتھ ہی وہ شفاء کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا ناظمہ کیوں اتنا واویلا کر رہی ہو۔" بالآخر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور اسے ڈانٹتے ہوئے چپ کروانے کی کوشش کی۔

"ہائے باجی جی میرے ساتھ تو ہاتھ ہوگیا اتنا بڑا دھوکا اس بدمعاش شفاء نے کیا کہ کیا بتاؤں میں جو یہ سمجھتی تھی کہ میرا میاں میرے کہنے پر اس موٹی کو الو بنا رہا ہے غلط سمجھتی تھی وہ دونوں مل کر میری ناک کے نیچے ایک عشق کا ڈرامہ کھیلتے رہے اور میں بیوقوف بنی انہیں ملنے کے موقع دیتی رہی لعنت ہے مجھ پر۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ایک بار پھر سے رونے لگی۔

"کیوں کیا تمہارے میاں نے شفاء سے شادی کرلی ہے؟"

ظاہر ہے کل سے لے کر آج تک رونما ہونے والے واقعات سے میں یہ ہی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی سو کر لیا اور میری بات سنتے ہی وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

"وہ کمینہ شادی کر کے تو دکھائے دونوں کو گولی نہ ماردی تو ناظمہ نام نہیں۔ کڑے تیور لیے وہ اپنا رونا دھونا بھول کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا پھر ایسا کیا ہوگیا جو تم آتے ہی دھواں دھار رونے لگی ہو۔"

"وہ تو جی مجھے ان دونوں پر شک ہوگیا تھا اسی لیے میں نے شفاء کو صاف لفظوں میں منع کر دیا کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر نہ آیا کرے ساتھ ہی۔" وہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو چھوٹی کہا کرتی تھی" کو بھی سمجھا دیا کہ میری غیر موجودگی میں اگر شفاء آئے تو گھر نہ گھسنے دینا لیکن وہ بچی کی کہاں سنتی تھی اور گھر میں لڑائی کے ڈر سے چھوٹی نے بھی اپنی زبان بند کرلی لیکن پچھلے ہفتہ میں نے ان دونوں نمک حرام عاشقوں کو اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جب طبیعت خراب ہونے کے سبب میں آپ سے جلدی چھٹی لے کر گھر چلی گئی تھی۔"

"اور پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا شفاء تو رونے دھونے لگی ساتھ ہی سادی بھی میرے قدموں میں بیٹھ گیا کہ غلطی ہوگئی۔ آج معاف کردو پھر ایسا نہ ہوگا مزید یہ کہ آج جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار تم بھی ہو نہ تم ہمیں ایک دوسرے کے قریب کرتیں نہ یہ دن دیکھنے کو ملتا۔" اور یقیناً اس کی دوسری بات میں سو فیصد سچائی تھی جس نے میری زبان پر تالے ڈال دیئے۔ اب اگر میں مزید کوئی واویلا کرتی تو سارا گند میرے سر ہی آن پڑتا۔ اس لیے بہتر تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے لیکن پھر بھی میں نے شفاء سے کہا ہے کہ آئندہ وہ میری غیر موجودگی میں دوبارہ اس گھر کا دروازہ پار نہ کرے۔ ورنہ میں اس کے باپ اور بھائیوں کو سب سچ بتادوں گی کہ سادی تمہارا بیٹا نہیں داماد بننے کی تیاریوں میں مصروف ہے اور چھوٹی کو بھی کونے والی دکان سے ادھار فون لے کر دیا کہ اب یہ حرافہ عورت میرے پیچھے تمہارے باپ کے پاس آئے تو مجھے فون کر دینا پھر دیکھنا میں کیسے گھر آ کر اس کی چوٹی کاٹتی ہوں۔"

زور و شور سے بولتی ناظمہ جیسے ہی سانس لینے کو رکی میں نے

Digitized by Google

تیزی سے ایک سوال کیا۔

"تمہارے گھر میں تو ایک ہی کمرہ ہے پھر جب وہ تمہارے گھر آتی ہے تو بچیاں کہاں جاتی ہیں؟"

"جانا کہاں ہے جی ساری دوپہر باہر صحن میں بچھی چارپائی پر کھیل کر گزار دیتی ہیں اور باپ اتنا بے غیرت ہے کہ ذرا احساس نہیں۔"

"تو شفاء اپنی جاب پر کب جاتی ہے؟ سارا دن تو وہ تمہارے گھر پڑی رہتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی شام پانچ سے رات گیارہ تک کی ہوتی ہے اور وہ گھر سے دو بجے ہی نکل آتی ہے مجال ہے جو باپ بھائیوں کو پتہ ہو کہ آوارہ بیٹی سارا دن کہاں خوار ہوتی ہے۔"

ناظمہ کی یہ بات تو سچ تھی کہ دن دو بجے گھر سے نکلنے والی لڑکی سے کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ تم رات بارہ بجے واپس آتی ہو بھلا اتنی لمبی ڈیوٹی کہاں کرتی ہو لیکن شاید یہاں بھی وہ ہی بات تھی کہ مٹھی بھر نوٹ کمانے والی شفاء اتنی خود مختار ہو چکی تھی کہ اسے اپنے باپ یا بھائیوں کا کوئی خوف باقی نہ رہا تھا اس نے اپنے پیسے کے زور سے سب کی زبان بند کر رکھی تھی مگر سادی کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ کی طرح ناظمہ ہی قصور وار نظر آئی جس نے ایک ذرا سے اپنے زبان کے ذائقہ کے لیے پورا شوہر داؤ پر لگا دیا اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ ناظمہ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔

"اچھا پھر کل تمہیں چھوٹی کا فون آیا تھا؟" میں نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا۔

"ہاں اس نے مجھے بتایا کہ شفاء ابھی ابھی ہمارے گھر آئی ہے بس پھر کیا تھا میں نے جھٹ برقعہ اوڑھا آپ سے چھٹی لی اور گھر پہنچ کر ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا بھلا ناظمہ سے پنگا لے کر کوئی کہاں جا سکتا ہے میں نے تو وہ شور مچایا کہ پورا محلہ جمع ہو گیا تھا اور روبالش لمبی داڑھی لئے شفاء کا باپ بھی آن پہنچا جو یہ ساری صورت حال دیکھ کر نہایت بے غیرتی سے بولا۔

"میری سیدھی سادی بیٹی کو ان دونوں میاں بیوی نے ورغلایا ہے اب یہ چاہتی ہے کہ ہم اس کے میاں کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیں تا کہ جہاں یہ ایک اکیلی سارا دن جوتیاں توڑ کر چار پیسے کماتی ہے وہاں میری بیٹی کی کمائی بھی شامل ہو جائے اور یہ میاں بیوی بچوں سمیت عیاشی کریں یہ سارا گیم اس عورت کا کھیلا ہوا ہے۔" اور پھر اپنی روتی دھوتی بیٹی کو گلے سے لگا کر گھر واپس لے گیا اور سادی کو دیکھو ذرا کل شام کا جو غصہ میں گھر سے نکلا ابھی تک واپس نہیں آیا میں نے کئی بار فون کیا مگر مجال ہے جو میری کال اٹھائے پتہ نہیں کہاں ہوگا جیب میں تو کوئی روپیہ دھیلا بھی نہ تھا جانے کہاں بھوکا پیاسا پڑا ہوگا۔

غصہ میں بولتی ناظمہ کے لہجہ میں یک دم ہی سعدی کے لیے در آنے والی مامتا نے مجھے حیران کر دیا میں اتنے سالوں میں کبھی اس عورت کو نہ سمجھ پائی تھی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ایک لمحہ کو گالیاں اور بددعائیں دیتے دیتے اچانک ہی شوہر کی محبت سے اس کا دل سرشار اور چہرہ گلنار ہو جاتا اب بھی وہ جتنا ٹائم کام کرتی رہی اس کا سارا دھیان اپنے میاں میں ہی لگا رہا ہر پندرہ منٹ بعد اسے فون کرتی اور پھر اگلے ہی لمحے مایوس ہو کر کال کاٹ دیتی دو بار تو وہ چھوٹی کو فون کر کے پوچھ چکی تھی۔

"تمہارا باپ گھر آیا؟" اور یقیناً دوسری طرف سے جواب انکار میں ہوتا جس کا اندازہ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا اور پھر اگلے دو دن تک سعدی گھر نہ آیا اور اس عورت نے جلے پیر کی بلی کی طرح اسے سارے محلے میں کھنگالا بالآخر وہ اپنی ایک منہ بولی بہن کے گھر سے برآمد ہو گیا۔ ہاں اکثر و بیشتر وہ دونوں میاں بیوی اتوار والے دن جایا کرتے تھے اور اس کے گھر واپس آنے پر ناظمہ نے مانو جیسے سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر سے وہ جی اٹھی۔

❁……❁……❁……❁

سادی بہت بدل گیا تھا اور ایسا مجھے ناظمہ نے ہی بتایا کہ اب اس کا میاں روز صبح گھر سے نکلتا ہے اور پھر شام کو واپس آتا ہے ساتھ ہی وہ روزانہ کے دو سو روپے بھی بیوی کو دینے لگا تھا اور وہ غریب اس میں خوش ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آنے والا کل اس کے مقدر میں کیا لکھنے والا ہے اور یہ مقدر کا لکھا کچھ ایسا اٹل ہوتا ہے کہ انسان چاہ کر بھی اس کا توڑ نہیں کر سکتا اور آخر میں یہ کہہ کر صبر کر لیا جاتا ہے کہ شاید یہ ہماری کسی غلطی کی سزا ہے یا پھر اللہ کی طرف سے دی جانے والی کوئی آزمائش۔ جو بھی ہے بعض دفعہ مقدر کا لکھا فیصلہ انسان کی تمام حیاتی کو رول دیتا ہے جیسے کہ ناظمہ کے ساتھ ہونے والا تھا شوہر کی جانب سے ملنے والی چند روزہ محبت اور جلد ہی اسے ایک اندھے کنویں میں دھکیلنے والی تھی اور ایسا ہی ہوا جب دو ماہ قبل اس نے مجھے بتایا کہ سعدی شاہ عتیق زیارت کے لیے گیا ہوا ہے مجھے اور بچیوں کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر میری مجبوری تھی ابھی اگر تین دن چھٹیاں

Digitized by Google

کرتی تو آگے اتوار آ جاتا تو سمجھو پورا ایک ہفتہ نکل جانا تھا تو پھر مگہت آپا نے تو مجھے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دینا تھا بس ان کے خوف نے مجھے میاں کے ساتھ نہ جانے دیا۔" اور پھر تین سے چار اور پانچ دن بیت گئے سادی شاہ عتیق سے واپس لوٹ کر ہی نہ آیا اب ناظمہ کو ایک بار پھر پریشانیوں نے آن گھیرا کہیں سادی کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو کیونکہ اس کا فون مسلسل تین دن سے بند جا رہا تھا ایسے میں جانے مجھے کیا سوجھی جو بنا سوچے سمجھے ہی پوچھ بیٹھی۔

شفاء ہے اپنے گھر یا وہ بھی غائب ہے؟ میرے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے ایک پل کو ناظمہ کو بھی جیسے ساکت کر دیا وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی "آپ کو کس نے بتایا کہ شفاء پنجاب اپنے گاؤں گئی ہے؟"

اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔

"مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا میں تو ویسے ہی تم سے ایک سوال کر رہی ہوں وہ کب سے اپنے گاؤں گئی ہے اگر زیادہ دن ہو گئے ہیں تو اس کے گھر جا کر پتہ کرو شاید واپس آ گئی ہو۔ میں نے ناظمہ کی پریشانی کو کچھ کم کرنے کی کوشش کی جو میری بات سن کر مزید بڑھ گئی تھی جواباً وہ خاموش رہی جب کہ مجھے افسوس ہوا کہ میں بلاوجہ اس سے اس کے سامنے شفاء کا ذکر کر دیا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔

❁.....❁.....❁

اگلے دن کام ختم کرتے ہی ناظمہ میرے پاس نیچے کارپٹ پر آن بیٹھی میں نے دیکھا وہ کچھ الجھی ہوئی تھی۔ بار بار کچھ کہنے کی کوشش میں منہ کھولتی اور پھر بند کر لیتی بالآخر میں نے ہی پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے ناظمہ تمہارے میاں کا کچھ پتہ چلا؟"

"جی کل اس کا فون آیا تھا۔" اس کے لہجے میں وہ خوشی ندارد تھی جو اس سے دس دن بعد آنے والے سادی کے فون سے پیدا ہونی چاہئے یقیناً کچھ گڑبڑ تھی۔

"چلو شکر کرو کہ وہ زندہ سلامت ہے ورنہ تم تو بلاوجہ ہی کئی دنوں سے ہلکان ہو رہی تھیں بتایا نہیں کہ اتنے دنوں سے کہاں تھا اور فون کیوں بند تھا؟"

"کہہ رہا تھا کہ شاہ عتیق پر کسی نے اس کا بیگ چوری کر لیا تھا جس میں موبائل اور پیسے کپڑے تھے خاص طور پر شناختی کارڈ بھی اسی میں تھا پھر پولیس کا چکر بھگتنے یہ دن آ گئے اب کہیں جا کر جان چھوٹی تو ایک دوست کے نمبر سے مجھے فون کر لیا مگر پتہ نہیں کیوں مجھے لگا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" بات کرتے کرتے وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اسے میرا نمبر کبھی بھی زبانی یاد نہیں ہوتا اس لیے فون میں محفوظ کر کے رکھا ہوا ہے اب جب فون ہی گم ہو گیا تو بتاؤ بھلا مجھے کیسے کال کر لی؟"

بات تو پتہ کی تھی جس کی امید مجھے ناظمہ جیسی جاہل عورت سے نہ تھی مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ جس کے تن لاگے وہ ہی جانے تو شاید اس سے ناظمہ کے تن میں لگی وہ ہی جان پا رہی تھی۔

"آپ کے فون میں پیسے ہوں گے؟" مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... کیوں خیریت ہے؟"

"یہ نمبر ہے جی جس سے کل سعدی نے مجھے فون کیا تھا آپ اس پر کال کر کے دیکھیں کون اٹھاتا ہے؟" میں سمجھ گئی اس کے ذہن میں شفاء والا خدشہ اپنے پنجے پھیلا چکا ہے اس لیے وہ تصدیق کرنا چاہ رہی ہے کہ نمبر کسی عورت کا تو نہیں ہے لہٰذا ناظمہ کی تسلی کے لیے میں نے اپنے فون سے وہ نمبر ملا کر سیل ناظمہ کے ہاتھ میں تھما دیا وہ عالم بے قراری سے دوسری جانب فون اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگی پھر شاید کسی نے فون اٹھا لیا جس کی آواز سنتے ہی ناظمہ جیسے شاکڈ ہو گئی مجھے لگا دوسری طرف شفاء ہے مگر ناظمہ کی زبان سے ادا ہونے والے اس جملے نے میرے خیال کو فوراً ہی تردید کر دی۔

"شاہ جہاں آپا یہ نمبر آپ کا ہے؟" اس کی آواز میں بے یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

"سادی آپ کے گھر ہے؟" اور پھر دوسری جانب سے جواب سنے بنا ہی اس نے فون بند کر کے میرے حوالے کر دیا۔

"یہ کمینی بھی سادی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔" بات کرتے سے گالیاں دینا اب اس کی عادت بن چکا تھا جسے ٹوکنے کا کوئی فائدہ مجھے نظر نہ آتا تھا میں سمجھ گئی شاہ جہاں سادی کی منہ بولی بہن تھی جو ناظمہ کے محلے میں کہیں رہتی تھی اور سادی ان کے گھر رہنے سے قبل شاہ جہاں کا کرایہ دار تھا جسے شروع میں اس نے اپنی رشتہ کی بہن بتایا تھا جب کہ بعد میں دیگر باتوں کی طرح یہ بھی جھوٹ ثابت ہوا مزید یہ کہ شاہ جہاں کا تعلق بھی ناظمہ کی طرح صوبہ بہار یا بنگال کے ہی کسی علاقے سے تھا۔

"میں مہاجر کیمپ جا رہی ہوں ذرا جا کر دیکھوں تو سہی یہ

Digitized by Google

بے غیرت انسان وہاں کیا کر رہا ہے؟" جلدی جلدی اپنے برقعہ کے بٹن بند کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی آج اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ گھر پر اس کی بیٹیاں تنہا ہیں جب کہ مہاجر کیمپ سے واپس کورنگی آتے ہوئے اسے خاصی رات ہو جاتی تھی لیکن اب اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ اس کی زندگی میں رونما ہونے والی قیامت اسی لمحہ سب سے زیادہ تھی جو کچھ اس پر بیت گئی تھی اس میں بچے یا گھر یاد رکھنا کوئی بہت ہی بہادر عورت کر سکتی تھی ورنہ عام طور پر تو عورتیں ایسی خبر سن کر سمجھو اپنی جان ہی دے دیتی ہیں اور خبر یہ تھی کہ شفاء اس کی سوتن بن کر سادی کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی جو اگلے دن کام پر آتے ہی مجھے ناظمہ نے بتایا۔

"میں جب شاہ جہاں آپا کے گھر گئی تو انہیں امید نہ تھی کہ میں اتنی جلدی وہاں پہنچ کر چھاپہ ڈال دوں گی ساتھ ہی میرا بھائی بھی تھا اور اتفاق دیکھو گھر کا دروازہ ہی سادی نے کھولا جو مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بدحواس ہو گیا جب کہ اندر کمرے میں بھی سنوری شفاء دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے لال اور ہری چوڑیاں پہنے مجھے خود پر ہنستی محسوس ہوئی اب میرے پاس کچھ بھی کہنے کی گنجائش ختم ہو گئی تھی سوائے اس کے کہ سادی مجھے ابھی اور اسی لمحے مجھے طلاق دے دے کیونکہ میں اب مزید ایک لمحہ بھی سادی کے ساتھ نہ رہ سکتی تھی مگر اس کا گھٹیا پن دیکھیں کہتا ہے کہ اس شادی میں میرا ہاتھ شامل تھا اور میں نے خود اسے یہ سبق پڑھایا کہ وہ شفاء کو پھنسالے مزید یہ کہ طلاق کی صورت میں مجھے اپنی بیٹیاں اسے دینا ہوں گی ورنہ وہ مجھے کبھی طلاق نہ دے گا آپ سوچ نہیں سکتیں باجی اس کی ان باتوں نے میرا کتنا دل خراب کیا یہ بیٹیاں پیدا کرنے والی میں اور ان کا حق دار وہ بن بیٹھا جس نے کبھی اپنی بچیوں کے لیے ایک وقت کے کھانے کی بھی فکر نہ کی اب کہتا ہے کہ میں ان کا باپ ہوں اب میں بھی دیکھتی ہوں کیسے مجھ سے میری بچیاں چھینتا ہے۔"

اس کی باتیں سنتے ہوئے میرا دل چاہا پوچھوں تم نے اپنے میاں اور شفاء کو گولی کیوں نہ ماری اور اگر وہ نہ مار سکیں تو اب بھلا اپنی بچیاں اس سے کیسے بچاؤ گی مگر یہ وقت ایسے نازک سوالات کا نہ تھا کیونکہ وہ غریب تو پہلے ہی پریشان تھی مزید کیا پریشان کرتی لہذا خاموش رہی اور پھر سادی چند ہی دنوں بعد میرے گھر کے باہر آن موجود ہوا اور جیسے ہی ناظمہ کام ختم کر کے باہر نکلی اس نے پکڑ لیا وہ ہی معافی تلافی کہ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا جانے اس میں بھی اس کی کوئی چال تھی یا واقعی وہ سچ کہہ رہا تھا بقول ناظمہ اتنے سالوں میں اس نے پہلی بار سادی کو روتے دیکھا تھا دوسری طرف اس کا یہ بھی خیال تھا وہ یہ سارا ناٹک اپنی بچیوں کے حصول کے لیے کر رہا ہے۔

"سالا بیوقوف بنا رہا ہے مجھے وہ حرام خور شفاء میری صبا کے بنا نہیں رہ سکتی اس نے بھی سادی کو مجبور کیا ہے مجھ سے صلح کے لیے پھر آپ دیکھنا یہ ایک دن میری بچیاں بھی لے اڑے گا اور میں میاں کے بعد اولاد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔" مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے تمام تر بہادری کے باوجود اس کے لہجہ میں مامتا کا خوف جھلک رہا تھا ایسے میں مجھے اپنے سامنے بیٹھی یہ غریب عورت کافی قابل رحم لگی جس کی میں چاہ کر بھی کوئی مدد نہ کر سکتی تھی کہ یہ ان کا خاندانی معاملہ تھا اور فی الحال وہ سادی کے نکاح میں تھی اس لیے بہتر تھا کہ خاموشی سے سب سن لیا جائے ویسے بھی مجھے شعیب نے سختی سے منع کیا تھا کہ میں گھر کی ملازمہ کے کسی مسئلے میں دخل اندازی کر کے اپنے سر کوئی مصیبت ڈالنے سے گریز کروں اور پھر اگلے دو دن بڑی خاموشی سے گزرے نہ ناظمہ نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے اس سے کوئی سوال کیا وہ صبح خاموشی سے اپنے کام پر آتی اور اپنا کام نبٹا کر چپ چاپ واپس چلی جاتی شاید اس نے اپنے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اسے اس طرح چپ چاپ دیکھ کر میں بھی مطمئن ہوئی لیکن جلد ہی میرا یہ اطمینان رخصت ہو گیا جب ایک دن صبح سویرے وہ گھبرائی ہوئی میرے دروازے پر آن پہنچی آج ہیں تاریخ تھی اور اسے اپنی پورے ماہ کی تنخواہ چاہیے تھی کیونکہ وہ آج اور اسی وقت کام چھوڑ کر جانا چاہتی تھی وجہ وہی اس کا شوہر سادی تھا جو رات کچھ آدمیوں کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا کہ یا تو ناظمہ صلح کر کے اس کے ساتھ چلی جائے ورنہ طلاق کی صورت میں تینوں بیٹیاں اس کے حوالے کر دے جب کہ اسے ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ تھی لہذا اب وہ دن نکلتے ہی اپنی بچیوں کے ساتھ نہ صرف وہ محلہ بلکہ ہمارے گھروں کا کام چھوڑ کر اپنی ماں کے گھر بلدیہ ٹاؤن جا رہی تھی جو ظاہر ہے میرے گھر سے بہت فاصلے پر ہونے کے سبب اس کا وہاں سے روز روز کام پر آنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا ابھی بھی اس کا بھائی اس کے ساتھ ہی تھا ناظمہ جس کا ہمارے گھروں میں کام کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو تعلیم دلانا چاہتی تھی اور اسی سلسلے

Digitized by Google

میں اس نے شفاء کو بیوقوف بنایا تھا مگر اس کی تمام پلاننگ الٹی ہو کر اس کے گلے پڑ گئی اور آج وہ شوہر کے ساتھ ساتھ اپنے گھر بار سے بھی ہاتھ دھو کر در بدر ہو گئی اور اس سارے قصہ کا المناک پہلو یہ تھا کہ شفاء کی ساری فیملی اس شادی میں نہ صرف شریک تھی بلکہ اس کے باپ اور بھائی شادی کو اپنا داماد بنا کر بڑے خوش تھے اور پھر فاطمہ مجھ سے مل کر چلی گئی اور میں نے اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھا اس کا فون بھی بند تھا اکثر جب مجھے اس کی یاد آتی پرانی ڈائری میں لکھا اس کا نمبر نکال کر ضرور ملاتی لیکن لاحاصل جانے وہ کہاں چلی گئی تھی رفتہ رفتہ رسم زمانہ کے مطابق میں بھی اسے بھول گئی یہاں تو قریبی رشتے بھی وہ ہی یاد رہتے ہیں جو آپ کے آس پاس موجود اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں ایسے میں ایک معمولی ملازمہ کو کون یاد رکھتا ہے اور جب وہ میرے دماغ سے بالکل محو ہو گئی تو کل اچانک ہی اس طرح میرے سامنے آئی کہ مجھے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ ناظمہ کون تھی؟ ہوا کچھ یوں کہ میں اپنی ایک دوست کے ساتھ کل بولٹن مارکیٹ گئی۔ جہاں سے اسے ایک غریب لڑکی کی شادی کے لیے کچھ جہیز کا سامان خرید کر کسی فلاحی ادارے کے حوالے کرنا تھا اور ایسے کاموں کے لیے وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ ہی لے جایا کرتی تھی لہٰذا جب ہم دونوں سامان خرید کر ڈرائیور کی مدد سے سوزوکی میں رکھوا رہے تھے جانے کہاں سے ایک قدرے فربہی مائل سانولی سی خاتون میرے سامنے آن کھڑی ہوئی کچھ دیر تو اس نے مجھے خوب غور سے دیکھا پھر خوشی بھری آواز میں چلائی۔

"آپ مشاباجی ہیں نا؟"

"ہاں اور تم کون ہو؟" چار پانچ سالہ لڑکے کی انگلی تھامے کھڑی وہ خاتون یقیناً میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اس لیے اس کا اپنا نام پکارنا مجھے خاصا حیران کر گیا۔

"میں ناظمہ ہوں ناظمہ۔" وہ خوشی سے کپکپاتی آواز میں بولی جب اسی لمحہ کہیں سے نکل کر ایک خاتون اور دو لڑکیاں بھی اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئیں۔

"کون ناظمہ....." میں نے دیکھا اب اس کا خوشی سے گلنار چہرہ بجھنے لگا تھا۔ مجھے اپنی یادداشت کی کمزوری پر اتنا غصہ کبھی نہ آیا تھا جتنا اسی لمحہ آیا۔ جس کے سبب میرے سامنے کھڑی مخلص عورت مایوسی کا شکار ہو چکی تھی عین اسی وقت ایک رکشہ وہاں آن رکا جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جیسے روشنی کا جھماکا ہوا۔

ارے یہ تو سادی تھا ناظمہ کا بے وفا شوہر اب آپ یقیناً جان چکے ہوں گے کہ مجھے ناظمہ بھی یاد آ گئی تھی جو اپنی سوتن شفاء کے ساتھ شیر و شکر کھڑی مجھے دنیا کی کوئی بھی مخلوق دکھائی دی ساتھ ہی میں اس کی دو بیٹیاں تھیں جب کہ بڑی والی کی شادی ہو چکی تھی شفاء کے پیسوں سے خریدا گیا رکشہ سادی چلاتا تھا اور شفاء ابھی بھی کال سینٹر پر جاب کرتی تھی ناظمہ کی انگلی تھامے کھڑا بچہ شفا کا بیٹا عبدالرحمن تھا جسے ناظمہ نے ماں بن کر پالا کیونکہ وہ اب کہیں کام نہ کرتی تھی سوائے گھر داری کے ناظمہ کی باتیں اور صحت یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ اپنے شوہر اور سوتن کے ساتھ خوش حال زندگی گزار رہی ہے اس سے ملنے کے بعد سے لے کر اب تک میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ کیا واقعی ناظمہ نے اپنی زندگی میں اچھا وقت لانے کے لیے شفاء کو استعمال کیا یا پھر قسمت کا لکھا سمجھ کر حالات سے سمجھوتے نے اس کا نصیب بدل دیا بہرحال میں آج ایک بار پھر سے ناظمہ کی چالاکی کی قائل ہو گئی ہوں جس نے ایسا کھیل کھیلا کہ اپنی زندگی میں موجود مشکلات پر قدرے قابو پانے میں کامیاب ہو گئی مگر جو بھی تھا اپنے شوہر کی تقسیم کے لیے بڑے جگر کی ضرورت ہے جو ہر عورت کے پاس نہیں ہوتا یا شاید روپیہ اور دھن دولت وہ رنگ جو ہر رشتہ کی خوب صورتی کو زائل کر دیتا ہے اور اسی رنگ نے ناظمہ کے دماغ کو بھی گھن لگا دیا جس نے محض اپنے مفاد کے لئے سوتن کا ساتھ قبول کیا تاکہ اپنی زندگی کو سہل بنا سکے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی رہی تھی اب آپ کا کیا خیال ہے ناظمہ کا کیا گیا سودا نفع کا تھا یا وہ گھاٹے میں رہی یہ کہانی پڑھ کر اپنا فیصلہ ضرور سنائیے گا۔

Digitized by Google

وہ تیسرا دن

عمارہ خان

قسط نمبر 4

یہ کہانی خودغرضی اور لالچ پر مبنی ہے کہ کیسے کچھ انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کا احساس کیے بنا ہی کچھ ایسے شرمناک کام انجام دے جاتے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے باعث شرم بن جاتے ہیں۔اپنے حال پر مطمئن رہنا بھی ایک شکر گزاری ہی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔اس کہانی کے کچھ کرداروں کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ وہ غلط تھے یا درست، حالات کے بے رحم سمندر میں بہتے ہوئے کمزور انسان اپنے آپ کو بچانے کی خاطر، اکثر فطرت اور ضمیر کے خلاف بھی چلے جاتے ہیں جس کا خمیازہ اس کے ساتھ اولاد کو بھی بھگتنا ہوتا ہے۔ مجھے یعنی صاحب تحریر عمارہ خان کو جیسے بتایا گیا تھا اسے جوں کا توں لکھ دیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کو پڑھ کے آپ اپنے گھر کی بنیاد کے بارے میں بھی مشکوک ہوجائیں، کیونکہ یہ کہانی ایک ایسے خونی گھر کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کسی نے بہت پیار سے اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کی بنیاد میں کالے جادو کے کچھ اثرات ہیں جن سے پیچھا چھڑانا بے حد مشکل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہانی پڑھنے کے دوران آپ کو کچھ سوال الجھن میں ڈال دیں، لیکن جیسے جیسے کہانی اپنے انجام کی سمت جائیگی آپ کو سوالوں کے جوابات بھی ملتے جائیں گے اور پھر شاید فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ حقیقتا قصوروار کون تھا۔کون تھا جس نے اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لگام نہیں ڈالی اور کتنے ہی گھروں کو اپنے ساتھ تکلیف میں ڈال دیا قصہ مختصر کرتے ہیں اور اس آسیب زدہ خونی گھر کی کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔

وقاص ہاتھ دھو کے باتھ روم سے باہر نکلا اور اسی وقت کمرے کا دروازہ ہلتا ہوا محسوس ہوا جیسے کوئی باہر نکلا ہو، اس نے الجھی نگاہوں سے گیٹ کو دیکھا الماری سے دوسری شرٹ نکال کے پہننے لگا کیونکہ چائے آستین پر ہی گری تھی جس کے باعث اسے بھی دھونا پڑا لیکن شرٹ بدلتے ہوئے وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جب سونیا کمرے میں تھی تو اسے جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔

لیکن سوچوں میں گم وقاص کو وہ کالی بلی نظر نہیں آئی تھی جو نہایت خاموشی سے کمرے سے اسی وقت باہر نکلی تھی جب وہ باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

.....☆❀❀☆.....

''کب واپس آؤ گی الشبہ۔'' شہیر نے خونی گھر کے کمیشن کے پیسوں سے کچھ پیسے الشبہ کو دیتے ہوئے سرسری سے انداز میں سوال پوچھا۔

''وہ پاپا..... وہ پاپا۔'' الشبہ ایک دم گھبرا گئی۔

''کیا ہوا؟'' شہیر کے لیے الشبہ کا ردعمل حیران کن تھا۔ ''کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔''

''نہ..... نہیں..... پاپا وہ میں سوچ رہی تھی کیا وقت بتاؤں آپ کو مجھے خود ہی علم نہیں نا ابھی پیپے تو آپ مجھے دے چکے۔'' الشبہ نے فوراً ہی شہیر کا دھیان دوسری طرف کرنے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں، کوئی بھی ایمرجنسی ہو سکتی ہے، پیسے ہاتھ میں ہونا چاہیں چاہے خرچ ہو یا نہیں۔''

''اوکے پاپا..... لو یو۔'' الشبہ نے شہیر کے گلے لگتے ہوئے شرمندگی سے کہا تو شہیر کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''چلو تمہیں کرن کے گھر چھوڑ دوں۔'' شہیر نے بائیک کی چابی پینٹ کی جیب میں ٹٹولتے ہوئے بیٹی کو آفر دی۔

''نن..... نہی..... نہیں پاپا وہ چھ بجے پک کرے گی مجھے۔'' الشبہ نے بمشکل شہیر سے نظریں چرائی۔ ''بتایا تو تھا آپ کو پک اینڈ ڈراپ وہی دے رہی ہے آپ فکر نہیں کریں نا۔''

''ہوں..... چلو اچھا پھر میں سلطان کے پاس ہو آتا ہوں، ایک مکان کی چابی لینی ہے اس سے۔'' شہیر نے وقت دیکھتے ہوئے کہا تو الشبہ نے بھی سکون کی سانس لی۔

''میرے پاس تمہارے ان دونوں دوستوں کے نمبر ہیں نا؟'' شہیر کو ایکدم یاد آیا۔

''یس پاپا..... میں نے دونوں کے نمبر فیڈ کر دیے تھے۔'' الشبہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ جھوٹ بولا۔

''اچھا پاپا وہ اگر زیادہ لیٹ ہو گئی تو میں کرن کے گھر رہ جاؤں نا؟'' الشبہ نے ایک بار پھر کنفرم کرنا چاہا۔

شہیر نے جاتے جاتے لمحہ بھر رک کے بیٹی کو دیکھا جس نے آج تک ایسی کوئی فرمائش نہیں کی تھی، بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچوں کے تقاضے بھی شاید الگ ہو جاتے ہیں۔ دل پر جبر کر کے بالآخر شہیر نے اجازت دے ہی دی۔

''لیکن یہ فرسٹ اینڈ لاسٹ ٹائم ہو گا الشبہ۔'' شہیر نے آزادی دینے کے ساتھ ہی اس کو پابند بھی کر دیا۔

''اوکے پاپا۔'' الشبہ نے مسکراتے چہرے کے ساتھ سر ہلایا۔

''میں آج ہی راحیل کو سختی سے منع کر دوں گی آگے سے ایسے نہیں آ سکتی، پاپا سے جھوٹ بولنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے بس یہ لاسٹ ٹائم ہی ہے۔'' الشبہ نے سوچا۔

بیٹی کی یقین دہانی کے بعد شہیر نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور سلطان کو فون کرنے کے لیے اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

.....☆❀❀☆.....

''اچھا یار میں سونے جا رہی ہوں۔'' الماس نے تھکے ہوئے انداز میں انگڑائی لی اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ''بھائی کو یاد دلا دینا باجی ڈریسنگ کا۔'' جاتے جاتے بھی الماس کو اپنا کام یاد تھا۔ سونیا نے بے خیالی میں سر ہلا دیا اور خود بھی کچن کی سمت جانے لگی۔

''اب کیا کام رہ گیا۔'' الماس نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے سونیا کو ایک بار پھر کچن کی سمت جاتے دیکھا تو حیرت سے سوال پوچھا۔

''بچوں نے دودھ کہاں پیا ہے ابھی۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور فوراً دونوں بچوں کا گلاس بنا کر الماس کے پیچھے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

.....☆❀❀☆.....

''مہربرش کیا؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سونیا نے مہر کو گھورتے ہوئے پوچھا جس کا جواب فوراً ہی

Digitized by Google

اثبات میں ہلتا ہوا سر تھا۔

"ہوں، آئندہ ایسا نہیں کرنا اوکے۔" مہر کے ہاتھ سے گڑیا لے کر اس کے سر پر پیار کیا اور عمر کے ہاتھ سے کبھی کتاب لی۔

"چلو سونے کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

بچے دودھ کے گلاس دیکھتے ہی منہ بسورنے لگے۔

"اونہوں، دودھ نہیں پیو گے تو بڑے کیسے ہو گے۔"

"لیکن ماما میں تو بڑا ہو چکا ہوں۔" عمر نے بے بسی سے سونیا کو دیکھتے ہوئے کہا تو مہر نے بھی منہ بناتے ہوئے تکیے میں سر دے دیا۔

"اور مجھے بڑا نہیں ہونا..... چھوٹا ہی رہنے دیں لیکن یہ دودھ نہیں پینا بس۔"

سونیا عمر کے بیڈ پر بیٹھ کر اس کے سر پر پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی۔ "چلو اٹھو اور ختم کرو اسے۔"

"نہیں پینا نا۔"

"مت تنگ کرو عمر، میں ویسے بھی بہت تھکی ہوئی ہوں۔" سونیا نے روہانسی ہو کر عمر کو دیکھا۔ "ماما کو تنگ نہیں کرتے میری جان۔"

"تو رہنے دیں نا آج۔" عمر نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ "کل سے پی لوں گا۔"

"دودھ تو.....!" سونیا کی بات کاٹ کر مہر نے جملہ مکمل کر دیا۔

"دودھ تو پینا پڑتا ہے۔ چاہے رو کر پیو یا ہنس کر پیو۔" سونیا ایک دم قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئی۔ "شاباش اب پی لو اور سو جاؤ۔" دونوں منہ بسور کر دودھ پینے لگے۔ سونیا دونوں کو ایک نظر دیکھ کر ان کے اسکول بیگ کی طرف مڑی۔

"بیگ ریڈی کر لیے نا؟"

"کل سنڈے ہے ماما۔"

"اوہ ہاں تھینک گاڈ۔" سونیا نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اتنا تھک کر سونے کے بعد چھ بجے اٹھنا مشکل امر تھا۔

"ویسے منڈے کو کرائے کلاس ہے، بھول مت جانا عمر لاسٹ ٹائم بھی آپ نے.....!"

"سوری نا ماما آپ اتنی بار یاد دلا چکی ہیں۔" عمر کو ویسے ہی دودھ پینے پر غصہ آ رہا تھا۔

"اوکے اوکے۔" سونیا نے ہنس کر عمر کی چڑچڑاہٹ نوٹ کی۔ "جتنا مرضی وقت لگا لو میری جان میں ادھر ہی ہوں، خالی گلاس لے کر ہی جاؤں گی۔" سونیا کی بات سن کر عمر نے ایکدم ٹھنڈی سانس لی۔ وہ آہستہ آہستہ گلاس خالی کر رہا تھا تاکہ سونیا چلی جائے تو اس کی جان چھوٹ جائے۔

"لک ماما..... آئی ایم ونر۔" مہر نے گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے سونیا کو مخاطب کیا۔

سونیا نے جتاتی ہوئی نظروں سے عمر کو دیکھا اور مہر کو پیار کرنے لگی۔

"آپ تو ہو ہی ونر۔ بھائی ہمیشہ ہار جاتا ہے۔"

"جیسے آج ہار گیا۔" عمر نے بھی بالآخر گلاس خالی کر ہی دیا۔

"اٹس اوکے بیٹا، آپ بھی جلدی پیا کرو، باتیں کم کیا کرو تو آپ ونر ہو جاؤ گے۔" سونیا نے اسے تسلی دی اور مہر کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

عمر نے یہ دیکھ کر افسوس سے سر ہلایا اور خاموشی سے اپنے بیڈ پر لیٹ کے چادر اوڑھ لی۔ سونیا نے دونوں کو گڈ نائٹ کس کی اور ٹرے اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی کہ اچانک اس کی نگاہ بیڈ کے نیچے گئی جہاں کچھ فاصلے پر گیند پڑی ہوئی چمک رہی تھی۔

"ماما گڈ نائٹ آئی لو یو۔" مہر کی بلند آواز سن کے گم صم سونیا ایک دم چونک گئی اور لائٹ بند کر کے باہر نکل گئی۔

"اف شکر ہے کل اتوار ہے سکون سے سو کر اٹھوں گی۔" سونیا نے سیڑھیاں اترتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

وقاص سے بولوں کی حلوہ پوری ہی لے آئیں ایک اتوار تو چھٹی ملنی چاہیے مجھے بھی۔" سونیا نے سلیب پر ٹرے رکھی اور ایک آخری نظر کچن میں ڈالی۔

"اوہو۔" سامنے ہی دودھ کی پتیلی اور بچا ہوا کھانا رکھا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا دیکھ لیا ورنہ صبح تک خراب ہو جاتا یہ سب۔" سونیا نے فریج کھول کر پہلے اپنے کمرے کے لیے پانی کی بوتل نکالی اور جیسے ہی پلیٹ کے دودھ کی پتیلی اٹھانے لگی اسے سامنے سیڑھیوں پہ بچے کا عکس نظر آیا ایک دم ہی سونیا کو شدید غصہ آ گیا۔

Digitized by Google

"یہ عمر پٹے گا اب مجھ سے۔" ابھی لٹا کے آئی تھی اور اسے دیکھو کیسے مزے سے چہل قدمی فرما رہا ہے سونیا نے پانی کی بوتل سلیپ پر پٹخی اور تیز رفتاری سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی لیکن ایک دم ہی اس کے بڑھتے قدم رک گئے کیونکہ سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔

"ارے، یہ کہاں غائب ہوگیا ایک دم۔" سونیا نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر عمر کو ڈھونڈنا چاہا۔

"گیا کدھر آخر یہ......" سونیا نے سٹپٹا کر عمر کو آہستگی سے آواز دی۔

"عمر......اے عمر......شرافت سے باہر آجاؤ، میں نے دیکھ لیا ہے تم کو۔" جواب میں خاموشی سن کے سونیا کو مزید غصہ آگیا۔

"عمر اگر میں اوپر آگئی تو اس بار پٹائی ہوجانی ہے، سنا؟"

سونیا بالآخر دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگی، اس کے حساب سے وہ ٹیرس میں ہی چھپ گیا تھا۔

"لسن کڈ......آئی ایم ویری مچ ٹائیرڈ۔ ایسا نہ ہو کہ نئے گھر میں پہلے ہی دن آپ کی شامت آجائے۔" سونیا نے ہونٹ بھینچ کر ایک بار پھر عمر کو تڑی لگائی لیکن جواب میں سناٹا ہی ملا۔

بچوں کے کمرے کے سامنے کھڑے ہوکر سونیا نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا لیکن عمر کو نا پا کر ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر نائٹ بلب کی مدہم روشنی تھی جس میں دونوں بچے بے سدھ لیٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سونیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دو قدم مزید آگے بڑھ کر اس نے آنکھیں سکیڑ کے بچوں کو دیکھا۔

"ہاؤ از اٹ پاسیبل" سونیا نے عمر کو دیکھتے ہوئے سوچا اچانک ہی اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اور ایک ہاتھ دائیں سمت سے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوا سونیا نے بوکھلا کر جیسے ہی چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی ہاتھ نے سونیا کا منہ دبوچ لیا۔ سونیا کی سانس رک گئی اور وہ پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم......" سونیا نے غصے سے غراتے ہوئے کہا اور زوردار دھکا دیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔"

"شششش......شش اور جو تم عمر کو زور زور سے آوازیں دے رہی تھیں وہ کیا تھا۔"

"ابھی میرا ہارٹ فیل ہوجاتا تو۔" سونیا نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وقاص کو گھورا جواب میں وقاص نے مسکراتے ہوئے سونیا کو کندھوں سے تھاما اور نرمی سے اسے باہر کی سمت نکالتے ہوئے بچوں کے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔

"بیگم صاحبہ بچوں کا پیچھا چھوڑ دیں کچھ ان کے ابا پر بھی نظر عنایت کردیں۔" اپنے ساتھ لگائے لگائے سیڑھیاں اُترتے ہوئے وقاص نے سونیا کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"اُفف آپ بھی نا۔" سونیا ایک دم جھینپ گئی۔

"اچھا تو بچوں کے اباجی کیا چاہیے آپ کو۔"

"ہمم۔ بچوں کی اماں جی، ذرا کمرے میں تشریف لائیں پھر بتاتے ہیں۔"

سونیا نے ہنستے ہوئے وقاص کو کندھے سے آگے دھکیلا۔

"آپ جائیں میں بس دودھ اور کھانا فریج میں رکھ کے آتی ہوں۔"

"اوہ کم آن یار پہلا ہی دن ہے آج اس گھر کا۔ تم نے لازمی امور خانہ داری میں پورے نمبر لانے ہیں۔"

سونیا وقاص کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتی ہوئی اسے مزید چھیڑنے لگی۔

"آپ کی اردو غصہ میں کتنی اعلیٰ ہوجاتی ہے نا۔"

"چلو اب تم کچن تک جا رہی ہو تو لگے ہاتھوں......" وقاص نے ہاتھ سے چائے پینے کا اشارہ کیا اور آنکھ ماری۔

"دیکھو دیکھو وہ چائے تو تمہاری اولاد کی نذر ہوگئی تھی نا یاد کرو۔" وقاص نے فوراً ہی سونیا کے ماتھے پر بل نمودار ہوتے دیکھے تو اسے یاد کرنا شروع کیا۔

"اور یہ دیکھو وہ شرٹ بھی گئی کام سے۔" فوراً ہی اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے صفائی بھی دی۔

"اُفف وقاص میں واقعی آپ کے بے وقت چائے پینے سے بہت تنگ ہوں۔" سونیا نے جھنجلاتے ہوئے اسے گھورا اور بڑبڑانے لگی۔ "اتنی چائے نہیں پیا کریں۔"

"کیوں کالا ہوجاؤں گا کیا۔" وقاص نے مسکراتے

Digitized by Google

ہوئے سونیا سے معصومیت بھرا سوال پوچھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ''چلو جلدی ہاتھ چلاؤ شاباش۔''

سونیا نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور سر جھٹک کے مسکرانے لگی۔ چائے کی پتی لے کر جیسے ہی چولہے کی سمت متوجہ ہوئی اسے بجھے ہوئے دیکھ کے بے اختیار ہی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

''بس اسی کی کمی تھی اب۔''

باہر کے اندھیرے میں، لان کی سمت بیٹھی، کچن کی کھڑکی کے پار کیک سے کالی بلی بیٹھی اسے گھورتے ہوئے ہلکے ہلکے غرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس اندھیرے میں ایسے چمک رہی تھیں، جیسے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔

.....☆❀❀☆.....

پہلی رات اور انجانا گھر جس کے مکینوں کو اس خونی مکان کی کوئی ہسٹری معلوم نہیں رخ تاج اپنی کھڑکی سے لگی ہوئی مسلسل اس کالی بلی کو دیکھ رہی تھیں جو لان میں بیٹھی ہوئی کچن کی سمت منہ کیے ہوئے تھی۔

''یہ کالی بلی اب پتہ نہیں کس کو ساتھ لے جائے گی۔ کیسی عجیب بات ہے نا، آج کل کے زمانے میں بھی ایسی ماورائی چیزیں وجود رکھتی ہیں جن پر کوئی اس وقت تک یقین نہیں کرتا جب تک وہ خود اس کا شکار نہ ہو جائے۔''

رخ تاج کے کانوں میں یک دم بچے کی سسکیوں کی آواز گونجی جسے سن کر وہ بے چین ہو گئیں۔

''اوہ اوہ.....'' اچانک ان کی نظر سامنے گئی جہاں اب کالی بلی کے برابر چمکتی ہوئی گیند بھی پڑی ہوئی تھی جو ایسے ہل رہی تھی جیسے کوئی اس کے پاس بیٹھا ہوا اسے ہلا رہا ہو رات کے اس پہر آسمان پر اکیلا چاند بھی اداسی میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''اوہ خدایا رحم..... رحم..... اس بار تو رحم کر دے۔''

.....☆❀❀☆.....

''راحیل میں بہت مشکل سے آئی ہوں۔'' الشبہ نے ڈرتے ڈرتے کلب کے آزاد ماحول کو دیکھا اور راحیل کو احساس دلانا چاہا۔

''اوہ کم آن ڈارلنگ یہ ہی تو لائف ہے تھرل ہے اونچے طبقے کے۔'' راحیل آفریدی کے لیے مڈل کلاس الشبہ میں کوئی چارم نہیں تھا سوائے اس کے وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور اس کی ریپوٹیشن اپنے کالج کے ساتھ کو چنگ میں بھی نمایاں تھی۔

''پھر بھی، میں نے کبھی پاپا سے جھوٹ نہیں بولا اور آج تمہاری خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولا ہے۔'' الشبہ نے گلٹی محسوس کرتے ہوئے راحیل کا سرسری سا انداز دیکھا اور سامنے ہی ادھ ننگی لڑکیوں کو لڑکوں کی بانہوں میں گرے دیکھ کر نظریں چرائی۔

''چلو اب تو مزہ خراب نہیں کرو نا، آ گئی ہو تو لیٹس انجوائے مائے پارٹی۔'' راحیل نے مشروب سے بھرا ہوا گلاس الشبہ کی طرف بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے شانے تھپتھپائے تو ایک سنسنی سی لہر الشبہ کے جسم میں دوڑ گئی۔

''تم اس پارٹی کو کبھی نہیں بھلا سکو گی الشبہ مائی بے بی۔'' راحیل نے اپنے گروپ کی سمت دیکھ کر آنکھ ماری اور آنکھ کے اشارے سے الشبہ کو گلاس میں موجود مشروب پینے کا اشارہ کیا۔ راحیل کے گروپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کا بلند و بانگ قہقہہ سن کر الشبہ مزید بدحواس ہو گئی، وہی سہی کسر اس مشروب سے اٹھنے والی بھک نے کر دی تھی جسے زبردستی راحیل نے الشبہ کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔ چار و ناچار دو تین گھونٹ تو گلے سے اتارنے ہی پڑے۔ ایک دم تیز کھانسی سے وہ بے دم ہو گی۔

''اوہ مائی پور بے بی گیٹ آسائیڈ پلیز آؤ الشبہ ریسٹ روم میں چلتے ہیں۔'' راحیل نے فوراً ہی الشبہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اسے تسلی دی اور آنکھ مارتے ہوئے اپنے دوستوں کو سائیڈ میں ہونے کا اشارہ دیا۔ ہم ابھی آتے ہیں فرینڈز۔'' اور الشبہ کو دھیرے دھیرے تسلی دینی جاری رکھی۔

''ابھی صبح ہو جاؤ گی، کم آن ڈارلنگ، مجھے امپریس نہیں کرو سب کے سامنے، یہ لوگ کیا سوچیں گے راحیل آفریدی کی گرل فرینڈ کو محفل کے ایٹی کیٹس بھی نہیں آتے۔''

الشبہ نے پانی پی کر ہر ممکن طریقے سے خود پر قابو پانا چاہا لیکن اس تیز سیال کی تلخی بھلائے نہیں بھول رہی تھی جو گلے سے سینے تک ایک آگ کی کیفیت مچاتی ہوئی اتری تھی۔

Digitized by Google

''اب ایسی محفل کی عادت ڈالو لو الشبہ یہ میری لائف اسٹائل کا حصہ ہے اور تم میری لائف ہو۔'' راحیل نے الشبہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کلب کی اوپری منزل کی سمت جاتے ہوئے کانوں میں سرگوشی کی۔

''تم واحد لڑکی ہو جسے دیکھ کر مجھے کچھ کچھ ہوتا ہے۔ یونو کچھ کچھ.....'' الشبہ جو پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی، ان نرم گرم سرگوشیوں نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔ ڈیڈی کے واپس آتے ہی میں سب سے پہلے تمہیں انٹروڈیوس کراؤں گا لیکن اسے پہلے کم از کم ہمارے طبقے کے کچھ..... یونو.....!'' راحیل نے جان بوجھ کے بات ادھوری چھوڑی لیکن یہ ایک بات تھی کہ الشبہ شرمندہ ہوتے ہوئے سمجھ گئی اور سر ہلاتی ہوئی خاموشی سے اپنے آپ کو کنویں میں گرتے دیکھتی رہی اور قطرہ قطرہ باہر رات بہتی رہی۔

.....☆❁❁☆.....

سائیں سائیں ہوا کے تیز چلنے کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی تو ایک ہیولہ خونی گھر کے چاروں طرف گھومتا ہوا نظر آرہا تھا جو کسی بھی انسانی نظروں سے اوجھل تھا چاند کی دلفریب روشنی میں بھی اس گھر کو رات کے اس سے دیکھنا اپنے آپ میں ہی بتا دیتا تھا یہ گھر نارمل نہیں ہے کچھ الگ ہے کچھ انوکھا ہے جو لفظوں میں نہیں بتایا جاسکتا لیکن اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہیولہ جہاں جہاں گھوم رہا تھا اس کے عین نیچے کالی بلی بھی چکر لگا رہی تھی، کبھی رک کر آسمان کی سمت منہ اٹھا کر رونے لگتی تو کبھی غصے میں غرانے لگتی تھی۔ صبح کاذب تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور جیسے جیسے چاند کی روشنی اپنی اہمیت کھوتی رہی ویسے ویسے وہ ہیولہ بھی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا اور کالی بلی بھی تھک ہار کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

.....☆❁❁☆.....

رات کا اندھیرا چھٹتے ہی سورج کی ٹھنڈی اور روشن کرنیں ہر سمت پھیل کے انسان کو روزمرہ کے کاموں کی طرف بلانے کا سبب بننے لگی تھیں۔ الارم کی مخصوص آواز سونیا کو نیند سے بے دار کرگئی تھی سونیا نے ہاتھ پھیلا کر بھرپور انگڑائی لی اور آنکھیں گھما کے اپنا نیا کمرہ دیکھنے لگی۔ نیا گھر پرانے والے سے جہاں اچھے نقشے پہ بنا ہوا تھا وہیں کمرے بھی بڑے بڑے تھے، چھت کچھ بلندی پر ہونے کے سبب از خود ہی کمرے اور گھر اپنے سائز سے بڑے لگتے تھے۔ ہر کمرے میں جہازی سائز کھڑکی تھی جو لان میں کھلتی تھی۔

اتنے کم کرائے میں ایسا اچھا گھر قسمت کی بات تھی۔ سونیا نے مسکراتے ہوئے سوچا اور ایک نظر بے سدھ سوئے ہوئے وقاص پر ڈالی جو ہاتھی گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ سونیا نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے بال باندھتے ہوئے بیڈ چھوڑنے میں ہی عافیت دیکھی ورنہ بچے اسکول سے لیٹ ہوجاتے۔ باتھ روم وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد یک دم اسے یاد آیا آج تو اتوار تھا۔

''اُف..... میں نے الارم لگایا ہی کیوں۔'' سونیا نے جھنجلاتے ہوئے خود کو کوسا۔ آرام سے تھکن پوری کرکے اٹھتی۔ اب نیند بھی نہیں آئے گی دوبارہ۔ سونیا نے ایک بھرپور نظر کمرے میں ڈالی جہاں کونے میں ہی کارٹن کے اوپر کارٹن رکھے ہوئے تھے یہ، یقیناً الماریوں کا سامان تھا۔ چلو اب اٹھ ہی گئی ہوں تو کچھ کام ہی نمٹا لیتی ہوں۔ سونیا نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہیئر برش کرکے باہر کی سمت بڑھ گئی جہاں اس کے لیے کچھ انہونیاں منتظر تھیں۔

سونیا اپنے کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج تک آئی اور ایک بار پھر گھر کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ہر خاتون خانہ کی طرح اچھا گھر اس کی بھی کمزوری تھی۔

''بڑے ہی دل سے بنوایا ہے کسی نے۔'' سونیا نے چھت پر ایک نظر ڈالنے کے لیے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ بچوں کے کمرے سے گزرتے ہوئے انجانے میں اس نے دروازہ کھولا اور عمر کی چادر سے اس کی ٹانگیں باہر نکلتے دیکھ کر فوراً ہی اندر آگئی۔ پنکھا ہلکا کیا اور دونوں بچوں پر چادریں ٹھیک کیں۔ موسم مناسب حد تک خوشگوار تھا۔ سر ہلاتی ہوئی سونیا نے غور ہی نہیں کیا باتھ روم کی لائٹ کھلی ہوئی تھی، جیسے ہی بچوں کے کمرے سے باہر نکلی اسی وقت باتھ روم سے فلش چلنے کی ہلکی سی آواز گونجی اور چھت کی سمت جاتی سونیا کو بالکل بھی علم نہیں ہوا کہ اس کے جانے کے بعد عمر باتھ روم سے نکل کر ایک بار پھر سونے لیٹ گیا تھا کہ اسے یاد تھا آج اتوار ہے۔

سونیا دل ہی دل میں پلاننگ کرتی ہوئی چھت کی سمت

Digitized by Google

ست روی سے جا رہی تھی اسے اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا، بے ساختہ پلٹ کے دیکھا تو سامنے ہی کالی بلی بیٹھی ہوئی تھی۔

''اوہو مانو بلی تم نے تو ڈرا ہی دیا۔'' سونیا نے اسے پچکارا تا کہ وہ باہر چلی جائے لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھی ہوئی سونیا کو گھورتی رہی۔ ''ہشش ہشش'' سونیا نے ایک بار پھر کوشش کی شاید پرانے والے کرائے دار کی پالتو رہی ہوگی ورنہ ابھی تک تو بھاگ جاتی۔ سونیا نے کندھے اچکائے اور چھت کا دروازہ پورا کھول دیا تا کہ بلی چاہے تو وہاں آجائے اور بھاگ جائے۔

......☆❀❀☆......

''اوہ اب بس بھی کرو الشبہ، اتنے آنسو کہاں سے آتے ہیں آخر۔'' راحیل نے بے زار ہوتے ہوئے اس کو چپ کرایا۔ الشبہ کو راحیل کے لہجے کی بے زاری بھانپ کر ایک بار پھر اپنے تہی دامن ہونے کا احساس ہوا۔

''اس میں اتنا واویلا مچانے کی کیا ضرورت ہے یار، ہوگیا جو ہونا تھا اور ویسے بھی پوری طرح ذمہ داری مجھ پہ تو عائد نہیں ہوتی نا۔'' راحیل کے منہ سے الفاظ نہیں آگ کے گولے نکلے تھے جو الشبہ کے تن من کو جھلسا گئے تھے۔ ''انس کوائٹ نارمل الشبہ شاباش چلو مسکرا کر دکھاؤ۔'' راحیل کو الشبہ کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کے اندازہ ہوا کچھ غلط بول دیا ہے شاید۔

''تم...... تم یہ بات کہہ بھی کیسے سکتے ہو راحیل؟ میں نے جان بوجھ کر وہ ڈرنکس نہیں لی تھی تم نے زبردستی پلائی تھی مجھے اور مجھے ہی الزام دے رہے ہو۔'' الشبہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''میں اپنی سب سے قیمتی چیز کھو چکی ہوں اور تم مجھے بول رہے ہو، انس کوائٹ نارمل؟''

''اوہ مائی گاڈ یہ مڈل کلاس کا رونا دھونا۔'' راحیل کو کوفت ہوئی۔

''پہلے مزے کرتے ہیں پھر یہ ڈرامہ شروع کر دیتے ہیں۔''

''میری زندگی خراب ہوگئی ہے راحیل اور اس کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔''

''میں تم سے شادی کروں گا الشبہ، جو بعد میں ہونا تھا وہ پہلے ہوگیا اور اس میں ہماری رضامندی شامل تھی نا اب رونے سے وہ وقت واپس تو نہیں آسکتا ورنہ آؤ میں بھی تمہارے ساتھ روتا ہوں۔'' راحیل نے ہر ممکن کوشش کی حالات کی سنگینی کم کرنے کی۔

''کب آئیں گے تمہارے ڈیڈی۔'' الشبہ نے بھی دھیمے انداز میں پوچھا، جو ہونا تھا ہو چکا تھا، اب راحیل سے بگاڑ کر نہیں رہا جا سکتا تھا ورنہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔

''جیسے ہی پاکستان آئیں گے جان من فوراً تمہارے پاس لے آؤں گا۔ اب تو تمہارے بغیر میں بھی نہیں رہ سکتا۔'' راحیل نے مسکراتے ہوئے الشبہ کا ہاتھ تھاما اور اس کی پشت پر بوسہ دیا۔ الشبہ نے زخمی نگاہوں سے اس ہاتھ کی سمت دیکھا جہاں دو جلتے ہوئے لبوں نے چھوا تھا۔

''او کے میں چلتی ہوں۔'' بالآخر الشبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے خود پر قابو پا ہی لیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے اترتے ہوئے بے ساختہ آنسو صاف کیے۔

''ڈیٹس لائک آ مائی گرل۔'' راحیل نے بھی سکون کی سانس لی۔

''کل ملتے ہیں کوچنگ میں۔'' الشبہ کے گاڑی سے اترتے ہی راحیل نے ہوا سے شرط باندھ لی۔

''اوہ ربش، فولش گرل۔''

......☆❀❀☆......

''افوہ لگتا ہے کب سے صفائی نہیں کی چھت کی۔'' سونیا نے چھت دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑانا شروع کیا۔ پانی کی ٹنکی کے گرد جالے ہی جالے لگے ہوئے تھے، اس کے نیچے ڈھیروں ڈھیر چاکلیٹ کے ریپرز اور چونٹیوں کی جوق در جوق قطار۔ سونیا نے ایک نظر دیکھ کے فوراً ہی دوسری سمت دیکھنا شروع کیا۔ سامنے ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی ہوئی تھی جس کے نیچے مختلف اوزار اور پتہ نہیں کیا کیا الم غلم پڑا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ٹوٹا ہوا پلنگ تھا جس پر ایک بوسیدہ چادر تھی جو ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھی۔ سونیا نے چہل قدمی کرنے کے انداز سے اِدھر سے اُدھر چلتے ہوئے چھت کی چار دیواری سے باہر کی سمت جھانکنا شروع کیا۔ کچھ ہی فاصلے پر کالونی کی باؤنڈری وال تھی جو یقیناً قبرستان کی حد کا تعین کرتی تھی۔ سونیا کو ایک دم جھرجھری

Digitized by Google

سی آگئی۔ فوراً ہی دوسری سمت چیک کی جہاں ہلکی ہلکی دھوپ میں لہراتے ہوئے درخت بے حد دلکش لگ رہے تھے۔ آس پاس گھروں کے باہر کی کیاریاں دیکھ کر لگتا تھا باقاعدہ کسی مالی کا ہاتھ لگتا رہتا ہے ورنہ اتنی نفاست نہیں ہوسکتی تھی

ہوں تو سب سے پہلے ایک مالی کا بندوبست کرنا ہوگا تاکہ لان کی بھی کانٹ چھانٹ ہوسکے اور کچھ مزید پودے بھی لگوائے جاسکیں۔ دل ہی دل میں پلاننگ کرتی ہوئی سونیا اگر اپنے پیچھے دیوار پر بنے ہوئے سائے کو دیکھ لیتی تو مزید کسی پلاننگ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

......☆❀❀☆......

"ارے تم کب آئی الشبہ۔" شہیر نے معمول کے مطابق اٹھ کر اپنے لیے ناشتہ بنانا چاہا تو سامنے ہی صوفے پر الشبہ کو بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے پاپا۔" بھرائی ہوئی آواز سن کر شہیر نے فوراً ہی الشبہ کی سمت دیکھا۔

"کیا ہوا تمہیں۔"

"کچھ نہیں بس ایسے ہی تھکن ہے تو آواز......!"

"آنکھیں بھی سوجی ہوئی ہیں جیسے...... جیسے......!" شہیر کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کسی برتھ ڈے پارٹی میں اس کی بیٹی روئے گی اسی لیے اس کا ذہن رونے کی توجیہہ تلاش نہیں کرسکا

وہ پاپا نیند پوری نہیں ہوئی نا اسی لیے۔" الشبہ نے فوراً ہی بہانہ بنایا اور آنکھیں جھکا کے ہاتھ مسلنے لگی۔

"مجھے پریشان کیوں لگ رہی ہے میری بیٹی کیا ہوا؟" شہیر نے پاس بیٹھ کر پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا تو بے اختیار ہی الشبہ کی آنکھوں سے سیال بہہ نکلا۔

"کیا ہوگیا میری جان کسی نے کچھ کہا ہے کیا، بتاؤ مجھے۔" شہیر نے پریشان ہوتے ہوئے اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھا جس کی فوراً ہی ہچکیاں بندھ گئی تھی۔

"الشبہ الشبہ۔ کیوں رو رہی ہو ایسے۔"

"کچھ نہیں پاپا۔ میں اچھی بیٹی نہیں ہوں نا۔ میں نے آپ کو کل تنگ کیا۔"

"نہیں بالکل نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو خوشی ہوئی میری بیٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود کرسکے۔" شہیر نے ہاتھوں کے پیالے میں الشبہ کا چہرہ سماتے ہوئے کہا تو اس کے دل سے آہ نکل گئی۔

"کاش پاپا آپ مجھے بڑا نہیں سمجھتے تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا مجھے، کاش آپ کل مجھے منع کردیتے تو شاید آج میں اپنی لٹی ہوئی عزت کا ماتم نہیں کررہی ہوتی، کاش آپ کرن سے تصدیق کرلیتے تو آج میں اپنی ذات کا غرور قائم رکھے ہوتی، آہ کاش پاپا......" الشبہ نے خود پہ قابو پاتے ہوئے اپنی کچلی ہوئی عزت نفس کا ماتم کیا۔

......☆❀❀☆......

"فیصل بھائی فیصل بھائی۔" بلند آواز سن کے سوچوں میں گھرے ہوئے فیصل نے چونک کے پیچھے کی سمت دیکھا، سامنے ہی وارڈ کا گارڈ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" فیصل نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"وہ موبائل تمہارا ہے نا۔" گارڈ نے نرمی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو فیصل نے بے ساختہ اپنی پاکٹس چیک کی۔

"اوہ کہاں سے ملا۔" موبائل لیتے ہوئے سوال پوچھا تو گارڈ نے اشارے سے بینچ کی طرف انگلی کی۔

"اچھا اچھا۔" فیصل نے اپنی یادداشت کو کوسا۔ "بہت شکریہ بھائی۔"

"کوئی بات نہیں بھائی۔ اب تو آپ سے ام مانوس ہوگیا ہے۔" پٹھان گارڈ نے بیچارے شوہر کو دیکھ کر رسانیت سے کہا۔

"تمہاری زوجہ بخریت گھر جائے ہم مٹھائی بانٹے گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے۔" فیصل نے مروت میں پوچھا۔

"فتح خان۔" مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا گارڈ نے فخریہ انداز میں کہا تو نا چاہتے ہوئے بھی نجانے کتنے عرصے بعد فیصل نے لبوں پر کھچاؤ محسوس ہوتا دیکھ کے خود پر حیرت کی۔ اچھا تو وہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ہنسنا نہیں بھولا تھا۔

"اچھا فتح خان تمہارا بہت شکریہ جو موبائل دے دیا ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوتی۔" فیصل نے والٹ کھول کے کچھ نذرانے کے طور پر پیسے دینا چاہے تو فتح خان نے یہ بھانپتے ہی اپنے تیور سے اسے جتادیا۔

"پٹھان نے ڈیوٹی نبھائی ہے کوئی احسان نہیں کیا۔"

Digitized by Google

''وہ تو میں بس ایسے ہی۔'' فیصل خود ہی فتح خان کے انداز دیکھ کے جھینپ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ابھی اماری طرف سے چائے پی لو تم۔'' فتح خان نے نرمی سے بول کر اس کے کندھے پر ہاتھ لگایا اور خود اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

دنیا میں اچھے لوگ ابھی بھی موجود ہیں۔ فیصل نے سوچتے ہوئے اپنی بیوی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور یہ حساب لگانا بھول گیا کہ ان اچھے لوگوں کی لسٹ میں اس کا نام آتا ہے یا نہیں۔

.....☆❀❀☆.....

بدلتے موسم کے تیور دیکھ کے سورج بھی دن بھر روشنی پھیلا کر اپنا سفر ختم کرنے میں جلدی کرنے لگا تھا۔ سرِشام ہی اندھیرا اور سردی ہونے کے سبب لوگ بھی جلدی گھروں میں دبک جاتے تھے۔ کراچی کے باسی ویسے ہی ٹھنڈ کے عادی نہیں رہے تھے اسی لیے رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی لوگ گرم گھروں میں پناہ لے لیتے تھے، کچھ من چلے اس عالم میں بھی کیفے اور سڑک کنارے ڈھابے آباد کرنے پہنچ جاتے لیکن ہائی وے کی رہائشی کالونی میں ایسا کوئی جی دار نہیں تھا جو پوری ہائی وے طے کر کے سہراب گوٹھ یا نیو کراچی کے کسی چائے خانے کا رخ کرے۔ ایسے میں جہاں سونیا اور وقاص کو حیرت ہوتی تھی وہیں ایک سکون کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

''ادھر بہت خاموشی ہے نا وقاص۔'' سونیا نے دھیرے سے لیپ ٹاپ میں گم وقاص کو مخاطب کیا تو وہ چونک گیا۔ ایک دم جو ہر جیسے علاقے سے ایسی جگہ پہ آنا۔

وقاص نے سونیا کو بغور دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا آیا یہ بات وہ خوشی سے کہہ رہی یا اسے کوئی افسوس ہو رہا ہے۔

''لیکن گھر بہت اچھا ہے اور فی الحال تو یہ خاموشی میں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ ہارن کی چنگھاڑتی ہوئی آوزیں نہیں، نا ہی ٹریفک کا دھواں دھواں ماحول۔''

''ہوں یہ تو ہے۔'' وقاص نے سکون کا سانس لیا۔

''لیکن.....!''

''کیا لیکن.....!''

''گھر نیا ہے، ماحول نیا ہے لیکن روٹین وہی پرانی ہے۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے وقاص کو دیکھا۔

''چلو پھر ایسا کرتا ہوں میں دوسری شادی کر لیتا ہوں۔ روٹین بھی کچھ بدل جائے گی۔'' وقاص نے کچھ سوچتے ہوئے سونیا کو مسئلے کا حل بتایا۔

''بس ایک تو آپ مردوں کی ازلی خواہش۔ دوسری شادی۔'' سونیا نے منہ بناتے ہوئے وقاص کو دیکھا۔

''ایک تو تمہاری روٹین کا خیال کرتے ہوئے قربانی دینے کی سوچ رہا تھا۔'' وقاص نے جھینپے لاچاری سے سر ہلایا۔ ''واقعی تم عورتیں بہت ناشکری ہوتی ہو۔''

سونیا نے پاس رکھا ہوا تکیہ اس کی طرف اچھال دیا۔ وقاص بروقت دیکھنے کے باعث عین وقت پر سائیڈ میں ہو گیا ورنہ تکیہ اچھلتا ہوا کمرے میں موجود کھڑکی سے ٹکرا کے نیچے گر گیا۔

کھڑکی کے پار اندھیرے میں بیٹھی ہوئی کالی بلی نے ایک ٹک ان دونوں کو دیکھا اور دھیرے سے چلتے ہوئے مڑ گئی۔

الارم کی بلند ہوتی ہوئی آواز سے سونیا نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولی اور انگڑائی لیتے ہوئے جسم کو کھولا۔

''بالآخر روٹین شروع ہو ہی گئی آج سے۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے پاس لیٹے ہوئے وقاص کو دیکھا اور آہستگی سے بیڈ سے اتر کے باتھ روم کی سمت بڑھ گئی۔

''اب یہ تو روز مسئلے والی بات ہے کہ نیچے سے اٹھ کے اوپر آنا پڑے۔'' سونیا نے بڑبڑاتے ہوئے سیڑھیوں پہ قدم رکھا، انٹر کام لینا پڑے گا۔

''عمر..... مہر..... اٹھو شاباش۔ اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔'' سونیا نے بچوں کا دروازہ کھولا اور دونوں کو آواز دینی شروع کر دی۔ بچے گہری نیند میں تھے اسی لیے ان پر پہلی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''میں کچن میں جا رہی ہوں۔ ہری اپ بچو۔'' سونیا نے جاتے جاتے جو ایک نظر دونوں پر ڈالی تو ایک بار پھر کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا۔

''افوہ۔ اٹھ بھی جاؤ نا۔ اس بار باقاعدہ ہاتھ سے بچوں کو ہلایا۔

''اٹھ گیا ہوں ماما۔'' عمر نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

Digitized by Google

''مہر۔'' سونیا نے مہر کی چادر اتاری۔ ''اٹھو جانو۔ اسکول نہیں جانا کیا۔''

''ماما میں نے نہیں جانا۔'' مہر نے فوراً ہی پھیل جانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

''نو چھٹی۔ میں نیچے جارہی ہوں۔ فوراً اٹھو اور کچن میں آؤ۔'' سونیا نے سختی سے دونوں کو مخاطب کیا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے لیکن باہر جاتے جاتے کن انکھیوں سے دونوں کو دیکھنا نہیں بھولی۔ علی اٹھ کے انگڑائیاں لے رہا تھا تو مہر بیڈ پر بیٹھی ہوئی جھوم رہی تھی۔ سونیا نے ایک نظر ان کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے نیچے جانے لگی۔

''پہلے تم جاؤ بھائی پھر میں جاؤں گی۔'' مہر نے منہ بسور کر بھائی کو پہلے باتھ روم جانے کی آفر دی تو عمر منہ بناتا ہوا باتھ روم کی سمت بڑھ گیا۔

''کل تم جاؤ گی اب پہلے۔'' مہر اتنی دیر میں دوبارہ بیڈ پہ لیٹ چکی تھی۔

سونیا نے پھرتی کے ساتھ ٹیکسس نکال کر فرائی کرنے رکھے اور گرما گرم نوڈلز نکال کر باؤل میں ڈالے ساتھ ہی جوس کے گلاس بھر کر کچن کاؤنٹر پر رکھے اور لنچ باکس نکال کے ان میں ٹشو رکھنے لگی۔

سامنے سے مہر اور علی اسکول بیگ لیے ہوئے نیچے اترتے ہوئے دکھائی دیے۔ ''صرف دس منٹ ہیں بچو، جلدی سے آجاؤ۔'' سونیا نے فریج سے واٹر بوتل بھی نکال کر ان کے سامنے رکھیں تاکہ وہ بیگ میں رکھ لیں۔

منہ بسورتے ہوئے دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور ناشتہ کرنے لگے۔

سونیا نے دونوں کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

''کیسی نیند آئی نئے گھر میں۔''

''بہت مزے کی ماما۔'' بے زاری سے نوڈلز کھاتی ہوئی مہر نے ایکدم سر اٹھا کے جواب دیا۔

عمر کی طرف سے کوئی ردعمل نہ پا کر سونیا نے عمر کو مخاطب کیا۔ ''اور عمر آپ کو بیٹے۔''

عمر جواب دینے ہی لگا تھا کہ ہارن کی آواز فضاء میں گونج گئی۔ سونیا نے فوراً ہی ان کو جانے کا اشارہ کیا اور ٹکسس نکال کر لنچ باکس میں ڈالے۔

''ہری اپ ہری اپ۔''

''کیا ماما پہلے دن تو آپ نے چھوڑنا تھا نا ہمیں اسکول۔'' عمر نے بے ساختہ ہی شکوہ کیا۔

''اوہ آئی ایم سوری۔ مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اچھا تم لوگ جاؤ میں بابا سے کہہ دوں گی وہ چکر لگالیں گے اوکے۔'' سونیا نے شرمندہ ہوتے ہوئے تسلی دی۔ واقعی پہلے دن تو اسے جانا چاہیے تھا

بابا اسکول اور ہم اکیلے جارہے ہیں۔ مہر نے بھی منہ بسورتے ہوئے اپنا حصہ ڈالا۔

''سوری سوری۔ چلو ایسا کرتے ہیں، واپسی پر میں آجاؤں گی لینے اور پھر لنچ بھی باہر ہی کرلیں گے۔'' سونیا نے دونوں کو بانہوں میں بھرتے ہوئے باہر کی سمت قدم بڑھائے۔

''کیا کہتے ہو پھر، ڈن؟'' سونیا نے بیچ کی ایک راہ نکالتے ہوئے بچوں کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

''یس ماما۔ ڈیل۔'' دونوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا اور خوشی خوشی مرکزی دروازے سے باہر نکل گئے۔

''ارے یہ تو رکھ لو۔'' سونیا نے عمر کی واٹر بوتل لہرائی۔

''ہر بار بھول جاتے ہو، پہلے سے رکھا کرو نا۔''

عمر مہر کو چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا اور بوتل لے کر بھاگتا ہوا ہی واپس چلا گیا۔ سونیا بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ بچوں کے جانے کے بعد آسودہ سی سانس لیتی ہوئی آس پاس بنے ہوئے لیکن سکون آمیز خاموشی میں بسے ہوئے گھروں کو دیکھ کر گہری گہری سانس لے کر جیسے صاف ہوا اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی۔ شہر کی آلودہ فضا سے پاک، یہ صاف ستھرا احول سونیا کے موڈ پر بہتر اثر ڈالا تھا۔ بھٹکتی ہوئی نگاہیں، عین سامنے والے گھر کی جانب اٹھ گئیں، جہاں کھڑکی کا پردہ حسب معمول ہل رہا تھا لیکن ایک بار کوئی بندہ بشر سامنے نہیں تھا۔ سونیا نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کھڑکی کو تکا اور جب دیکھتے دیکھتے ہی پردہ برابر ہونے کے ساتھ کھڑکی بھی بند ہوگئی تو وہ کندھے اچکا کر گھر کے اندر کی سمت چلی گئی۔

.....☆❀❀☆.....

رخ تاج ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے کھڑی تھی ان کے سامنے وقاص کے گھر کا اندرونی گیٹ کھلا اور پہلے بچے منہ

Digitized by Google

بسورتے ہوئے باہر نکلے ان کے پیچھے ہی ان کی ماں پانی کا تھرماس لہراتے ہوئے کچھ بولتی ہوئی تیزی سے آئی۔ رخ تاج بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔ جب بچے کوون کے قریب جا کر بھاگتے ہوئے واپس آتا دیکھا۔ رخ تاج اپنی ہی دھن میں کھڑکی سے لگی ہوئی جاتی وین کو دیکھتی رہی تھی کہ ان کو کسی کی نظریں اپنے اوپر جمی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن وہ یہ جانتی تھیں ان کی کھڑکیوں میں لگا ہوا شیشہ باہر سے کچھ نہیں دکھا سکتا جبکہ وہ اندر کھڑی ہو کر بھی باہر کی ایک ایک چیز صاف طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ انہوں نے سامنے کھڑی ہوئی خوب صورت عورت کو دیکھا جو یقیناً ان بچوں کی ماں تھی۔ وہ انہیں کی کھڑکی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ رخ تاج نے نامحسوس طریقے سے پیچھے ہو کر پردہ برابر کر دیا۔

مہر اور عمر اسکول وین میں بیٹھ کر پہلے تو ادھر اُدھر دیکھتے اندازہ لگاتے ہیں کون کون وین میں ساتھ ہے لیکن ابھی چند ہی بچے بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی اونگھتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے بیگ کھولے اور اس میں سے مخصوص برانڈ کی چاکلیٹ نکال کر کھانے لگے۔

"مزے کی ہے نا۔" مہر نے عمر کو دیکھا اور بولتے ہوئے چاکلیٹ کا ریپر باہر کی سمت اچھال دیا۔

.....☆☆.....

"چلو جی کام سے لگتے ہیں۔"

سونیا نے بچوں کے جانے کے بعد کچھ پل باہر ہی کھڑے ہو کر بتائے اور اندر جانے کے لیے پرتولے بچوں کے کیے گئے ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا کہ اچانک کسی خیال کے تحت سونیا ایک دم چونک گئی پھرتی کے ساتھ ذرا آگے ہوتے لاؤنج کی وال کلاک میں وقت دیکھا اور سر جھٹک کر ایک بار پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی وقاص کے جانے میں ابھی وقت تھا۔

چلو اب وقاص کو اٹھا ہی دوں۔ سونیا نے صاف ستھرے کچن پر ایک نظر ڈالنے کے بعد لاؤنج میں رکھے ہوئے کچھ کارٹن کو نظر انداز کیا اور سیدھا اپنے بیڈ روم میں جا کر ہی دم لیا۔ وقاص بے سدھ اوندھا لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ سونیا اسے مسکرا کر دیکھتی ہوئی آفس کے کپڑے نکال کے پریس کرنے لگی اور ساتھ ہی وقاص کو آواز دینا جاری کر دیا۔

"وقاص.....وقاص....."

وقاص نے مندھی آنکھوں سے اسے دیکھا اور کروٹ بدل لی۔

"اٹھ جائیں جناب، آٹھ بجنے والے ہیں۔"

"ہوں۔" وقاص نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

"پھر مجھے نہیں بولنا دیر سے جگایا۔" جواب نا ملنے پر سونیا نے سر جھٹک کے کپڑے ہینگر کر دیے اور کمرے میں رکھے ہوئے باکس کھول کے اس میں رکھی ہوئی چیزیں نوٹ کرنے لگی۔ سامنے آنے کے باعث اپنے چند جوڑی جوتے بھی نکال کر الماری کے نچلے خانے میں ترتیب سے رکھے۔

"ارے ابھی تک نہیں اٹھے۔" سونیا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پلٹ کے وقاص کو دیکھا جو کروٹ لیے ہوئے سو رہا تھا۔

"بہت تنگ کرتے ہیں آپ بھئی۔" سونیا نے چمکتی ہوئی نگاہوں سے سائیڈ کارنر پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل اٹھائی اور تھوڑا سا پانی لے کے وقاص پہ پھینکا۔ وقاص تڑپ کے اٹھ بیٹھا۔

"دیکھا کیسے اٹھایا۔ مانتے ہیں نا۔" سونیا نے کھلکھلاتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگنے میں عافیت جانی۔

"بتاتا ہوں تم کو۔" وقاص نے جھنجلا کے اسے گھورا اور زوردار آواز میں تڑی لگانا نہیں بھولا۔

"اٹھیں گے تو بتائیں گے نا جناب۔" دور سے سونیا کی ہنسی نے وقاص کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکان سجا دی بھرپور طریقے سے انگڑائی لے کر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائی اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے منہ بنایا۔

"بس اٹھانے کی ہی جلدی تھی سونیا میرے کپڑے نہیں نکالے یار۔"

"پریس بھی کر چکی ہوں۔"

وقاص نے ایک بار پھر کمرے میں نظریں دوڑائیں اور بلند آواز میں جواب دیا۔ "اچھا تو جن بھوت لے گئے پھر۔ میں شاور لینے جا رہا ہوں یار۔ آجاؤ ذرا دوسرے نکال دو۔"

کچھ ہی لمحے بعد سونیا ہاتھ میں پراٹھے کا پیڑہ لیے

Digitized by Google

ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور سامنے ہی ہینگ ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر چڑ گئی۔

''اف سامنے رکھی ہوئی چیز نظر نہیں آتی ان کو۔'' باتھ روم کا دروازہ بجاتی ہوئی بلند آواز میں کہا۔ ''یہ رکھے کپڑے اور اب میں ناشتہ بنانے جارہی ہوں۔ خبردار جو آواز دی مجھے۔''

''اچھا، اوکے میڈم۔''

.....☆❀❀☆.....

''لو سموسے کھاؤ یار۔'' سلطان نے دکان میں داخل ہوتے ہی اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے شہیر کو دیکھا جو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''شہیر کس سوچ میں گم ہو یار۔'' سلطان نے شہیر کو گم صم انداز میں بیٹھا دیکھا تو پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔ ''کیا ہوتا جارہا ہے تم کو۔''

''نن..... نہیں..... نہیں کچھ بھی تو نہیں۔'' شہیر نے چونکتے ہوئے سلطان کو جواب دیا۔

''ہمارا اتنا پرانا ساتھ ہے شہیر۔ اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے چہرے پہ پریشانی نہیں پڑھ سکتا۔''

''اچھا دوست بھی ایک نعمت ہی ہوتا ہے۔'' شہیر نے مسکراتے ہوئے سلطان کی تعریف کی۔

''بس تو اچھے دوست کو فوراً بتا دو کیا مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے میں کچھ ہیلپ کردوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں یار۔ بس وہ.....!''

سلطان نے سامنے رکھے ہوئے اخبار کو اپنی طرف کرتے ہوئے سرسری انداز میں مزید استفسار کیا۔

''سائٹ والے مکان کے کرائے داروں کا سوچ رہے ہو کیا۔''

''تم کو کیسے معلوم ہوا۔'' شہیر نے بے ساختہ بول کر اپنے لب بھینچ لیے۔

متوقع جواب سن کے سلطان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ارے یار..... واحد وہی گھر ہے جس کے کرائے داروں کو تم کبھی کبھی فون کرکے پوچھتے ہو۔ سب خیریت ہے نا۔'' (شہیر کی نقل اتاری)

شہیر نے فوراً ہی ماحول کو ہلکا کرنے کی خاطر ہنس کر اسے ٹوکا۔

''اچھا..... مجھے معلوم نہیں تھا۔ تمہاری اتنی توجہ ہے مجھ پر

اس ایجنسی میں ہم دو کے علاوہ ہے ہی کون یار۔ دن کے سات آٹھ گھنٹے ہم ساتھ ہوتے ہیں۔''

''ہوں بات تو واقعی سچ ہے ادھر ہم دونوں کے علاوہ تیسرا ہے ہی کون۔ ویسے میں واقعی ان کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ فون کرکے پوچھوں گھر کیسا لگا۔''

''تو اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے یار۔ کرلو کرائے دار اچھے ہوں تو آگے بھی ان سے کام ملنے کا چانس رہتا ہے۔'' بات کرتے کرتے ہی بجتے ہوئے فون کو اٹھا کر اخبار میں کسی مکان کے دیئے ہوئے نمبر کو ڈائل کرنے لگا۔

''ہماری تو روزی روٹی ہی یہ کرائے دار ہیں۔ اگلے مکان کے لیے تم کو ہی ذہن میں رکھیں تو اچھا ہے نا۔''

''ہاں ہیلو۔''

شہیر جو بغور سلطان کی بات سن رہا تھا ایک دم اس کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ گیا۔

''اگلے مکان کے لیے زندہ بچے تب نا۔''

.....☆❀❀☆.....

''عمر۔'' اسکول ٹیچر ماریہ نے عمر کو مسلسل ہاتھ ہوا میں اچھالتے ہوئے دیکھا تو ٹوکے بنا نہیں رہ سکیں۔

''کیا کررہے ہیں آپ''

''کچھ نہیں مس، سوری.....!'' عمر نے فوراً ہی بال اپنے بیگ میں رکھی اور سامنے کھلی ہوئی کاپی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مس ماریہ نے بھی پہلے دن کا لحاظ کرتے ہوئے مزید کچھ نہیں کہا لیکن ان کے نزدیک اچنبھے کی بات تھی ایک بچہ خیالی انداز میں کیوں ہاتھ ایسے اوپر نیچے کررہا ہے جیسے کسی گیند کو کیچ کررہا ہو۔

''ڈائری لائیں عمر وقاص۔''

''اوکے مس۔'' عمر نے فوری طور پہ جواب دیا اور بیگ کھول کر پہلے ایک نظر سامنے رکھی ہوئی گیند پر ڈالی جو ابھی اندر رکھی تھی اور ڈائری نکال کے مس کی طرف بڑھ گیا۔

.....☆❀❀☆.....

Digitized by Google

وقاص گنگناتا ہوا کچن کاؤنٹر پر آ بیٹھا اور سونیا کو دیکھ کر مسکرانے لگا جو اسے گھور رہی تھی۔

''اب ناشتہ کریں، دیر ہو رہی ہے۔''

''مجھے اٹھانے کی جلدی ہوتی ہے خاتون کو۔''

''جی نہیں۔ میں نے پہلے کپڑے پریس کیے تھے پھر آپ کو اٹھایا تھا۔'' سونیا نے ناراضگی سے جواب دیا۔

''سامنے ہی رکھے ہوئے تھے لیکن جناب کو نظر کہاں آتا ہے۔''

''ہاں ہوا میں اڑ گئے تھے پھر جب میڈم کی سواری آئی توڈر کر واپس آ گئے۔'' سونیا روہانسی ہی ہوگئی۔

''آپ میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہے ایک تو اتنی تھکن کے باوجود سارا کام وقت پر کر رہی ہوں اور پھر.....!''

وقاص جو سونیا کو چھیڑ رہا تھا یکا یک اس کے بدلتے موڈ کو دیکھ کے گھبرا گیا۔

''ارے ارے میرا وہ مطلب نہیں تھا سونیا۔ میں سمجھ سکتا ہوں تھکن بھی ہے، فیند کی کمی ہے پھر نیا گھر نئے سرے سے سب کچھ ارینج کرنا۔ ہو جاتا ہے۔ اٹس اوکے یار۔''

''لیکن میں نے.....!''

وقاص چائے کا کپ سلیب پر رکھ کے سامنے کھڑی سونیا کا سر تھپتھپایا۔

''اوکے یار اتنا میریس میٹر تو نہیں ہے یہ۔ چلو میں چلتا ہوں۔''

سونیا اس کے جانے کے بعد الجھی سی کھڑی تھی اچانک اس کی نظر سامنے پڑی ہوئی چمکتی ہوئی بال پر پڑی، جو لمحہ بھر پہلے وہاں ہرگز نہیں تھی۔ سونیا بے خیالی میں اس گیند کی سمت بڑھتی چلی گئی۔

.....☆❀❀☆.....

''اے تم نئے ہو نا۔''

عمر لنچ بریک میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا چاکلیٹ کھا رہا تھا کہ اچانک ایک بچہ اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔

''ہاں۔'' عمر نے ایک نظر اس بچے کو دیکھا۔

''کہاں سے آئے ہو۔ اور کیوں آئے ہو۔'' یقیناً وہ بچہ بدتمیز تھا۔

''ہم نے ادھر گھر لے لیا ہے تو اسی لیے اس برانچ میں آ گئے۔'' عمر نے تحمل سے جواب دیا۔

''لیکن یہ جگہ میری ہے۔ کس کی اجازت سے ادھر بیٹھے ہو تم۔''

''اوکے تم آ جاؤ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔'' عمر نے اپنا لنچ باکس اٹھایا اور جانے لگا۔

''دکھاؤ کیا لائے ہو لنچ میں۔''

''یہ میرا ہے۔'' عمر نے تیزی سے جواب دیا۔ ''کیوں دوں تم کو۔''

''دکھاؤ مجھے..... لاؤ۔'' اس بچے نے عمر کو دھکا دیتے ہوئے لنچ باکس کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اچانک اس کے سینے پر تیزی سے ایک گیند لگی وہ بچہ چیخنے لگا۔

''واٹ ہیپنڈ بلال۔'' اسی وقت عمر کی کلاس ٹیچر مس ماریہ کی آواز بلند ہوئی۔

''مس اس نے مجھے مارا۔'' بلال نے منہ بسورتے ہوئے مس کو شکایت کی جسے سن کر عمر نے حیران ہو کر مس کو دیکھا اور تیزی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن یہ تو خود نیچے گرا ہوا ہے اور کافی دور ہے، آپ کو کیسے مار سکتا ہے۔''

''مس اس نے مجھے دھکا دیا تھا اور.....!''

''جھوٹ بول رہا ہے یہ مس۔'' اس نے مجھے بال سے ہٹ کیا ابھی۔''

''بٹ ویئر از بال۔''

''یہ ہے نا۔'' بلال نے سامنے پڑی ہوئی بال کو دیکھتے ہوئے مس کی سمت دیکھا اور ان کی سوالیہ نظروں کو خود پر جمے ہوئے حیران ہو کر ایک بار پھر گیند کی سمت نگاہیں کی لیکن وہ اب وہاں نہیں تھی۔

.....☆❀❀☆.....

سونیا چمکتی ہوئی گیند کو اپنی نگاہوں میں لیتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی، لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر ایک ٹک اسے ہی دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے سے دو ہاتھ خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سونیا پر سوچ انداز میں بال کو دیکھ رہی تھی اور جیسے ہی اسے اٹھانے کا سوچ کر اٹھنے لگی ایکدم پیچھے سے آتے ہوئے دو ہاتھ اس کی آنکھوں کو چھپا گئے۔ سونیا کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔

Digitized by Google

''ارے باجی۔'' الماس نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ہی ڈرا دیا۔''

''یہ کیا بدتمیزی تھی۔'' سونیا نے اسے گھورا۔

''کہاں گم تھیں باجی جی جو ایسے ڈر گئیں یار۔'' الماس نے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے سوال پوچھا۔

سونیا نے بال کی سمت نظر اٹھائی لیکن وہ اب اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔

''ارے۔''

''کیا ہوا.....''

''ابھی ادھر تھی وہ کہاں گئی۔''

''کون کہاں گیا یار کچھ ناشتہ واشتہ ہے کیا بھوک لگ رہی ہے۔'' الماس نے فوراً ہی سونیا کا دھیان اپنی طرف کیا۔

''لل.....لیکن.....وہ.....!''

''گھر پر کوئی نہیں ہے کیا۔ اتنا سناٹا ہے۔'' الماس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرسری سا سوال پوچھا۔

''بچے اسکول وقاص آفس۔'' سونیا نے الجھے ہوئے انداز سے لاؤنج میں نظریں گھمائی۔

''اوہ بھائی چلے گئے چلیں چھوڑیں ان کو بھوک کا کچھ کریں۔'' الماس نے بلند آواز میں سونیا کو مخاطب کیا اور پیٹ پہ ہاتھ پھیرا۔

''چلیں نا اٹھیں، مزے دار سا پراٹھا بنا دیں۔ بہت دن ہوئے کھائے ہوئے۔'' الماس نے سونیا کو ہاتھ سے پکڑ کے اٹھاتے ہوئے لاڈ کیا تو وہ بھی مجبوراً کھڑی ہوگئی۔

''تم نے آفس نہیں جانا تھا کیا۔''

''میں نے دو چار دن کا آف لے لیا ہے۔ گھر سیٹ ہو جائے تو پھر آفس جانا اسٹارٹ کروں گی۔''

''چلو شکر کسی کو تو میرا خیال آیا۔'' سونیا نے چولہا جلاتے ہوئے سامنے بیٹھی ہوئی بہن کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

الماس فوراً ہی مسکرانے لگی۔

''کیوں مسکرا رہی ہو بھئی۔''

''اصل وجہ بتادوں کیا آفس نہیں جانے کی۔'' الماس نے شرارتی نگاہوں سے بہن کو دیکھا جو سر ہلا کے جواب مانگ رہی تھی۔

''وقاص بھائی سے بولا ہوا ہے اپنی برانچ میں ٹرانسفر کرا دیں میرا۔ اب میرا آفس جو اتنا دور ہو گیا کسی کو خیال ہی نہیں کہ ادھر سے اتنی دور جانا پڑے گا مجھے۔'' الماس نے مصنوعی افسوس کرتے ہوئے سر پہ ہاتھ مارا۔

''بس بس ڈرامہ کوئن..... کیا کھاؤ گی؟''

''بس گرم گرم چائے اور پراٹھا۔ ہائے ہائے۔'' الماس نے چٹخارہ لیتے ہوئے آنکھیں گھمائیں اور مسکراتی ہوئی سونیا کی سمت دیکھا۔

''یہ لو بھئی۔'' سونیا نے ٹرے میں پراٹھا اور چائے کا بڑا سا کپ رکھا۔

''آجائیں لاؤنج میں ہی بیٹھ جاتے ہیں نا۔''

''ہوں چلو میں آتی ہوں۔'' سونیا نے اپنا چائے کا کپ بھی ٹرے میں رکھا اور الماس کو جانے کا اشارہ کیا۔

''بچے نہیں ہیں کیسا عجیب لگ رہا ہے گھر یار آپ کیسے اتنا وقت اکیلے گزار لیتی ہو۔'' سونیا نے آہستگی سے لاؤنج کی سمت جاتے ہوئے بلند آواز سے سونیا سے پوچھا اور سکون سے ناشتہ کرنے لگی۔ ''میری مانیں تو جاب کرلیں آپ بھی باجی۔''

سونیا نے پھرتی کے ساتھ دودھ نکال کے پتیلی پر رکھا اور خود بھی الماس کے پیچھے چل پڑی۔

''بور نہیں ہوتیں ہو جاتی آپ ایسے تو بہ آپ نے خود کو زنگ لگا لیا ہے۔ نکلیں گھر سے یار۔'' الماس نے مزے سے پراٹھا کھاتے ہوئے بہن سے باتیں کرنا جاری رکھا جو مسکراتے ہوئے مسلسل سر ہلا رہی تھی۔

جہاں ایک طرف یہ دونوں بہنیں آپس میں باتیں کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں وہیں بچوں کے کمرے میں رکھے ہوئے دونوں بیڈ میں سے ایک بیڈ کی چادر ہلنا شروع ہوئی جیسے اس کے نیچے کوئی ہو۔ آہستگی سے چادر ہوا میں بلند ہوئی اور اس کے نیچے سے ایک ہیولہ نمودار ہوا۔ چادر بیڈ سے نیچے گر گئی ہیولہ کمرے سے باہر کی سمت قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ بلند آواز میں بند ہوا۔

''پتا بھی نہیں چلتا یار تم لوگ اتنا کام پھیلا کے جاتے ہو کہ وہی سمیٹتے سمیٹتے ایسے وقت گزر جاتا ہے۔'' سونیا نے چٹکی بجاتے ہوئے الماس کی جانب دیکھا۔ اسی وقت اوپر

Digitized by Google

سے گیٹ بند ہونے کی آواز گونجی۔

''ارے اوپر کون ہے۔'' سونیا نے چونکتے ہوئے الماس کی جانب دیکھا۔

''ہوا سے بند ہوا ہوگا۔'' الماس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔ ''ہمارے علاوہ اس وقت کوئی نہیں گھر پر۔''

''ہوا سے۔'' سونیا نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا۔

''نہیں کوئی جن بھوت نے کیا ہوگا باجی۔''

''الماس مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے.....!''

''ہوں جیسے۔''

''جیسے ہمارے علاوہ بھی کوئی ادھر رہتا ہے۔'' سونیا نے اٹکتے ہوئے سامنے بیٹھی ہوئی بہن کو دیکھا اور بات مکمل کی۔

''اوہ کم آن باجی۔'' بلند و بالا قہقہہ لگاتے ہوئے الماس نے چائے کے کپ کو رکھا اور بنا آواز تالیاں بجا کر جیسے داد دی ہو سونیا کو۔

''ایک ہوا سے بے چارہ دروازہ کیا بند ہوگیا آپ نے تو.....!''

سونیا جو اسے گیند کے ایک دم غائب ہونے کے بارے میں بتانے والی تھی ایکدم خاموش ہوگئی۔

''اسی لیے آپ کو کہہ رہی ہوں کوئی جاب واب کرلیں۔ خالی ذہن میں ایسی ہی فضول کی باتیں آتی ہیں۔'' الماس نے مسکراتے ہوئے سونیا کا مزید مذاق اڑایا۔

''بھائی کو بتاؤں گی تو دیکھیے گا وہ کیسے ریکارڈ لگائیں گے آپ کا۔''

سونیا کو صبح وقاص کے کپڑے والی حرکت یاد آگئی۔

''تمہارے بھائی کو اچھے سے آئی اسپیلشسٹ کی ضرورت ہے فی الحال تو۔''

''بس بس اب آپ بھائی کے پیچھے نا پڑ جائیں۔''

''اچھا چلو اب تم نے آف لیا ہے تو میرے ساتھ ہیلپ ہی کرادو۔''

''میں نے اپنا کمرہ سیٹ کرنا ہے یار۔'' الماس نے بیچاری سی شکل بنا کے بہن کو دیکھا۔

''کم از کم یہ ہی بتادو آج کیا پکاؤں۔'' سونیا نے اسے گھورتے ہوئے سوال پوچھا۔

''اوہ پلیز۔ باجی جی۔ میں نے آفس سے اس لیے آف نہیں لیا کہ آلو ٹنڈے ڈیسائڈ کرنے بیٹھ جاؤں اب خود سوچو اور بناؤ اور ہاں جب پکالو تو بتا دینا۔ کھا ضرور لوں گی۔'' بات کے اختتام تک خود ہی قہقہہ لگا کر جیسے خود کو داد دی۔

''ارے.....!'' سونیا کو اچانک کچھ یاد آیا اور فوراً ہی اٹھ کے بھاگنے کے انداز میں کچن کی سمت بڑھی۔

''کیا ہوگیا۔'' الماس نے حیرت سے بلند آواز میں پوچھا۔

''دودھ چولہے پر رکھ کر آئی تھی۔''

الماس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور سامنے رکھی ہوئی چائے کی ٹرے کو اٹھالیا۔

''افوہ کام بڑھ گیا۔'' سونیا نے چولہے پر گرے ہوئے دودھ کو دیکھ کے خود کو کوسا۔ کم از کم آنچ ہی ہلکی کردیتی تو شاید۔ لیکن آنچ تو میں بہت ہلکی کر کے گئی تھی۔ اچانک سونیا کو یاد آیا تو اس نے چولہے کے سارے ناب کھول کھول کے جلانا شروع کردیے۔ کہاں گڑبڑ ہے اس میں۔ سونیا نے تینوں برنر کو چیک کیا۔ ہر چیز نارمل تھی۔ کندھے اچکا کر صافی کی مدد سے چولہے پر گرا ہوا دودھ صاف کرنا شروع کردیا۔

''چلو اسے ہی کچن تک رکھ دیتی ہوں۔ کیا یاد کریں گی باجی بھی۔'' الماس نے دبے قدموں سے کچن کی سمت جاتے ہوئے زیرلب کہا اور خاموشی سے ٹرے کچن کی سلیب پہ رکھ دی۔

سامنے ہی سونیا بڑبڑاتے ہوئے چولہا صاف کرنے میں مگن تھی، اسے قطعی علم نہیں ہوا الماس کے کچن تک آنے کا۔

الماس نے کچن سے نکلتے ہی بلند آواز میں سونیا کو مخاطب کیا۔

''باجی اس سے زیادہ کی امید نہیں رکھنا مجھ سے۔''

پھرتی کے ساتھ الماس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور اپنے موبائل میں کچھ ٹائپ کرتے ہوئے اوپر چڑھنے لگی۔

Digitized by Google

”یہ ہی کام رہ گیا ہے نا کہ گھر کا مینوڈیسائیڈ کرتی پھروں۔“

سونیا جو مگن سے کام کررہی تھی ایکدم الماس کی بلند آواز سن کے مسکرانے لگی اور صافی دھونے کے بعد پتیلی بھی لگے ہاتھوں دھودی تاکہ کام کم ہوجائے۔ ہر چیز دھودھلا کے وہ الماس کے ناشتے کے برتن بھی لینے پلٹی ہی تھی کہ سامنے ایک تسلے میں رکھی ہوئی سبزی دیکھ کے ہنس پڑی۔

”شکر ہے کچھ تو ہیلپ کرگئی یہ لڑکی بھی۔“

”سونیا کو معلوم نہیں تھا سلیپ کے بلکل نیچے چمکتی ہوئی بال پڑی ہوئی ہے۔

......☆☆......

شام کے سائے تیزی سے بڑھ رہے تھے جب وقاص نے گاڑی پارکنگ ایریا میں پارک کی اور جیسے ہی گاڑی سے دو قدم دور ہوا اس کے اندر کی لائٹ ایکدم روشن ہوگئی۔ وقاص نے چلتے چلتے پلٹ کے دیکھا اور حیران ہی رہ گیا۔

”یہ کیا ہوا۔“ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر لائٹ بند کرکے سوچ کا اندازہ لگانے لگا کہیں کوئی چیز لوز تو نہیں ہوگئی۔ ہر چیز نارمل دیکھ کر وہ کندھے اچکاتے ہوئے باہر جانے کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا لیکن وہ کسی حال میں نہیں کھلا۔ وقاص شدید گھبرا گیا، گھبراہٹ سے دروازے کو اپنے کندھے سے دھکا لگانے لگا، لیکن اس کے دھکوں سے ٹریگر بلند آواز میں بجنا شروع ہوگیا۔

”ٹون ٹون۔“ بلند آواز شام کے سناٹے میں دور تک سنائی دے رہی تھی۔ وقاص اس آواز سے مزید گھبرا گیا اور شد و مد سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک ہی گاڑی کے شیشے پر ایک بچے کا عکس نمودار ہوا جس کے بارے میں گھبرائے ہوئے وقاص کو اندازہ تک نہیں ہوپایا۔ وہ دروازہ کھولنے میں بری طرح مگن تھا۔

بچے کا عکس پوری طرح نمایاں ہوا اور اچانک ایک چھوٹا سا ہاتھ ونڈ اسکرین پر جا لگا۔

وقاص جو دروازہ کھولنے میں اپنا پورا زور لگا چکا تھا وہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور وقاص باہر لڑھک گیا، سامنے ہی مہر کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی تھی۔

”واٹ ہیپنڈ بابا۔“ مہر نے گرے ہوئے وقاص کے پاس پھرتی سے جاکر اسے اٹھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

”نتھنگ جانو، آپ ادھر کیا کررہی ہو اس وقت۔“ وقاص نے الجھی ہوئی نگاہوں سے گاڑی کو دیکھا اور مہر سے سوال کیا۔

”آپ کو کیا ہوا بابا، کیوں چھلانگ لگائی گاڑی سے۔“ وقاص کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کچھ نہیں بابا کی پرنسس، چلو اندر چلیں۔“ وقاص نے مہر کو گود میں اٹھایا اور اس کے ماتھے پہ پیار کیا۔

”چلو آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں ورنہ ماما دیکھ لیں گی تو غصہ کریں گی۔“

”ماما تو سو رہی ہیں ان کے سر میں درد تھا نا۔“

”اوہ۔“ وقاص کو ایکدم تشویش ہوئی۔ ”آپ نے تنگ تو نہیں کیا زیادہ اور کھانا کھالیا۔“

”یس بابا۔ خالہ نے کھانا دے دیا تھا۔“

”اوکے ہیریو گو مائے ڈارلنگ۔“ مہر کو اس کے بیڈ پہ لٹاتے ہوئے وقاص نے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور چادر اڑھاتے ہوئے دھیان دیا مہر کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی بال تھی۔

”ارے بابا سوتے وقت تو اسے رکھ دیا کرو چلو اب سو جاؤ، اوکے اور یہ عمر کیسے سوگیا آج اتنی جلدی۔“

”خالہ نے ڈانٹا تھا نا۔“ مہر نے جیسے کوئی انکشاف کیا۔

”او ہو اسی لیے چلو اچھا ہوا اسی بہانے سوگیا۔“ وقاص نے عمر کی بھی چادر ٹھیک کی اور نائٹ بلب جلاکر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وقاص اور مہر کے جانے کے بعد جہاں ایک طرف گاڑی کے نیچے سے کالی بلی نکل کر بونٹ پر جا بیٹھی تو دوسری سمت سے چمکتی ہوئی بال نکل کر ہلنے لگ گئی جیسے کوئی اس کے پاس بیٹھ کر اسے ہلا رہا ہو۔

......☆❀❀☆......

”کیا ہوا یار۔“ وقاص نے سونیا کو نڈھال سا لیٹے دیکھا تو سوال پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔ اپنی طرف سے وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اور باتھ روم سے فارغ ہوکر جیسے ہی لیٹنے لگا اسی وقت سونیا کی کراہ سن کر اس کی سمت متوجہ ہوگیا۔

Digitized by Google

"پتہ نہیں سر بہت بھاری ہو رہا ہے شام سے۔"
"میڈیسن لی۔"
"الماس نے پین کلر دی تھی، اسی سے کچھ آرام ملا تو سوگئی تھی لیکن اس وقت پھر ایسا لگ رہا ہے کوئی سر پر بیٹھا ہوا ہے۔" سونیا نے کراہتے ہوئے سر تھاما۔
"دبادوں۔" بے ساختہ وقاص سونیا کے قریب ہوا۔
"ہاں پلیز.....!"
وقاص نے نرمی کے ساتھ سونیا کے سر کو دبانا شروع کردیا۔
"تم سونے کی کوشش کرو، تھکن سے ہوگیا ہوگا۔"
"ہوں ہوسکتا ہے۔"
"ارے ابھی پتہ ہے کیا ہوا۔" وقاص کو فوراً ہی اپنا گاڑی میں بند ہونا یاد آیا۔
"اوہ یہ تو عجب بات ہے۔" سونیا کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔
"سمجھ نہیں آیا ہوا کیا تھا اور پھر ایکدم دروازہ کھل کیسے گیا اور تمہاری صاحبزادی پوچھتی ہیں، بابا آپ چھلانگ کیوں لگا رہے ہیں۔" وقاص نے بے ساختہ ہی قہقہہ لگایا۔
"صبح ہوتے ہی مکینک کو دکھا دینا وقاص۔" سونیا نے سامنے کھڑکی سے چاند کو ٹکٹکی باندھتے ہوئے دیکھا۔
"صبح کون سا مکینک اٹھا ہوگا خاتون اول۔ تم فکر نہیں کرو میں دیکھ لوں گا۔"
"مجھے فکر رہے گی۔" کھوئے کھوئے انداز میں سونیا نے چاند کو دیکھنا جاری رکھا۔
"ارے بابا نشین ہی تو ہے، کوئی وائرلوز ہوگئی ہوگی بس۔"
"لیکن اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا نا۔" سونیا نے وقاص پر نظریں جماتے ہوئے اسے یاد دلایا۔
"تو چلو اب ہوگیا نا۔ چھوڑو چلو سونے کی کرو بس تم۔ ادھر کوئی دکان بھی پاس نہیں ہے جو نا شتے کی جگاڑ لگ سکے اسی لیے پلیز پھرتی کے ساتھ طبیعت ٹھیک کرو ورنہ صبح ناشتہ کون بنا کردے گا۔" معصوم سے انداز میں وقاص نے ہونٹ لٹکا کر کہا تو سونیا بے اختیار مسکرا گئی۔
"بس یار ایسے ہی ہنستی رہا کرو۔ تم میری آکسیجن ہو۔"
"چلیں سو جائیں ورنہ صبح آنکھ نہیں کھلے گی۔"
"کیسے نہیں کھلے گی تمہارا سیٹ الارم مردے کو بھی جگا دیتا ہے ہم کیا چیز ہیں۔" وقاص نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کارنر پر رکھے ہوئے کلاک کو دیکھتے ہوئے لاچاری سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر نائٹ لیمپ بند کردیا۔

.....☆❀❀❀☆.....

صبح کاذب کی ٹھنڈی اور حسین ہوا اردگرد فضاء میں پھیلی ہوئی تھی۔ رخ تاج نے نماز پڑھ کر حسب معمول اپنی کھڑکی میں کھڑا ہونا پسند کیا اور تسبیح پڑھتے ہوئے اندھیرے سے اجالے میں سامنے کھڑا ہوا حسین گھر اپنی نظروں میں بسالیا۔
"آہ.....!"
اس حسین گھر میں ہلکی ہلکی آواز میں گونجتا ہوا الارم اپنی سی کوشش کررہا تھا لیکن بے سدھ سوئی ہوئی سونیا کو کوئی خبر نہیں تھی۔ وقاص نے بجتے ہوئے الارم کو کسمساتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بند کیا اور ایک بار پھر خواب غفلت کی نیند میں ڈوب گیا۔
الارم بند ہوتے ہی سونیا اور وقاص کے بیڈروم کے دروازے سے ایک بچے کا سایہ گزرا جیسے وہ سونیا کے جاگنے کا منتظر ہو اور اب ماؤں ہو کر واپس پلٹ رہا ہو۔
"کیسی طبعیت ہے بیگم صاحبہ۔" ٹرے میں چائے پراٹھے اور میڈیسن سلیقے سے پیش کرتا ہوا وقاص سونیا کی خوش نصیبی نہیں تھا تو اور کیا تھا۔
"بہتر ہوں، لیکن وہ.....!"
"کوئی بات نہیں بچوں کی چھٹی ہوگئی تو یار خیر ہے کبھی کبھی تو چلتا ہے نا۔" وقاص نے بے پروائی سے جواب دیا۔
"آپ کی گاڑی.....!" سونیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وقاص ایک دم چونک گیا۔
"ارے ہاں میں نے ابھی جا کر دیکھا تھا اسے ایک وائرلوز تھا۔" سونیا کا اپنی طرف دیکھنا وقاص نے محسوس کرلیا تھا اور اسے تسلی دینے کی خاطر ہنسنے لگا۔
"کیا ہوگیا یار، واقعی وائرلوز تھا میں نے سیٹ کردیا ہے اور اب سوچ رہا ہوں اس کی سروس بھی کرادوں۔"
"مجھے الجھن سی....."
"ارے یار نہیں پریشان نہ کرو نا۔ پہلے ہی آفس کا اتنا

Digitized by Google

پریشر ہے کہ حد نہیں.....''

''وقاص.....!'' سونیا نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا لیکن وقاص الماری کھولے اپنے آفس کے کپڑے سلیکٹ کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

''مجھے لگتا ہے وقاص اس گھر میں کوئی ہے۔'' سونیا نے جھجکتے ہوئے نظریں نیچے کرتے ہوئے بالآخر وقاص کو بھی اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''کیا.....!'' وقاص کو لگا اس نے سننے میں کوئی غلطی کی ہے۔

''کیا تم نے کہا دوبارہ کہنا۔'' اس نے انگلی اپنے کان میں گھماتے ہوئے سونیا کو دیکھا۔

''ہر چیز مذاق کی نہیں ہوتی۔''

''میں سیریس ہوں یار اور میں ہی ہوں نا اس گھر میں الماس ہے بچے ہیں اور کیا چاہیے تم کو ہاں اگر عریا مہر کا کوئی چھوٹا بہن بھائی بھی چاہیے تو بولو بندہ حاضر ہے۔'' وقاص نے شرارتی نظروں سے سونیا کو دیکھا جس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اسے احساس تک نہیں تھا۔

''اف.....'' سونیا نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔ کوئی اس کی بات سیریس نہیں لے رہا تھا۔

''ارے میری جان۔'' وقاص نے سونیا کا ایک دم خاموش ہونا محسوس کیا اور فوراً ہی اس کے پاس بیٹھ کر تسلی دینے لگا۔

''کچھ بھی نہیں ہے۔ نیا گھر ہے اور پھر اتنا بڑا بھی ہے نا شاید اور پھر تم اکیلے رہتی ہوں دن کا بیشتر حصہ کچھ ہی دن میں جب گھر نارمل روٹین میں آجائے گا تو میرا مشورہ ہے آس پڑوس کے گھر جاؤ دیکھو کس کی ساس تیز ہے کون سی بہو اپنے گھر والوں کا جینا حرام کیے ہوئے ہے۔'' بات کے اختتام تک وقاص ایک بار پھر شرارتی انداز اپنا چکا تھا۔

''اچھا یار میں تو اٹھوں۔ لیٹ ہو رہا ہوں۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اس کمرے سے باہر نکلنے کی اچھا الماس ہے گھر میں اس کو بولنا کچھ بنا دے گی میں بھی جاتے جاتے اسے بول جاؤں گا۔'' وقاص نے پھرتی سے اٹھ کر اپنے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ سونیا نے اسے مسکرا کر دیکھا اور ایک نظر اپنی چائے پر جمی ہوئی براؤن بالائی کو دیکھا۔

''الماس پہلے مجھے چائے تو بنا دے، پھر کھانا بھی بنا دینا۔'' الماس نے پریڈ اٹھائی اور اسے کترنے لگی۔

''ہاں واقعی میں تھک گئی ہوں اسی لیے اس سے پہلے بھی تو اتنے مکان بدلے ہیں لیکن اس گھر میں.....!''

''نہیں سونیا ایسا ویسا کچھ نہیں ہے۔'' سونیا جانے کب تک خود ہی سوال جواب کرتی رہی کہ اچانک وقاص باتھ روم سے باہر نکلا اور گم صم سونیا کو دیکھ کے سر جھٹک کے اسے ٹوک گیا۔

''تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو یار۔ چلو جلدی سے یہ میڈیسن کھاؤ اور دوبارہ لیٹ جاؤ۔''

سونیا نے ٹرے اٹھا کے کارنر پہ رکھی اور مسکرا کر وقاص کو دیکھا۔

''ہاں ویٹس لائک میری وائف، ایسے ہی رہا کرو۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' وقاص نے موبائل اٹھایا اور وولٹ چیک کر کے اپنی پاکٹ میں رکھا۔ ''چلو یار میں نکلوں۔ بائے.....''

سونیا نے لیٹ کر سر تکیے پر رکھا اور کمرے کی کھڑکی سے باہر لان کو دیکھا جہاں ہوا کے دوش پر درخت ہلتے ہوئے دیدہ زیب لگ رہے تھے لیکن کہیں کہیں بڑھے ہوئے پودے نظروں کو بھلے نہیں لگ رہے تھے۔

''ہوں۔ ایک مالی کی ضرورت ہے اتنے گھر ہیں دائیں بائیں کسی کو بھی بول دوں گی گھر بہت اچھا ہے یہ ذرا سی سیٹنگ مزید کرنی ہوگی۔''

''سونیا خود سے ہی باتیں کرتے نجانے نیند کی آغوش میں جا پہنچی۔''

.....☆❀❀☆.....

''یار باجی۔'' الماس موبائل میں کچھ ٹائپ کرتے کرتے اس کے پاس کمرے میں آبیٹھی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے سونیا کے سامنے رکھی۔

''وہ اپنے میاں کو یاد کرائیں نا میرے کام کا۔'' الماس نے موبائل بیڈ پر رکھا اور سونیا کو اپنی طرف متوجہ نا پا کر ٹھنک کر ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

''سن رہی ہیں۔''

''ارے تو کیا ابھی تک تمہاری ٹرانسفر نہیں ہوئی۔'' سونیا نے ٹرے میں موجود سینڈوچ دیکھتے ہوئے الماس کو

Digitized by Google

مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔
"اگر ہو جاتی تو میں گھر میں نظر آتی کیا۔" سونیا نے خفگی سے جواب دیا۔
"خاموشی سے کھالیں یہ۔ آپ کے بچوں کو میگی بنا کے دیئے اور اب چپس بنانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کس قدر پیٹو ہیں یہ دونوں..... توبہ.....!"
"بس ایک ہی دن میں ساری محبت ختم ہوگئی خالہ کی، اچھا اچھا میں بات کرتی ہوں آج۔ اتنی رات کو آتے ہیں وہ آج کل....." سونیا کو ایک دم کھلے ہوئے دروازے سے کسی کا عکس محسوس ہوا تو اس نے بات ادھوری چھوڑ کر پیچھے دیکھنا شروع کر دیا۔
"کوئی ہے کیا باہر؟"
"نہیں تو بچوں کو ان کے کمرے میں بٹھا کر آئی ہوں ابھی۔" الماس نے سونیا کے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی دیکھی۔
"کیوں کیا ہوگیا۔"
"الماس۔" سونیا نے اسے دیکھتے ہوئے کنفیوژ ہوتے ہوئے پکارا۔
"جی بولیں۔"
"وہ..... وہ کیا تم کو اس گھر میں۔ وہ میرا مطلب تھا کہ.....!"
الماس جو وقاص کو ایس ایم ایس کر رہی تھی اپنی ٹائپنگ روک کے سونیا کو دیکھنے لگی۔
"کیا ہوا گھر کو۔"
سونیا ایک دم جھجک گئی اور دبے ہوئے لہجے میں سوال پوچھا۔
"میں دراصل پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم کو اس گھر میں کچھ الگ سا محسوس نہیں ہوتا۔ جیسے..... جیسے۔" سونیا کو شاید الفاظ نہیں مل رہے تھے اپنی بات سمجھانے کے لیے۔
"ہاں ہاں بالکل ہوتی ہے۔" الماس نے کندھے اچکاتے ہوئے سرسری سا جواب دیا اور ایک بار پھر موبائل کی طرف دھیان دیا۔
"دیکھا میں نے کہا تھا نا اس گھر میں کچھ ہے۔"
"ایک منٹ ایک منٹ۔" الماس نے اس بار سونیا کو بغور دیکھا اور فوراً ہی ہاتھ اٹھا کے اس کی بات کاٹ دی۔
"کیا مطلب ہے اس بات کا؟"
"ابھی تم نے کہا نا کچھ الگ ہے اس گھر میں.....!"
"وہ اس لیے کہا ہے کیونکہ ہمیں ادھر آئے کچھ ہی دن تو ہوئے ہیں ادھر، ابھی ہمیں اس گھر کے سوچ کا بھی یاد نہیں رہتا یا دائیں طرف ہے یا بائیں طرف۔" سونیا نے ہنستے ہوئے جواب دیا "اور اس کو اجنبیت کہتے ہیں میری باجی اور کچھ نہیں۔"
سونیا ایک دم جیسے ٹھنڈی ہوگئی۔
"اور آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہوگا اور یہ جو آپ ہر وقت کام میں لگی رہتی ہیں نا، ذرا خود کو وقت دیں۔ آپ تھک گئی ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اوہو شکر بھائی کا فون آگیا۔ ہیلو ہاں بھائی کیا ہوا یار میرے ٹرانسفر کا، بور ہونے لگی ہوں اب تو گھر میں آپ.....!" الماس فون پہ بات کرتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی اور پیچھے سونیا گم صم بیٹھی رہ گئی۔
"نہیں الماس اجنبیت نہیں ہے اس گھر میں مجھے کچھ ہے ادھر، کچھ الگ سا جو میں بتا نہیں سکتی لیکن محسوس کر سکتی ہوں وہ اپنا آپ محسوس کراتا ہے لیکن سامنے نہیں آتا۔"
سونیا نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے کمرے میں چاروں طرف ایک نظر دوڑائی اور خاموشی سے ٹرے پر جھک گئی۔ اس کے جھکتے ہی لان میں کھلنے والی کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک کالی بلی نمودار ہو کر اسے گھورنے لگی اور ہلکی آواز میں غرانے لگی۔
(انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Digitized by Google

تیسری جنگ عظیم سے قبل

ڈاکٹر ریاض توحیدی

کشمیر اس وقت دنیا کا سلگتا ہوا موضوع ہے انسانیت کے بدن پر ایسا زخم ہے جو ہر وقت آزاد روحوں کو کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ وہ ان کے لیے کب آواز اٹھائیں گی۔
ڈاکٹر ریاض توحیدی کی ایک علامتی کہانی جس کے حسن کو آپ محسوس کرسکتے ہیں لیکن بیان کرنے کے لیے الفاظ تلاش نہیں کرسکتے۔

وہ سنگ دل گلچیں تھیں ...... اپنے پُر فریب محدّب شیشوں کی زہریلی شاعوں سے ...... گلِ زمین کے لالہ فام پھولوں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔ چمنستان کے شاہین فطرت پرندے، ان مردہ خور کرگسوں کی بدطینت خصلت بھانپ گئے اور اپنے چمنستان کو ان مردہ خوروں کی پروازوں سے آزاد کرانے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ چمنستان کے یہ شاہین جب ان مردہ خور کرگسوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پر تولنے لگے تو اسیر فضا حیران ...... درندے پریشان ...... لیکن چند سے کیا ہوتا، وہ شکار بننے والے غافل پرندوں کو مدد کے لئے پکارتے رہے، اتحاد کی صدائیں دیتے رہے لیکن سب فضول ...... آپسی پھوٹ کی وجہ سے سب بزدل نکلے ...... موت سے خوف زدہ، خودداری سے محروم ......!

یہ شاہین فطرت پرندے ایک درخشاں تہذیب کی نمائندہ علامت تھے۔ وہ تہذیب جس سے جدید دنیا کے سوتے پھوٹے تھے۔ وہ اسی پرامن، خوشحال اور پائیدار تہذیب کے پروردہ شاہین تھے۔ ان کے چمن میں ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ چمن کی فضا امن و سکون کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ باغی پرندوں کے گلستان کی یہ معطر ہوائیں، ان بدمست درندوں کو دیوانہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے اپنی عفونت زدہ سانسوں کو ان خوشبودار فضاؤں میں تحلیل کرنا شروع کر دیا اور اپنی بدصورت چونچوں سے آزاد چمن کے نرم و نازک پھولوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ چمن کے شاہین اپنے پُر امن چمن کو ان درندہ صفت کرگسوں کی تباہی سے بچانے کی خاطر مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ کافی عرصہ تک وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ دو لومڑیوں نے بھی ایک خونخوار شیر کو مار گرایا تھا، یہاں تو جدید دور کے طاقت ور درندوں کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔ انجام تو سب کو معلوم تھا، وہ بھی بے خبر نہیں تھے لیکن وہ خوددار تھے، باغیرت تھے، ان کی خودداری اور غیرت مندی نے انھیں، جھکنے نہیں دیا۔ انہوں نے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ان درندوں کے سازشی آشیانوں کو بھی تباہ کر ڈالا' لیکن اس سب کے باوجود وہ فتح مندی کا سورج نہیں دیکھ سکے۔ ان کی نسل نے جب انھیں تنہا چھوڑ دیا تو وہ اپنے محفوظ ٹھکانوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ ان کی غافل نسل دور سے کھیل کا نظارہ کرتے ہوئے لطف اندوز ہوتی رہی' نتیجہ ...... ان کے آزاد چمن امن کے دعویداروں کے غلام بن گئے۔

غلاموں کی لگام کسنے کا کام بڑے درندے نے اپنے ہاتھ میں لے لیا' وہ ابھی بے قرار تھا۔ اُس کا سکون جنون میں تبدیل ہو رہا تھا کیونکہ باغی پرندوں کا سردار شاہین، اُس کی پکڑ سے باہر تھا اور اسے سزا نہ دینا اُس کے مغرور دماغ پر کوڑے برسنے کے مترادف تھا۔ تلاش جاری رہی۔ چمنستان کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئیں۔ کئی باغی پرندے شکار ہوئے اور کئی شکاری کے زہریلے پھندے میں پھنس گئے۔

Digitized by Google

انھیں درندے کے عدالتی پنجروں میں لایا گیا اور انھیں اپنے مقاصد کو بیان کرنے کا حکم ہوا۔ وہ شاہین فطرت پرندے موت کے پنجروں میں پھڑ پھڑانے لگے کہ

"ہم آزاد چمن کے اسیر پرندے ہیں۔ ہم اپنے چمن کو آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں...... ہمیں غلامی سے سخت نفرت ہے...... ہم ہر کسی کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں...... ہم غلامی کی ذلت آمیز زندگی پر آزادی کی باعزت موت کو ترجیح دیتے ہیں......"

مغرور درندے شاہینوں کے عزائم دیکھ کر غرائے:

"آزادی دینا اور چھیننا ہمارا حق ہے کیونکہ ہم آزاد ہیں...... طاقت ور ہیں...... امن کے پیامبر ہیں...... جمہوریت کے علمبردار ہیں...... تم غلاموں کی یہ ہمت کہ تم ہمارے خلاف بغاوت پر اتر آئے...... تمہاری نسل کی سانسیں ہمارے رحم و کرم پر چل رہی ہیں۔"

باغی شاہینوں کو جب موت کی سزا سنائی گئی تو بھی وہ آزادی آزادی پکارتے رہے۔ ان کی گردن میں جب پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے شبنمی قطرے چمک رہے تھے۔ درندوں کا سردار خوشی سے چہک رہا تھا۔ وہ اپنی تہذیب کے گن گا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج وہ اس نسل سے صدیوں کا بدلہ لے رہا ہے لیکن وہ پھر بھی کبھی کبھی مایوس ہو رہا تھا کیونکہ ان باغی پرندوں کا سردار ابھی ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا باغی پرندوں کی نسل کے کچھ پرندے خاموش احتجاج کرتے رہے، انھوں نے غلامی کی ذلت دیکھی تھی، وہ احتجاج کے بغیر کرتے بھی کیا کیونکہ غلام کے پاس احتجاج کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

زمانہ گردش کرتا رہا...... برسوں گزر گئے...... وقت کا مزاج بدلتا رہا...... درندوں میں پھوٹ پڑ گئی کیونکہ بڑا درندہ دوسرے درندوں پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے...... سارا جنگل آگ برسانے لگا...... تمام خون خوار درندوں کے ٹھکانے اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے...... ہر طرف بربادی اور تباہی پھیل چکی تھی کیونکہ دنیا میں تیسری جنگ عظیم کا سائرن بج چکا تھا۔

Digitized by Google

سفید ہیولہ

زرین قمر

اس دیہی علاقہ میں اچانک چند پر اسرار ہیولے نمودار ہوگئے جس نے پولیس اور ایف بی آئی کو چکرا کر رکھ دیا تھا اور پورا علاقہ خوف کا شکار ہوگیا تھا وہ کیا پر اسرار مخلوق تھی اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

ایک لیبارٹری انچارج کی بے پروائی سے جنم لینے والی پر اسرار کہانی

مسٹر بینک کی زمین تین سو ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی اس کے پاس نوے گائیں تھیں جن کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں سے کتنی گائیں وافر مقدار میں دودھ دیتی ہیں اسے اپنی زمینوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات تھیں کیونکہ وہ خود ہی ان پر کام کرتا تھا ہر سیزن میں اس کی زمینیں اسے بہترین فصل دیتی تھیں اس کی زمینوں میں سے کچے راستے انہیں مختلف آبادیوں سے ملاتے تھے اور زمینوں ہی کے پچھلے حصے میں موجود جنگل میں وہ بڑے شوق سے ہرنوں کا شکار کرتا تھا جو کبھی کبھی اس کی زمینوں کی طرف بھی آنکلتے تھے۔

موسم خزاں کی ایک صبح مسٹر بینک اپنے ٹریکٹر میں بیٹھا بڑی سستی سے گھاس کاٹنے میں مصروف تھا رات کی نیند کا خمار اب بھی اس پر چڑھا تھا اور وہ کچھ سونے جاگنے کی کیفیت میں سست روی سے اپنا کام کررہا تھا اس کی زمینوں کے اطراف لگی سرکنڈوں کی باڑ بہت اونچی ہوگئی تھی اور وہ اسے چھانٹنے میں مصروف تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی ہر سانس کے ساتھ بینک کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی ٹریکٹر کے پیچھے ایک لمبے بلیڈوں والا موور لگا ہوا تھا جو لمبی گھاس کے بچ جانے والے چھوٹے حصوں کو چھانٹ رہا تھا کچھ ہی دیر میں سورج کی دھیمی دھیمی روشنی آسمان پر پھیلنے لگی تھی اور بینک اپنے اندازے سے کہہ سکتا تھا کہ آج کا دن بہت گرم گزرنے والا تھا اس کے ٹریکٹر میں پچھلی سمت لگا بلیڈ گھاس کو ننھے ننھے ٹکڑوں میں کاٹ رہا تھا اور ٹریکٹر کے انجن کی آواز کسی چڑیل کی چیخوں کی طرح ماحول کو خوفناک بنا رہی تھی زمین کے کنارے تک پہنچ کر بینک نے ٹریکٹر کو موڑا تاکہ دوسری قطار میں کام کرسکے پھر وہ بمشکل دس قدم آگے ہی گیا ہوگا کہ اسے اپنے پیچھے ایک دھمک سنائی دی وہ اس آواز سے اچھی طرح واقف تھا یہ آوازیں وہ تیس سال سے ان زمینوں پر کام کرنے کے دوران سنتا رہا تھا بعض آوازیں خوش آئندہ ہوتی تھیں لیکن یہ آواز ایسی نہیں تھی اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دھات کے بلیڈ کسی گوشت نما چیز سے ٹکرائے ہوں بینک نے فوراً ٹریکٹر کو بریک لگائے تھے اور اطراف کا جائزہ لیا تھا اسے کھیتوں میں دور دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آئی تھی صرف صبح کی ہوا سے گھاس اور سرکنڈوں کے پتے زور زور سے لہرا رہے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ اس نے دھمک کی آواز سنی تھی ٹریکٹر کے بلیڈ کسی گوشت جیسی چیز سے ٹکرائے تھے اور وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ ایسی آواز جب پیدا ہوتی ہے جب کوئی جانور بلیڈ سے ٹکرائے اور زخمی ہوکر بھاگ کھڑا ہو کچھ سال پہلے بھی ایسا ہوا تھا تب ایک آوارہ کتا اس بلیڈ کی زد میں آ گیا تھا تب سے بینک اپنے پاس ایک پستول رکھنے لگا تھا کیونکہ وہ جانوروں کو تکلیف کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا وہ ان کے شدید زخمی ہونے پر انہیں گولی مار کر تکلیف سے آزاد کردیا کرتا تھا۔

بینک نے ٹریکٹر کا انجن بند کردیا اور نیچے اتر گیا پھر اس نے ٹریکٹر کے اطراف کا جائزہ لیا انجن کی آواز کے بند ہوتے ہی اسے ایک کراہ سنائی دی۔

''آآآ......'' اس کو اندازہ ہوگیا کہ جو کچھ بھی ٹریکٹر سے ٹکرایا ہے وہ شدید زخمی ہوگیا ہے اسے کراہ کی آواز سے اندازہ نہیں ہوپایا تھا کہ زخمی ہونے والا کون سا جانور ہے ان جنگلوں میں بہت سے جانور پائے جاتے تھے کتے جنگلی بلیاں لومڑیاں ہرن جنگلی مرغیاں ریچھ بھیڑیے وغیرہ وہ زیادہ تر تو جنگلی علاقے میں رہتے تھے لیکن راتوں کو گشت کرتے ہوئے زمینوں پر بھی آنکلتے تھے اور علی الصبح ان کی واپسی ہوئی تھی بینک کے اندازے کے مطابق اس وقت زخمی ہونے والا ریچھ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ریچھ انسانوں کو دیکھ کر ہی بھاگ جاتے تھے اور خاص طور سے ٹریکٹر کے تو بالکل قریب نہیں آتے تھے خرگوش اور چوہے ضرور یہاں پائے جاتے تھے اور اکثر فصلوں کے لیے مصیبت بنتے تھے خاص طور سے اس کی بیوی کے لگائے ہوئے باغ میں وہ اکثر تباہی مچاتے تھے۔

جانور کے کراہنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور بینک ٹریکٹر کے پیچھے کی سمت بڑھا زمین پر لگی گھاس اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ اس کے گھٹنوں تک آرہی تھی بینک نے جھک کر موور کے بلیڈز کو چھوا وہ گرم تھے اور سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے ہوا میں کٹنے والی گھاس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور درختوں پر موجود پرندے زور زور سے بول رہے تھے بینک نے کٹی ہوئی گھاس پر دور دور تک نظر دوڑائی لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا لیکن اس کی چھٹی حس اسے خطرے سے آگاہ کررہی تھی اسی طرح جیسے بارش آنے کا اندازہ اس سے

پہلے ہوجاتا ہے جیسے نئے سیزن میں فصل لگانے سے پہلے فی فصل کاٹنے کا اندازہ ہوجاتا ہے جیسے پرندوں کے ایک سمت میں پرواز کرنے سے آنے والے طوفان کا اندازہ ہوجاتا ہے جیسے بھیڑیوں کے بولنے سے کسی خطرے کا اندازہ ہوجاتا ہے ایک کسان بہت کچھ جانتا ہے اور اپنے تجربے سے بتا سکتا ہے ایسے ہی بینک کو خطرے کا احساس ہوا تھا وہ احتیاط سے قدم بڑھاتا آگے بڑھا تھا اور اسے مور کے بلیڈ میں چپکا کھال اور گوشت نظر آیا تھا وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور بینک اندازے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ جو بھی ہے زندہ نہیں ہے یا مرنے کے قریب ہے وہ جو بھی تھا اس کے کئی ٹکڑے ہوگئے تھے اور وہ بے حرکت تھا خون کی بو فضا میں رچی تھی بینک کو اپنے پیٹ میں کھلبلی سی محسوس ہوئی اور اسے ابکائی آئی۔

وہ کٹا پھٹا زخمی جسم انسانی جسم تھا اور بینک اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا یہ حادثہ ہونے سے پہلے اسے وہاں کوئی نظر بھی نہیں آیا تھا اس نے جھک کر زخمی کا معائنہ کیا اسے جسم نظر آرہا تھا لیکن سر کا حصہ کٹ چکا تھا جس کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی تھیں وہ کوئی مرد تھا بینک اسے نہیں جانتا تھا وہ اس ریاست میں رہنے والا کوئی شخص نہیں تھا اس کی ٹکڑوں میں بٹی باڈی ساکت تھی بینک کا دل متلایا اور اسے الٹی آگئی اس کا صبح کا ناشتہ باہر آگیا تھا اور وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

سیدھے ہوکر اس نے اپنی آستین سے اپنا منہ صاف کیا اور گھاس کے میدانوں پر دور تک نظر ڈالی اوپر آسمان پر سفید اور سرمئی بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اس نے اپنا باقی کام وہیں چھوڑا اور ٹریکٹر کو بھی موقع پر چھوڑ کر سر کنڈوں کے کھیتوں سے پیدل گزرتا پہاڑیوں سے نیچے اترتا ہوا اپنے فارم ہاؤس کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی بیوی اس کا انتظار کررہی تھی۔

بینک کے فارم ہاؤس کے قریب واقع کچے راستے کے چوراہے پر ایک دوسرا ٹریکٹر جارہا تھا کہ ایک اسپورٹ کار اس کے راستے میں آرکی اور اس کی ڈرائیور والی کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر آیا اور اس نے دور سے آتے ہوئے بینک کو اشارہ کیا لیکن بینک اس سے بے خبر تھا۔

دور درختوں کے درمیان بیٹھی میگی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اسے یہاں سے پہاڑی سے نیچے آتا ہوا راستہ اور آگے شہر تک جانے والا راستہ فارم ہاؤس اور اس میں بنا ہوا کھتوں اور گھاس پھونس کا جھونپڑا نظر آرہا تھا ہر طرف سبزہ اور رنگ برنگے پھول کھلے تھے وہاں سے دور دور تک کا منظر صاف نظر آرہا تھا لیکن یہاں سے میگی کو اپنا گھر نظر نہیں آرہا تھا جو پہاڑیوں کے اوپر روڈ کے دوسری طرف واقع تھا دو زمینوں کو ایک گھنے جنگل نے الگ کیا ہوا تھا میگی کی فراک کی جیب سے صبح کے ناشتے سے لیے ہوئے چند بسکٹ رکھے تھے اسے سخت بھوک لگی تھی لیکن گھر جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا دو گھنٹے پہلے اسے اپنی ماں کی آوازیں سنائی دی تھیں جو اسے پکار رہی تھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ اپنی ماں کو کھیتوں میں ادھر ادھر دیکھنے اور آوازیں دیتے دیکھ رہی تھی آخر کار اس کی ماں بے پروائی سے شانوں کو جھٹکتی ہوئی واپس پہاڑیوں پر واقع اپنے گھر کی طرف چلی گئی تھی دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا میگی کو چند لمحوں کے لیے شرمندگی کا احساس ہوا لیکن پھر اس نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا وہ اپنے بھائیوں سے ناراض تھی جو پچھلی رات گھر آئے تھے وہ پانی پینے کے لیے ایک اسکاؤٹ کیمپ پر گئے ہوئے تھے اور اپنی ماں کے کہنے پر میگی نے اپنا بیڈروم ان کے لیے خالی کردیا تھا ان کے گرمیوں کے فارم ہاؤس میں صرف دو بیڈروم تھے جو پانچ افراد کی فیملی کے لیے ناکافی تھے گرمیوں میں لڑکے گھر کے باہر لگے خیمے میں ہوتے تھے لیکن اب بھیڑیوں کی بہتات ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ایسا ممکن نہ تھا نچانچہ میگی برآمدے میں منتقل ہوگئی تھی جس میں تین اطراف میں کھڑکیاں تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آتی تھی ایک سمت سیٹی پڑی تھی جس پر وہ سوجاتی تھی وہ وہاں تنہائی میں خوش رہتی تھی وہاں رکھے ٹی وی سے بھی وہ دل بہلا سکتی تھی لیکن اس کی ماں کی ہدایات تھی کہ وہ آواز دھیمی رکھے گی رات کو وہ پرسکون نیند سوئی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی گردن میں درد تھا اس نے اپنے تکیوں کو دیکھا تو وہاں اس کے سنہرے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کٹی پڑی تھی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس کے شیطان بھائیوں کی حرکت تھی اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں سے شکایت نہیں کرے گی کیونکہ اس کے بھائی اس کا مذاق اڑائیں گے اور اسے مختلف ناموں سے پکاریں گے اس نے

Digitized by Google

غصے میں قینچی سے اپنے باقی بال بھی کاٹ دیئے اور ناشتہ کیے بغیر بھاگتی ہوئی گھر سے نکل کر مسٹر بینک کی زمینوں پر آ چھپی جہاں سے وہ اپنے گھر کی زمینوں کو دیکھ سکتی تھی لیکن درختوں کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی زمینوں سے بھی مسٹر بینک کو ہر صبح کسی نہ کسی ٹریکٹر پر آتے جاتے دیکھ سکتی تھی پھر اچانک اسے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس نے درختوں کی اوٹ سے آوازوں کی سمت جھانکا وہ اس کے بھائی تھے جو پہاڑیوں سے نیچے اترتے اور باتیں کرتے آ رہے تھے پھر اچانک وہ رک کر درختوں پر اچھلنے والی گلہریوں کو پتھر مارنے میں لگ گئے میگی نے موقع غنیمت جانا اور درختوں کی آڑ لیتی ہوئی مسٹر بینک کے کھیتوں میں بنے گھاس پھونس کے جھونپڑے میں آ گئی جہاں وہ محفوظ رہ سکتی تھی یہ بہت بڑا جھونپڑا تھا اور بڑے بڑے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا اس میں بینک سارا سال گائیوں کو کھلانے کے لیے چارہ جمع کرتا تھا اور کبھی گائیوں کو گرمی سے بچانے کے لیے یہاں بھی رکھتا تھا میگی کو پتہ تھا کہ اگر اس جھونپڑے میں مسٹر بینک نے اسے دیکھ بھی لیا تو وہ اسے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ وہ اسے اور اس کی فیملی کو جانتے تھے اس نے جھونپڑے میں داخل ہو کر اس کا دروازہ بند کر دیا تھا میگی جھونپڑے کے اندر بھائیوں کی آوازیں سن رہی تھی جو اسے ڈھونڈتے وہاں تک آ گئے تھے۔

''ڈیڈی کہہ رہے تھے انہیں اس کا سر نہیں ملا ہے۔''

''نہیں انہوں نے یہ نہیں کہا تھا انہوں نے کہا تھا کہ انہیں اس کے ہاتھ نہیں ملے تھے وہ اس کے فنگر پرنٹ لینا چاہتے تھے بھلا سر کی ضرورت انہیں کس لیے ہوگی؟'' دوسرے بھائی نے کہا۔

''اگر اس کا سر نہیں ملا تو اس کی شناخت کیسے ہوگی؟ اس کا سر اب بھی وہاں موجود ہوگا میں وہ سر ڈھونڈوں گا۔'' اس کے بڑے بھائی جسٹن نے کہا۔

''انہیں اس کے فنگر پرنٹس کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی فیملی کو اس کی موت کی اطلاع دے سکیں۔'' اس پر اس کے چھوٹے بھائی جے سن نے کہا۔ پھر وہ باتیں کرتے آگے نکل گئے تھے۔

جھونپڑے میں تازہ کٹی گھاس کی بو اور گوبر کی بو رچی ہوئی تھی میگی کا دل چاہا کہ وہ گھر چلی جائے لیکن اسے غصہ تھا اب جھونپڑے میں اندھیرا پھیل رہا تھا جھونپڑے کی چھت میں ایک چوکور سوراخ تھا جس سے کچھ روشنی اندر آ رہی تھی اور جھونپڑے کے دوسرے حصے میں کچھ گائیں بندھی تھیں اچانک ایک کار کی آواز آئی اور اس نے جھونپڑے کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا وہ اسے پہچانتی تھی وہ انکل فل کی کار تھی جو ایک ریٹائرڈ فوجی تھے اور اس کے والد کے دوست تھے وہ ہر سال گرمیوں میں ان سے ملنے ان کے فارم ہاؤس آتے تھے اور میگی کو بدروحوں سے ڈراتے تھے وہ ان سے چڑنے لگی تھی اور ان کی کار کو دیکھ کر اس نے گھر جانے کا ارادہ بالکل ہی ملتوی کر دیا تھا۔

وہ جھونپڑے میں سونے کی کوئی جگہ تلاش کرنے لگی اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا اور خون میں لتھڑا ہوا تھا وہ آہستہ سے اس کے قریب گئی۔

''ہیلو۔'' اس نے آہستہ سے کہا لیکن سامنے پڑے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

''مسٹر کیا تم ٹھیک ہو؟'' اس نے مزید آگے بڑھ کر پوچھا اور اس کا کاندھا چھوا۔ اسی وقت اس آدمی نے کروٹ لی اور میگی کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''تم نے میرے بھائی کو کاٹ ڈالا ہے؟'' اس نے میگی سے کہا اور غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا اور میگی اسے حیرت اور خوف سے دیکھ رہی تھی۔

اگلی صبح علاقے کے تھانے میں بیٹھی شانون کو ایک کال موصول ہوئی تھی۔

''او کے ادکے میں کسی کو بھیجتی ہوں..... ابھی لائن پر رہنا۔'' اس نے عجلت میں کہا اور کمرے ہی سے ہانک لگائی۔

''ڈینی، ہمیں ایمرجنسی کال آئی ہے فارمر کا کہنا ہے کہ اس نے ایک آدمی کو کاٹ ڈالا ہے جب وہ اپنے کھیتوں میں ٹریکٹر چلا رہا تھا کیا تم جا سکتے ہو تاکہ موقع کا جائزہ لو وہ کہہ رہا ہے کہ وہاں پر بہت خون بکھرا ہوا ہے شاید کوئی ہرن مارا گیا ہے میں ایمبولینس کو بھی فون کرتی ہوں تم جلدی کرو۔'' اس کی بات سن کر آفیسر ڈینی روز نے اپنے کمرے کی کھڑکی

Digitized by Google

سے باہر دیکھا جہاں اس کا پرانا اور بوسیدہ کالا پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔

''اوہ کتنی دور جگہ ہے۔'' ڈینی نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے آفس سے کیپٹن شانون نے پھر ہانک لگائی۔

''ڈینی ایمرجنسی ہے جلدی کرو کیا سوچ رہے ہو؟'' اور وہاں سائرن مت بجانا تمہیں یاد ہے نا پچھلے سال اس کسان کی گائیں بھاگ گئی تھیں۔''

''ہاں بس میں جارہا ہوں۔'' ڈینی نے کہا۔

''ایڈریس بتاؤ۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''کنٹری روڈ سے سیدھے ہاتھ کو مڑنا ہے آگے جو فارم شروع ہوں گے یہ وہی جگہ ہے جہاں پچھلے سال ریچھ نے ایک شکاری پر حملہ کردیا تھا۔'' کیپٹن شانون نے کہا اور ڈینی کی طرف مڑی۔ ڈینی نے اثبات میں سر ہلایا اسے شانون کے بات کرنے کا انداز پسند نہیں تھا وہ ہمیشہ اس سے تیکھے لہجے میں ہی بات کرتی تھی حالانکہ وہ اس کا افسر تھا لیکن شانون بھی کیپٹن ڈینی کی بیوی کی بہن تھی اور ہمیشہ اپنا دماغ چڑھا رکھتی تھی۔

ڈینی اپنے پک اپ ٹرک میں سوار ہوا تھا اس نے پولیس ریڈیو آن رکھا تھا تاکہ کوئی بھی اہم خبر سن سکے ہلکی آواز میں ٹیپ آن کرکے میوزک لگایا تھا ٹرک کا اے سی آن کیا تھا اور موقع واردات کی طرف روانہ ہوگیا تھا پولیس ریڈیو پر جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں ان سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ دو مجرم جیل سے فرار تھے انہیں تلاش کیا جارہا تھا لیکن ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا کئی جگہوں سے لوگوں نے اطلاع دی تھی کہ انہوں نے ان دو مشتبہ افراد کو دیکھا ہے لیکن ان کی کوئی تصویر نہیں تھی ان دونوں پر ڈاکے اور قتل کے الزامات تھے اور وہ جیل سے فرار ہوئے تھے اور ایف بی آئی کی ایک ٹیم ان کو تلاش کررہی تھی ڈینی نے پولیس ریڈیو کی آواز بڑھادی۔

''جیسا کہ ہم نے پہلے تفصیل بتائی پچھلے کئی ہفتوں سے ہم ان مضافاتی علاقوں میں تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں جہاں سے مجرم فرار ہوئے ہیں ہمارے تجربہ کار لوگوں کی ٹیم ہر جگہ تلاش کررہی ہے انہیں جیل سے پچاس پچاس میل دور کے علاقے تک میں سرچ کیا جارہا ہے شمال کی جانب ہم نے سرحدوں تک اس سرچ کو پھیلا دیا ہے لیکن ابھی تک

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ حجاب کراچی

محبت، نفرت کی آمیزش سے مزین ناقابل فراموش کہانیاں

میرے خواب زندہ ہیں

محبت و بے وفائی مرد کا شیوا ہے، وہ اس میں کسی مقام تک جاسکتا ہے، نادیہ فاطمہ رضوی کی خوب صورت تحریر

شب آرزو تیری چاہ میں

محبت و جذبات اور خودسری کا اثر لیے ایک پراثر دلکش تحریر نائلہ طارق کے قلم کا ایک نیا انداز، ایک نئی کہانی

عشق دی بازی

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے ریحانہ آفتاب کے نوک قلم نکلی ایک خوب صورت تحریر

اس کے علاوہ دنیا ادب کے نئے ستارے ہر ماہ اس میں شامل ہیں

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

Infoohijab@gmail.com

021-35620771/2

0300-8264242

Digitized by Google

کامیابی نہیں ہوئی ہے میں نیو یارک اسٹیٹ پولیس میں موجود تمام مرد اور عورتوں کو کہتا ہوں کہ وہ مقامی انتظامیہ کی مدد کریں اور اپنی ایف بی آئی ٹیم اور عوام کا شکر گزار ہوں جو تعاون کر رہے ہیں ہم جلد ہی انہیں گرفتار کرلیں گے جلد ہی ان کی تصویریں بھی سب جگہ جاری کردی جائیں گی۔'' اس کے بعد پیغام ختم ہوگیا تھا ڈینی ان مجرموں کی تصویریں دیکھ چکا تھا کیونکہ ان کے فرار کے بعد ہر روزنامے میں ان کی تصویر ہی شائع ہوئی تھیں۔

جب ڈینی بینک کے فارم ہاؤس پہنچا تو اس کے گھر اور کھیتوں میں بنے جھونپڑے کے باہر کئی گاڑیاں اور ٹریکٹر کھڑے تھے اس وقت بینک ناشتہ کر رہا تھا اور اس کی بیوی جوڈی نے ڈینی کو اس کے پاس پہنچا دیا تھا۔

''میرا خیال ہے تم میرے ٹرک ہی میں چلو۔'' بینک نے کہا اور ڈینی نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ جلد ہی موقع پر پہنچ گئے تھے اور ڈینی ٹریکٹر کے مور کے نیچے کچلنے جانے والے ہرن کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا تھا لیکن وہاں تو ہرن کے بجائے ایک انسان کی لاش تھی جو جیل کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس کی گردن پر ایک ٹیٹو بنا ہوا تھا جو کئی ہفتوں سے ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا ڈینی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''یہ تو ایک مفرور مجرم ہے اس کی تلاش تو جگہ جگہ جاری ہے۔'' ڈینی نے چیخ کر کہا۔

''مجھے حیرت ہے لیکن میں اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔'' بینک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میں نے ٹی وی کی نیوز میں اس کی تصویر دیکھی تھی لیکن میں فون پر یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''بھلا ان علاقوں میں یہ کیا کر رہا تھا؟'' بینک نے پھر کہا۔

''کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ دو ہیں اور دونوں بھائی ہیں اور دونوں قاتل ہیں۔''

''ہاں میں ایک کال کرنا چاہتا ہوں اور یہ خبر اپنے پولیس اسٹیشن کو بھی دینا چاہتا ہوں ایف بی آئی والوں کے لیے بھی یہ خبر دلچسپی کا باعث ہوگی۔'' ڈینی نے کہا پھر اس نے اپنے فون سے لاش کی تصویریں لی تھیں اور فون بھی کیا تھا جس کے بعد وہ واپس آگئے تھے۔

وہ شخص میگی کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا اور میگی نے بھی ایسا ڈراؤنا شخص اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ جو پوچھ رہا تھا وہ میگی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا بھلا وہ اس کے؟ وہ اس کے بارے میں کیا جان سکتی تھی وہ اسے پہچانتی نہیں تھی وہ اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا وہ اس علاقے کے ہر شخص کو دیکھ چکی تھی ان سے واقف تھی لیکن یہ آدمی یہاں سے تعلق نہیں رکھتا تھا اس کا چہرہ میگی کے چہرے سے بہت قریب تھا اس کے گالوں پر مٹی لگی تھی۔

''نہیں، میں تو سارا دن اس بڑے درخت کے پیچھے چھپی رہی ہوں جو باہر کھیتوں میں ہے۔'' میگی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا آدمی برابر اسے گھور رہا تھا اس نے اب میگی کی کلائی پکڑی ہوئی تھی میگی پریشان تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے وہ شخص نہایت دبلا تھا اچانک ایک لفظ میگی کے ذہن میں آیا۔

''کیا تم کوئی بدروح ہو؟'' میگی نے پوچھا جس پر اس آدمی نے نفی میں سر ہلایا وہ کافی دیر تک سوتا رہا تھا اور دو ہفتوں سے یہاں وہاں بھاگتا پھر رہا تھا جب سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ جیل سے بھاگا تھا وہ بینک کے کھیتوں میں بھی چھپے تھے اس نے وہ ٹریکٹر دیکھا تھا جس نے اس کے بھائی کو کچل دیا تھا یہ خیال آتے ہی اس نے میگی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

میگی ایک قدم آگے بڑھی اور اس کا پاؤں ایک ران پر پڑا شاید یہ ران اس شخص کو جنگل میں ملی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ اس جھونپڑے میں لے آیا تھا لوگ تو ہرن کی ران پیسے دے کر خریدتے ہیں لیکن اسے فری میں مل گئی تھی میگی آگے بڑھی تو اس کا پاؤں دوسری ران پر پڑا اس کا گوشت زیادہ نرم تھا پھر اس ران میں سے سفید سی لکیر نکل کر میگی کے پاؤں پر چڑھنے لگی تھی اور میگی آنکھیں پھاڑے اسے غور سے دیکھ رہی تھی اس کے سیدھے پاؤں کی انگلی میں کچھ چبھا تھا اور اسے درد محسوس ہوا تھا اس کے پاؤں سے خون نہیں نکلا تھا لیکن درد تھا پھر اس کے اندر ایک کپکپی سی پیدا ہوئی تھی جو اس کے سارے جسم میں یوں پھیل گئی تھی جیسے تیز لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں اور پھر اس کا جسم پاؤں سے سر تک سن ہوگیا تھا میگی نے چیخنا چاہا تھا لیکن اس شخص نے میگی کے منہ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا تھا اس کی چیخ گلے ہی میں گھٹ گئی تھی۔

Digitized by Google

"چپ ہو جاؤ۔" اس نے غصے سے کہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کی چیخ سے لوگوں کی توجہ اس طرف ہو اور وہ پکڑا جائے۔

جو بھی چیز میگی کے پاؤں پر رینگ رہی تھی وہ آہستہ آہستہ اوپر بڑھ رہی تھی پھر دوسرے پاؤں اور ہاتھوں سے گزرتے ہوئے اس نے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا میگی اسے کوئی نام نہیں دے سکتی تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو چیز بھی اس پر رینگ رہی تھی اس نے میگی کے تازہ آکسیجن سے بھرے خون کو پسند کرلیا تھا اس کے خلیے تیزی سے ملٹی پلائی ہو رہے تھے اور بڑھ رہے تھے پھر اس کی گردن ناک کان اور آنکھیں بھی ان بڑھتے ہوئے خلیوں کی زد میں آ گئی تھیں اور اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وقت کی رفتار بہت آہستہ ہو گئی ہو اسے پھر کسی قسم کا احساس نہیں رہا تھا آدمی نے دیکھا کہ لڑکی بے حس ہو گئی ہے تو اس نے میگی کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"تمہیں کیا ہوا لڑکی؟" اس نے پوچھا لیکن میگی چپ تھی۔

"میں نے پوچھا تمہیں کیا ہوا ہے؟" آدمی نے دہرایا لیکن اب بھی خاموش تھی اس نے جھک کر میگی کو دیکھا لیکن اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا اسے ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی جیسے میگی کا جسم کچھ شکلیں اختیار کر رہا تھا اس کے جسم کی انرجی خرچ ہو رہی تھی اور اس کی ہڈیاں مضبوط کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ایک مکمل ہیولا آدمی کے سامنے کھڑا تھا وہ حیرت سے اس سفید مخلوق کو دیکھ رہا تھا جس کی نہ آنکھیں تھیں نہ چہرہ صرف سفید ہڈیاں تھیں جو ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی تھیں اور اس مخلوق کے چلنے پر حرکت کر رہی تھیں اس کے بازو رانوں کی شکل کے ہو گئے تھے اس سفید ہیولے نے اس شخص کو اٹھایا اور ایک طرف اچھال دیا وہ بھوسے کے ایک ڈھیر پر جا گرا تھا پھر وہ ہیولا جیسے ہوا میں تیرتا ہوا اس جھونپڑے سے باہر چلا گیا تھا گائیں اپنے درمیان ایک اجنبی بو کو محسوس کر کے خوف سے گھبرا رہی تھیں اور بے چین ہو گئی تھیں۔

جھونپڑے سے باہر نکلنے کے بعد سفید ہیولے نے کھیتوں میں بینک کے فارم ہاؤس کی طرف دیکھا تھا پھر اس کا رخ جنگل کی طرف ہو گیا تھا جہاں سے کچھ انسانی آوازیں آ رہی تھیں وہ انہی راستوں پر جنگل کی طرف بڑھ رہی تھی جن راستوں سے صبح میگی گزر کر جنگل گئی تھی فضا میں کیمپ فائر کی بو رچی ہوئی تھی اور دور کوئی بھیڑیا غرا رہا تھا شاید اسے بھی کسی ان جانی اجنبی مخلوق کی بو محسوس ہو گئی تھی اور وہ غرا کر دوسروں کو باخبر کر رہا تھا کچھ دور جانے کے بعد اس ہیولے کا رخ میگی کے گھر کی طرف ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁

شام کے چار بجے تک بینک کی پراپرٹی پر اسٹیٹ پولیس اور ایف بی آئی کی ٹیمیں پہنچ چکی تھیں سینئر ایف بی آئی انچارج بینک سین ٹوزا اپنے ساتھ چالیس افراد کی ٹیم لایا تھا جنہوں نے کام شروع کر دیا تھا اور وہ رات کے اندھیرے میں بھی جائے واردات پر کام کر رہے تھے وہاں انہوں نے خیمہ لگا دیا تھا اور موقع سے ثبوت جمع کر رہے تھے جیل سے مفرور دو قیدیوں میں سے ایک بینک کے کھیتوں میں مارا جا چکا تھا اور دوسرا مفرور تھا جس کا نام کیلی تھا اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کرنے والے تمام جرائم کا ماسٹر مائنڈ تھا۔

میگی کی والدہ سارہ فلینٹ اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی وہ پریشان تھی اس کے گھر میں بھی ایف بی آئی کے لوگ تحقیقات کے سلسلے میں آئے تھے اور اس نے انہیں میگی کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا وہ میگی کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن اس کا کہیں کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔

"کیا تم نے بینک کے فارم پر تلاش کیا؟" سارہ نے ایف بی آئی انچارج سے پوچھا۔

"جی ہاں ہم نے وہاں بھی تلاش کر لیا۔"

"دونوں بچے کہاں ہیں؟" سارہ کا اشارہ اپنے بیٹوں جسٹ ان اور جے سن کی طرف تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" انچارج نے جواب دیا۔

دونوں بچے سارا دن جنگل میں مرے ہوئے شخص کا سر اور ہاتھ ڈھونڈتے رہے تھے جو انہیں نہیں ملے تھے اور پھر جب ایف بی آئی کی ٹیمیں وہاں پہنچی تھیں تو انہوں نے بچوں کو ڈانٹ کر وہاں سے ان کے گھر بھیجا تھا۔ سارہ اور اس کا شوہر فلینٹ رات دیر تک فیملی روم میں بیٹھے رہے تھے انہیں میگی کی واپسی کا انتظار تھا فلینٹ بار بار سارہ کو یقین دلا رہا تھا

Digitized by Google

کہ میکی اپنی کسی دوست کے ہاں چلی گئی ہوگی اور واپس جلد گھر آجائے گی لیکن سارہ کا دل کسی طرح بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا اسے میکی کے بستر سے اس کے کٹے ہوئے بال ملے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ گھر سے غصے میں کہیں گئی تھی اور ناراض تھی اس کے لیے سارہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی ڈانٹا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ ان دونوں کی شرارت رہی ہوگی وہ پہلے بھی ایک بار ایسا کر چکے تھے اس وقت میکی کو گھر سے غائب ہوئے سولہ گھنٹے ہو چکے تھے اور گھر کے چاروں طرف موجود کھیتوں اور جنگلات میں مسلح پولیس افسران اور ایف بی آئی کے افراد مفرور کیلی کی تلاش کر رہے تھے۔

❁.....❁.....❁.....❁

پہاڑوں کی اترائی میں موجود جنگل میں پہلے ٹیپ سے نشان زدہ جگہ کے قریب تین افراد کھڑے تھے جن میں دو مرد اور ایک عورت تھی انہوں نے پولیس کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی سب کی عمریں بیس سال سے زیادہ ہی تھیں وہ یہاں کھلی جگہ میں موجود تھے جب کہ باقی ساتھی گھنے جنگل کے اندر کھلے ہتھیاروں سمیت موجود تھے کھلے میدان میں موجود تینوں ساتھی وقت گزارنے کے لیے باتوں میں مصروف تھے ان کی نظریں پہاڑی پر نظر آنے والی روشنی پر لگی تھیں جو ایک اسپاٹ لائٹ کی تھی جسے وہاں روشنی کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

''ارے ٹینا تمہارا کیا خیال ہے کیا ہمیں اپنی شفٹ ختم کرنے کے بعد کچھ کھانے کا موقع ملے گا؟'' مارٹن نے کہا جو ٹینا کے قریب ہی موجود تھا۔

''یہ پتہ نہیں مارٹن جب تک ہمیں وہ مفرور مجرم مل نہیں جاتا کچھ بھی کہنا مشکل ہے ہم بے فکر ہو کر کہیں کچھ نہیں کھا سکتے۔'' ٹینا نے جواب دیا۔

''آج رات بھی کتنی طویل لگ رہی ہے۔'' اس نے اپنے بالوں کی لٹ کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے مارٹن سے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے۔'' مارٹن نے جواب دیا۔ وہ ٹینا کے ساتھ ٹریننگ کلاس میں تین سال گزار چکا تھا اور ان دونوں میں بے تکلفی کی حد تک دوستی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں ساتھیوں کی طرف سے وسل کی آواز آنا چاہئے جس سے پتہ چلے کہ سب جاگ رہے ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔'' جمی نے کہا جو ان کے قریب ہی موجود تھا۔

''ہاں کام تو سب کر ہی رہے ہوں گے کیونکہ ایک لاش تو ہمیں کھیتوں سے مل ہی چکی ہے۔'' ٹینا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے وہ لاش دیکھی تھی؟'' جمی نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی سگریٹ سلگائی جس کی انہیں ڈیوٹی پر اجازت نہیں تھی اسے جنگل میں کچھ سائے سے نظر آئے تھے جن کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی اس کی نظریں ٹینا پر تھیں جو ایک بوتل سے پانی پی رہی تھی اور اس کے جسم پر اسپاٹ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی جمی کی نظریں اس کے جسم سے ہٹنا بھول گئی تھیں اسے پھر اچانک جنگل میں کسی سائے کی حرکت نظر آئی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اس کی چیخ نکلی تھی جیسے ہی جھاڑیوں میں سے ایک سفید ہیولے نے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کے سفید نوکدار بازو اس کے جسم میں اندر تک پیوست ہو گئے تھے۔

یہ سفید ہیولا جب کھیتوں میں بنے بینک کے جھونپڑے سے نکل کر جنگل کی طرف آیا تھا تب سے اب تک اس کے جسم پر جگہ جگہ اس کی ہڈیوں سے نئی شاخیں سی پھوٹ آئی تھیں اس کا جسم بڑھ گیا تھا جب اس نے جنگل میں اکیلے ایجنٹ کو کھڑے دیکھا تو اس پر حملہ کر دیا اور اپنے بازوؤں سے اسے زخمی کر دیا پھر جب تک وہ شخص بے حس نہیں ہو گیا تھا تب تک اس نے اسے نہیں چھوڑا تھا جب اس نے اپنے نوکدار بازو ایجنٹ کے جسم سے نکالے تھے تب اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا اپنے بازو نکالنے کے بعد اس نے پہاڑی کی طرف بھاگتے ہوئے لوگوں کا تعاقب شروع کر دیا تھا اس کی رفتار تیز تھی اور اس کے ہڈیوں جیسے پاؤں پتھروں پر پھسلتے جا رہے تھے۔

❁.....❁.....❁.....❁

جھونپڑے میں موجود کیلی کی آنکھ گن فائر کی آواز سے کھلی تھی۔ جھونپڑے میں اندھیرا تھا اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے اپنے بائیں پہلو میں درد کا احساس ہوا جیسے اسے کوئی بڑا زخم لگا ہوا سے یاد نہیں تھا کہ وہ کیسے زخمی ہوا تھا پھر لگاتار کئی فائر سنائی دیئے درمیان میں گنیں لوڈ کرنے کی

Digitized by Google

آوازیں بھی آرہی تھیں وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا جھونپڑے کے دروازے کی طرف بڑھاتا کہ کسی جھری سے باہر جھانک سکے لیکن راستے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اس نے جھک کر اس چیز کو چھوا وہ کسی ہرن کی ران کا حصہ تھا اور خاصا بھاری تھا اسے یاد آیا یہ ران کا ٹکڑا اسے کھیتوں سے ملا تھا جب اس کا بھائی ٹریکٹر کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا جب یہ ران کا ٹکڑا اسے ملا تو یہ بھی بالکل صحیح سالم تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا اب وہ کٹا پھٹا تھا لیلی نے اسے پھینک دیا وہ ایک دھمک کے ساتھ فرش پر گر گیا اس کے ساتھ ہی وہ جھونپڑا زور زور سے گھومنے لگا اور لیلی کو خیال آیا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو پھر اچانک اسے وہی سفید ہیولا نظر آیا جو پہلے نظر آیا تھا لیلی دیکھ سکتا تھا کہ اس ہیولے کے ہڈیوں نما نوکدار بازو اس کی طرف بڑھ رہے تھے پھر وہ اس کے جسم میں پیوست ہو گئے اور جب وہ زمین پر گرا تو وہ سوچ رہا تھا کہ کاش یہ سب خواب ہوتا جو کہ خواب نہیں حقیقت تھا وہ ہیولا اسے چھوڑ کر جھونپڑے سے باہر نکل گیا تھا باہر پھر گنوں کے فائر شروع ہو گئے تھے اور لیلی کا دل چاہا کہ اس کے پاس بھی گن ہوتی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے گن کہاں مل سکتی ہے۔

❁.....❁.....❁.....❁

میگی جاگ رہی تھی کم از کم اس کا یہی خیال تھا اسے حرکت آواز اور فاصلے کا احساس تھا لیکن اسے زمین پر چلتے ہوئے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا جب وہ چھوٹی تھی اور اپنی فیملی کے ساتھ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی تب وہ جانتی تھی کہ وہ سفر کر رہی ہے لیکن یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے وہ کافی عرصے سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکی تھی لیکن کتنے عرصے سے اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا بس یہ احساس تھا جیسے اس نے کافی طویل عرصہ سرد اندھیرے میں گزارا ہو اسے وہ جگہ پسند بھی تھی لیکن اب وہاں نہیں تھی اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہوا میں تیر رہی ہو۔

ٹینا اور مارٹن تیزی سے پہاڑی کی چڑھائی کی طرف بھاگ رہے تھے ان کی سانسیں پھول گئی تھیں اور وہ ہیولا ان کے پیچھے موجود تھا ٹینا نہیں جانتی تھی کہ وہ ہیولا کیا بلا ہے لیکن اس نے اپنی آنکھوں سے اس ہیولے کو جمی کو مارتے دیکھا تھا اسے یہ تو یقین تھا کہ وہ ہیولا مفرور مجرم نہیں ہو سکتا کیونکہ جس طرح اس نے جمی کو قتل کیا وہ کوئی انسان نہیں کر سکتا تھا مارٹن اور ٹینا کا فاصلہ اس ہیولے سے کم ہو رہا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ ان دونوں کو پکڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک انہیں پکڑ چکا ہوتا یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے ذریعے اس جگہ تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں وہ جا رہے تھے ہیولا لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اس کے ہڈیوں جیسے پاؤں زمین کو کم ہی چھو رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بچوں کا کوئی کھیل ہو جس میں وہ ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

پہاڑیوں پر اوپر فلیٹ کے گھر کے برآمدے میں ایف بی آئی انچارج سینٹو اپنے ریڈیو پر کچھ عجیب آوازیں سن رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو جیسے کوئی خوف زدہ ہو کر بھاگ رہا ہو اسے اپنے ساتھیوں پر غصہ آیا اس نے بہت بار انہیں ہدایت کی تھی کہ اپنی ڈیوٹی کے دوران کبھی کسی چیز سے خوف زدہ ہو کر بھاگنا نہیں بلکہ سمجھ داری سے اس کا مقابلہ کرنا لیکن اس وقت یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت خوفزدہ ہے اور بھاگ رہا ہے اس کا دل چاہا کہ وہ ریڈیو پر ہی چیخ کر اس فرد کو ڈانٹے لیکن وہ خاموش رہا وہ دھیان سے سننا چاہتا تھا کہ معاملہ کیا ہے اب اسے سانسیں لینے کی دو آوازیں آ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ایک دھمک کی بھی آواز آتی تھی جیسے کچھ فاصلے پر کوئی ڈھول تھپتھپا رہا ہو وہ بہت غور سے سنتا رہا اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے وہ سچ ہے اب وہ سوچ رہا تھا کہ دو سانسیں لینے والے کس چیز سے بھاگ رہے ہیں؟

آخر کار اسے ریڈیو پر ایک عورت کی آواز سنائی دی جس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ تیزی سے بول رہی تھی۔

"مین ڈاؤن ڈاؤن ادھر ایک خوفناک بلا ہے وہ پہاڑی پر جا رہی ہے۔" یہ الفاظ بہت تیز مگر خوفزدہ آواز میں کہے گئے تھے یہ آواز سینٹو پہچان گیا تھا یہ اس کی پارٹی کی کارکن ٹینا کی آواز تھی اور ٹینا بہت بہادر تھی وہ معمولی چیزوں سے گھبرانے والی نہیں تھی سینٹو ایک دم چوکنا ہو گیا اسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا اس نے اپنے قریب کھڑی ایک ایجنٹ کو مخاطب کیا۔

Digitized by Google

"پال نیچے جنگل میں ایک آدمی زخمی ہوگیا ہے فوراً ایمبولینس بلاؤ اور پہاڑی پر نظر رکھو اور فائر کے لیے تیار رہو لیکن جب تک میں آواز نہ دوں فائر مت کرنا۔"

"یس سر۔" پال نے جواب دیا۔

سینٹو چاند کی روشنی میں اپنے ایجنٹس کو اپنے حکم پر عمل کرتے اور اپنی پوزیشن بدلتے دیکھ سکتا تھا وہ سب فلیٹ کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے یوں لگتا تھا کہ آنے والا شخص ان کے دائرے کے اندر ہی کہیں جنگل میں موجود ہے اور آگے بڑھ رہا ہے فلیٹ کے گھر کے اندر اندھیرا تھا کچھ دیر بعد ہی سینٹو کو لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں پھر اسے سوگز کے فاصلے پر ٹینا اور مارٹن بھاگتے ہوئے نظر آئے ان کے چہروں پر خوف تھا اور ان کے پیچھے ایک سفید ہیولا تھا جو ان کا تعاقب کر رہا تھا اس کا کوئی چہرہ نہیں تھا کان نہیں تھے لیکن ایسا اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ دیکھنے اور سننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا جسم سفید ہموار ہڈی کا بنا ہوا تھا جس پر جگہ جگہ سفید ہڈی جیسے کانٹے نکلے ہوئے تھے اس کے ہاتھ سفید ہڈی جیسے نوکیلے بنے تھے اور وہ ہوا میں چلنے کے بجائے تیر رہا تھا کچھ دیر بعد اس کا جسم زمین سے لگتا تھا جس سے ایک دھمک پیدا ہوتی تھی دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت' سینٹو حیرت سے اس کے چہرے کی جگہ کو تک رہا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خوفناک فلم دیکھ رہا ہو اس کا جسم بالکل تتلی کے لاروا جیسا لگ رہا تھا اور وہ اس کے ایجنٹس کا تعاقب کرتا اس گھر کی طرف آرہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت میکسن فلیٹ نے اپنے گھر کے عقبی حصے کی ایک کھڑکی کھولی اور اس کے ذریعے پچھلی طرف اتر کر جنگل میں غائب ہوگیا وہ اپنی بیٹی میگی کو ڈھونڈنے جا رہا تھا یہ بات اس نے گھر کے افراد سے بھی چھپائی تھی اور وہاں موجود ایف بی آئی ایجنٹ سے بھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کسی کو بتایا تو کوئی بھی اسے ایسا نہیں کرنے دے گا۔

برآمدے میں سینٹو کھڑا اپنے ایجنٹس اور ہیولے کو اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا اچانک اس نے گہری سانس لی۔

"شوٹ اٹ۔" اس نے پولیس ریڈیو پر زور سے کہا اور کئی سمت سے فائروں کی آوازیں سنائی دیں۔ اسی وقت پہاڑی پر لگی اسپوٹ لائٹ کسی فائر سے ٹوٹ گئی اور اندھیرا ہوگیا پھر سڑک پر لگی لائٹ اور جنگل میں لگی تیسری لائٹ بھی کسی نے فائر کر کے توڑ دی تھی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا سینٹو حیران تھا کہ یہ کام اس کے ایجنٹس نہیں کر سکتے تھے اس کا مطلب تھا کہ علاقے میں کوئی اور بھی کارروائی میں مصروف تھا۔

❀ ❀ ❀ ❀

کیلی زخمی حالت میں جھونپڑے سے گھسیٹتا ہوا باہر آیا تھا جنگل میں چاند کی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، آسمان پر تارے چمک رہے تھے اس نے ایک لمبے کو کھلی فضا میں سانس لی تھی اس منظر کو دیکھنے اور اس تازہ ہوا میں سانس لینے کو وہ جیل میں ترس گیا تھا پھر وہ جنگل کی طرف بڑھ گیا تھا اور درختوں کی اوٹ لیتا ہوا ایک سمت بڑھنے لگا تھا اچانک اسے کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی تھی جو کہیں قریب ہی آ کر رکی تھی اس نے خود کو گھنے درختوں کے درمیان چھپا لیا تھا اس کے پیچھے وہ جگہ تھی جہاں کھیتوں میں اس کا بھائی ٹریکٹر کے نیچے کچلا گیا تھا اور اس کے سامنے پہاڑی پر مسٹر فلیٹ کا گھر تھا وہ سوچ رہا تھا کہ آج اگر اس کی جیب میں کچھ رقم ہوتی اور اس کے پاس کار ہوتی تو وہ کہیں بھی جاسکتا تھا لیکن اب بچت کی کوئی صورت تھی وہ ایک دن دو دن یا رہا ایک ہفتہ ہی آزاد گزار سکتا تھا پولیس اس کی تلاش میں تھی اور اسے کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا تھا اچانک فضا میں کسی الو کے بولنے کی آواز آئی اس نے اوپر دیکھا لیکن کوئی پرندہ نظر نہیں آیا پھر وہ آواز دوبارہ آئی اور کسی مچھر نے اس کی گردن پر کاٹا جسے اس نے زور سے ہاتھ مار کر مسل دیا پھر اسے کچھ فاصلے پر انسانی آوازیں سنائی دیں جیسے چند افراد آپس میں باتیں کر رہے ہوں اب فائروں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں پھر اچانک اسے اس بچی کا خیال آیا جسے اس نے جھونپڑے میں دیکھا تھا وہ بد شکل بارہ سال کی رہی ہوگی لیکن اس کے دیکھتے دیکھتے وہ ایک سفید بلا میں تبدیل ہوگئی تھی اب کیلی کو لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اسے شدید پیاس کا احساس ہوا اور اس نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اس کے اندازے کے مطابق وہاں کوئی پانی کی نہر قریب بھی ہونا چاہیے تھی وہ چند قدم آگے بڑھا۔

"جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔" اچانک اسے اپنی پشت

Digitized by Google

سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اگر ہلے تو کھوپڑی اڑا دوں گی۔" سخت آواز میں کہا گیا اور کیلی کو لگا جیسے اس کا خون رگوں میں جم گیا ہو۔ اسے ڈھونڈ لیا گیا تھا اس کی پشت سے گن کی ٹھنڈی نال لگی ہوئی تھی اور فی الحال حکم ماننے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ پرندے پھڑپھڑاتے تھے اور اسے پکڑنے والی کی توجہ ان کی طرف ہوئی تھی اس موقع سے کیلی نے فائدہ اٹھایا تھا اس نے اپنی کہونی پیچھے کھڑی پولیس آفیسر کے پیٹ میں ماری تھی اور اسے گرا دیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے اس کی گن کیلی کے ہاتھ میں تھی اور اس نے گن کا بٹ آفیسر کی کنپٹی پر مارا تھا وہ بے ہوش ہوگئی تھی پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر کیلی نے ایک کار کی چابیاں ہتھکڑیاں اور ان کی چابیاں نکالی تھیں کار کی چابیاں اس نے رکھ لی تھیں اور ہتھکڑیاں اور ان کی چابیاں جنگل کے اندھیرے کی طرف اچھال دی تھیں پھر اس آفیسر کی جیکٹ بھی اس نے لے لی تھی اور کچے راستے کی طرف چل پڑا تھا جہاں کچھ کاریں کھڑی تھیں اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں وہ جانتا تھا کہ اس کی آزادی کا راستہ وہیں سے شروع ہوتا ہے۔

❁……❁……❁……❁

جنگل میں لگی تین اسپوٹ لائٹس کے ٹوٹنے کے بعد ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا سینٹو کے حکم پر ایک کار کی ہیڈ لائٹس آن کی گئی تھیں لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی سفید ہیولا وہاں سے غائب ہو گیا تھا وہ قریب ہی کھیتوں میں چھپ گیا تھا اس کا نرم ہڈیوں جیسا جسم فضا میں معلق تھا اور وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا فلیٹ کے گھر کی طرف جا رہا تھا سب کی نظروں سے اوجھل پھر وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر کے پیچھے پہنچا تھا اب بھی ایف بی آئی کے ایجنٹس اسے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن وہ ان کی مدھم آوازیں سن سکتا تھا وہ آہستہ آہستہ گھر کے پیچھے پورچ کے دروازے تک پہنچ گیا تھا جس کا جالی کا دروازہ لاک نہیں تھا اور اندر کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اس دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

گھر میں تاریکی اور ٹھنڈک کا راج تھا جے سن اور جسٹن اپنے کمرے میں سو رہے تھے کہ اچانک جے سن کو دروازے پر دستک سنائی دی اس کی آنکھ اسی آواز سے کھلی تھی جب وہ اٹھا تو سردی کے باوجود اسے پسینے آرہے تھے پہلے اس نے سوچا کہ وہ خواب میں ہے اور دروازے پر دستک کی آواز اس کا وہم ہے لیکن کچھ دیر بعد اسے آواز پھر سنائی دی اس کا خیال تھا کہ شاید سارا دن گھر سے غائب رہنے کے بعد میگی واپس آئی ہو لیکن وہ اکیلے دروازے کھولنے سے گھبرا رہا تھا اس نے قریب لیٹے کو کئی آوازیں دیں لیکن وہ گہری نیند میں تھا چنانچہ جے سن نے خود ہی دروازہ کھولنے کا فیصلہ کیا اسی وقت دستک کی تیسری آواز سنائی دی یہ آواز گھر کے پیچھے پورچ کے دروازے کی تھی وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر نکلا ٹی وی لاؤنج میں اس کی والدہ سارہ سو رہی تھی وہ دبے قدموں اس کمرے سے نکل کر راہداری سے گزرتا ہوا پورچ کے دروازے کی طرف بڑھا دستک پھر سنائی دی اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا۔

"میگی؟" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اپنی بہن کو آواز دی۔

"میگی کیا تم ہو؟" اس نے ایک بار پھر پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا چنانچہ وہ واپس اندر آ گیا اور اس نے پورچ کا دروازہ بند کر لیا پھر جیسے ہی وہ دروازہ بند کر کے مڑا تھا تو حیران رہ گیا تھا اس کے سامنے ایک سفید ہڈیوں کا ہیولا کھڑا تھا اس نے اپنے نوکیلے بازوؤں سے جے سن کو پکڑنا چاہا تو وہ بھاگ کر لیونگ روم کی طرف گیا ہیولا اس کے پیچھے تھا وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگا اس کا دل خوف سے ڈوبا جا رہا تھا ہیولا اس کے ساتھ ہی کچن میں داخل ہوا تھا اور پھر اس کے بازو لہرائے اور جے سن کو جکڑنے کے لیے...... الاسٹک کی طرف کھنچ کر لمبے ہو گئے تھے وہ فضا میں یوں لہرا رہے تھے جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

❁……❁……❁……❁

کیپٹن ڈین اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی ایک ایف بی آئی آفیسر نے اسے فون کیا تھا اور کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"آفیسر میں جانتا ہوں کہ مسٹر بینک کی زمینوں پر ملنے والی لاش دیکھنے سب سے پہلے تم ہی گئے تھے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ڈینی نے جواب دیا۔

"پلیز کیا تم مجھے اپنا تجربہ ایک بار بیان کر سکو گے جب تم وہاں پہنچے تو تم نے کیا دیکھا؟ اور جب تک واپس آئے کیا کیا معلومات جمع کیں کن لوگوں سے ملے؟"

"میں وہاں پہنچا تو اس کی بیوی نے مجھے ریسیو کیا پھر بینک مجھے اپنی زمینوں پر لے گیا میں نے لاش دیکھی اس کی ایک مجرم کی حیثیت سے شناخت کی وہ ایک مفرور مجرم تھا اور واپس اسٹیشن آ گیا۔"

ڈین نے ناگواری سے جواب دیا کیونکہ وہ یہ واقعہ اب تک کئی بار بیان کر چکا تھا دوسری طرف سے اسے کاغذ پر قلم چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی گویا تفصیل تحریر کی جا رہی ہو۔

"ٹھیک ہے میں تم سے کچھ تفصیلات مزید جاننا چاہوں گا کیونکہ میں ایک فارم بھر رہا ہوں۔"

"مجھے تمہارا بات کرنے کا لہجہ پسند نہیں آیا۔" ڈینی نے چڑ کر کہا۔

"اور مجھے بھی تمہارا انداز پسند نہیں آیا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"لیکن میں اس کیس کا انچارج ہوں تم نہیں چنانچہ مجھے تمہاری پروا نہیں کہ تم کیا پسند کرتے ہو تم میرے سوالوں کے سیدھے سیدھے جواب دو اور بس۔" دوسری طرف سے کہا گیا پھر ڈینی نے ناگواری سے سارے جوابات دیئے تھے آخر میں اسے ہدایات ملی تھیں کہ وہ اس واقعہ کا ذکر ابھی کسی سے نہ کرے اور نہ ہی میڈیا سے کئے جانے والے کسی سوال کا جواب دے۔ ایف بی آئی اس معاملے کو خود ہینڈل کرے گی۔" ڈینی نے برا سا منہ بنا کر ریسیور رکھ دیا تھا اور کافی دیر تک اس معاملے پر سوچتا رہا تھا اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ وہ اس معاملے کو ہینڈل کرنے والا پہلا شخص تھا اور اب ایف بی آئی اسے لے اڑی تھی پر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

✿✿✿

سارہ کافی دیر تک بے خبر سوتی رہی تھی پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کاؤچ پر لیٹی کافی دیر تک گھر کے باہر پہرہ دینے والے ایف بی آئی آفیسر کی باتیں کرنے کی آوازیں سنتی رہی تھی کچھ دیر بعد وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں اور کچھ کاروں کے دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آئیں سارہ کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی رات کی شفٹ تبدیل ہو رہی ہے سارہ کی آنکھ پھر لگ گئی کچھ دیر بعد جب وہ پھر جاگی تو مکمل سکوت تھا یوں لگ رہا تھا جیسے پہرے پر موجود آفیسرز بھی سو گئے تھے سارہ کو سینٹو کا خیال آیا جس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سو جائے اور ایف بی آئی آفیسران سب کا خیال رکھیں گے اچانک سارہ کو کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں وہ کسی کے بولنے کی آوازیں نہیں تھیں بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چپکے چپکے چل رہا ہو آوازیں خاصی مدھم تھیں سارہ کچھ دیر غور سے انہیں سنتی رہی اسے خیال آیا کہ راتوں کو بعض اوقات جب میکس کو بھوک لگتی ہے تو وہ کچن میں آلو کے چپس کی تلاش میں گھس جاتا ہے لیکن پھر قدموں کی آہٹ سے اسے احساس ہوا کہ وہ میکس نہیں تھا وہ قدم ہلکے اور تیزی سے اٹھ رہے تھے وہ جسٹن یا جے سن ہو سکتے تھے نیند اب بھی اس کی آنکھوں میں تھی پھر اچانک اسے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ کاؤچ سے اٹھی اور کمرے کی لائٹ آن کی اور اس کی نظر کمرے کے فرش پر پڑے شیشے کے لیمپ سے ٹکرائی وہ چکنا چور ہو چکا تھا یہ رنگین شیشوں والا لیمپ برسوں سے اس کے گھر میں استعمال ہو رہا تھا اور اسے بے حد پسند تھا۔

اسی وقت سارہ کی نظر ایک سفید ہیولے پر پڑی جس کے سامنے جے سن کھڑا تھا اس کے نرم گال سرخ ہو رہے تھے اور وہ اپنے سامنے کھڑے ہیولے کی طرف متوجہ تھا۔

"مام!" جے سن نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے مڑے بغیر اسے آواز دی اور سارہ کا دل جیسے سینے سے باہر آ گیا اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ممی۔" اس بار جے سن نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور سارہ کی نظر اس کے ہاتھ میں موجود گن پر پڑی اس کے ہاتھ میں میکسن کی گن تھی جسے میکسن اکثر اپنے دوست فل کو دکھانے کے لیے استعمال کرتا تھا پھر اس کی نظر جسٹن پر پڑی جو قریب ہی کھڑا خوفزدہ نظروں سے ہیولے کی طرف دیکھ رہا تھا سارہ نے پھر جے سن کو دیکھا ہیولے کا ایک نوکدار بازو جے سن کے پیٹ میں چبھا ہوا تھا اور پھر جے سن نیچے گر گیا تھا اور سارہ کی طرف کھسک رہا تھا ہیولا ساکت کھڑا سارہ کو دیکھ رہا تھا اس کے بازو فضا میں یوں حرکت کر رہے تھے جیسے کچھ محسوس کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

سارہ کو خوف کے باوجود اپنے اندر بہادری اور ہمت کا احساس ہوا اور وہ بہرحال ایک ماں تھی اور اس کے دونوں

بچے خطرے میں تھے اس نے جے سن کے ہاتھ سے گن چھینی اور چیختی ہوئی ہیولے کی طرف لپکی پھر ہیولا بھی اس کی طرف بڑھا تھا انداز ایسا تھا جیسے وہ سارہ سے بغل گیر ہونا چاہتا ہو لیکن اس کے دونوں بازوؤں میں بچے سن کا خون لگا ہوا تھا سارہ کو اس خون کی بو محسوس ہو رہی تھی اسے ہیولے کے نوکدار بازوؤں اور ان کی تیز دھار کا خیال آیا اور اس نے ہیولے پر گن تان لی۔ اسی وقت باہر تیز روشنی ہوئی اور فائر کی آواز آئی سارہ پلٹی کمرے کی کھڑکی سے اسے باہر کا منظر نظر آرہا تھا جہاں ایمرجنسی لائٹس آن ہوگئی تھیں کسی کار کی ہیڈ لائٹس بھی آن تھیں اور ایک شخص اس کی کھڑکی کی طرف بھاگتا آرہا تھا سارہ کو یوں لگا جیسے وہ اس کی جانب سلوموشن میں بھاگتا آرہا ہو اس شخص کے چہرے کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی اسے کئی بار اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا وہ مفرور قیدی تھا وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا اور سارہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے گھر کی طرف کیوں آرہا ہے وہ یہاں تو ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتا تھا جب کہ چاروں طرف ایف بی آئی کا پہرہ تھا اور انہیں اس کا ہی انتظار تھا۔

پھر وہ کھڑکی کے قریب پہنچ گیا تھا جو لان میں کھلتی تھی وہ سارہ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا کہ اچانک نیچے گر گیا وہ گرتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا تھا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی تھی اور وہ گر گیا تھا اس کے پیچھے سنیڈ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں گن تھی اور اس وہ کھڑکی سے اندر سارہ اور ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔

کچن سے آنے والی روشنی میں ہیولا بالکل سفید نظر آرہا تھا اور جب سارہ بے خبری میں باہر دیکھ رہی تھی نہ جانے کب اس ہیولے نے اس کی کلائی پکڑی تھی اور اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اس کا نوکدار بازو سارہ کی کلائی میں چبھ گیا تھا اور کلائی سے خون بہہ رہا تھا سارہ کی کلائی ٹھنڈی اور سن ہوگئی تھی اسے تکلیف کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے سفید ہیولے کو تک رہی تھی جس کا کوئی چہرہ نہیں تھا وہ سوچ رہی تھی کہ گھر کی لائٹیں اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں یا پھر ہیولے کی ہڈیاں واقعی حرکت کر رہی تھیں اس کے خلیے بھی حرکت میں تھے اور چہرہ بھی بار بار شیپ بدل رہا تھا۔

اچانک اس ہیولے کے چہرے نما حصے میں ایک سوراخ بنا اور سارہ نے کوئی اور آواز سنی جیسے اس سوراخ سے ہوا نکلی ہو اور پھر وہ سوراخ بڑا ہوا چند سیکنڈ ہی میں وہ تین انچ کا ہو گیا پھر چار اور پھر پانچ۔

سارہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اسے یوں لگا جیسے اس کا دل رک گیا ہو اور خون رگوں میں جم گیا ہو وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی تھی ہیولے کو دیکھ رہی تھی جس کی ہڈیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کر رہی تھیں جیسے کسی اسٹیج پر پڑے پردے حرکت کرتے ہیں اس کی کھوپڑی ایک خالی انڈے کی طرح تھی سارہ نے اس کے اندر جھانکا جہاں اسے ایک انسانی چہرہ نظر آیا وہ ایک سوتی ہوئی لڑکی کا چہرہ تھا اس کی بارہ سالہ میگی کا چہرہ اس کا دل چاہا وہ چیخ کر اسے باہر نکال لے پھر میگی کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور ان سے خوف جھانک رہا تھا پھر وہ چیخی تھی۔

"ہیلپ می۔"

آواز سنتے ہی سارہ بے ہوش ہو کر گر گئی تھی ہیولے کی نوک اس کی کلائی سے نکل گئی تھی اور میگی کا چہرہ موٹی ہڈیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جیسے اسٹیج کا پردہ گر گیا ہو پھر ہیولا پورچ میں جا کر رات اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔

سنیڈ کے حکم پر جلد ہی وہاں ایمبولینس اور ہیلی کاپٹر پہنچ گئے تھے جے سن بہت زخمی تھا اسے ہیلی کاپٹر میں شہر کے قریبی اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور سارہ کو طبی امداد دے کر اس کے بیڈ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا میکس اور جسٹن گھر میں موجود نہیں تھے علاقے میں ان کی بھی تلاش شروع کر دی گئی تھی اس تمام گہما گہمی میں علاقے کے چند رہائشی جن کی رہائش وہیں آس پاس تھی وہاں پہنچ گئے تھے جنہیں تیزی سے ہٹایا جا رہا تھا ابھی لوگوں کے درمیان ڈینی بھی موجود تھا جو موقع کا جائزہ لے کر تیزی سے وہاں سے کھسک گیا تھا اچانک ایف بی آئی کے ایک ایجنٹ کی نظر جیٹ پر پڑی جو ایک صحافی تھی اور میکس کے پڑوسی فل کے ساتھ کھڑی تھی۔

"ارے جیٹ تم یہاں کہاں؟" مرفی نے کہا جو لوگوں کو وہاں سے ہٹانے کا کام کر رہا تھا۔

"میں فل کی دوست ہوں اس سے ملنے اس کے گھر آئی تھی تو یہاں مجھے ایک زبردست خبر بھی مل گئی۔"

"جیٹ تم یہاں سے جاؤ۔"

"نہیں مرفی تم مجھے بتاؤ کیا مجرم پکڑے گئے۔" جیٹ

Digitized by Google

نے پوچھا۔
"آخر تمہیں کیا دلچسپی ہے؟" مرفی نے کہا۔
"مجھے فل نے سب بتا دیا ہے میں اس خبر کی ساری معلومات جمع کرنا چاہتی ہوں۔" جیٹ نے جواب دیا۔
"لیکن ابھی کسی کو اجازت نہیں۔" مرفی نے سختی سے جواب دیا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔
سینٹو فلیٹ کے برآمدے میں اداس بیٹھا تھا اس کا ایک ایف بی آئی آفیسر مارا گیا تھا جس کا اسے افسوس تھا لیکن جیل سے فرار دونوں مجرم بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اسے اپنے ماتحت جیکسن کی آواز سنائی دی۔
"سینٹو جلدی آؤ یہ دیکھو۔"
"کیا ہے کیا بات ہے؟" سینٹو نے پورچ کی طرف آتے ہوئے کہا اور جیکسن نے کمرے کی طرف آنے کا اشارہ کیا وہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی پر بریکنگ نیوز دیکھ رہا تھا سینٹو جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا حیران رہ گیا تھا ٹی وی پر اسی مخلوق کو دکھایا جا رہا تھا جسے وہ ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔
"قریب ہی ایک عوامی میلا ہو رہا تھا جہاں اسے دیکھا گیا ہے۔" جیکسن نے کہا۔
"کسی کو زخمی تو نہیں کیا؟" سینٹو نے پوچھا۔
"نہیں خبر یہ ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔" مرفی نے بتایا جو اندر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا ٹی وی پر ایک خاتون رپورٹر نظر آ رہی تھی جو خبر سنا رہی تھی اور موقع پر ہی موجود تھی۔
"اگر آپ نے ہمیں ابھی جو فوٹیج دکھائی ہے تو ہم ایک اور ویڈیو کلپ دکھا رہے ہیں یہ کچھ خوفزدہ کر دینے والا ہے چنانچہ آپ سے درخواست ہے کہ اگر بارہ سال سے چھوٹے بچے آپ کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہے ہیں تو انہیں ہٹا دیں یا چینل بدل دیں۔" رپورٹر نے کہا اور پھر ویڈیو شروع ہو گئی۔
اس ویڈیو کو اوپر فضا سے ریکارڈ کیا گیا تھا جو ایک ڈرون کیمرے سے فلمائی گئی تھی اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بھاری ٹرک کچے راستے پر جا رہا تھا اور لوگوں کا ایک بڑا مجمع اسے جاتا دیکھ رہا تھا ایک ہری روشنی نظر آئی تھی اور ٹرک کے پچھلے پائپ سے کالا دھواں نکلا تھا ویڈیو اندھیرے کی وجہ سے زیادہ صاف نہیں تھی لیکن جو دکھایا جا رہا تھا وہ سمجھ میں آ رہا تھا اچانک سفید ہیولا ٹرک کے سامنے نمودار ہوا تھا پھر وہ ٹرک کے انجن والے حصے پر کودا تھا اور اپنے نوکدار بازوؤں سے اسے مارنے لگا تھا۔
"یہ کیا ہے؟" اچانک مرفی نے پوچھا۔
"لگتا ہے کوئی جنگلی جانور ہے جو عوامی میلے میں پہنچ گیا ہے۔" جیکسن نے جواب دیا اسی وقت خاتون رپورٹر پھر اسکرین پر نظر آئی۔
"شہر انتظامیہ کا کہنا ہے کہ علاقے کے لوگ آج اپنے گھروں میں رہیں دروازے بند رکھیں اور اپنے جانوروں کی حفاظت کریں ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے لیکن یہ کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔"
"آپ یہ ویڈیو دوبارہ دیکھیں شاید یہ سمجھنے میں مدد ملے کہ یہ کیا ہے؟" رپورٹر نے کہا اور ویڈیو دوبارہ چلنے لگی لیکن ابھی وہ آدھی ہی چلی ہوئی تھی کہ ایک اور اعلان ہوا۔
"ہم اپنے رپورٹر کے پاس واپس چلتے ہیں اب آپ لائیو دیکھیں گے کہ کیا ہو رہا ہے اور عوامی میلے میں کیا صورت حال ہے۔" اب ٹی وی پر لائیو منظر نظر آ رہا تھا۔
"اب وہ دو ہیں۔" رپورٹر نے کہا۔
"وہ دیکھنے میں خطرناک لگ رہے ہیں ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں۔" رپورٹر نے کہا اور کیمرہ مین سے درخواست کی کہ وہ انہیں قریب سے دکھائے کیمرہ زوم ہوا تھا اور اس نے ان بلاؤں کو فوکس کیا تھا وہ سفید ہیولے تھے جو کچے راستے پر ایک دوسرے کے تعاقب میں نظر آ رہے تھے۔ اور لوگ انہیں دیکھ کر بھاگ رہے تھے ان میں خوف و ہراس تھا۔
اس رات نیویارک سے باہر جنوب کی جانب دیہاتیوں کا ایک عوامی میلہ لگا تھا جس میں بہترین فرکوں کا مقابلہ ہونا تھا ہیولا جس ٹرک پر نمودار ہوا تھا وہ سے جے کا ٹرک تھا جو اس نے بہت شوق بہت پیسہ خرچ کر کے بنایا تھا اسے امید تھی کہ وہ یہ مقابلہ جیت جائے گا لیکن اس انجانی بلا نے اس مقابلے کو پامال کر دیا تھا۔

❁.....❁.....❁.....❁

جس ہیلی کوپٹر میں زخمی جے سن کو بھیجا گیا تھا اس میں پائلٹ کے علاوہ دو میڈیکل اسٹاف کے کارکن اور ایک

Digitized by Google

خاتون نرس موجود تھی۔

"میں نے ایسے زخم کبھی نہیں دیکھے" ربیکا نے کہا وہ اپنے قریب بیٹھے جارج سے مخاطب تھی جس کا تعلق بھی میڈیکل اسٹاف سے تھا اور اس کا دس سال کا تجربہ تھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو یہ زخم کسی چاقو سے لگنے والے زخموں سے بہت مختلف ہیں۔" ربیکا نے کہا ان کا زخمی ہیلی کاپٹر کے پچھلی طرف والے حصے میں اسٹریچر پر بندھا بیہوش پڑا تھا اور وہ لوگ باتوں میں مصروف تھے سارے راستے وہ مختلف موضوعات پر بات کرتے رہے تھے پھر ہیلی کاپٹر ایک اسپتال کے ہیلی پیڈ پر اترا تھا اور میڈیکل اسٹاف جب مار کر باہر آیا تاکہ زخمی کو اسٹریچر سمیت اسپتال میں لے جائیں لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسٹریچر خالی تھا۔

"وہ لڑکا کہاں ہے؟"

"کہیں وہ اسٹریچر سے گر تو نہیں گیا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا وہ اسٹریپ کی مدد سے اسٹریچر سے بندھا ہوا تھا۔"

"وہ ان اسٹرپ کو دیکھو یہ تو کٹے ہوئے ہیں۔" سب کی نظریں کٹے ہوئے اسٹرپ اور خالی اسٹریچر پر لگی تھیں۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟"

"یہ رات ہمارے لیے مصیبت بن کر آئی ہے اب ہم کیا جواب دیں گے؟" ربیکا نے کہا۔

اسی رات عوامی میلے میں ایک اور واقعہ ہوا تھا ایک بچی سیلسیا اپنے والدین کے ساتھ اس میلے میں شرکت کرنے آئی تھی لیکن اسے کاروں اور ٹرکوں کے مقابلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اپنے والدین سے بچھڑ کر میلے سے دور نکل گئی تھی اور ایک قریبی فارم ہاؤس میں پہنچ گئی تھی جہاں ایک احاطے میں کچھ چھوٹے جانور موجود تھے احاطے پر چھت تھی اور وہ کچی جھونپڑی کی صورت میں تھا یہاں مختلف حصوں میں بکریاں مرغیاں خرگوش وغیرہ پلے ہوئے تھے وہ انہیں شوق سے دیکھ رہی تھی اچانک فارم پر کام کرنے والا ایک بوڑھا وہاں آیا تھا اور سیلسیا کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو اچھی لڑکی رات بہت ہوگئی ہے جاؤ...... اپنے گھر جاؤ۔" اس نے پیار سے کہا اور سر جھٹکتا ہوا وہاں سے چلا گیا سیلسیا خرگوش کے بچوں کو دیکھ کر واپسی کے لیے مڑ رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے ایک آہٹ سنائی دی وہ

AANCHALPK.COM
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
اکائی
عشنا کوثر سردار کا ایک لازاول ناول ایک پڑھے لکھے گھرانے کا احوال جو لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا
جنون سے عشق تک
ضد و انا سے گندھی عشق کی ایک لازاول داستان سمیرا شریف طور کا مدتوں یاد رہ جانے والا دلکش ناول
تیری زلف کے سر ہونے تک
خاندانی اختلاف کے پس منظر میں لکھا گیا اقراء صغیر احمد کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ دیگا
AANCHALNOVEL.COM
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (03008264242)

Digitized by Google

کبھی بوڑھا پھر آ گیا ہے وہ تیزی سے پیچھے مڑی۔

''سوری۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی لیکن اپنے پیچھے ایک سفید ہیولے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اس ہیولے کا چہرہ نہیں تھا بس ہڈیوں کا بنا ایک لاروے جیسا جسم تھا سیلیسا اسے دیکھ کر ایک ہی جگہ کھڑی رہ گئی تھی اس ہیولے نے اپنے نوکدار بازو اس کی طرف بڑھائے تھے اور وہ خوف سے پیچھے ہٹی تھی اور پانی کے ایک بڑے سے ٹب میں گر گئی تھی جو جانوروں کے لیے وہاں رکھا گیا تھا وہ تقریباً اس ٹب کے پانی میں ڈوب گئی تھی ہیولے نے اسے پکڑنے کے لیے اپنے بازو اس پانی کے ٹب کے طرف بڑھائے تھے اور سیلیسا نے آنکھیں بند کرلی تھیں اس وقت باہر کسی ٹرک کے انجن کی تیز آواز سنائی دی تھی اور ہیولا اپنی جگہ رک گیا تھا وہ چند لمحے یونہی رکا رہا تھا اور پھر اس احاطے کے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا سیلیسا سانس روکے ایک منٹ تک پانی میں پڑی رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس نے پانی ہی میں آنکھیں کھول کر دیکھا اسے چھت نظر آئی اب ہیولا وہاں نہیں تھا اس نے پانی سے سر باہر نکالا اور دو گہری سانسیں لیں اور تیزی سے احاطے سے باہر نکل گئی وہ جلد از جلد میلے میں اپنے والدین کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁ ...... ❁

میکس اپنے گھر سے نکل کر کھیتوں اور جنگلوں میں اپنی بیٹی میگی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ اس کے دونوں بیٹے اور بیوی سارہ کس حال میں ہیں وہ جنگل میں کافی آگے نکل گیا تھا اور ہرنوں کی گزرگاہوں سے ہوتا ہوا اس حصے میں آ گیا تھا جہاں مضافاتی علاقہ ختم ہوکر نیویارک کا شہری علاقہ لگ جاتا تھا پھر وہ مغرب کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا وہ یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ اس کا بچپن یہاں گزرا تھا جنگل اب زیادہ گھنا اور بڑا ہوچکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میگی کو پکارتا بھی جا رہا تھا وہ جانتا تھا وہ جنگل میں اکیلی بھٹک گئی ہے اور خوف زدہ ہوسکتی ہے رات کافی گزر چکی تھی اور رات کو جنگل میں بھیڑیوں اور ریچھوں کا خطرہ بھی تھا اچانک اسے ہلکی سی آواز سنائی دی پہلے تو وہ اسے اپنا وہم سمجھا لیکن پھر دوبارہ بھی آواز سننے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا وہ ایک چشمے کے پانی بہنے کی آواز تھی جو پہاڑیوں کی طرف سے بہتا آ رہا تھا میکس جانتا تھا اس کا پانی صاف شفاف ہے چنانچہ اس نے چشمے سے پانی پیا اور آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے نیچے پڑے پتوں پر لیٹ گیا پھر اسے نیند آ گئی تھی۔

صبح سورج نکلنے سے کچھ پہلے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی وہ جنگل سے نکل کر سڑک پر آیا تھا اور ایک ٹرک سے لفٹ لے کر اپنے گھر پہنچا تھا جہاں سینٹو اور مرفی موجود تھے اور کچن میں کچھ کام کر رہے تھے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میکس نے ان سے پوچھا۔

''گھر میں ایک حادثہ ہوگیا تھا۔'' مرفی نے کہا اور میکس نے دیکھا ٹی وی لاؤنج میں جہاں جے سن گرا تھا وہاں پیلا ٹیپ لگا ہوا تھا اور قالین پر خون کے دھبے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟'' میکس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ سو رہی ہے میں تمہیں بتاتا ہوں ہم کئی گھنٹے سے تم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے تم کہاں تھے؟'' سینٹو نے پوچھا۔

''میں اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے گیا تھا کیونکہ تمہیں تو اپنے مفرور قیدیوں کی پروا تھی میری بیٹی کی کسی کو فکر نہیں۔'' میکس نے غصے سے کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم گھر میں رہنا اس علاقے میں تحقیقات ہو رہی ہے۔''

''کچھ بھی ہو اب میں واپس آ گیا ہوں تم میرے گھر سے نکلو۔'' میکس نے کہا۔

''جناب آپ ذرا پرسکون ہوجائیں۔'' مرفی نے میکس کو سمجھایا۔

''میری بیٹی کھوئی ہوئی ہے میری ساری زمینوں پر ایف بی آئی کے لوگ ٹہلتے پھر رہے ہیں میرے بیٹے اور میری بیوی کہاں ہیں؟''

''تمہارا بیٹا زخمی ہوگیا ہے اسے ہم نے اسپتال بھیجا ہے اور تمہاری بیوی بیڈروم میں آرام کر رہی ہے۔''

''کیا میرا بیٹا کیسے زخمی ہوگیا؟''

''ایک حادثہ ہوا تھا اس کے ساتھ۔'' مرفی نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے تم اکیلے میں اپنی بیوی سے مل لو یہ زیادہ

Digitized by Google

بہتر ہوگا۔'' سینٹو نے کہا اور اسی وقت جیکسن گھر میں داخل ہوا اس کے دو ہاتھوں میں دو رائفلیں تھی اس نے سیدھا ہاتھ اوپر اٹھایا مجھے یہ رائفل مجھے مسٹر بینک کے بھوسے کے جھونپڑے سے ملی ہے۔'' پھر اس نے دوسرا ہاتھ اوپر اٹھایا اور یہ مجھے اس کے کھیتوں سے ملی ہے جہاں سے لاش ملی تھی یوں لگتا ہے یہ رائفلوں کا جوڑا ہے۔''

''ہاں لگتا تو یہی ہے۔'' سینٹو نے رائفلوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''انہیں میڈیکل ریسرچ سینٹر کو بھیج دو۔''

''تم انہیں نہیں لے جاسکتے..... بھلا یہ کیا بات ہوئی بغیر اجازت میری زمینوں پر گھس آئے ہو اور جو دل چاہے اٹھا کر لے جارہے ہو؟'' میکس نے اعتراض کیا۔

''مسٹر فلینٹ یہ ہمیں جائے حادثہ سے ملی ہیں اور ثبوت کے طور پر انہیں استعمال کیا جائے گا۔'' سینٹو نے جواب دیا۔

''یہ تحقیقات کا حصہ ہیں۔''

''خدا جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میکس نے پریشانی سے کہا اور اسی وقت بیڈروم کا دروازہ کھول کر سارہ باہر آئی اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند تھی اور اس نے نیلا سلیپنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔

''میکس تم کہاں تھے؟'' سارہ نے کہا لیکن میکس اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے غصے میں باتھ روم میں چلا گیا پھر اس نے دروازہ بند کرلیا تھا اور پانی گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔

''وہ پریشان ہے، ہم سب بھی پریشان ہیں۔'' سارہ نے پولیس آفیسرز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم سمجھ سکتے ہیں ہم جلد ہی چلے جائیں گے بس کچھ چیزیں اور ٹمٹالیں اگر تم اجازت دو تو ہم تم سے کچھ سوالات تمہاری بیٹی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں اگر اس کا کوئی رومال کوئی کپڑا مل جائے جس میں اس کی بو رچی ہو کل ہمارے ٹریکنڈ کتے پہنچ جائیں گے ان کی مدد سے ہم اسے تلاش کریں گے۔''

''ہاں میں لاتی ہوں۔'' سارہ نے کہا پھر اس نے میگی کی ایک سفید شرٹ انہیں دی تھی۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں یہاں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔'' سینٹو نے کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں میں خود بھی بہت پریشان ہوں اپنی بیٹی اور بیٹے کی وجہ سے۔'' سارہ نے کہا اور اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔''

''ہم سے جو بھی ہوسکا ہم تمہاری بیٹی کے لیے کریں گے تمہارا بیٹا بھی اسپتال میں خیریت سے ہوگا تم کل جاکر اس سے مل سکتی ہو۔'' سینٹو نے اسے دلاسہ دیا۔

''میں چاہتی ہوں میرا بیٹا جسٹن کچھ آرام کرلے۔'' سارہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کا کوئی فون نمبر ہے تو دیں تاکہ آپ سے بات ہوسکے۔'' سینٹو نے کہا جس پر سارہ نے اسے اپنا اور میکس کا نمبر دے دیا۔

''شکریہ ہم جلد ہی تم سے رابطہ کریں گے..... شب بخیر۔'' سینٹو نے کہا اور گھر سے نکل گیا باہر جیکسن کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں دونوں رائفلیں تھیں اور دوسرے سے فون پکڑے وہ کسی سے بات کررہا تھا۔

''سر ایک اہم خبر ہے۔'' جیکسن نے سینٹو کو دیکھتے ہی کہا۔

''بولو؟''

''اسپتال سے کال آئی ہے جب ہیلی کاپٹر وہاں اترا تو اس میں جے سن نہیں تھا۔'' جیکسن نے کہا تو سینٹو چلتے چلتے رک گیا۔

''اوہ میرے خدا! کیا آج ساری بری خبریں ہی ملیں گی؟'' اس نے افسوس سے کہا۔

''لیکن یہ خبر میں اس وقت اس کے والدین کو سنانا مناسب نہیں سمجھتا۔''

''پھر پھر اب کیا کریں گے؟''

''میں کل شاید انہیں بتادوں ابھی تو وہ لڑکی کے صدمے سے باہر نہیں نکلے۔'' سینٹو نے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁

سفید ہیولے کے لاروے نما خول میں میگی جس پوزیشن میں تھی اسے وقت کا احساس نہیں تھا اس کے ذہن میں اس کے ماضی کے واقعات کسی فلم کی صورت میں چلنے لگے تھے جن میں وہ جھاڑیوں سے بلیک بیریز اور دوسرے پھل توڑ کر کھا رہی ہوتی تھی اور کبھی خوفناک تصورات اسے

Digitized by Google

اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے اس نے اپنی ماں کو گھر میں دیکھا تھا جہاں خون کی بو رچی ہوئی تھی اس نے عجیب و غریب آوازیں سنی تھیں شاید کوئی چیخ رہا تھا وہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا اسے لگ رہا تھا کہ اسے بہت بھوک لگی ہے اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے آخری بار کب کھانا کھایا تھا اس نے تصور میں خود کو کئی بار بلیک بیریز توڑتے دیکھا تھا لیکن اسے ان کا مزہ یاد نہیں آ رہا تھا پھر اس کا خواب ختم ہو گیا تھا اور وہ پھر دوبارہ کچھ سوئی کچھ جاگی پوزیشن میں آ گئی تھی وہ حرکت محسوس کر سکتی تھی شاید وہ خود بھی حرکت کر رہی تھی لیکن اسے شدید پیاس لگی تھی اسے یاد تھا کہ وہ اپنے بیڈ کے قریب رکھی ٹیبل پر ہمیشہ پانی سے بھرا ایک گلاس رکھتی تھی اس وقت اس کے ہونٹ زبان اور حلق خشک ہو رہے تھے اور پانی پینے کی شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁

دوسری صبح سارا سو کر اٹھی تو میکس اس کے قریب ہی بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا سارا اسے ابھی تک میکی کے بارے میں نہیں بتا سکی تھی اسے موقع ہی نہیں ملا تھا میکس جب سے واپس آیا تھا وہ شدید غصے میں تھا رات کو ایک بار سارا نے اٹھ کر بچوں کے بیڈ روم میں جھانکا تھا وہاں پر جسٹن بے خبر سو رہا تھا پھر اچانک اسے باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ سینٹو کے ٹرینڈ کتے وہاں پہنچ گئے ہیں میکی کو ڈھونڈنے کے لیے۔

صبح آٹھ بجے اس کے فون کی بیل بجی تھی اس وقت میکس کچن ہی میں بیٹھا کاغذات ٹائپ کر رہا تھا وہ اکثر اپنے آفس کا کام وہاں بیٹھ کر کرتا تھا۔

"اسپیشل ایجنٹ سینٹو کا فون تھا وہ ابھی یہاں آنا چاہتا تھا۔" سارا نے میکس کو بتایا۔

"اس سے کہہ دو میں مصروف ہوں۔" میکس نے قدرے غصے سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ پھر بھی آئے گا اس نے بتایا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گا وہ کوئی خبر بتانا چاہتا ہے۔" سارا نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جاننا میں اس سے نہیں ملوں گا۔"

"میکس تم اتنے خفا کیوں ہو؟ میں بھی تمہاری طرح پریشان ہوں۔" سارا نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں لیکن تمہارے سر پر دفتر کا کام نہیں لٹک رہا ہے میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں بچوں کی طرف سے پریشان ہوں لیکن مجھے دفتر کا کام بھی وقت پر دینا ہے ورنہ میری نوکری جا سکتی ہے اس سے سینٹو کو کیا فرق پڑے گا؟" میکس نے پھر غصے سے کہا اور سارا تیزی سے چلتی بیڈ روم میں چلی گئی پھر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب سینٹو وہاں پہنچا تھا تو سارا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں وہ شرمندہ شرمندہ سا گھر میں داخل ہوا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں کہ صبح صبح آپ کو تنگ کیا۔"

"کوئی بات نہیں کیا میں آپ کے لیے کافی بناؤں؟"

"نہیں شکریہ۔"

"آپ اندر آ جائیں میکس ابھی باہر گیا ہے۔" سارا نے کہا اور جب سینٹو اندر داخل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ کل جہاں قالین پر خون کے دھبے تھے وہ صاف کر دیئے گئے تھے ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑے بھی اب وہاں نہیں تھے گھر کا سامان قرینے سے رکھا گیا تھا۔

"آج بہت صبح سے میرے آدمی ٹرینڈ کتوں کو لے کر علاقے کا سرچ کر رہے ہیں۔" سینٹو نے بتایا۔

"ہاں میں نے آوازیں سنی تھیں۔"

"کتوں نے تمہاری بیٹی کی بو محسوس کر لی ہے۔ شاید وہ اسی علاقے میں کہیں ہے۔ وہ ابھی تک ہمیں نہیں ملی صرف اس کی بو محسوس کی گئی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق وہ مسٹر بینک کے کھیتوں میں پہاڑی کی ترائی میں موجود سب سے بڑے اور پرانے درخت کے پاس بھی بیٹھی تھی اور وہ اس کے جانوروں کے جھونپڑے میں بھی رہی تھی۔"

"جھونپڑے میں۔" سارا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں جہاں وہ جانور اور بھوسہ رکھتا ہے وہ آخری جگہ ہے جہاں کتوں نے اس کی بو کو محسوس کیا۔" کیا وہ پہلے بھی وہاں جاتی رہی ہے۔"

"مجھے وہ کبھی وہاں نہیں گئی کہیں تمہارے کتے غلطی تو نہیں کر رہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہوتا وہ اس کام کے لیے ٹرینڈ کیے گئے ہیں وہ کبھی غلطی نہیں کرتے۔"

Digitized by Google

"کیا کبھی مسٹر بینک نے بچوں کو ادھر جانے کے لیے ڈانٹا یا منع کیا؟"

"نہیں میں نے انہیں منع کیا ہے میں نہیں چاہتی کہ وہ اپنی شرارتوں سے پڑوسیوں کے لیے مصیبت کھڑی کریں۔"

"اس کے علاوہ کتوں نے میگی کے ساتھ ساتھ کسی اور کی بھی بو وہاں محسوس کی ہے اس جھونپڑے میں میگی کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔" سینو نے کہا۔

"کچھ لڑکے؟"

"نہیں جیل سے فرار ہونے والا مجرم جو کل رات مارا گیا۔ ممکن ہے وہ ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں اور الگ الگ وقت میں وہاں رہے ہوں لیکن ان دونوں کی بو کتوں نے وہاں پائی ہے لیکن پھر بھی میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ کہیں تمہاری بیٹی اور کیلی ایک دوسرے کو جانتے تو نہیں تھے۔"

"مم میں نہیں جانتی۔" سارا نے کچن کی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے تم چیک کرو..... اپنے ملنے والوں سے پوچھو۔" سینو نے کہا۔

"اس بچی کے دوستوں سے بات کرو۔"

"ہاں میں یہ کر سکتی ہوں۔" سارا نے کہا اور اسی وقت میکس گھر میں داخل ہوا۔

"کیپٹن سینو میرا خیال ہے میں غصے سے پاگل ہو جاؤں گا۔" میکس نے غصے سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں میم کاش میں کوئی اچھی خبر سنا سکتا۔" سینو نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل رات میں نے اس چیز کو دیکھا یا شاید میرا خیال ہے کہ وہ وہم ہو۔" سارا نے بات کرنا شروع کی لیکن سینو کی توجہ یکدم میکس کی طرف ہو گئی وہ غصے میں چیخ رہا تھا۔

"تم اسے تحقیقات کا نام دیتے ہو؟ تم نے میرا بچہ کھو دیا اور تم یہاں تحقیقات کر رہے ہو؟"

"میکس آرام سے تم کیا کہہ رہے ہو؟" سارا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"سینو ہمیں کچھ نئی معلومات دینے آیا ہے۔"

"ہاں یقیناً ایسا ہی ہو گا کیا اس نے ابھی تک تمہیں جے سن کے بارے میں بتایا؟ مجھے ابھی ابھی اسپتال سے کال آئی ہے جیسن غائب ہے اسے اسٹریچر پر جس اسٹریپ سے باندھا گیا تھا وہ کٹی ہوئی تھی کل رات جب ہیلی کاپٹر وہاں اترا تو جیسن اس میں نہیں تھا۔ اوہ میرے خدا۔"

"جس وقت میرے بچے کو آپریشن تھیٹر میں ہونا چاہیے تھا اس وقت یہ یہاں تحقیقات کر رہا ہے آخر یہ کیسا آپریشن ہے جو تم لوگ یہاں کر رہے ہو؟" میکس نے غصے میں پوچھا۔

"ہاں مسٹر میکسن مجھے بھی یہ خبر دی گئی تھی لیکن میگی کی تلاش ہم شروع کر چکے تھے یہ خبر ہمیں بعد میں ملی۔"

"بعد میں ملی کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ تمہاری ذمہ داری نہیں؟"

"ذمہ داری ہے لیکن میں پہلے آپ کی بیوی کو یہ بتانے آیا تھا کہ میگی کے بارے میں ہمیں کیا نئی معلومات ملی ہیں ابھی ہم نے جے سن کے کیس کو اس کے ساتھ شامل نہیں کیا۔" سینو نے کہا اور اسے تفصیل بتائی۔

"ابھی شامل نہیں کیا؟ کیونکہ تم بے پروا ہی برت رہے ہو۔"

"نہیں اگر میگی اور کیلی کے معاملے سے لڑکوں کا تعلق نکلا تو اسے شامل کیا جائے گا ہمیں وہاں سے خون کے کچھ نمونے ملے ہیں میں اس سلسلے میں تم سے تعاون چاہتا ہوں۔"

"کیا تعاون؟"

"میگی کا بلڈ گروپ کیا تھا؟"

"AB+" میکس نے کہا۔

"شکریہ۔" سینو نے ڈائری میں نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں موقع سے جو خون کے نمونے ملے ہیں وہ اس گروپ کے ہیں۔" میکس نے پریشانی سے پوچھا۔

"ابھی لائسٹ ہو رہا ہے۔" سینو نے مختصر جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں نے آپ سے جو معلومات مانگی ہیں وہ آپ مجھے کمپیوٹر پر بھیج دیجئے گا یہ میرا ای میل ہے۔" سینو نے ایک چٹ سارا کی طرف بڑھائی۔

Digitized by Google

"ٹھیک ہے۔" سارا نے کہا پھر سینٹو گھر سے باہر نکل گیا تھا اور مسٹر بینک کی زمینوں کی طرف بڑھ گیا تھا جب وہ بینک کے گھاس پھونس کے بنے بڑے سے جھونپڑے تک پہنچا تھا تو بینک گائیوں کا دودھ دوہنے کی تیاری کر رہا تھا جو وہ مشینوں سے نکالتا تھا کچھ ہی دیر میں بینک کی بیوی چائے بنا کر لائی تھی اور سینٹو بینک کے ساتھ چائے پینے میں مصروف ہو گیا تھا ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے کچھ ضروری سوالات بھی پوچھتا جا رہا تھا۔

"کیا میگی اکثر تمہارے اس جھونپڑے کی طرف آتی تھی؟" اس نے بینک سے پوچھا۔

"نہیں ایک بار اس کے بھائی یہاں آئے تھے وہ گائیوں کو پریشان کر رہے تھے پھر جب مسز میکس کو پتہ چلا تو انہوں نے بچوں کو خاصا ڈانٹا تھا اور ان پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ ادھر نہیں آئیں گے تب سے وہ نہیں آئے۔"

"تمہارے جھونپڑے سے کتوں نے مجرم کیلی اور میگی کی بو محسوس کی ہے وہ ٹریند کتے ہیں تم اس بارے میں کیا کہو گے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ہاں کتوں کی آوازیں میں نے ضرور سنی تھیں لیکن تمہیں چاہئے تھا کہ یہاں کتوں کو تحقیقات کے لیے لانے سے پہلے مجھے اطلاع دے دیتے دراصل یہاں میرے خاصے جانور ہیں اور اگر وہ بھڑک جاتے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہوتا۔"

"اگر کیلی یہاں چھپا تھا اور میگی بھی تو تمہیں پتہ نہیں چلا؟"

"نہیں میں صبح گائیوں کا دودھ نکالنے آتا ہوں پھر انہیں چارہ ڈال کر چلا جاتا ہوں اس کے بعد اگلے روز ہی میرا آنا ہوتا ہے میں نے اپنے کام کے لیے ایک آدمی رکھا ہوا ہے وہ میری مدد کرتا ہے اگر کیلی یہاں چھپا تھا یا میگی یہاں آئی تھی تو وہ میرے علم میں نہیں۔"

"تم نے یہاں کسی غیر معمولی چیز کو تو نہیں دیکھا۔" سینٹو نے پوچھا۔

"غیر معمولی؟ کیا مطلب؟"

"وہ سفید ہیولے جیسی ہے ہوا میں یوں چلتی ہے جیسے اڑ رہی ہو اور یوں لگتا ہے جیسے اس کا جسم ہڈیوں سے بنا ہو جب وہ حرکت کرتی ہے تو ہڈیاں بھی ایک دوسرے پر چڑھتی ہیں اور حرکت کرتی ہیں دیکھنے میں کسی لاروے کی طرح لگتی ہے۔" سینٹو نے وضاحت کی کیونکہ اس نے سارہ کے گھر کی کھڑکی سے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔

"نہیں میں نے اسے ویسے تو نہیں دیکھا لیکن ٹی وی پر کل سے اس کی خبریں چل رہی ہیں جن میں وہ عوامی میلے پر دیکھی گئی تھی اور اس نے ایک ٹرک پر حملہ کر دیا تھا پھر وہ دور ہو گئی تھیں۔" بینک نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھلا کیا ایسی بلا بھی ہو سکتا ہے؟"

"بینک یہ بتاؤ تم نے اپنی زمینوں پر کبھی اس بلا سے ملتی جلتی کوئی چیز تو نہیں دیکھی یہاں سے ہمیں دو رانیں بھی ملی ہیں۔" سینٹو نے کہا۔

"گوشت کے ٹکڑے تو یہاں ملتے رہتے ہیں رات کو ریچھ اور بھیڑیے اگر ادھر نکلیں تو وہ چھوٹے جانوروں کو مار ڈالتے ہیں ارے ہاں کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک عجیب چیز نظر آئی تھی۔" بینک نے یوں کہا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔

"کیسی چیز؟"

"میری ایک گائے کے چاروں پاؤں گھٹنوں تک سفید ہو گئے تھے بالکل ایسے ہی جیسے اس ہیولے کی ساخت ہے جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے اسے کوئی پھپھوندی لگ گئی ہو جس نے اس کے پیروں کو ڈھانپ لیا ہو پھر وہ بیمار پڑ گئی اور میں نے اسے شوٹ کر دیا اس کے بعد میں نے کھیتوں ہی میں ایک بڑے گڑھے میں اسے ڈال دیا تھا اگر تم دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتے ہو وہ جگہ اس مقام سے مغرب کی جانب آدھے میل کے فاصلے پر ہے جہاں سے تمہیں لاش ملی تھی۔" بینک نے کہا اور سینٹو اس سے رخصت ہو کر کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔

کھیتوں میں پہنچ کر اسے وہ گڑھا ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور وہاں اسے وہ گائے بھی مل گئی تھی جس کے پاؤں کو سفید رنگ کی پھپھوندی نما چیز چمٹی ہوئی تھی اس نے فون کر کے مرفی کو وہاں بلایا تھا اور اس سے گائے کے پیروں سے کچھ نمونے لینے کے لیے کہا تھا پھر اس نے ہدایت کی تھی کہ ان نمونوں کو نیویارک میں سائنسدان سلویا کو پہنچا دیا جائے وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ پھپھوندی کس قسم کی ہے اور اس کی مشابہت کا سفید ہیولے سے کیا تعلق ہے۔

Digitized by Google

صبح کے سات بجے تھے پہلے تو سلویا کے فون کی گھنٹی بجی تھی اور پھر اس کے دروازے کی بیل وہ حیران تھی آج اس کی چھٹی کا دن تھا اور وہ کسی کے آنے کی منتظر بھی نہیں تھی اس نے دروازہ کھولا اس کے سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا جس نے ایف بی آئی کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا سلویا اسے نہیں جانتی تھی لیکن اس کا چہرہ اس نے ٹی وی پر کئی بار دیکھا تھا وہ ایف بی آئی انچارج سینٹو کا ایک افسر تھا اس نے سوالیہ انداز میں اس شخص کو دیکھا تھا۔

''میں آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں یہ سینٹو نے بھجوایا ہے۔ جو نیویارک میں ایف بی آئی برانچ کے انچارج ہیں۔'' اس سلویا کو دیتے ہوئے کہا ڈبے پر بھی ایف بی آئی لکھا ہوا تھا۔

''ہاں میں نے کل رات ٹی وی نیوز میں دیکھا تھا دو مردہ مجرم پائے گئے تھے آؤ اندر آجاؤ۔'' سلویا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اندر آنے کے بعد ایف بی آئی ایجنٹ نے ایک فارم اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''اس پر بھی دستخط کردیں۔''

''اور کچھ؟'' سلویا نے دستخط کرنے کے بعد پوچھا۔

''ارے ہاں ایک پرچہ بھی ہے آپ کے لیے۔'' اس نے کہا اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیا اور سلویا نے اس لفافے سے نکال کر نوٹ پڑھا اس میں پکس میں موجود سامان کے بارے میں تفصیل اور کچھ ہدایات تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کو آج کی چھٹی قربان کرکے اس ڈبے کے ساتھ آفس جانا ہوگا کیونکہ اس کو جو کام دیا گیا تھا وہ ارجنٹ تھا نوٹ بھی بہت مختصر لکھا گیا تھا۔

''دو رانیں الگ الگ کریں۔'' یہ کام سلویا کے لیے نیا تھا وہ اب مختلف قسم کے کیمیکلز ٹیسٹ کرتی رہی تھی وہ بڑی عجلت میں وہ ڈبہ لے کر اپنے آفس پہنچی تھی اور اس کا گارڈ اسے اتوار کے دن وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''آج تو آپ کے آنے کی توقع نہیں تھی مس سلویا۔''

''ہاں کچھ ارجنٹ کام آگیا ہے۔'' سلویا نے جواب دیا اور اپنی لیبارٹری میں داخل ہوگئی تھی پھر اس نے ڈبا ایک میز پر رکھا تھا اپنا سفید لیب کوٹ پہنا تھا دستانے پہنے تھے اور ڈبہ لے کر اپنی خاص میز پر آبیٹھی تھی ڈبے میں موجود اسے کچھ اور انفارمیشن ملی تھی ایف بی آئی کے سرچ کی کچھ معلومات اور عوامی میلے میں نمودار ہونے والے سفید ہیولوں کی ویڈیو اس نے ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔

سینٹو کسان بینک کے کھیتوں میں ایک درخت کے پاس کھڑا تھا وہ دور سے کسی کو آتے دیکھ رہا تھا اس کے ہاتھ میں گن تھی لیکن جب اس نے مرفی کو پہچانا تو گن واپس ہولسٹر میں لگالی۔

''اگر ایک چھوٹی سی وارننگ دے دی جائے تو ایک زندگی بچ سکتی ہے۔'' سینٹو نے کہا۔

''میں نے تمہیں کال کی تھی لیکن تم نے جواب ہی نہیں دیا۔'' مرفی نے کہا تو سینٹو نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب پر ہاتھ مارا اس کا موبائل فون وہاں نہیں تھا۔

''اوہ شاید جب میں بینک کے بھوسے والے جھونپڑے میں تھا تو شاید فون وہاں گر گیا ہوگا خیر تم بتاؤ کیا بات ہے؟''

''آفس میں ایک کال وصول ہوئی ہے کوئی شخص دھوئی کررہا ہے کہ وہ ان سفید ہیولوں کے بارے میں جانتا ہے کہ ان کا راز کیا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ یہ اس کی غلطی ہے۔''

''کیا کال تم نے خود سنی ہے؟''

''ہاں وہ کوئی فیک کال نہیں ہے وہ یہیں کورننگ میں رہتا ہے میں نے اس کا پتہ لے لیا ہے یہاں سے تیس منٹ کا راستہ ہے۔''

''بہت اچھے بہترین کام تو پھر چلو۔'' سینٹو نے جلدی سے کہا اور مرفی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

سہ پہر کا وقت تھا درختوں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر نیچے زمین پر پڑ رہی تھی وہ جس راستے پر جارہے تھے وہ حد نظر تک جارہا تھا یہ ہرنوں کے راستے پر ہی پگڈنڈی تھی اچانک درختوں میں سے کہیں سے فلیش لائٹ کا جھماکا ہوا۔

''یہ کیا تھا؟'' سینٹو نے فوراً اس روشنی کو محسوس کیا تھا۔

''کیا؟''

''فلش کی طرح کوئی روشنی چمکی تھی۔''

Digitized by Google

"ہوسکتا ہے کہ ہرنوں کے لیے لگائے جانے والے کیمروں میں سے ایک ہو یہاں جگہ جگہ ہرنوں پر نظر رکھنے کے لیے درختوں پر کیمرے لگائے گئے ہیں۔" مرفی نے کہا اور آس پاس کے درختوں پر کیمرہ تلاش کرنے لگا۔

"اوہ..... وہ دیکھو وہ اس درخت پر کیمرہ لگا ہے۔" مرفی نے ہاتھ کے اشارے سے سینٹو کو دکھایا ایک چھوٹا سا کیمرہ ایک ٹیپ کے ذریعے پائن کے درخت سے بندھا ہوا تھا مرفی نے آگے بڑھ کر کیمرے کے لینس کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا تو فلیش لائٹ پھر چمکی۔

"ہم م م م..... اگر تمہاری اور میری فوٹو بن سکتی ہے تو اس پر اور تصویریں بھی بنی ہوں گی۔" سینٹو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

پھر بینک کے فارم سے کورنگ تک آتے انہیں پینتالیس منٹ لگے تھے مرفی کارڈ رائیو کر رہا تھا اسی وقت اس کے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف سے سلویا بول رہی تھی۔

"میں سلویا بول رہی ہوں۔ ہیلو۔"

"ہاں تمہیں کیا ملا؟" مرفی نے پوچھا سینٹو اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے مزید معلومات ملنے پر مجھے ایک بیل دے دینا۔" مرفی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" سینٹو نے پوچھا۔

"ران پر سے خون کے جو نمونے ملے ہیں وہ لڑکی کے ہیں اور ڈی این اے مضروب مجرم کیلی کا ہے۔"

"او کے۔"

"اور ایسا لگتا ہے جیسے ران پر کسی چیز کی کوٹنگ ہوا بھی اسے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کس چیز کی کوٹنگ ہے وہ بعد میں کال کرے گی۔"

"کورنگ میں پائپر اسٹریٹ پر انہیں 72 نمبر اپارٹمنٹ جلد ہی مل گیا تھا اور فلیٹ نمبر دو کے دروازے پر مرفی نے دستک دی تھی ایک لمبے نوجوان نے دروازہ کھولا تھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں یوں لگتا تھا جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔

"جی؟"

"مسٹر کیمپس میں مرفی ہوں اور یہ اسپیشل ایجنٹ سینٹو کچھ دیر پہلے ہماری بات ہوئی تھی ہم تم سے ایف بی آئی پر کی جانے والی کال کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔" مرفی نے کہا اس کے ساتھ ہی مرفی اور سینٹو نے اپنے آئی ڈی کارڈ اس کو دکھائے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے اندر آجائیں پلیز۔" کیمپس نے کہا۔

وہ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے لیونگ روم میں آگئے تھے جہاں ہر طرف اخبار و رسائل پھیلے ہوئے تھے کیمپس اپنے ساتھ انہیں اپارٹمنٹ کے پچھلے حصے میں بنے کچن میں لے گیا تھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا اس نے مرفی اور سینٹو کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"تو مسٹر کیمپس تمہارا کہنا ہے کہ سفید ہیولوں کو تم نے تخلیق کیا ہے جو پچھلے دنوں ملبے پر نظر آتے تھے۔" کیا اس بارے میں تم ہمیں کچھ بتانا پسند کرو گے؟" مرفی نے کہا تو کیمپس منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔

"کیا تم نے جو کہا وہ دوہراؤ گے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔" سینٹو نے کہا۔

"میں اسے لیب سے گھر اٹھا لایا تھا۔"

"تم لیب سے کوئی چیز گھر لے آئے تھے۔ تم کیا لائے تھے؟"

"وہ ایک کیمیکل تھا۔" کیمپس نے کہا بات کرتے ہوئے وہ نشے میں لگ رہا تھا اور کچن کی ٹیبل پر ایک شراب کی خالی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔

"کس لیب سے؟"

"اسکول کی سائنس لیب سے۔"

"کیا تم کسی کلاس کو کوئی اضافی تجربہ کروا رہے تھے؟"

"نہیں نہیں میں وہاں لیب اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔"

"کیا تم ہمیں اس لیب تک لے جا سکتے ہو؟"

"او نہیں اب میں وہاں کام نہیں کرتا۔"

"کیوں کیوں نہیں کرتے؟"

"مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"میں شیشے کے سامان کو اچھی طرح نہیں دھوتا تھا۔"

"ذرا اس بات کی وضاحت کرو گے؟" سینٹو نے کہا۔

"میں شیشے کے سامان کو اچھی طرح اسٹرلائز نہیں کرتا تھا چنانچہ ہر کسی کے تجربے میری وجہ سے خراب ہو جاتے تھے وہ

Digitized by Google

میری تنخواہ سے جرمانہ کاٹ لیتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ میں سارے ہفتے کی ان کی محنت برباد کردیتا ہوں۔"
"یہ تو بہت بری بات تھی۔"
"ہاں میری باس مجھ سے تنگ تھی اور میرا خیال ہے وہ مجھے نوکری سے نکالنا ہی چاہتی تھی۔"
"لیکن وہ بھلا تمہیں نوکری سے کیوں نکالنا چاہتی تھی؟"
"شاید وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی۔"
"تم یہاں کیسے آئے؟"
"مجھے کمیونٹی کالج سے یہاں منتقل کیا گیا تھا۔"
"تمہاری عمر کیا ہے؟"
"اس سال سینئرز میں شمار ہوں گا۔"
"گویا جب تمہیں یہاں منتقل کیا گیا تو تم جونیئر تھے لیکن تم اکیس سال سے بڑے لگتے ہو۔"
"ہاں میں ستائیس سال کا ہوں مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں اچھا خاصا وقت لگا ہے۔"
"یہ واقعہ کب ہوا تھا کیمیکل والا۔" سینٹو نے پوچھا۔
"پچھلے سال جب مجھے منتقل کیا گیا تھا میں کام کرکے پڑھتا تھا اور مجھے میرے ایک دوست کی وجہ سے ملازمت ملی تھی۔"
"جب تمہیں ملازمت سے نکالا گیا تو کیا پھر تمہیں دوسری نوکری ملی؟"
"ہاں مجھے ایک بک اسٹور پر نوکری ملی تھی۔"
"کیا یہ نوکری بہتر تھی؟"
"ہاں قدرے بہتر تھی۔" کیمپس نے کہا سینٹو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا گواہ کافی کم گو ہے لیکن یہ ان کا واحد چانس تھا اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
"مجھے اس کیمیکل کے بارے میں بتاؤ جو تم لائے تھے۔"
"میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھا بس دیکھنے میں اچھا لگ رہا تھا وہ چمکدار تھا سفید اور چمکدار اور وہ مجھے ضائع کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔"
"اوکے۔"
"میری باس شروع میں میرے ساتھ بہت ٹھیک تھی وہ اکثر مجھے چیزوں کے بارے میں بتاتی تھی کہ کونسی چیز کا کیا نام ہے وہ کہاں استعمال ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ مجھے مائیکرو اسکوپ میں بھی چیزیں دکھا دیتی تھی۔"
"تمہاری ذمہ داریاں کیا تھیں؟"
"لیب کی صفائی کرنا کیمیکل نکال کر دینا مکس کرنا میزوں کی صفائی کرنا اور ڈشیں اور شیشے کا سامان دھونا۔"
"اور جس دن تم کیمیکل لے کر آئے اس دن تم کیا کر رہے تھے؟"
"میری باس نے پریکٹیکل ختم کیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ تجربہ ناکام رہا تھا چنانچہ وہ کیمیکل ضائع کردوں۔"
"کیمیکل کیسے ضائع کرتے تھے؟"
"نیچے تہہ خانے میں بھٹی لگی تھی اس میں جلا دیا جاتا تھا۔"
"کیا تم پہلے بھی کبھی بھٹی تک گئے تھے؟"
"ہاں پہلے دن جب میری باس نے وہ جگہ مجھے دکھائی تھی اور ایک بار خود اس جگہ کو یاد رکھنے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔"
"تم کیمیکل کو بھٹی میں ڈالنے کے بجائے گھر کیوں لے کر آئے تھے؟"
"وہ بیکر میں بہت خوب صورت لگ رہا تھا سفید اور چمکدار بالکل لاوا لیمپ کی طرح میں جب سگریٹ پیتا تو اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور سوچتا تھا کہ ایسی چیز کسی کے پاس نہیں ہوگی۔"
"حالانکہ تمہاری باس نے خطرناک کیمیکلز کو ضائع کرنے کی ہدایت کی تھی۔" سینٹو نے کہا۔
"ہاں......" اس نے شرمندگی سے کہا۔
"جو کیمیکل تم لاتے تھے اس کے بارے میں تم کیا جانتے تھے؟"
"زیادہ نہیں میں نے دیکھا تھا کہ میری باس اس کیمیکل کے ساتھ بیکٹیریا کا ٹیسٹ کرتی تھی اور وہ کیمیکل ان کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔"
"وہ کیا کرتا تھا؟"
"وہ انہیں موٹا اور مضبوط بنا دیتا تھا۔"
"اور موٹا اور مضبوط؟"
"ہاں اس کا یہی کہنا تھا وہ ان کی خلیوں کی دیوار کو موٹا کر دیتا تھا لیکن وہ اندر زندہ رہتے تھے۔"

Digitized by Google

''اس کیمیکل کا مقصد کیا تھا؟''

''میں زیادہ نہیں جانتا بس میں اندازے سے ہی بتا سکتا ہوں۔''

''اچھا تو بیکٹریاز میں بہت معمولی سے تبدیلی ہوتی تھی چنانچہ تمہاری باس نے اسے ضائع کروانے کا فیصلہ کیا تھا؟''

''ہاں۔''

''اور جب تم لیب سے واپس آ گئے تو کیا ہوا؟''

''میں واپس لیب نہیں گیا میں گھر چلا گیا۔ میں نے فون کر کے بتایا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھٹی کے پاس جانے کی وجہ سے چنانچہ میں گھر آ گیا ہوں۔''

''اچھا تو تم اس کیمیکل کو گھر لے آئے پھر تم نے اس کا کیا کیا؟'' سینٹو نے پوچھا لیکن کیمپس نے جواب نہیں دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا کہ میلے میں نظر آنے والے سفید ہیولوں کا تعلق اس کیمیکل سے ہے؟'' مرفی نے پوچھا۔

''اس ہیولے کی سفید چمکدار تہہ کی وجہ سے۔'' کیمپس نے کہا۔

''ہاں ہاں آگے بولو۔'' مرفی نے اسے مزید اکسایا۔

''میں نے اس کیمیکل کو ایک چوہے پر ڈالا تھا۔''

''تو کیا ہوا تھا؟''

''وہ ایسا ہی ہو گیا تھا جیسے میلے پر وہ ہیولے نظر آ رہے تھے لیکن وہ سائز میں چھوٹا تھا لیکن اس پر کانٹے نہیں تھے لیکن سفید چمکدار تھا اور وہ حرکتیں بھی انہی کی طرح کر رہا تھا۔''

''حرکتیں کیا مطلب؟''

''جیسے وہ پاگل ہو غصے میں ہو۔ وہ میری بلی کے پیچھے سارے لان میں بھاگتا رہا تھا اور پھر بلی بھاگ گئی تھی لیکن چوہا بھی اس کے پیچھے کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا میں نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت تیز رفتار تھا۔''

''اچھا تو چوہا بھاگ گیا۔'' پھر تم نے باقی کیمیکل کے ساتھ کیا کیا؟''

''وہ میرے پاس اب بھی ہے۔'' کیمپس نے کہا اور اپنی کرسی کے نیچے سے ایک کالا پلاسٹک کا تھیلا نکالا جس میں سے ایک بیکر نکال کر سامنے رکھ دیا سینٹو حیرت سے مرفی کو دیکھ رہا تھا جو اپنی جیبوں میں پلاسٹک کے دستانے تلاش کر رہا تھا۔

''میری کار میں ایک بیگ ہے۔'' سینٹو نے مرفی کو بتایا اور وہ باہر جا کر کار میں سے ایک کالے رنگ کا بڑا پلاسٹک کا بیگ لے آیا پھر اس نے وہ بیکر بیگ میں رکھ لیا تھا جس میں اب بھی سفید چمکدار کیمیکل موجود تھا پھر مرفی نے اسے سیل کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر مزید ضرورت ہوئی تو تم سے سوالات پوچھنے کے لیے رابطہ کریں گے تمہارا شکریہ کہ تم نے ہم سے رابطہ کر کے یہ معلومات دیں۔'' سینٹو نے کہا اور کیمپس کے گھر سے نکل گئے۔

''ہمارے پاس سفید ہیولے ہیں ہمارے پاس یہ کیمیکل ہے اور ہمارے پاس ایک ایسا شخص بھی ہے جس کا خیال ہے یہ سب اس نے ہی شروع کیا تھا۔'' مرفی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم ایک چیز بھول رہے ہیں۔'' سینٹو نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ بینک نے ہمیں گائے کے بارے میں کیا بتایا تھا؟ اس نے بتایا تھا کہ گائے کے پیروں پر سفید پھپھوندی جیسی چیز لگی تھی۔''

''گویا جب یہ کیمیکل کسی جاندار انسان یا جانور پر عمل کرتا ہے تو انہیں کمبل کی طرح ڈھک لیتا ہے۔'' مرفی نے کہا۔

''اور اس کے اندر وہ جاندار زندہ رہتا ہے۔'' سینٹو نے اضافہ کیا۔

''بالکل بیکٹریا کی طرح وہ بیرونی سطح ڈھانپ لیتا ہے وہ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ چیزوں کو موٹا بنا دیتا ہے۔'' مرفی نے کہا۔

''چنانچہ اگر یہ ایک انسان پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ ان کو مکمل کور کر لیتا ہے سر ہاتھ پاؤں سارا جسم۔'' سینٹو نے کہا وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''اوہ میرے خدا وہ سفید ہیولے۔''

''کہیں وہ فلیٹ کے دونوں بچے تو نہیں ہیں؟'' مرفی نے حیرت اور خوف سے کہا۔

Digitized by Google

سارا فلیٹ نے دستک سن کر دروازہ کھولا تھا تو سینٹو سامنے ہی کھڑا تھا۔

"مجھے افسوس ہے ایک بار پھر میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں میرا مقصد پریشان کرنا نہیں بلکہ میں کچھ اہم باتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ اندر آ جائیں۔" سارہ نے اداسی سے کہا۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ میرے بچوں کے سلسلے میں کوئی پرامید خبر لائے ہوں گے۔"

"ہم اس سلسلے میں تحقیقات کر رہے ہیں آپ جانتی ہیں کہ جیل سے فرار ہونے والے دونوں مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں وہ فائل بند ہو گئی ہے لیکن اب میلے میں نظر آنے والے سفید ہیولوں کے سلسلے میں تحقیقات ہو رہی ہے۔" سینٹو نے کہا اور ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے میکس فلیٹ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بھلا سفید ہیولوں سے ہمارے بچوں کا کیا تعلق آفیسر سینٹو تم ہمیشہ غلط سمت میں ہی تحقیق کیوں کرتے ہو؟" میکس کے لہجے میں ناگواری تھی سارا نے سینٹو کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میکس ہمیں سینٹو کی بات سن لینا چاہئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں سن رہا ہوں۔" میکس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کل ہم لوگ بینک کی زمینوں پر بہت اندر مغرب کی جانب نکل گئے تھے جہاں درختوں پر جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"ان کیمروں میں اس علاقے میں حرکت کرنے والے جانوروں انسانوں کی تصویر بن جاتی ہیں ان میں یقیناً ان سفید ہیولوں کی تصویریں بھی بنی ہوں گی جو اس علاقے میں کثرت سے نظر آ رہے ہیں۔" سینٹو نے کہا۔

"تو اس سلسلے میں تم نے کیا کیا؟" بھلا تصویروں سے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟" میکس نے پھر اعتراض کیا۔

"میکس تم کچھ دیر چپ تو رہو سینٹو کو بات پوری کرنے دو۔" سارا نے کہا اسے یکا یک اس ہیولے کا خیال آیا تھا جو اس کے گھر میں آ گیا تھا اور سارا نے اس کے اندر اپنی بیٹی میگی کا چہرہ دیکھا تھا لیکن اب تک کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ سب اس بات کو جھوٹ سمجھیں گے اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اور وہ خود بھی اکثر یہ سوچتی تھی کہ کہیں یہ اس کا وہم ہی نہ ہو اب تک کئی لوگوں نے ان سفید ہیولوں کو دیکھا تھا لیکن کسی نے بھی ایسی کوئی شکایت نہیں کی تھی کہ انہیں ان ہیولوں میں کسی کا چہرہ نظر آیا ہو۔

"میں کل بینک کے بھوسے کے جھونپڑے میں بھی گیا تھا اور بینک سے ملا تھا اس نے بتایا کہ ایک سال پہلے اس کی ایک گائے ایک عجیب بیماری سے مر گئی تھی اس گائے کے چاروں پیروں میں ایک ہی رات میں سفید پھپھوندی سی لگ گئی تھی اور وہ بیمار ہو گئی تھی دو دن اس کی یہی حالت رہی بینک نے اسے گولی مار کر زمینوں پر کھدے بڑے سے گڑھے میں ڈلوا دیا تھا میں اس جگہ گیا وہاں سے کچھ سفید پھپھوندی کے نمونے مجھے مل گئے اور میں نے سائنسدان ریسرچ کو وہ نمونے بھجوا دیئے ان میں تمہاری زمینوں سے ملنے والی دونوں رانیں بھی تھیں جن میں سے ایک تمہاری زمین سے ملی تھی اور دوسری بینک کے جھونپڑے سے۔"

"پھر؟" میکس نے جلدی سے پوچھا اب گفتگو میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"مجھے سائنسدان ریسرچ کا فون آیا تھا اس نے بتایا کہ اسے ران پر اے بی پوزیٹو خون کے نمونے ملے ہیں جو میگی کے بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ بھی پتہ چل چکا ہے کہ میگی اس جھونپڑے میں چھپی تھی۔"

"اوہ میرے خدایا۔" سارا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میری میگی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟"

"ہماری تحقیقات کے مطابق وہ اسی علاقے میں کہیں ہے لیکن ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔" سینٹو نے کہا۔

"اب آگے تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میکس نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہمیں ایک اور فون بھی آیا تھا۔" سینٹو نے کہا۔

"کیسا فون؟" اس بار سارا نے پوچھا تھا۔

"وہ کیمپس کا فون تھا وہ اسی علاقے کا رہائشی ہے اس کا خیال ہے کہ ان سفید ہیولوں سے اس کا کچھ تعلق بنتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میکس کے انداز میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی تھی۔

Digitized by Google

''اس کا کہنا ہے کہ ایک سال پہلے وہ ایک اسکول میں لیب اسسٹنٹ کی ملازمت کرتا تھا جہاں سے اس نے لیب سے ایک کیمیکل چرایا تھا جو سفید چمکدار کلر کا تھا اور اس کی صلاحیت تھی کہ وہ کسی بھی جاندار چیز کے اوپر اپنا خول چڑھا دیتا تھا لاروے کی طرح۔'' سینٹو نے کہا اور سارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اوہ میرے خدا میں نے تمہیں پہلے کیوں نہیں بتایا..... کہیں دیر نہ ہوگئی ہو۔'' سارا بے اختیار رونے لگی تھی۔ ''اگر میگی کو کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔''

''کیوں؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' سینٹو نے پوچھا میکس بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''جس روز جے سن زخمی ہوا اور کیلی مارا گیا اس روز ایک سفید ہیولا ہمارے گھر میں بھی آ گیا تھا اور جے سن کو اسی نے زخمی کیا تھا اس کے بازو نوکدار تھے جن کی مدد سے اس نے جے سن کو زخمی کیا تھا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''اس ہیولے کو تو میں نے بھی کھڑکی کے باہر سے دیکھا تھا لیکن بس ایک لمحے کے لیے جب کیلی گولی کھا کر گرا تھا تب وہ ہیولا مجھے ایک لمحے کے لیے نظر آیا تھا وہ تمہارے سامنے کھڑا تھا تم حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں پھر دوسرے ہی لمحے تم بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں اور وہ ہیولا باہر نکل کر جنگل میں غائب ہوگیا تھا جب میں اندر آیا تو جے سن قالین پر زخمی پڑا تھا۔'' سینٹو نے کہا۔

''ہاں اور تم جانتے ہو آفیسر جب میں پھٹی پھٹی نظروں سے ہیولے کو دیکھ رہی تھی تو مجھے کیا نظر آ رہا تھا؟'' سارا نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا نظر آ رہا تھا؟'' میکس نے پوچھا۔

''جہاں اس ہیولے کا منہ ہونا چاہیے وہاں ایک سوراخ نمودار ہوا تھا اور پھر بڑھتے بڑھتے وہ چھ انچ کا ہوگیا تھا اس کے اندر مجھے ایک انسانی چہرہ نظر آیا جو میری طرف دیکھ رہا تھا پھر اس کی آواز بھی میں نے سنی۔

''مجھے بچاؤ۔'' سارا نے کہا۔

''وہ میری میگی تھی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔'' سارا پھر رونے لگی۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ کہیں تم میگی کے غم میں پاگل تو نہیں ہوگئی ہو بھلا اس ہیولے سے ہماری میگی کا کیا تعلق؟'' میکس نے سارا کو سمجھاتے ہوئے کہا اسے سارا کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

''میں نے اب تک اسی لیے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی کیونکہ کوئی بھی میرا یقین نہیں کرے گا لیکن مجھے بتاؤ کہ سارا کوز میں نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ وہ اچانک کہاں غائب ہوگئی؟'' سارا نے کہا اس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

''اس کیمیکل کے بارے میں جاننے کے بعد میرا بھی یہی شک تھا اب تمہاری بات سے تصدیق ہوگئی ہے۔'' سینٹو نے کہا۔

''آج دوپہر تک انشاء اللہ مزید بہتر پیش رفت ہوگی۔'' سینٹو جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا۔

''اب اگلا قدم تم کیا اٹھانے والے ہو؟'' میکس نے اس سے پوچھا۔

''سب سے پہلے میں جنگل میں موجود کیمروں کی تصاویر حاصل کروں گا اور ان کی روشنی میں اگلا قدم اٹھاؤں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' میکس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں خود تمہیں ہر خبر سے آگاہ رکھوں گا۔''

''مجھ سے اب گھر میں بیٹھا نہیں جائے گا تم جانتے ہو میں پہلے بھی ایک پوری رات اپنی بیٹی میگی کی تلاش میں جنگل میں گزار چکا ہوں۔ میں نے وہاں کچھ آوازیں بھی سنی تھیں لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ قریب ہی چشمے سے نکلنے والی ندی بہہ رہی تھی میرا خیال تھا کہ وہ آوازیں ادھر سے ہی آئی ہوں کی کوئی جانور پانی پینے آیا ہوگا یا پانی میں گرا ہوگا۔ میں نے خود بھی اس ندی سے پانی پیا تھا۔'' میکس نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے لیکن تم موقع پر اترو گے نہیں بس گاڑی میں بیٹھ کر دور ہی سے دیکھو گے۔'' سینٹو نے ہدایت کی۔

''مجھے منظور ہے۔'' میکس نے جلدی سے کہا۔

پھر سینٹو نے کام کی رفتار بڑھادی تھی چشم زدن میں ایف بی آئی کی کئی ٹیمیں موقع پر پہنچ گئی تھیں جنہوں نے

Digitized by Google

درختوں پر موجود کیمروں سے ریکارڈ حاصل کرلیا تھا اس مقصد کے لیے ایک بکتر بند گاڑی نما وہیکل ان کے پاس تھی جس میں تمام تر آلات نصب تھے اور چند منٹوں ہی میں انہیں سفید ہیولوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

پچھلے ایک ہفتے میں وہ ہیولے کثرت سے ان علاقوں میں نظر آرہے تھے وہ پہلے ایک تھا لیکن پھر دو ہوگئے تھے وہ اکثر راتوں کو نظر آتے تھے اور زیادہ تر ندی کے مقام سے نظر آنا شروع ہوتے تھے اور وہیں آکر غائب ہوجاتے تھے۔ سینٹو نے ان تصاویر کو محفوظ کروالیا تھا اور اپنے عملے کو ہدایت کردی تھی کہ وہ اس ندی میں جال بچھا کر اس کی تہہ سے جو بھی حاصل ہو پکڑنے کی کوشش کریں۔"

"لیکن ندی تو بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔" جیکسن نے کہا۔

"ہاں لیکن ہم پہلے ان مقامات پر ہی جال ڈالیں گے جو تصاویر میں ان ہیولوں کے حوالے سے کثرت سے استعمال کیے جارہے ہیں۔" سینٹو نے جواب دیا پھر اس نے فشریز کے محکمے سے رابطہ کرکے اس کے ماہر فشر مین بلوائے تھے جو اپنے سامان کے ساتھ آئے تھے اور فوراً ہی کام شروع کردیا گیا تھا۔

شام تک وہ تین مقامات پر جال ڈال چکے تھے لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا آخری بار انہوں نے بینک کے علاقے میں موجود ندی کے حصے میں جال ڈالا تھا جو ندی کے اور مقامات کی نسبت زیادہ گہرا تھا وہ جال بھی بہت بڑا تھا اور کافی بڑے علاقے کو کور کررہا تھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس میں کوئی بڑی مچھلی پھنسی تھی اور اسے باہر کھینچا گیا تھا لیکن وہ بہت بھاری تھا چنانچہ سینٹو کی ہدایت پر اسے کرینوں کی مدد سے کھینچا گیا تھا جب وہ اوپر آیا تو اس میں درختوں کے پتوں سیپوں مچھلیوں کے ساتھ ساتھ سفید رنگ کے ہیولے بھی تھے جو روشنی میں چمک رہے تھے اس جال کو یونہی ایک بڑے ٹرک کی اندر ڈال کر لاک کردیا گیا تھا اور ٹرک نیو یارک کی طرف روانہ ہوگیا تھا سینٹو موقع پر عملے کے دوسرے افراد کی ڈیوٹیاں لگا کر خود بھی ٹرک کے پیچھے روانہ ہوگیا تھا۔ میکس اور مرفی اس کے ساتھ اس کی کار میں موجود تھے۔

❖ ...... ❖ ...... ❖ ...... ❖

صبح تین بجے کے قریب دونوں سفید ہیولوں کا آپریشن مکمل ہوا تھا اور میکی کے ساتھ جے سن کو بھی انتہائی نگہداشت کے شعبے میں پہنچا دیا گیا تھا ان کے آکسیجن لگی تھی اور وہ بے ہوش تھے اسپتال کے اندر سارا جٹ سن اور میکس ایف بی آئی کے عملے کے ساتھ موجود تھے اور باہر الیکٹرانک میڈیا کے لوگ اپنے کیمروں اور گاڑیوں کے ساتھ جمع تھے سب کی یہی کوشش تھی کہ اس واقعہ سے متعلق کسی بھی شخص کے ساتھ ان کا رابطہ ہوجائے لیکن ان سب میں پیش پیش جینٹ تھی جو سب سے پہلے خبر بریک کرچکی تھی کہ جیل سے مفرور دوسرے ساتھی کے مرنے کے وقت سب سے پہلے سفید ہیولا دیکھنے والی وہ پہلی صحافی خاتون ہے اس نے بھی موقع سے ہیولے کو فرار ہوتے دیکھا تھا لیکن اس کی تصویر نہیں بنا سکی تھی کیونکہ اس وقت وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی اور حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

سلویا بھی اسپتال کے اندر کیمپس کے ساتھ موجود تھی جس نے ریسرچ کے بعد ثابت کردیا تھا کہ سفید ہیولوں میں میکی اور جٹ سن ہوسکتے ہیں پھر کیمپس سلویا سارا اور سینٹو کے ساتھ ساتھ بینک کے بیانات کی روشنی میں اس بات کو تقویت ملی تھی کہ سفید ہیولوں کا آپریشن کیا جائے جو کامیاب ہوگیا تھا اور ہیولوں کے اندر سے دونوں بچے برآمد ہوئے تھے۔

آپریشن کے ایک ہفتے بعد دونوں بچوں کو جنٹ ہی نے سب سے پہلے اپنے ٹی وی چینل پر دکھایا تھا اور ان کا انٹرویو پیش کیا تھا اسے ایک بار پھر اہم ترین خبر بریک کرنے کا موقع مل گیا تھا کہ میکی کس طرح اپنے دونوں بھائیوں کی چھوٹی سی شرارت کے باعث ایک سفید ہیولے میں تبدیل ہوگئی تھی اور علاقے میں خوف و ہراس کا سبب بنی تھی جب کہ اس حقیقت سے وہ خود بھی واقف نہیں تھی۔

❖

Digitized by Google

آسیب

ماہ رخ ارباب

انسانی ذہن کے اسرار سمجھنے میں آج تک کوئی مکمل طور پر کامیاب نہ ہوپایا ہے کس وقت کون سی چیز اس کے ذہن کو کس نہج پر ڈال دے اور وہ کوئی ایک کلیہ جو تمام انسانوں پر لاگو کیا جاسکے اسے تلاش کرنے کی کوشش میں سب ہی ناکام ہوئے انسانی ذہن کے اتھرے گھوڑے کو قابو کرنے کی کوشش میں مادی و غیر مادی طاقتوں کی جدوجہد کا احوال۔

سارہ نے جھک کر اوون میں لکڑیوں کو اوپر نیچے کیا اور ایک تشویش سے بھری نظر تیزی سے کم ہوتے لکڑیوں کے ذخیرے پر ڈالی۔ اس موسم میں جب ہر چیز پر برف کی دبیز تہہ جمی ہو جلانے کے قابل خشک لکڑی تلاش کرنا شکار کرنے سے زیادہ مشکل تھا۔

اوران برستی گولیوں کے درمیان ایسی حالت میں جب باہر نکلنے والا زندہ واپس آنے کی امید رکھے بغیر نکلتا ہو شکار کرنا یا اشیائے خورد و نوش مہیا کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

کئی دن سے وہ اس تباہ حال مکان میں قید ذخیرہ کیے ہوئے اناج تھوڑے سے خشک گوشت اور لکڑی کے تیزی سے خرچ ہوتے ڈھیر کے ساتھ حالات سدھرنے کے منتظر تھے مگر دھماکوں کی دن بدن قریب ہوتی آوازیں بتا رہی تھیں اتحادی افواج نازیوں کو روکنے میں ناکام ہو رہی ہیں وہ تیزی سے قریب آرہے ہیں اور ان کے مکمل قبضے کے بعد وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے یہ تصور کرنا بھی محال تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ان کے انتہائی نزدیک ہوا تھا۔ پہلے سے خستہ حال در و دیوار اس دھماکے سے لرز اٹھے لکڑی کی چھت کے درمیان لٹکتے سیمنٹ اور اینٹوں کے ٹکڑے زور! آواز کے ساتھ زمین بوس ہونے لگے تھے۔ ٹیبل کے گرد کھانا بننے کے انتظار میں بیٹھے تینوں نفوس نے اس اچانک ہونے والی پتھروں کی بارش سے بچنے کے لیے میز کے نیچے پناہ لی۔

سارہ نے بھاگ کر ایک کرسی اپنے اوپر تان لی تاکہ کوئی اینٹ یا پتھر کا کوئی ٹکڑا سر زخمی نہ کردے۔ اس کسمپرسی کے عالم میں جہاں رزق بھی ناپید ہو وہ بیمار یا زخمی ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

کچھ دیر میں اینٹوں اور دھول مٹی کی بارش تھمی تو گبریل نے سب سے پہلے سر ٹیبل کے نیچے سے نکالا وہ اس گھر کا سربراہ تھا گھر کو بچانے والے نقصان سے زیادہ اسے اپنی بیوی سارہ اور دس سالہ بیٹے کو ہن کی فکر تھی۔

اس نے باہر نکل کر کوہن اور پھر اپنے بھائی کو نکلنے میں مدد دی۔ رافیل اسی کی طرح مضبوط جسامت کا مالک نوجوان تھا اور ان نامساعد حالات میں گبریل کو اس کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنی بیوی اور کم سن بیٹے کو چھوڑ کر باہر نہ جا پاتا۔

کھانے کی ٹیبل مٹی اور بڑے بڑے پتھروں سے بھری

Digitized by Google

ہوئی تھی کی پلیٹیں چکنا چور ہو چکی تھیں چھت میں پڑے شگاف جنہیں پوری طرح مرمت بھی نہ کیا جاسکا تھا مزید کھل چکے تھے۔

اور ان شگافوں سے چھت پر موجود برف فرش پر گر کر پگھلنے لگی تھی کمرے کا درجہ حرارت جو پہلے ہی کچھ زیادہ نہیں تھا تیزی سے نیچے گرنے لگا تھا گبریل نے کوبن کو ہاتھ بغلوں میں دیے کانپتے دیکھا تو کمرے سے اس کا گرم کوٹ لانے چلا گیا۔

حیرت انگیز طور پر دیگچی میں پکتا دلیہ اس طوفان گرد و غبار سے محفوظ رہا تھا بس اس کے ڈھکن پر کچھ مٹی لگی تھی۔

جب تک گبریل کوٹ لایا سارہ دلیہ پلیٹوں میں نکال چکی تھی۔ رافیل نے ٹیبل کی مٹی ایک طرف ڈھیر کر دی۔

اور کھانا اس خاموشی سے کھایا گیا جیسے کسی کی مرگ کی خبر ابھی ابھی سنی گئی ہو۔

کھانے کے بعد دونوں بھائیوں نے باہر نکل کر چھت کا جائزہ لیا اسے مرمت کرنے میں کئی دن لگ جاتے وہ بھی نارمل موسم میں اس برف باری میں اسے مرمت کرنا ناممکن تھا۔

دونوں خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گئے۔

"کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟"

رافیل نے اس مرگ آسا خاموشی کو توڑتے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں یہاں سے جانا ہوگا کچھ دن اور یہاں رہے تو نکلنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ ہمارے پاس کھانے کو بس اتنا ہے جو قریبی قصبے تک پہنچنے میں ساتھ دے سکے۔"

اس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو وہ قصبہ سلامت رہا ہوگا۔ یہ نزدیک ترین دھماکے تمہیں کسی انہونی کی خبر نہیں دے رہے؟"

"اس برف باری اور خراب موسم میں ہم کئی کلومیٹر کا

Digitized by Google

سفر بھی نہیں کر سکتے جبکہ گھوڑے بھی اتنی شاندار حالت میں نہیں ہیں۔

"اگر وہاں پہنچ کر بھی اجڑا ہوا قصبہ اور تباہی ہی دیکھنی ہے تو بہتر ہے ہم یہیں رہیں۔ کم سے کم یہاں امید تو ہے کہ جلد ہی جنگ بند ہو گئی تو ہم خوراک لا سکیں گے سارہ اور کوہن ایسا سفر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔"

لیکن اس گھر میں گزاری گئی اس رات نے گبریل پر ثابت کر دیا کہ اس کا مکان میں رکنے کا فیصلہ غلط تھا ایک زوردار دھماکے سے مکان کا ایک حصہ منہدم ہو گیا اگر وہ نچلے ہال میں نہ ہوتے تو یقیناً کسی جانی نقصان کا بوجھ اٹھا چکے ہوتے۔

گبریل اس واقعے سے لرز کر رہ گیا تھا اس کے لیے یہ سوچنا بھی اذیت ناک تھا کہ اس کے بیٹے یا بیوی کو اس کے کسی فیصلے کے نتیجے میں نقصان اٹھانا پڑتا۔

صبح سویرے تمام ضروری سامان باندھ لیا گیا۔

یہ مکان گبریل کے دادا کا تھا جو نسل در نسل وراثت میں منتقل ہوتا اس تک پہنچا تھا مگر کچھ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس دوسروں سے بقدر ضرورت بھی چھین رہی تھی۔

اس نے نکلنے سے پہلے گھوڑوں کو خوراک اور پانی پلا کر اچھی طرح سیر کر دیا تھا۔

برف باری بند تھی مگر آسمان پر چھائے سرمئی بادل اگلی برف باری جلد متوقع ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

ان کا مکان قصبے سے کافی دور کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ مرکزی سڑک پر چلتا وہاں سے گزرنے والے فوجیوں کی نظر میں آنا تھا اور کئی دن سے گھر میں قید انہیں بالکل نہیں معلوم تھا باہر دوستوں سے واسطہ پڑے گا یا دشمنوں سے۔

گبریل نے بائیں ایک ہاتھ سے سنبھال کر بھی کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا سارہ ایک ہاتھ سے گرم شال لپیٹے دوسرے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو دبوچے بیٹھی تھی وہ خوبصورت مگر مضبوط جسامت کی حامل تھی جنگ شروع ہونے سے پہلے کھیتوں میں وہ اپنے شوہر اور دیور کے ساتھ برابر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

انہیں چلتے کافی دیر ہو چکی تھی مگر قریبی قصبے کے آثار ابھی تک ناپید تھے شاید پختہ سڑک سے ہٹ کر کچا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے فاصلہ بڑھ گیا تھا۔

جنگل کے اندر اس نے گھوڑے کھول دیے وہ سخت موسم میں ان پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

آزاد ہو کر گھوڑوں نے ہنہنا کر خوشی کا اظہار کیا تو وہ ان کا سر تھپتھپاتا رافیل کے پاس آ بیٹھا جو آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا برف باری پھر شروع ہو چکی دوپہر کے وقت بھی جنگل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا جتنی دیر میں رافیل نے آگ جلائی سارہ نے خشک گوشت کے پارچے نکال کر گبریل کے حوالے کیے۔ خاموشی سے قہوہ اور خشک گوشت کے بھنے ہوئے پارچے حلق سے اتارے گئے۔

گبریل ایک طرف بیٹھا رافیل کو بھی میں گھوڑے جوتتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اسے درختوں میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اچانک ایک خیال نے اسے جھٹکے سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تیزی سے اپنی لکڑی کاٹنے والی کلہاڑی ہاتھوں میں تھامتا وہ بیوی اور بیٹے کے سامنے ڈھال بنکر کھڑا ہو گیا۔

"ہمیں جلدی کرنی ہوگی رونی یہاں بھیڑیے ہیں۔ تم دونوں بھی میں جاؤ۔" اس نے اٹھل پھل ہوتی سانسوں سے دونوں کو بھی میں دھکیلا اور جلد ہی اس کا خدشہ درست ثابت ہوا پہلے وہ سیاہ بھیڑیا غراتی سانسوں کے ساتھ باہر آیا اس کے پیچھے دو اور۔

وہ یقیناً بہت بھوکے تھے ان کی خونخوار آنکھوں کی چمک سے گھوڑے بھی بدکنے لگے تھے۔ رافیل نے تیزی سے گاڑی پر سوار ہو کر لگام تھام لی اگلے سیاہ بھیڑیے نے جیسے ہی جست لگائی گبریل کی کلہاڑی ہوا میں گھومی، ایک برق سی لہرائی اور سیاہ بھیڑیا لہراتا ہوا درخت سے جا ٹکرایا۔

خون آلود کلہاڑی کو سنبھالتا گبریل تیزی سے بھی میں سوار ہوا اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

مگر کم خوراکی کا شکار گھوڑے جلد ہی اپنی رفتار کھونے لگے تھے اور تب ہی ایک عجیب بات ہوئی خرخراتی سانسوں کے ساتھ پیچھا کرتے ہوئے بھیڑیے بھی کے نزدیک پہنچ چکے نگر اس سے پہلے کہ وہ زقند لگا کر اوپر آ پاتے فائرنگ کی زوردار آوازوں سے پورا جنگل لرز اٹھا اتنے گھنے درختوں کے درمیان یہ معلوم کرنا بھی مشکل تھا کہ فائرنگ کا مرکز اور نشانہ کیا ہے۔

بھیڑیے زخمی ہوئے یا نہیں مگر ان سے پیچھا ضرور چھوٹ

Digitized by Google

گیا۔

سکون کی یہ لہر بھی عارضی ثابت ہوئی جلد ہی کسی گاڑی کے انجن کی غراہٹ اور روشنی سے انکار رہا سہا سکون بھی جاتا رہا

آرمی جیپ کی طرف سے دیا گیا کاشن اتنی دور سے سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ کونسی زبان ہے نہ ہی جیپ کا رنگ اور اس پر لکھی تحریر پڑھنے کے قابل تھی رسک کسی صورت لینا مناسب نہیں تھا۔

اور تب ہی گھبرائے ہوئے رافیل نے وہ غلطی کی۔اس نے تیزی سے دوڑتی کوچ کو سیدھے راستے سے ہٹا کر گھنے جنگل میں موڑنے کی کوشش کی گھوڑوں نے اچانک رخ بدلا تو گاڑی کا پہیہ کسی پتھر پر آیا اور ایک ٹاپے کو وہ ہوا میں ہی معلق رہ گئی اس کے بعد ایک جھٹکے سے برفیلی زمین پر گری۔

گبریل نے خود کو ہوا میں پرواز کرتا محسوس کیا اور سہارے کے لیے کچھ تھامنے کی غرض سے ہاتھ پیر چلائے لیکن وہاں سوائے ہوا میں تیرتے برفیلے ذرات کے کچھ نہیں تھا درخت کے تنے سے ٹکرانے سے پہلے آخری منظر جو اس نے دیکھا وہ تیزی سے آگے نکلتی ہوئی گاڑی کا تھا۔

☆.....☆.....☆

زوردار لگنے والے جھٹکے سے گبریل بگھی سے گر گیا تھا مگر رافیل گاڑی روکنے پر قادر نہیں تھا جیپ کی ہیڈ لائٹس ابھی بھی جنگل کے کچھ حصے کو روشن کیے ہوئے تھی مطلب وہ ابھی بھی اس کے پیچھے تھے اپنے بڑے بھائی کو ممکنہ دشمن کے حوالے کر دینے کا فیصلہ بہت مشکل تھا مگر یہ ایسا ہی تھا

جیسے کوئی جان بچانے کیلیے اپنا خوراک کا ذخیرہ بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دے۔

اس نے تین جانیں بچانے کے لیے بھائی کی قربانی دینا گوارا کیا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا بگھی کے اندر موجود نفوس کس حال میں ہیں بس اندھا دھند گاڑی بھگاتے ہمیشہ کا دیکھا بھالا جنگل اس وقت ان کے لیے ایک بھیانک خواب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وہاں سے جلد از جلد نکلنا اس وقت اسکی اولین ترجیح تھا۔

درخت بتدریج چھدرے ہونے لگے اور گہرے سیاہ اندھیرے کی جگہ سرمئی روشنی سی پھوٹنے لگی تو اس نے راہیں ڈھیلی چھوڑ دیں نڈھال جانور دلکی چال چلنے لگے۔

قصبے کے چرچ کا مینار سامنے ہی موجود تھا۔

لیکن وہاں موجود سناٹا کسی انہونی کا احساس جگانے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اسے یاد آیا کہ آج انہیں برف باری شروع ہونے سے پہلے گھر کی چھت مرمت کرنی ہے لیکن اٹھنے کی کوشش میں جسم نے مدد کرنے سے انکار کر دیا جسم پر جیسے کئی ٹن وزن دھر دیا گیا ہو۔

وہ ساکت پڑا جسم کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا گردن گھما کر دیکھنے سے جو چھت نظر آئی وہ اس کے بیڈ روم کی ہرگز نہیں تھی اور پھر اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ جنگل میں وہ کس طرح بگھی سے لڑھک کر باہر جا گرا تھا۔

وہ اس وقت ایک پختہ عمارت کے ٹھنڈے فرش پر چت پڑا تھا۔

جانے کتنی دیر سے کھڑکی سے آتی مدھم روشنی سے وقت کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ سہ پہر ہے یا ڈھلتی شام یا پھر صبح اسے یاد آیا کہ وہ کس برے طریقے سے درخت سے ٹکرایا تھا اگر ٹھنڈے فرش پر لیٹنے سے جسم سن نہ ہوتا تو وہ درد سے کراہ رہا ہوتا۔

کچھ دیر کی کوشش اور قوت ارادی کے استعمال سے وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔

اسے سارہ اور اپنے بیٹے کی فکر ہونے لگی تھی جنگل سے یہاں تک پہنچ آنے کا مطلب تھا کہ وہ سب جیپ برداروں سے بچ چکے تھے

لیکن اسے یہاں لانے کے بعد وہ تینوں غائب تھے۔

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا ایک کونے میں بیڈ دوسرے کونے میں رکھی ٹیبل اور کرسی اس نے آنکھوں کو مسل کر دیکھا لکڑی کی میز پر ایک پیالہ رکھا تھا۔اس نے قریب جا کر کھڑکی سے باہر دیکھا وہ اس وقت قصبے کی ہی ایک عمارت میں موجود تھا۔باہر برف آلود سڑک پر کسی قسم کی چہل پہل مفقود تھی۔

قصبے سے ہر قسم کے زندگی کے آثار ناپید تھے وہ انسانوں کا مسکن نہیں بلکہ کوئی اجڑا ہوا کھنڈر معلوم ہو رہا تھا جس کے مکانات گردش زمان و مکان میں بھی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہ گئے تھے۔ٹانگ میں تکلیف کے یکدم بڑھتے احساس

Digitized by Google

سے مغلوب آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے اس نے لکڑی کی کرسی سنبھال لی رائفل اور سارہ کی طرف سے اتنی دیر کی خاموشی اسے الجھن اور خوف میں مبتلا کرنے لگی تھی۔

وہ پیالہ منہ تک نیم گرم دلیے سے بھرا تھا اس کا مطلب انہیں یہاں سے گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

بے صبری سے اس نے پہلا نوالہ منہ میں لیا اور پھر پیالہ خالی ہونے تک اس کا ہاتھ منہ سے پیالے کے درمیان گردش کرتا رہا۔

پیٹ بھرنے پر وہ آہستہ سے کرسی سے کھڑا ہو گیا ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا وہ ایک طویل راہداری تھی جس میں دونوں جانب کمرے بنے تھے اور تب اسے یاد آیا یہ بڑے قصبے کا واحد اسپتال تھا جس کی عمارت پختہ اینٹوں سے بنی تھی ورنہ تمام مکانات کھپریل کی چھتوں والے تھے۔

اس نے کمروں کا جائزہ لینے کا ارادہ بعد پر اٹھا رکھا اور پھر گھسیٹتا ہوا بستر پر جا گرا۔

دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ بہت واضح تھی

اس نے دھیرے سے ایک قدم اندر رکھا وہ اونچی ایڑھی کا زنانہ جوتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ سیاہ لبادے میں لپٹا وجود کمرے میں داخل ہوا بوسیدہ لباس اور نقاب میں چھپا چہرہ جس سے بس آنکھوں کی چمک کبھی کبھی ایک جھلک دکھلا کے غائب ہو جاتی باہر شام کا سرمئی اندھیرا جیسے ایک جگہ ٹھہر گیا تھا نہ گھٹتا تھا نہ بڑھتا تھا۔

اس نے دراندار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر ہاتھ پیر جیسے نادیدہ رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے گبریل نے گھبرا کر پورا زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

وہ سیاہ پوش اس کے نزدیک پہنچ کر خاموشی سے اس کی جدوجہد ملاحظہ کرتی رہی۔

اور اچانک جست لگا کر اس کے اوپر آ بیٹھی

نقاب ہٹنے سے اس کا چہرہ واضح ہو گیا

گوشت سے خالی گال ڈھیلوں سے محروم گہرے سوراخ اور بڑے بڑے دانت۔ گبریل نے خوف کی شدید لہر سے لڑتے اس کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور آزمائی شروع کر دی مگر محض آنکھوں سے آنسو ہی نکلے

اس پر سوار ڈھانچے نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے۔ منحنی ہاتھوں میں تھاما زنگ آلود خنجر تیزی سے نیچے آیا۔

گبریل نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

کہ اچانک اس کا جسم اس نادیدہ دباؤ سے ایک جھٹکے سے آزاد ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا

دہشت اور خوف کا پہلا دور گزرنے پر اس نے دائیں بائیں نگاہ گھمائی کمرا اسی طرح بند تھا جیسے وہ کر کے لیٹا تھا۔ شاید پریشان خیالی تھی اس نے خود کلامی کی

بہرحال اب ان تینوں کو ڈھونڈنا ضروری ہے۔ وہ ٹانگ کے دوبارہ لٹمانے والے درد کو دباتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

قصبے میں چھایا غیر فطری سناٹا اور دہشت انگیز خاموشی ان کو خوفزدہ کرنے لگی تھی سارہ نے مضبوطی سے کوہن کا بازو تھام لیا بچے نے کسمسا کر ماں کو دیکھا مگر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ رائفل نے بھی ایک عمارت کے سامنے روک دی جس پر لگا پب کا بڑا سا بورڈ بتا رہا تھا کہ یہاں انہیں اشیائے خورد و نوش اور سستانے کی جگہ ضرور مل جائے گی اس چھوٹے سے قصبے میں ہوٹل نام کی کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس نے گھوڑوں کو کھول کر ان کی لگامیں نزدیکی پول سے باندھ دیں۔ وہ گبریل کو گرا چکا تھا یہ بات اس نے سارہ کو بتا دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس بات کا نوے فیصد امکان تھا کہ وہ مارا جائے دیوانوں کی طرح ان کا پیچھے کرنے والے دوست ہرگز نہیں تھے۔ مگر وہ جانتا تھا ایسی بات کہنے کے بعد اسے ان دونوں ماں بیٹے کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا اس لیے وہ ان کی امید قائم رکھنا چاہتا تھا۔ سارہ اور کوہن کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔

سارہ آس پاس کا جائزہ لینے لگی خوف اور صدمے کے پے در پے جھٹکوں نے اس کے جسم کی تمام توانائی نچوڑ لی تھی جیسے۔ پورا قصبہ ایک جامد سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا جنگ کے دنوں میں ویسے بھی روشنیاں جلانے کی اجازت نہیں تھی مگر زندہ انسانوں کی موجودگی اپنا احساس دلا ہی دیتی ہے۔ گھومتے گھومتے اس کی نظر ایک کنکریٹ سے بنی مضبوط عمارت پر پڑی یہ قصبے کا اسپتال تھا مگر اسے دوبارہ بنایا گیا تھا یہ پہلے اس قدر مضبوط نہیں تھا۔

اچانک اسے ایسا لگا کوئی جاندار تیزی سے ایک مکان

Digitized by Google

کے پیچھے غائب ہوا ہے۔

اس نے آواز دینے کا خیال یکلخت ترک کیا وہ جو کوئی بھی تھا اگر ان کے سامنے آنا چاہتا تو چھپتا کیوں۔ رائیل بار کے دروازے پر نمودار ہوا اور انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر باہر کی بہ نسبت ماحول کچھ بہتر تھا وہاں کی ترتیب اور صفائی بتا رہی تھی بار کو انسانوں سے خالی ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا۔

"بار میں کوئی بھی نہیں میں اندر تک دیکھ آیا ہوں البتہ کمرے موجود ہیں جہاں ہم ریسٹ کر سکیں"

رائیل نے باہر سے سامان اندر لاتے ہوئے اسے اطلاع دی اور وہ بس تھکی تھکی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ خود کو بہت سنبھال کر کھڑی تھی مگر حقیقت میں شوہر سے اس طرح اچانک محرومی اس کے وہم و گمان سے پرے تھی وہ خوب سارا رونا چاہتی تھی لیکن بیٹے کا خیال اسے بکھرنے سے روکے ہوئے تھا۔ اس طرح اس کی غیر موجودگی میں یہ جگہ استعمال کرنا مناسب تو نہیں مگر وہ آیا تو اسے سمجھا لیں گے میں سامان رکھتا ہوں تم جب تک کھانے کا کچھ تیار کیوں نہیں کر لیتیں۔ وہ مسلسل بول رہا تھا شاید اسکی توجہ بٹانا چاہتا تھا۔ "ٹھیک ہے میں بناتی ہوں۔" وہ کچھ ہچکچائی۔ "مجھے ایسا لگتا ہے میں نے باہر کسی کو دیکھا۔" وہ یوں گویا ہوئی جیسے اپنی بات سے خود بھی بے یقین ہو۔

رائیل کچھ دیر پر سوچ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں ہر حال میں محتاط رہنا ہوگا میں گھوڑوں کو کسی عمارت کے اندر باندھتا ہوں۔ تم لوگ کمرے میں جاؤ۔"

کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تو سارہ بھی خاموشی سے اندر بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے بستر سے اٹھ کر اپنے اعصاب کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور باہر نکلا ایک لائن میں کل چھ کمرے تھے اگر دن کی روشنی ہوتی تو وہ آسانی اندازہ لگا لیتا کہ باہر کا راستہ کس طرف ہے مگر ڈھلتی ہوئی شام دھندلکے میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا جبکہ کہیں کوئی روشنی بھی موجود نہ تھی۔

وہ اندازے سے دیواریں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا ساتھ ہی بآواز بلند وہ سارہ اور روفی کی صدائیں بھی بلند کرتا رہا۔

اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا مگر ساتھ ہی گبریل کی آنکھیں کافی حد تک اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ تب ہی اس نے وہ عفریت اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

☆.....☆.....☆

سارہ اس وقت قہوہ کا مگ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی غیر ارادی طور پر وہ ہر آہٹ پر دروازے کی طرف اس آس پر دیکھتی تھی کہ شاید گبریل نے انہیں ڈھونڈ لیا ہو۔ رائیل شاید بار میں شدید سردی سے لڑنے کا سامان کرنے پہنچ گیا تھا۔

کوہن اس کے برابر میں لیٹا ہوا تھا اور تب ہی وہ بھیانک انسانی چیخ ان کی سماعتوں سے ٹکرائی اس نے جلدی سے مگ برابر میز پر رکھا اور جوتے چڑھانے لگی۔ اسے یقین تھا رائیل نے بھی یہ آواز سنی ہوگی۔

اس کے یوں بوکھلانے کی وجہ ایک عجیب خیال تھا کہ وہ آواز اس کے شوہر کی آواز جیسی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ عفریت چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے چھت اور دیواروں پر انتہائی برق رفتاری سے دوڑتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا اس کی مکروہ صورت بہت واضح نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی آنکھوں کے مردوں جیسے سفید ڈھیلے دیکھ سکتا تھا طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک اور لپلپاتی زبان کے ساتھ وہ کسی بھی ذی ہوش انسان کو پاگل کر سکتا تھا جبکہ گبریل تو پہلے ہی شدید قسم کی ذہنی و جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی اور تب ہی اس کا پیر کسی شکنجے میں آیا تھا اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بہت اندوہناک تھی۔ اس نے سہارے کے لیے کچھ تھامنا چاہا اور ہوا میں ہاتھ لہراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سارہ نے جلدی جلدی کوہن کو گرم کپڑوں میں لپیٹا گبریل کو اس کی مدد کی ضرورت ہے یہ خیال ہی اس میں بجلی بھر رہا تھا رائیل اپنی کلہاڑی اور گن سنبھالے ایک طرف کھڑا تھا اس کے ماتھے پر پڑی شکنیں اس کے اندرونی اضطراب اور کشمکش کی غماز تھیں وہ چیخ اس نے خود نہ سنی ہوتی تو کبھی اس طرح باہر نہ نکلتا لیکن اکلوتے بھائی کے زندہ بچ جانے اور مصیبت میں مبتلا ہونے کا خیال رسک اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

Digitized by Google

سارہ کو باہر جانے سے روکنے کی حتی الامکان کوشش کے بعد اس نے اسے بھی حفاظت کے لیے کہیں سے ایک خنجر ڈھونڈ کر دیا تھا۔

باہر منجمد کر دینے والی سردی اور اندھیرے میں گبریل کو ڈھونڈنا ایک ناممکن سا عمل تھا جب تک دن کی روشنی نہ ہوتی وہ اتنی ساری عمارتوں میں اسے کیسے ڈھونڈتے لہٰذا انہوں نے ترتیب وار یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا گاؤں کی سب سے پہلی عمارت ایک رہائشی مکان تھا۔ رائیل نے دعا کی کہ دروازہ بند نہ ہو۔ ایسا لگتا تھا گاؤں کے مکین کسی ناگہانی سے بچنے کے لیے افراتفری میں کہیں رخصت ہوئے تھے کہ دروازے بند کرنے کا خیال تک نہ آیا انہیں۔ رائیل نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور کچھ دیر وہیں کھڑا سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ دل کڑا کر کے اور اندر گیا سارہ کو بن کے ساتھ اس کے پیچھے لگی رہی۔

پورا مکان کھنگالنے کے باوجود وہ گبریل تو کجا کسی آدم زاد کا سراغ تک نہ پا سکے۔

اس مکان سے اگلی منزل وہ اسپتال تھا جس کا مرکزی دروازہ مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا اور دیواریں کنکریٹ کی اس چھوٹے سے قصبے میں ایسی مضبوط عمارت کا ہونا بذات خود اچنبھے کی بات تھی۔ رائیل نے کلہاڑا مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

عمارت کے اندر چھائے اندھیرے میں وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑے رہے آنکھوں کو گھور اندھیرے سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا۔ وہ عمارت بھی دوسری عمارتوں کی طرح ویران لگ رہی تھی وہ جہاں کھڑے تھے وہ کوئی بڑا سا ہال تھا جس میں جگہ جگہ موجود بیولے یقیناً وہاں موجود سامان تھا۔ بظاہر ویران نظر آتی اس عمارت میں خود کو دیکھے جانے کا ایک نامانوس سا احساس انہیں پریشان کرنے لگا تھا۔ گبریل کی وہ چیخ بھی انہیں اپنی سماعت کا دھوکا لگنے لگی تھی۔ اور تب ہی انہیں ایک اور بھیانک چیخ اندر کی طرف سے سنائی دی۔

☆.....☆.....☆

اسے کچھ احساس نہیں تھا وہ کتنی دیر غافل رہا وہ سیاہ پوش دوبارہ سے اس کے سینے پر سوار مسلسل ایک ہی بات کہتی رہی۔

"اگر اس جہنم سے نکلنا ہے تو مار دو اپنی تکلیف کا سبب بننے والے ہر شخص کو قتل کر دو۔" جب آنکھ کھلی تو وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں ڈوبی چھت کو تکتا رہا ان جملوں کی تکرار سے بچنے کے لیے اس نے سر جھٹکا نقاہت کے عالم میں یہ معمولی سی حرکت بھی عذاب لگی۔ پنڈلی میں ہونے والی تکلیف پر اس نے جھک کر پیر کی طرف دیکھا پینٹ کا پائنچہ خون سے تر تھا مگر سردی کی وجہ سے خون بہنا بند ہو چکا تھا۔

اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور لڑکھڑا کر دوبارہ گر پڑا۔

"لعنت ہے۔" وہ غرایا۔

"تم لوگ مجھے نہیں مار سکتے، میں گبریل ہوں تم لوگ مجھے نہیں ڈرا سکتے تم جو کوئی بھی ہو کوئی بھوت بدروح۔"

"میں تمہیں بتاؤں گا میں کون ہوں۔"

چلا چلا کر اس کا گلا بیٹھ گیا تو وہ ایک پیر گھسیٹتا ہوا تیزی سے باہر نکلا غصے نے اس میں عجیب طاقت بھر دی تھی۔

غصے میں تلملاتے اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ اس اندھیرے میں کچھ بھی ڈھونڈنا کارِ دارد تھا لیکن اپنی ہیئت کے سبب آتش دان فوراً اس کی نظر میں آیا۔

انگارے کریدنے والی سلاخ ایک بہتر ہتھیار کا کام دے سکتی ہے۔ اس نے خود کو مضبوط سا محسوس کیا۔

"اب میں تمہارا سامنا کر سکتا ہوں بزدلو۔" وہ پھنکارا۔

"قتل کر دو۔" کسی نے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔

"دفع ہو جاؤ میرا پیچھا چھوڑ دو۔" وہ دیوانوں کی طرح ہوا میں سلاخ گھمانے لگا اور تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ یکدم ساکت ہوا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا اس نے سلاخ ہاتھ میں تھامی اور باہر نکلا۔ کسی بھی دشمن سے لڑنے کے لیے اس کا ذہن پوری طرح تیار تھا۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتا سنا؟ تم ناکام ہو گئے....." اس نے پھر نادیدہ دشمن کو چڑایا۔ اسے یقین تھا وہ اسے دیکھ رہے ہیں تاکہ ڈرا سکیں اسے لمحہ بہ لمحہ موت کے منہ میں دھکیل سکیں۔ نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں نظر آئیں۔ تو وہ تیزی سے ادھر لپکا۔

☆.....☆.....☆

گبریل کی ایک چیخ بلند ہوئی اور اس کے بعد پھر سناٹا

Digitized by Google

چھا گیا۔ وہ یقیناً کسی بڑی مصیبت میں تھا اور اسے آواز دے کر وہ اپنے دشمنوں کو محتاط نہیں کر سکتے تھے رافیل انتہائی تیزی مگر خاموشی سے قدم بڑھا رہا تھا ہال میں کچھ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں مگر پہلے نیچے اسے ڈھونڈنا بہتر تھا اندھیرے میں ڈوبی آسیب زدہ عمارت میں اندر کسی ممکنہ دشمن کی موجودگی میں گھسنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ لیکن اس وقت انہیں خوف سے زیادہ گبریل کی عافیت کی فکر تھی۔

بیرونی سیڑھیوں سے سیدھا چلتے ہوئے باہر سے آنے والی روشنی کا ہلکا سا انعکاس موجود تھا لیکن اندر موجود گھمبیر اندھیرے میں قدم بڑھانا بھی دشوار تھا۔ رافیل نے سارہ کو پیچھے سے محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے بچے کو درمیان میں رکھا اور آگے بڑھنے لگا سیدھے ہاتھ پر موجود کمرا کھلا ہوا تھا اور وہاں کسی کے چھپنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ وہ آفس نما بہت مختصر سا کمرہ تھا۔

اس کی تلاش میں وقت ضایع کرنے کے بجائے انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا آگے چلتے ہوئے رافیل کے قدموں سے اچانک زمین نکلی تھی جیسے، منہ سے عجیب سی آوازیں نکالتا وہ لڑھکتا ہوا تیزی سے نیچے گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اچانک سامنے آنے والی سیڑھیاں گبریل کے لیے امید کی ایک کرن ثابت ہوئیں۔ دیوار کا سہارا لیتا وہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ دماغ پر چھاتی دھند کو جھٹکنے کے لیے وہ بار بار آنکھیں میچتا اور زور زور سے سانس لینے کی کوشش کرتا۔

سامنے ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو دن میں روشنی سے منور ہوتی ہوگی مگر اس بھیانک سرد رات میں ایک جہنم سے دوسرے جہنم کا دروازہ تھی اسے۔ ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھ کر باہر کی تازہ ہوا سینے میں بھرنے کی کوشش میں تیز سرد ہوا نے جیسے سینے میں برچھیاں اتار دیں۔ اندر تک منجمد کر دینے والی اس ہوا سے بچتا وہ کھانستا ہوا تیزی سے پیچھے ہٹا اور تب ہی اندھیرے میں دوڑتا ہوا ایک ہیولہ اسکی نگاہ کی زد میں آیا۔

"مارو اپنے دشمن کو۔"

پھر ایک تیز سرگوشی کان میں گونجی۔

"ضرور۔" اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ چمکی۔ اب اس نے سرگوشی سے بھاگنا ترک کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس سے بھاگ نہیں سکتا بس اس سرگوشی کے مالک کو ڈھونڈنا تھا اسے۔

لیکن اپنے اس ارادے کی خبر وہ دشمن کو ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا اسے کس منزل پر رکھا گیا تھا وہ اندھیرے میں اندازے سے ٹٹول کر تمام سیڑھیاں پار کر گیا۔ اب اس کے حساب سے یا تو سامنے دروازہ ہوتا یا سیدھے ہاتھ پر مزید سیڑھیاں۔

اس نے پہلے سامنے جانے کا فیصلہ کیا لیکن دائیں طرف سے آتی کچھ مبہم آوازوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور رخ بدلتا وہ ادھر ہو لیا۔ اندھیرے میں چمکتی اس کی آنکھیں کسی بھیڑیے کی آنکھوں سے مشابہہ تھیں۔

☆.....☆.....☆

رافیل سارہ کی آنکھوں سے اچانک اوجھل ہوا تھا۔ پہلے پہل تو وہ ہکا بکا سی کھڑی صورتحال سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پہلا خیال اسے یہی آیا کہ کسی نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد نیچے سے آنے والی اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ زندہ ہے اور ٹھیک ہے۔

تو وہ بھی نیچے اترنے لگی۔

رافیل کے سامنے اگر ہنستا مسکراتا گبریل آ کھڑا ہوتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس مکمل بلیک آؤٹ میں عمارت کے اندر جلتی روشنی سے ہوئی وہ ایک کمرہ تھا جس کے دروازے کی درزوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی طویل راہداری جس کے ایک طرف کمرے بنے تھے جن میں سے دو کمروں میں یقیناً کوئی موجود تھا شاید اس قصبے کے رہائشی۔

اس نے سوچا۔

مگر انہیں کسی کو اغوا کرنے اور تشدد کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ گبریل کہیں سے بھی غیر ملکی نہیں لگتا تھا۔ اس کے نقوش اور خاص دیہاتی انداز میں بولی گئی پوش کسی کو بھی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ کئی برسوں سے یا پیدائش سے پولینڈ کا شہری تھا لیکن اگر گبریل یہیں تھا تو اسے ان قصبے والوں سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

اس نے کوہن اور سارہ کو اوپر بنے کمروں میں سے ایک میں چھپا دیا اور خود دوبارہ نیچے آیا کہ اچانک بھاری قدموں کی چاپ سن کر وہ اندھیرے میں جیسے دیوار کا حصہ بن گیا۔ وہ جو

Digitized by Google

کوئی بھی تھا ان کی موجودگی سے بے خبر تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا اس نے تیزی سے نووارد کو چھاپ لیا ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند رکھنے اور دوسرے ہاتھ سے اسے قابو کرنے کے چکر میں وہ شاید اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تب ہی سارہ وہاں تائید غیبی بن کر آئی اس نے کسی چیز سے آنے والے کا سر زور سے بجایا اور وہ انشا غفیل ہو گیا۔ زمین پر پھینک کر رائیل نے غور سے اسکا جائزہ لیا۔

اور تب اس پر ایک بھیانک انکشاف ہوا۔ وہ شخص وردی میں ملبوس تھا رائیل نے اس کی زمین پر گری ہوئی ٹوپی تلاش کی اور کمروں سے باہر آتی روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔

ٹوپی پر بنا سواستیکا کا نشان یہ بتانے کیلئے کافی تھا کہ اندر کمروں میں موجود افراد کا تعلق کہاں سے ہے۔ جن نازیوں سے بچنے کے لیے وہ اس قدر مصائب برداشت کرتے رہے وہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اس سپاہی کو باہر آئے کافی دیر ہو چکی تھی اب جو بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا وہ اس طرح خاموشی سے ان کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سپاہی کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں ڈالا اور اسی کی شرٹ سے اس کے ہاتھ باندھ کر بقیہ حصہ اس کے منہ میں گھسیڑ دیا جبکہ پینٹ پیر باندھنے کے کام آئی اگر اسے بروقت کھولا نہ جاتا تو وہ ہٹ کٹا سپاہی سردی سے ویسے ہی مر جاتا۔ اس کا کوٹ رائیل نے چڑھا لیا۔

اس نے پہلے دروازے کی کنڈی چیک کی مگر وہ موجود ہی نہیں تھی زیر لب لعنت بھیجتا ہوا آگے بڑھا اور دوسرے دروازے کی کنڈی لگانے میں کامیاب رہا یہ بس ایک غیر ارادی حرکت تھی ورنہ کنڈی دونوں کمروں کے مکینوں کے آپس میں بات کرنے میں ہرگز حائل نہ ہوتی۔ وہ بس ایک گولی سے کنڈی کو پورا اکھاڑ دیتے۔ اس نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا وہاں ایک کرسی موجود تھی۔ کمرہ بظاہر خالی تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور تب ہی دو پیر بالکل اس کے سامنے آ رکے۔ وہ بے ساختہ پیچھے ہٹا۔

وہ قدم چند ثانیے بعد رخ بدل کر دوسری طرف نکل گئے۔

اس نے کمرے کو یونہی بند رہنے دیا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہاں سارہ پہلے سے نظر جمائے لیٹی تھی۔

"یہاں تین لوگ ہیں اندر اور مستقل مصروف ہیں۔ کسی ٹیبل کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ کہیں۔" اس کی بات سسکی میں ادھوری رہ گئی۔

"بہتر ہو تم کو بن کے پاس رہتیں۔"

"میں یہیں رہوں گی اگر انہوں نے میرے شوہر کے ساتھ کچھ برا کیا ہے تو میں انہیں اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچاؤں گی۔"

رائیل اس کی سرگوشی نما بات سن کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

اسی وقت دروازے کی طرف کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ رائیل جو اندر داخل ہونے کے لیے تیار کھڑا تھا گھبرا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا سارہ کو بازو سے گھسیٹ کر اسے بھی دیوار سے لگا دیا۔ دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی تو اس نے کلہاڑے والا ہاتھ سر سے بلند کر لیا۔

☆.....☆.....☆

سیڑھیوں سے نیچے اتر کر آگے بڑھنے کا ارادہ ایک طرف سے آنے والی مبہم سی آوازوں نے بدل دیا اب گبریل کا رخ دائیں جانب نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا لیکن اس سے پہلے ایک مختصر کمرہ تھا اور وہ غراہٹ کی آوازیں اسی طرف سے آ رہی تھیں۔

اس نے چکراتے سر کو ایک ہاتھ سے تھاما اور آہستگی سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ اس بار بھیڑیے بن کر حملہ آور ہوئے تھے اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔

"اس بار تم مجھ پر حملہ نہیں کر سکتے بزدلو۔" وہ غراتا ہوا اس انسان نما بھیڑیے پر حملہ آور ہوا جو اندھیرے میں جانے کس شے پر دانت نکوس رہا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے کی شاید اس درندے کو بالکل امید نہیں تھی وہ یکدم ہی جیسے پلے کی طرح اس کے پیروں میں گر کر لوٹنے لگا۔

گبریل نے سلاخ سر سے بلند کی اور بنا دیکھے پلے کے جسم میں گھونپ دی اس کے منہ سے دہاڑ کے بجائے ناقابل فہم سی غوں غاں جیسی آوازیں برآمد ہوئیں پے در پے سلاخ کے وار سے اسکا جسم چھلنی بن گیا خون تیزی سے زمین داغدار کرنے لگا۔

تب گبریل نے اس دوسری مخلوق کو دیکھا جو ایک کونے

Digitized by Google

میں گھٹی گھٹی تھی۔

وہ ایک بونا تھا، گبریل نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

بونا اور یہاں؟

نہیں بونے یہاں اس جہنم میں نہیں آسکتے۔ اس نے سر جھٹکا۔

لیکن وہ چھت پر الٹا دوڑتا بھوت، وہ چڑیل، تو بونے کیوں نہیں۔

"ماردو اسے سب کو ماردو۔"

پھر سرگوشی بلند ہوئی۔ تو اس نے خون آلود سلاخ سر سے بلند کرلی اسی وقت بونا گھپ اندھیرے سے نکل کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

گبریل ساکت سا ہوگیا اس بونے کی شکل اسے کوہن جیسی لگی۔

بونے کی سسکتی سرگوشیاں دکھتی ہوئی ٹانگ پر اس کی مضبوط گرفت، دماغ سے دھند چھٹنے لگی۔ تو اس نے بازو سے پکڑ کر اسے دور ہٹایا

اور بھیڑیے کو ایک ٹھوکر ماری پھر چونک کر اسے دیکھا اندھیرے سے مانوس اس کی نگاہ نے عجب منظر دیکھا بھیڑیے کی خطرناک لبی تھوتھنی غائب تھی۔ اس نے قدم آگے بڑھائے۔

سیڑھیوں سے دائیں مڑتے ہی روشنی کا انعکاس اس کی آنکھوں میں چبھنے لگا تو اس نے بے ساختہ بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

☆......☆☆......☆

کمرے سے نکلنے والا دروازے تک پہنچ چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ لاک کھول لیتا اسی وقت سیڑھیوں سے دھپ دھپ کی عجیب سی آواز ابھرنے لگی ایسا لگا کوئی بھاری بھرکم وجود بمشکل اپنا وزن گھسیٹ رہا ہو۔

رائیل عجیب الجھن کا شکار ہوگیا اسی وقت دروازہ کھلا اور موٹے اوورکوٹ میں ملبوس وہ سپاہی باہر نکلا۔ عین اسی وقت راہداری کے کونے سے ایک شخص نمودار ہوا رائیل نے تیزی سے ہاتھ چلایا مگر بٹی ہوئی توجہ اور انتہاء نزدیکی وار سے وہ شخص بچ نکلا مگر اس سے پہلے کہ منہ سے آواز نکال پاتا سارہ نے خنجر تیزی سے اس کے حلق میں گھسیڑ دیا۔ باقی کی کسر رائیل کے کلہاڑے نے پوری کردی اور وہ منہ میں پھنسے ہوئے چاقو اور گردن پر گہرے گھاؤ کے ساتھ پھٹی ہوئی آنکھیں لیے زمین بوس ہوگیا۔

اٹھا پٹخ کی آوازوں سے اندر والے تیزی سے باہر کی جانب لپکے تھے بند دروازہ بھی زور زور سے بجایا جارہا تھا اسی وقت راہداری کے کونے پر کھڑا ہوا شخص جو خاموشی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا نزدیک آنے لگا۔ رائیل اور سارہ دونوں دروازوں کے درمیان سے مزید پیچھے ہٹ گئے آنے والے پر نظر پڑتے ہی دونوں ہکا بکا رہ گئے۔

انہیں پوری امید تھی گبریل اندر موجود ہے اور وہ کہیں اور سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود سلاخ اور زخمی چہرہ بہت سی کہانیاں سنا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ رائیل کوئی ردعمل ظاہر کرتا گبریل کا سلاخ بردار ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آیا ایک روشنی کی لکیر سی بنی اور خون آلود سلاخ رائیل کے کندھے کو چھیدتی ہوئی نکل گئی اس کی بے ساختہ دہاڑ بہت بلند تھی سلاخ دوبارہ حرکت میں آئی گبریل اسے سنبھلنے کا موقع دیے بنا لگاتار وار کررہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ رائیل مزید مجروح ہوتا غیبی مدد دشمنوں کی طرف سے آئی زوردار آواز کے ساتھ بند دروازہ کھلا اور اندر سے ایک وردی پوش برآمد ہوا گبریل کی توجہ بٹی تو سارہ نے زمین بوس رائیل کو سہارا دیا اور موقع سے کھینچتی ہوئی دور لے گئی تیز دھار فولادی سلاخ کے زبردست وار نے بازو تقریباً ناکارہ کردیا تھا۔ اپنے شوہر کے اس اچانک ردعمل نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کردی تھی۔ جس کو ڈھونڈنے کے لیے وہ اس اندھیری قبر میں اترے تھے وہی ان کو یہاں دفن کرنے کے درپے تھا۔

گبریل کے تیز دھار ہتھیار نے کمرے سے نکلنے والے پہلے سورما کو وہیں چت کردیا تھا دوسرا اس تنگ جگہ میں اسے زیر کرنے کی آس میں گتھم گتھا ہوکر دیوار سے پیوست تھا اچانک اس کی گردن زخمی قیدی کے ہاتھ میں آگئی اور مسلسل "ماردو" گردان نے جیسے یکدم ذہن کو گرفت میں لیا کوئی لہر سی ہاتھوں کی طرف دوڑی گرفت مضبوط ہوئی۔ سوکھی شاخ کے چٹخنے جیسی آواز آئی اور دوسرا جرمن سپاہی بھی لہراتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ اس تمام مشقت نے یقیناً اس کو بھی متاثر کیا تھا وہ پہلے ہی زخمی اور نڈھال تھا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر اس کے ہانپنے لگا۔

Digitized by Google

سارہ زخمی رافیل کو سہارا دیے بیٹھی تھی اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا جسے روکنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔

راہداری میں اتنی اٹھا پٹخ کے بعد یکدم سناٹا چھا گیا تھا لیکن یقین سے کہنا مشکل تھا کہ اب طوفان نہیں آئے گا۔ اس نے ہمت مجتمع کی اور رافیل کا سر زمین پر ٹکاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ رافیل کا کلہاڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا اب وہ راہداری کے دوسرے سرے پر تھا اور درمیان میں اس کا جنونی شوہر براجمان تھا۔

اس نے آہستہ سے قدم بڑھایا اور اس کے برابر جا بیٹھی دل کے تیز تیز دھڑکنے کا شور اس کے کانوں میں گونجنے لگا تو ایک ہاتھ دل پر رکھے اس نے دوسرا ہاتھ گیبریل کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو سارہ نے اس کی حالت کا بغور جائزہ لیا وہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے شیر کسی لگڑ بھگوں کے جھنڈ سے زندہ سلامت نکل آیا ہو۔ مگر یہاں ایک لگڑ بھگا اور بھی تھا جو جانے کس کونے کھدرے میں چھپ گیا تھا۔ سارہ نے آہستہ سے اس کا کندھا سہلایا وہ اسکے ممکنہ ردعمل سے خوفزدہ بھی تھی مگر اس آسیب زدہ جگہ سے زندہ سلامت نکلنے کے لیے اسی کو ہمت جتانی تھی۔ اس کے ساتھ موجود دونوں مردنا گہانی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس نے گیبریل کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو پھلانگ کر کلہاڑا اٹھا لیا۔ اس نے کمرے میں تین لوگوں کے پیر دیکھے تھے اندر سے دو سپاہی برآمد ہوئے۔

مطلب تیسرا ابھی بھی اندر تھا۔ اس نے بھاری بھرکم ہتھیار مضبوطی سے دو ہاتھوں میں تھام لیا اس کا سامنا ایک تربیت یافتہ سپاہی سے تھا جو اپنی خونخواری میں بدنام تھے اگر وہ اس کے ہتھے چڑھ جاتی تو اس کی لاش بھی نہ پہچانی جاتی۔

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا جسے شاید اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا مگر اس وقت وہ کسی خلائی اسٹیشن کے کنٹرول روم کا منظر پیش کر رہا تھا دیوار پر لگی ٹی وی کی اسکرینز مختلف بٹن۔ دیواروں پر لٹکتی زنجیریں اور شکنجے اس کی نگاہ ایک عجیب چیز پر پڑی۔ وہ کوئی ماسک تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ ایک مکمل لباس تھا جسے جسم پر چڑھا لیا جاتا اس کی بھیانک صورت نے پل بھر کو سارہ کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑا دی۔ ایک دیوار بٹنوں سے بھری تھی تو دوسری دیوار کے ساتھ تین الماریاں قطار سے رکھی تھیں اور درمیانی اوزاروں سے بھری ٹیبل کے علاوہ صرف یہی جگہ تھی جو چھپنے کا کام دے سکتی تھی اس نے آہستگی سے قدم آگے بڑھائے پہلی الماری کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ دروازہ زوردار آواز سے کھلتا چلا گیا۔ اسکی سانس رک سی گئی مگر اندر کچھ نہیں تھا سوائے نا سمجھ میں آنے والے آلات کے۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسری الماری کو کھولتی دھاتی دروازہ زوردار چرچراہٹ کیساتھ کھلا، کوئی اندر سے اڑتا ہوا اس پر آپڑا تھا اچانک حملے سے بوکھلا کر وہ زوردار آواز کے ساتھ زمین بوس ہوئی تھی کمر اور سر میں آنے والی شدید چوٹ نے پل بھر کو جیسے حواس کو مختل کر کے رکھ دیا، وہ شاید مزید غافل رہتی لیکن دم گھٹنے کے شدید احساس نے جلد ہی اسے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سینے پر سوار وہ پوری طاقت سے اس کی گردن دبا رہی تھی اور کوئی دم جاتا تھا کہ اس کی سانسوں کی ڈور کٹ جاتی۔

اس کی نگاہوں میں اندھیرا سا چھانے لگا آخری خیال جو اسے آیا

وہ کوہن کا تھا

اور اچانک جیسے معجزہ سا ہوا۔

اس کے جسم سے وہ بھاری بھرکم بوجھ یکدم دور ہوا تھا گلے سے ہاتھ ہٹا تو سانس کے لیے مچلتے پھیپھڑوں نے تیزی سے آکسیجن اندر اتاری آنکھوں کے آگے چھاتا اندھیرا چھٹ گیا وہ کھانستی ہوئی بے ساختہ پلٹ گئی تب اس کی نظر اس منحوس روپوش سپاہی پر پڑی گیبریل اس عورت کا سر دیوار سے ٹکرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا مگر کمزوری کے سبب خود ہی مغلوب ہونے لگا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ مکمل طور پر غالب آتی کلہاڑے کی زوردار ضرب سے اس کا سر کٹ کر لڑھکتا ہوا دور جا پڑا خون کی ایک پچکاری سی گیبریل کے منہ کو داغدار کر گئی سارہ نے بروقت فیصلہ کیا تھا اگر چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو اسے وہاں گیبریل کی لاش ملتی۔ اسے بغلوں میں ہاتھ دیے وہ بمشکل گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئی۔ رافیل مکمل طور پر ہوش سے بیگانہ تھا ان دونوں کو عمارت سے باہر لے جانا اس اکیلی کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا وہ گیبریل کے حواسوں میں آنے کا انتظار کرنے کے بجائے کوہن کو لانے بھاگی وہ ابھی تک اسی اندھیرے کمرے میں سسک رہا تھا وہاں موجود سپاہی کی لاش پر اس کی نظریں

Digitized by Google

گرسی گئیں اپنی ہی وردی سے بندھا ہوا خون سے لت پت۔ یہ قتل گبریل نے کیا اسے بھی یقین نہ آتا اگر کوہن نہ بتاتا، وہ تیزی سے بچے کو سنبھالتی واپس راہداری میں لپکی اور یہ دیکھ کر ایک سکون کی لہر سی اس کے جسم میں پھیل گئی کہ اس کا شوہر نہ صرف ایک باہوش انسان کی طرح خود کو سنبھال رہا تھا بلکہ اپنے زخمی بھائی کو بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سارہ نے آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور وہ آہستہ آہستہ چلتے اس ویران بھوت گھر سے باہر نکل آئے۔ باہر بادلوں کی موجودگی کے باوجود صبح کی روشنی محسوس کی جاسکتی تھی۔

☆......☆......☆

گبریل کے ذہن سے جیسے اندھیرا سا چھٹنے لگا تھا سپاہی سے ہاتھا پائی کے دوران ایک زوردار سی چوٹ جو سر پر لگی اس نے ذہن پر چھائے سارے اندھیرے دور کردیے۔ ایک آسیب زدہ رات کا خاتمہ ہو گیا اندھیری رات کے اس بھوت کو اس نے اپنی قوت ارادی سے شکست دی تھی رائیل کو شدید زخمی کرنے کا دکھ اپنی جگہ مگر اسے خوشی تھی کہ سارہ اور کوہن اس کی بربریت سے محفوظ رہے تھے۔

☆......☆......☆

ان کا رخ اس مکان کی طرف تھا جہاں انہوں نے گھوڑے باندھے تھے مگر اب گھوڑے اپنی جگہ موجود نہیں تھے۔

سارہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا اسے اچھی طرح یاد تھا کوہن اور اس نے گھوڑے یہیں باندھے تھے

مگر اب وہ موجود نہیں تھے...... سر منزل پہنچ کر لٹ جانے والوں کی سی کیفیت میں اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ بگھی میں ان کا کل اسباب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتی ایک مکان کے کونے سے وہ سیاہ پوش نمودار ہوا اس فاصلے سے نووارد کی جنس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ قریب آیا تو انہیں علم ہوا یہ وہی پراسرار نوجوان تھا جو رات بھر گاؤں میں چکراتا رہا تھا۔

اس کے بعد کی کہانی اس مصیبت زدہ خاندان کے لیے ایک سہانا خواب ثابت ہوئی وہ اسی گاؤں کا باسی تھا اور رات سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ کسی ممنوعہ سرگرمی کی صورت میں ان کی پکڑ کی جاسکے۔ ان کے بقول وہ جرمنوں کے یہاں آنے سے پہلے ہی جنگل میں تیار شدہ تہہ خانوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ قصبے کو خالی پا کر وہ یہاں سے سدھار جائیں گے مگر ان کے ارادے کچھ اور تھے وہ ابھی تک لاعلم تھے کہ عمارت دراصل استعمال کس مقصد کے لیے ہو رہی تھی۔

صبح کی روشنی میں جب قصبے کے ڈاکٹر اور دوسرے نوجوانوں نے دوائیں لانے کے لیے اندر ہلا بولا تب انہیں ایک دلچسپ چیز ملی بند کمرے کے اندر نشے میں دھت وہ ایک زندہ نازی تھا۔ وہ تمام حالات سے لاعلم تھا۔ اس سے تفتیش کرنے پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ کانکریٹ کی اس مضبوط عمارت کو کیسے خطرناک انسانی دماغ کو مفلوج کرنے والے تجربات کے لیے استعمال کیا جارہا تھا خوف اور ذہن کو مفلوج کردینے والی دواؤں کے استعمال سے کسی بھی انسان کو اس حد تک وحشت میں بھر دینا کہ وہ ایک زندہ قاتل مشین بن جائے۔ گبریل یہ سن کر کانپ کر رہ گیا اگر وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو دنیا کا کیا ہوتا اور کون جانے ایسی ان کی کتنی اور تجربہ گاہیں ہوں گی۔ آخری سپاہی کو بھی اس کے ساتھیوں کے پاس بھیجنا طے کر کے لاشیں بھٹی میں جلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ رائیل کو فوراً طبی امداد دی گئی۔

یہ تمام تفصیل سنتے ہوئے قصبے والوں کے جھرمٹ میں کھڑے گبریل کی نظر ہاسپٹل کی بڑی سی اندھیری کھڑکی پر پڑی۔ وہ سن سا رہ گیا۔

کھڑکی کے خالی چوکھٹے میں کھڑا وہ وہی چہرہ تھا جس کی دہشت اور بہکاوے کے زیر اثر اس نے اپنے سگے بھائی کو قتل کرنے کی کوشش کی اس کی شیطانی مسکراہٹ نے جسم میں خوف سے پھریری سی دوڑا دی۔ گبریل نے سر جھٹکا اور پھر نگاہ کی کھڑکی خالی تھی۔

اس نے مسکرا کر اپنے بیٹے کو ساتھ لگایا اور جنگل کی جانب قدم بڑھا دیے۔

Digitized by Google

بکرا چور

ایم زیڈ شیخ

لقمۂ حرام کبھی کبھی ضرور رنگ دکھاتا ہے اس وقت اولاد کے لیے ساری حدیں پار کر جانے والے والدین خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ان کے آنسو گئے وقت کو واپس لانے میں ناکام رہتے ہیں۔
اولاد کو لقمہ حرام کھلانے والے والدین کی روداد

ہر طرف ڈم ڈم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، گھی کے ڈبے رسی سے باندھ کر گلے میں ڈالے بجا رہے تھے۔ گاؤں میں پہلی مویشی منڈی کا انعقاد ایک انوکھی روایت تھی۔ پورے گاؤں کی بچہ پارٹی جن میں کچھ نیم برہنہ بھی تھے اس جانب اُمڈ پڑی تھی۔ ان کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی۔ خوشی کے شادیانے بجائے جا رہا تھے۔ نہ جانے کہاں سے ان کے ہاتھ وہ گھی کے ڈبے لگے تھے جنھیں وہ ڈھول بنا کر بجا رہے تھے۔ بچوں کا تو یہ حال تھا مگر بڑے بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ منے قصائی کی مویشی منڈی میں کیسا مال آیا ہے، اسے دیکھنے بچوں کے ساتھ ساتھ بزرگ اور پکی عمر کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد وقتاً فوقتاً چکر لگا رہے تھے۔

”پاپا یہ موتی ہم نے لینا ہے۔“

”ابا یہ کوکلو کتنا مکھڑا ہے نا اپنے گولو کی طرح۔“

”ارے واہ کتنا کیوٹ بکرا ہے بالکل ای کی سلائی مشین جیسا۔“ یہ تھے وہ جملے جو بچوں کے ذوق کو ظاہر کرتے تھے کہ وہ کتنے پرجوش انداز میں اس منڈی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بچوں کی تو عید سے پہلے عید ہو گئی تھی۔ عیدالاضحی کو ابھی ایک عشرہ باقی تھا کہ امین خان عرف منے قصائی نے بہت سے جانوروں پر مشتمل ایک منڈی کیا لگائی پورے علاقے میں سب کو تفریح کا ایک شاندار موقع مل گیا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے سب بچے راستے میں جانوروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے بائے بائے کہتے اور پھر گھر آ کر جلد از جلد ضروریات سے فارغ ہو کر مویشی منڈی کی جانب بھاگ کھڑے ہوتے اور یہ شغل رات کے کھانے تک جاری رہتا۔ یہ سب تفریحات روز جاری رہتی تھیں کہ ایک صبح خبر ملی کہ منے قصائی کے پانچ بکرے راتوں رات کوئی کھول کر لے گیا۔ اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ لوگ اس کے گھر تعزیت کے لیے یوں جا رہے تھے جیسے کوئی عزیز فوت ہو گیا ہو اس کا۔ یہ گاؤں میں بڑی چوری کی پہلی واردات تھی۔

......○......

واجد اور ماجد کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں اکٹھے داخل ہوئے۔ آخری ڈیسک پر بیٹھنا ان کی علمی دلچسپی کا ثبوت تھا۔ جانوروں کی آوازیں نکال کر دوسروں کا نام بتا دینا، کاغذ چبا کر کسی پر پھینکنا اور کبھی کبھار ٹیپ سے کسی کی پیٹھ پر بے تکا جملہ چپکا دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جسمانی لحاظ سے کافی مضبوط اور تگڑے تھے اس لیے کلاس پر اکثر یا مونیٹر کی ان کے سامنے ایک نہ چلتی تھی۔ اساتذہ کے سامنے انتہائی شرافت اور چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح کا رویہ رکھتے تھے کہ سب ششدر رہ جاتے۔ مگر آہستہ آہستہ تمام

Digitized by Google

اساتذہ پر ان کی حرکات آشکارہ ہونے لگیں- پڑھائی کے معاملے میں اتنے بہرحال لائق ضرور تھے کہ پاس ہوجاتے تھے- سالانہ امتحان بورڈ کے ذریعے لیا جاتا تھا اس لیے بمشکل پاس ہو سکے مگر دسویں جماعت میں پہنچنے تک بہت سے اور کاموں میں بھی ماہر ہو چکے تھے- صحبت کا اثر انہیں جیب کترے بنا گیا- مزید ایک سال گزرا تو جیب سے ہوتا ہوا یہ سفر دوکانوں پر پہنچا- گھر والے اپنے سپوت علم کی روشنی کے لیے چھوڑ گئے تھے مگر انہیں کیا خبر کہ علم تو ان کے پاس بہت سا ذخیرہ ہو چکا تھا مگر منفی علم- میٹرک کے امتحانات کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو ان کے پاس میٹرک کی ڈگری کے بجائے ہاتھ کی صفائی کی سند تھی- نتائج کا اعلان تو کئی ماہ بعد ہونا تھا اس لیے آوارہ گردی کے لیے ان کے پاس کافی وقت تھا- کچھ دن تک تو انہوں نے آرام کیا مگر پھر آپس میں رابطہ کر کے ملاقات کی۔

بازار میں ماجد کے والد کا جنرل اسٹور تھا- اس پر پہنچ کر دونوں نے وہاں سے اٹھ کر ایک ہوٹل پر نشست کرنے کا فیصلہ کیا- دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے کھانا منگوایا گیا- کھانے کے دوران ان کی گفتگو جاری رہی۔

''یار ماجد بھائی کافی دنوں سے ہاتھوں میں خارش ہو رہی ہے اس لیے سوچا کوئی لائحہ عمل طے کیا جائے کیا خیال ہے؟''

''خیال اچھا ہے پر یہاں ذرا مواقع کم ہیں- اور بدنامی کا ڈر بھی زیادہ ہے- شہر میں تو چلو کوئی جاننے والا نہیں تھا مگر یہاں ذرا سی بھنک بھی ملی کسی کو تو سمجھو سب کچھ تباہ- '' ماجد نے سنجیدگی سے جواب دیا- ''مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا نا؟ یا پھر یوں ہی ترستے رہیں گے پائی پائی کو......؟''

''ایک آئیڈیا ہے میرے پاس۔'' ماجد کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''گڈ بلکہ فنٹاسٹک مجھے پتہ تھا کہ تمہارا شیطانی دماغ ضرور کوئی آئیڈیا ڈھونڈ نکالے گا۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے مگر اس پر عمل صرف تم ہی کر سکتے ہو۔'' وہ اپنی تازہ تازہ ہلکی ہلکی بھیگی مسیں ٹھوڑی پر سے کھجاتے ہوئے بولا تو واجد اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''ہماری دوکان میں چوری کی جائے تو کیسا رہے گا؟'' واجد نے چونک کر اسے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا- اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا- اس نے بمشکل اتنا ہی کہا۔

''کیا تم سنجیدہ ہو یا یہ کوئی مذاق ہے؟''

صد فیصد سنجیدہ! اور تم سے بھی سنجیدگی کی توقع رکھتا ہوں میرے لیے تو ابھی دوکان بھی پرائی ہے چند روپے اخراجات کے لئے ملتے ہیں جس سے ایک دن کے لیے سگریٹ نوشی بھی نہیں کی جا سکتی- اگر خود چوری کروں گا تو کہیں نہ کہیں پکڑا جاؤں گا - اس لیے تم کرو میں موقع فراہم کروں گا- ''واجد ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا آخر اسے یقین آ گیا کہ ماجد سنجیدہ ہے اور پھر اگلے مرحلے کے لئے لائحہ عمل طے کیا جانے لگا- گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر آمادہ تھا تو اسے کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑاتا- چنانچہ اگلی چوری کا پلان مکمل طور پر بنا لیا گیا- خواجہ صاحب کے وہم و گمان میں

Digitized by Google

بھی نہ تھا کہ ان کا اپنا بیٹا ہی چوروں سے ملا ہوا ہے۔

.....○.....

منے قصائی پر آفتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک ساتھ اتنا بڑا نقصان وہ بھی عید سے چند دن پہلے۔ اس پر اور گھر والوں پر شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ہر گھر میں چہ مہ گویاں ہو رہی تھیں۔ کسی کے مطابق یہ کام گاؤں کے اندر کا ہے کسی کے مطابق یہ بیرونی جانب سے کی گئی کارروائی تھی۔ کوئی اسے ذاتی رنجش اور کوئی سازش کہہ رہا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں.....

گاؤں کے تمام بڑوں کا اہم اجلاس اسی شام اس کے گھر پر منعقد ہوا۔ مویشی منڈی میں رونق اس طرح کی تو نہیں تھی مگر ابھی بھی تھوں میں کافی تیل تھا اس لیے بچے کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ البتہ ایک چیز کا اضافہ کیا گیا تھا کہ اب منے کا بیٹا اپنے باپ کی ہدایت پر ہر وقت ان جانوروں کی مکمل نگرانی کرنے لگا تھا۔ رات کو وہ خود مویشی خانے کے باہر سوتا تھا۔

جرگے کے افراد اکٹھے ہو کر ایک ہی بات پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جو اتنی دیدہ دلیری سے واردات کر گیا۔ بیک وقت چار چار جانوروں کو چرا کر لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا تھا۔ یہ پورے گاؤں کے لیے تشویش اور افسوس کا مقام تھا۔ بہرحال یہ باتیں اس کا دل رکھنے کو تو کافی تھیں مگر اصل مسئلہ جوں کا توں تھا۔ ایک ہی خاطر خواہ کامیابی یہ ملی کہ کسی جاننے والے کے توسط سے اگلے دن ایس پی صاحب کو مدعو کیا گیا اور ان کی آمد متوقع تھی جس کے بعد ممکن تھا کہ پولیس سنجیدگی سے اس کیس کو حل کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاتی بصورت دیگر لاکھوں کروڑوں کی چیزیں گم ہو جاتی ہیں اور کبھی برآمد نہیں ہوا کرتیں۔ ایک امید کی کرن ضرور تھی ایس پی صاحب کی صورت میں اسی لیے منا دوا اور دعا دونوں چیزوں کے ذریعے اپنے مسائل کے حل کے لیے کوشاں تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ عید سے پہلے پہلے اسے سب کچھ واپس مل جائے کیونکہ اس نے ان جانوروں کا ایڈوانس بھی پکڑ لیا تھا اور اب سودا نہ ہونے پر اسے دوگنا نقصان برداشت کرنا پڑتا۔

.....○.....

واجد اور ماجد کی یہ پہلی کارروائی تھی جس میں واجد نے جمعہ کی نماز کے دوران ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ ماجد کے پاس جو چابی ہوتی تھی وہ اس نے دو دن پہلے ہی گم ہونے کا ڈرامہ کیا تھا جو کہ درحقیقت اس نے واجد کو دے دی تھی۔ واجد اطمینان سے شٹر کھول کر دس ہزار روپے نکال کر رفو چکر ہو گیا۔ واپسی پر مالک اور اس کے بیٹے نے جب دوکان کھلی دیکھی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ شور اور واویلا کرنے پر آس پاس کے دکاندار اکٹھے ہو گئے۔ ابھی خال خال ہی دکانیں کھلی تھیں، تھوڑی دیر بعد لوگوں کا جم غفیر دکان پر موجود تھا اور پھر زبانی ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ اینڈ سنز بھی بڑے حضرت تھے انہوں نے بھی دس ہزار کی رقم کو پچاس ہزار روپے کی چوری بتلا کر خوب ہمدردی سمیٹی۔ دن دھاڑے چوری کی اس واردات پر باقی دکاندار بھی انگشت بدنداں تھے۔ کچھ کے نزدیک یہ اپنے ہی بیٹوں کی کارستانی تھی جبکہ کچھ لوگ خواجہ صاحب کی غریب پرور طبیعت کے قصیدے پر طنز کر رہے تھے کہ ایک پیسہ زکوٰۃ اور صدقہ نہ دینے والے کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، زبانِ خلق کو کون روک سکتا تھا۔ دوسری جانب خواجہ اینڈ سنز کے لیے یہ سب ایک بھیانک خواب کی مانند تھا۔ پولیس کے چکر میں وہ کیا پڑتے الٹا ہزاروں کا خرچ الگ ہو جاتا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر چپ چاپ تلاش میں لگے رہے کہ کسی جانب سے کوئی سرا ملے۔ گو کہ شک ماجد پر بھی گیا مگر ماجد نے اگلے دس دن تک واجد سے کوئی رابطہ اور تعلق نہ رکھا، کیا خبر کہ اس کے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھی جا رہی ہو۔ دونوں دوستوں کے درمیان بلاتفریق پچاس پچاس فیصد کی شرح طے تھی اس لیے اپنا پانچ ہزار وصول کرنے کے لیے وہ صبر سے کام لے رہا تھا۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے اس لیے وقت کی دھول اس چھوٹے سے واقعہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر منہدم کر چکا تھا۔ اگلے دو ماہ تک وہ وقتاً فوقتاً ملتے رہے اور عیش کرتے رہے۔ چوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھ جو نشے کی لعنت بھی سود کے طور پر ساتھ لے آئے تھے وہ الگ مصیبت تھی۔ اس لیے انہیں اپنے اخراجات چلانے کو رقم

Digitized by Google

کی خاصی ضرورت رہتی تھی۔ دو ماہ بعد پرانا مال ختم ہوا تو انہیں پریشانی ہونے لگی۔ مزید کوئی بڑا ہاتھ مارنے کے لیے لائحہ عمل طے کیا جانا تھا۔ اب کس کی شامت آتی یہ فیصلہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی ہوتا۔ فی الحال وہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

.....○.....

ایس پی صاحب کی آمد سے کچھ ڈھارس تو بندھی تھی انہوں نے یقین دلایا تھا کہ جلد از جلد مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ شام کے وقت پیپل کی چھاؤں میں چارپائیاں بچھا کر نشست شروع کی گئی تھی۔ علاقے کے زمیندار اور متمول خاندان کے لوگ بھی ایس پی صاحب سے ملنے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے زبانی دعوے تو کیے تھے اب ان پر عمل درآمد ہونا نہ ہونا بعد کی بات تھی۔ وہ کہنے لگے۔

"آپ سب لوگوں کو اپنے تجربات کی بنا پر یہ بات پورے وثوق سے کہنا چاہوں گا کہ اس چوری کے پیچھے ضرور کوئی اپنے گاؤں کا فرد ملوث ہے۔ جب تک اندرونی مدد نہ ہو بیرونی ذرائع سے کوئی کارروائی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو اپنے اپنے گھر ٹٹولے جائیں ممکن ہے کہ چور یہیں کہیں چھپا ہو اور ہم بچہ بغل میں ہونے کے باوجود شہر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوں۔"

"مگر جناب عالی! اتنے جانور اکٹھے گاؤں میں رکھنا مسئلہ ہے اس لیے جو کوئی بھی ہے وہ کم از کم اس گاؤں میں انہیں رکھنے کی حماقت تو نہیں کرے گا نا اور گاؤں کے تو ہم نے ہر کونے میں ڈھونڈ لیا ہے۔" منے میاں نے عاجزی سے کہا۔

"اس بات میں وزن ہے مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ مدد کسی اپنے ہی کی ہے وگرنہ باہر والوں کو کیا پتہ کہ کون کس وقت چوکنا نہیں ہوتا۔ البتہ میں ایک کام کرواتا ہوں۔ تمام مویشی منڈیوں کے مالکان تک اطلاع پہنچوا دیتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا جانور بیچنے والے کی اطلاع دیں۔ اس میں کافی حد تک چانس ہے کہ چور پکڑا جا سکے۔ بہرحال میں خصوصی طور پر ایک انسپکٹر کی ذمہ داری لگا دیتا ہوں کہ وہ اس کیس پر دلی سے کام کرے۔ ان شاء اللہ جلد ہی آپ کو خوشخبری ملے گی۔"

"وہ تھوڑی دیر مزید اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے اور پھر پرتکلف کھانے کے بعد روانہ ہو گئے۔ منے میاں نے اس شخص کا بھی خصوصی شکریہ ادا کیا جس کی وساطت سے ایس پی صاحب کی آمد ممکن ہوئی تھی اور پھر وہ آمد مبارک ثابت ہوئی اگلے ہی دن اسے خوشخبری ملی کہ اس کا ایک بکرا مل گیا ہے۔

.....○.....

"گدھا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا.....؟" ماجد نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا واجد کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یار میں تو تمہیں استاد مان گیا ہوں کیسے اپنے ہی گھر نقب لگوائی، خواجہ صاحب کو اگر پتہ چل جائے تو دونوں کو اپنے ہاتھوں سے کوڑے ماریں۔ خیر اب کیا ارادہ ہے؟"

"فی الحال تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ بڑی عید سر پر ہے اور اپنا یہ حال ہے کہ دل کرتا ہے دن سارا سوٹے پہ سونا لگایا جائے مگر مال و دولت کے بغیر لکڑی کے سوٹے ہی لگائے جاتے ہیں اور اوپر سے سالے اکرم نے الگ ہی کام پر لگا دیا ہے یوں سمجھو سونا خرید کر کھانا ہے۔"

"میں نے تجھے سمجھایا تھا یار کہ سگریٹ نوشی سادہ ہی کافی ہے مگر تو نہیں مانا ایک تو چھوٹی سی پڑیا پانچ سو کی اوپر سے کبھی ملتی کبھی نہیں اور دماغ کا بیڑہ غرق کر دیتی۔ میں تو پھر بنا سگریٹ کے کچھ دن برداشت کر سکتا ہوں مگر تیرا اللہ ہی حافظ ہے۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"میرا پیونہ بن یار! پاس رکھ اپنی نصیحتیں کوئی حل سوچ، ویسے میرے پاس ایک تجویز ہے تو سہی۔" ماجد نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیسی تجویز؟"

"منے قصائی کی مویشی منڈی۔" وہ کہہ کر مسکرانے لگا تو واجد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ٹوکا دیکھا ہے اس کا؟ اگر پکڑے گئے تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچ دے گا دونوں کے۔" واجد خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"کچھ بھی ہو۔ اگر چار پانچ جانور راتوں رات غائب کر دیئے جائیں اور ان کی قیمت کم لگا کر بیچ دیا جائے تو سمجھو کئی ماہ آرام سے گزر جائیں گے۔"

Digitized by Google

"مگر یار....."

"اگر مگر کو چھوڑ بس ڈن ہو گیا۔" ماجد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مصافحہ کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ واجد کو سوچتا چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔

دونوں نے اگلے دن فائنل پلان مرتب کیا اور اس بار انہوں نے اپنے ساتھ ایک اور فرد بھی ملا لیا۔ واجد کا کام جانور کھول کر ایک خاص مقام تک پہنچانا تھا جبکہ ماجد اور دوسرا لڑکا باقی کام کرتے۔ لڑکے کے منڈی میں جاننے والے موجود تھے مگر ان کے ساتھ طے کیا گیا تھا کہ وہ کسی انجان شخص کے ہاتھوں فروخت کریں گے۔ تیسرے لڑکے کو باقی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا بس فقط ایک ہزار فی جانور اس کا کمیشن تھا۔ ان کا پلان تھا کہ ایک سے زائد جانور حسب ضرورت کھول کر لائیں گے اور پھر اگلی رات ان لوگوں نے کارروائی کر دی۔ گھر والوں کو ایسی میٹھی نیند سلا دیا گیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور چور یکے بعد دیگرے پانچ موٹے تازے بکرے لے کر نو دو گیارہ ہو گئے۔

.....○.....

ایس پی صاحب کے مشورے نے کچھ نہ کچھ کام کر دکھایا تھا۔ ایک مویشی منڈی کے مالک نے ایک دن پہلے ہی ایک بکر اخریدا تھا۔ وہ بکرا ان ہی پانچوں میں سے ایک تھا۔ منا اور اس کا بیٹا مویشی منڈی میں پہنچے جہاں انہوں نے اپنا بکرا پہچان لیا۔ پولیس کی موجودگی میں مالک نے کمزور سا احتجاج کیا مگر پھر تیور دیکھ کر چپ کر گیا۔ اسے خبردار کیا گیا کہ اگر اس نے آئندہ چھان بین کیے بغیر ہی چوری کے جانور خریدنے کی کوشش کی تو اسے بھی حوالات کی ہوا کھانی پڑے گی۔ یوں پوری جمعیت میں واحد بکرا شان و شوکت کے ساتھ گھر پہنچا۔ پولیس والوں نے ایس پی صاحب کو اطلاع دی تو وہ اس بات پر برہم ہو گئے کہ ان لوگوں نے کوئی خاص چھان بین نہیں کی کہ باقی چار بکرے کہاں ہیں ممکن تھا کہ وہ وہی شخص بیچ چکا ہو یا پھر کم از کم اتنا تو کیا جاتا کہ اس شخص کا پتہ چلانے کی کوشش کی جاتی جس نے ایک بکرا بیچا تھا۔ پوچھ گچھ تو پولیس نے کی تھی مگر اس انداز سے نہیں۔ اس لیے مطلوبہ معلومات کے حصول کے لیے اس شخص کو منے قصائی کے گھر ہی بلا لیا گیا۔ ایک انسپکٹر اور دو سپاہی گاؤں ہی میں موجود تھے جنہوں نے چند معزز افراد کے ساتھ مل کر ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"کیوں بے سیٹھ جی! اس بندے کی نشاندہی کر سکتے ہو جس نے آ کر یہ سودا کیا تھا؟"

"جی حضور اگر کبھی سامنے آئے تو پہچان لوں گا۔ بھورے بالوں والا ایک خوبصورت سا جوان تھا یہی کوئی بیس بائیس سال تک کا۔ اس کے ساتھ ایک پندرہ سولہ برس کا نوجوان بھی تھا۔ مجھ سے انہوں نے یہی کہا تھا کہ بیمار دادی کا علاج کروانے کے لیے پیسے کی کمی کے باعث سستے داموں فروخت کر رہے ہیں اور واقعی انہوں نے ستر اسی فیصد قیمت پر بیچ دیا تھا۔ مجھے پتہ ہوتا کہ ایسا کچھ ہے تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ بس ہمدردی کے باعث پھنس گیا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا تو انسپکٹر نے اپنے لہجے میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے جھاڑا۔

"یہ ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کون کتنا خدا ترس اور نیک ہے۔ بہرحال پوری تفصیل سے حلیہ بیان کرو دونوں کا۔" اس نے جتنا یاد تھا اتنا تفصیلی حلیہ بیان کیا اور پھر آخر میں چونک کر بولا "ہاں یاد آیا! جو چھوٹا لڑکا تھا اس کی ایک خاص نشانی مجھے یاد رہ گئی۔

"سب اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تو وہ سانس درست کرنے کے بعد بولا۔ "اس لڑکے کے سر پر تھوڑے سے بال پیدائشی سفید تھے۔ ایک چاند سا بنا ہوا تھا چھوٹا سا۔

"وہ معافی تلافی کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گیا جبکہ انسپکٹر راشد گھر والوں کو تسلی دے کر تھوڑی دیر بعد تھانے واپس چلا گیا۔ شام تک سارے گاؤں میں سر پر چاند بنے لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی، مگر اس طرح کا کوئی لڑکا موجود ہی نہیں تھا۔ واجد چونکہ اسی گاؤں کا تھا اس لیے وہ جلد از جلد ماجد تک یہ خبر پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ آئندہ سے سر پر ٹوپی رکھے جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ اگلی صبح ایک اور خوشخبری گاؤں میں پہنچی کہ ایک اور بکرا مل گیا تھا۔ خریدنے والا اس بار ایک عام شہری تھا جس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو پہلے منڈی کے مالک کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کے

Digitized by Google

بیان کے مطابق بھی وہی دولڑکے بچنے والے تھے۔ پولیس کے لیے یہ لمحہ فکریہ تھا کہ ان کی مدد کے بغیر کوئی گروہ اکیلے ہی سب کچھ کرتا جارہا ہے۔ دوسری فکر انہیں یہ تھی کہ اگر کسی میڈیا یا اخبار والے تک یہ خبر پہنچ گئی تو ان کی دوڑیں لگ جائیں گی۔ الٹا ان پر مدد کا الزام بھی لگ جائے گا کہ مجرموں کے پیچھے پولیس کا ہاتھ ہے۔ ایس پی صاحب کی اس کیس میں خصوصی دلچسپی پہلے ہی متعلقہ تھانے کے لیے عذاب بنی ہوئی تھی۔ نہ وہ کچھ کھا پی سکتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ کرسکتے تھے۔ ایسے حالات میں ان کے پاس سوائے مجرم کو بے نقاب کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے سارا عملہ سنجیدگی سے اس کیس کے حل کے لیے کوشاں تھا۔ سر پر چاند والا لڑکا ان کے لیے عید کا چاند ثابت ہوا تھا جس کی تلاش زور و شور سے جاری تھی۔

.....○.....

"ابو آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

مالا نے منے قصائی سے کہا تو اس نے گھور کر مالا کی جانب دیکھا۔ ایک تو ان دنوں اس کا دماغ چوری کی وجہ سے منتشر تھا دوسرا وہ مالا سے چڑتا تھا۔ اسے اولاد نرینہ کی خواہش تھی مگر جب اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے خوب شور مچایا۔ رشتہ داروں نے سمجھایا کہ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر وہ دینی احکامات کو پس پشت ڈال کر مالا سے سخت نفرت کرنے لگا۔ ایک سال بعد جب اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو مالا کی نفرت تھوڑی سی کم ہوئی مگر جب بھی اس کے سامنے مالا کا نام لیا جاتا یا اس کا سامنا ہوتا تو وہ منہ پھیر لیتا۔ اس کے برعکس ماں کے لیے مالا ایسے ہی تھی جیسے بیٹا۔ بیٹی اپنے باپ پر جان نچھاور کرتی تھی مگر منا نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ کبھی اس نے سیدھے منہ مالا سے بات نہ کی۔ دن گزرتے گئے وہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم تھی۔ اس نے کبھی ایک نگاہ شکایت بھی نہ ڈالی کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرا بھی کوئی حق ہے۔ ماں چھپ چھپا کر جو کچھ دلا دیتی مالا کو اس پر قناعت کرنی پڑتی۔ وہ حرف شکایت سے مبرا باپ کے لیے ہمیشہ دعائے خیر ہی کرتی تھی۔ دن گزرتے گئے اور سالہا سال گزرنے کے باوجود باپ کے دل میں اس کے لیے ذرا سی محبت بھی پیدا نہ ہو سکی۔ بیٹے کو ہر سہولت میسر تھی اس لیے وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ آئی تھی جس پر گھر والوں کو اس کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے تھا مگر منے کے لیے وہ گھر میں پڑی بے جان سی چیز تھی اس لیے بیوی کے ٹھوکا دینے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آج بھی مالا نے اسے آواز دی تو اس کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"وہ ابو آپ چوری کی وجہ سے پریشان ہیں تو میں۔"

"کیا میں میں لگائی ہوئی ہے جلدی سے بولو جو کہنا یا پوچھنا ہے۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جس لڑکے کے بارے میں بکرے بیچنے کا کہا گیا ہے میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس کے لیے اس بات سے زیادہ اہم کوئی بات کیسے ہو سکتی تھی۔ "کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"اس کا لہجہ ذرا سا نرم ہوا مگر فطری سختی ابھی تک موجود تھی۔ مالا نے جو کچھ اس کے گوش گزار کیا اسے سننے کے دوران اس کے چہرے نے کئی بار رنگ بدلا۔ اور آخر کار وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد انسپکٹر راشد سے مشورہ کرنے کا سوچا۔ مالا سر جھکائے وہاں سے چلی گئی تھی۔

.....○.....

واجد اور ماجد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اس بار تو برے پھنسے، ہیں یار! کچھ سمجھ نہیں آرہا کیا کریں، ابھی تین بکرے موجود ہیں اپنے پاس۔ بیچنے والے نے بھی یہ خبریں سن کر مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دوسری جانب یہ مصیبت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ جن خریداروں کو چونا لگایا گیا ہے وہ بھی ہمارے خون کے پیاسے ہوں گے۔ کسی بھی جگہ ہمیں دیکھ کر وہ بھانڈا پھوڑ سکتے ہیں۔" ماجد نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ ایسا کرتے ہیں یہ بکرے واپس چھوڑ آتے ہیں اس سے کم از کم ہماری جان تو بچ سکتی ہے کہ مال واپس ملنے پر پولیس کا چکر ختم

Digitized by Google

ہو جائے گا۔" ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شلوار قمیص میں ملبوس ایک گھنی مونچھوں والا شخص اٹھ کر ان کے پاس آیا۔

"تم دونوں کی گفتگو میرے پاس ریکارڈ ہو چکی ہے۔ ابھی فی الحال تم لوگوں کو میرے ساتھ منے قصاب کے گھر تک چلنا ہوگا۔ تھانہ کچہری کا فیصلہ اس کے بعد ہی ہوگا۔" ماجد تو خوفزدہ تھا ہی مگر واجد کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی کیونکہ وہ انسپکٹر راشد کو پہچان چکا تھا جو دو بار گاؤں میں اسی مقصد کے لیے آچکا تھا۔ بھاگنے کی ہمت ان میں ویسے بھی نہیں تھی کیونکہ ان کے سارے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ انسپکٹر راشد انہیں لے کر گاؤں پہنچا تو سب چہرے حیران و پریشان تھے۔

......○......

دونوں کو پہچان لیا گیا تھا۔ ایک اسی گاؤں کا ہونہار سپوت تھا جبکہ دوسرے کو بطور فروخت کار دونوں خریداروں نے پہچان لیا تھا۔ بقیہ تین بکروں کے بارے میں ان دونوں نے بنا چوں چراں کیے بتایا تھا۔ ماجد کے سر پر بنا جانے اسے پھنسا گیا تھا۔ اصل قابل دید حالت تو منے قصائی کی تھی جس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا بیٹا واجد اس چوری میں ملوث ہے۔ مالا کی نشاندہی پر اس لڑکے کی طرف توجہ مبذول ہوئی تھی جو ایک دو بار واجد کے ساتھ گھر آچکا تھا۔ اس کی نشاندہی پر خفیہ طور پر واجد کی نگرانی کی گئی تو اگلے دن رنگے ہاتھوں دونوں کو ہوٹل پر پکڑ لیا گیا تھا۔ منے کو اپنے جس بیٹے پر غرور تھا اس نے سب کے سامنے اسے ذلیل و خوار کروا دیا تھا۔ اس نے خود کبھی قربانی نہیں کی تھی اس عید پر اس کی عزت قربان ہو چکی تھی۔ ناپ تول میں کمی بیشی کرنے کے باعث جو لقمہ حرام اس نے اپنی اولاد کو کھلایا تھا اس کا بدلہ اسے ایک چور کا باپ کہلا کر مل رہا تھا۔ وہ خود ہی قاتل تھا اور خود ہی مقتول۔ اسے جس بیٹی سے نفرت تھی اس نے کبھی باپ کا سر نیچا کرنے کا سوچا تک نہ تھا۔ ماں کی مدد سے وہ پرائیویٹ ایف اے میں پورا بورڈ ٹاپ کر چکی تھی جس پر بیسیوں بار اس کے باپ کو مبارک باد دی گئی مگر اس نے ہر تعریف جوتے کی نوک پر رکھی تھی۔ اسے لگا کہ تھا تو اپنے ہونہار بیٹے پر۔ جسے اتنی چاہ سے اس نے شہر تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا۔ مگر وہ بھول گیا تھا کہ لقمہ حلال پہلی شرط ہوتی ہے تعلیم و تربیت کی۔ وہ بولا تو اسے اپنی آواز دور سے آتی سنائی دی۔

"لے جاؤ اسے میری نظروں کے سامنے سے۔ ایسی اولاد سے میں بے اولاد ہی بہتر ہوں۔" اس کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکل رہے تھے۔ جس بیٹی کو اس نے بھیڑ بکری سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی اسی کی بدولت آج اس کی گمشدہ چیزیں مل گئی تھی۔ ہاں اس کی گمشدہ عقل اسے مل گئی تھی۔ مگر افسوس اس عقل کے حصول کے لیے اسے بیٹے کی قربانی دینی پڑی تھی۔ سارے گاؤں کی جانب سے اسے لعن طعن کیا جا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے واپس اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور باہر چار پائیوں پر بیٹھا ہوا مجمع پولیس کی واپسی کے بعد آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ اگلے دن کے اخبار ان دونوں کے مزید کارناموں کی داستان چھاپ رہے تھے۔ اس نے آج پہلی بار اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اتنا ہی کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا بیٹی! اصل قربانی تو تم نے دی ہے بچپن سے آج تک۔ بلکہ تم ہی کیا شاید بچیاں ازل سے ہی قربان ہوتی آئی ہیں کبھی بہن، کبھی ماں، کبھی بیٹی اور کبھی بیوی بن کر۔" اس کی آنکھیں ساون کا منظر پیش کرنے لگیں۔ اسے ہیرے اور کنکر کی پہچان ہو چکی تھی مگر قربانی دینے کے بعد۔

www.urdutube

Digitized by Google

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گے

دیدہ دل	امبرین اختر
بدصورت	عثمان غنی
شناخت	خلیل جبار
ہماری چاہ	بنت حوا
رقیب جان	سلمان بشیر
بانو	عدنان عباسی
لفظوں کا لہو	محمد علم اللہ
سمجھدار	زرینہ مریم
کالک	فرحین ناز طارق

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
WWW.URDUTUBES.COM
Digitized by Google

دیدہ دل

عنبریہ اختر

دور شیشم اور کیکر کے درختوں کی اوٹ میں آفتاب آخری ہچکی لے رہا تھا۔ شام کے مدھم سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ رات کا سیاہ آنچل ہر شے کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ آکاش کی وسعتوں میں چاند جگمگا رہا تھا۔ اس کے ہمسفر ننھے منے تارے اپنی مدھم روشنی سے لو افروز ہو رہے تھے۔ کسان دھرتی کا سینہ چیرنے کے بعد بیلوں کو باندھ رہے تھے۔ چاول اور گندم کی فصل کی بھینی بھینی مہک ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ یہی حال پرندوں کا بھی تھا۔ وہ اپنی نازک چونچ سے چاول کے دانے کھیتوں سے چن رہے تھے۔

دن بھر کی گرمی سے ستائے ہوئے بچے اور نوجوان قریب ہی ٹیوب ویل میں غوطہ زن تھے۔ یہ ٹیوب ویل گاؤں کے لوگوں کے لیے ایک طرح سے نعمت تھا۔ جب گرمی عروج پر ہوتی تو لوگ اسی کو اپنا عارضی سہارا سمجھتے۔ اپنے جسموں کو ٹھنڈا اور ہلکا پھلکا کر کے فرحت و تازگی کا احساس پیدا کرتے۔ پیڑوں پر پرندے دم سادھ کر بیٹھ گئے تھے۔ رات نے ہر شے کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ گھروں سے دھوئیں کے گہرے بادل اٹھتے دکھائی دینے لگے۔

عورتیں گھر داری میں مشغول ہو گئیں۔ نتاشا بھی شوہر کے لیے ترکاری بنا رہی تھی۔ شام سے رات ہو گئی شوہر کی راہ تکتے تکتے۔

''آج پھر تم نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ جب کہ تم سے کہا بھی ہے میرا انتظار نہ کیا کرو۔ جب بھوک لگے کھانا کھا کر سو جایا کرو۔ لیکن تم بھی بس اپنی مرضی کرتی ہو۔ بالکل کسی کی بات نہیں مانتیں۔'' اظہر رات کے دس بجے گھر آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''کیسے کھا لوں کھانا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، تمہارے بغیر میں نے کبھی کھانا نہیں کھایا۔ چاہے رات کے دو ہی کیوں نہ بج جائیں، جانتے ہو تمہارے بغیر کھانا کھانا زہر کھانے کے مترادف ہے۔'' نتاشا نے روہانسی آواز میں کہا۔

''اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو میرے ساتھ اور جلدی سے کھانا گرم کر کے لاؤ۔'' اظہر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

نتاشا فوراً اٹھی۔ پاؤں میں چپل پہنی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر کھانا گرم کرنے لگی۔ آج اس نے اظہر کی پسند کا آلو لوبیا پکایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں میاں بیوی صحن میں بچھی چارپائی پر کھانا کھانے لگے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اظہر بار بار نتاشا کے حسین مکھڑے کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس کی سوجھی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے روشن تھے۔

جیسے آج پھر اس نے ماں کی تلخ باتوں پر ڈھیر سارے آنسو بہائے ہوں اور اپنا دل ایک بار پھر جلایا ہو۔ اظہر نے دو تین بار بیوی کو دیکھا جو بس خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ اظہر اور نتاشا کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ لیکن نتاشا کی گود ہری نہ ہوئی تھی۔ اس کی ساس صغراں اسے ہر وقت طعنے دیتی رہتی۔ اسے بانجھ کہتی اور بہو کا مقابلہ گاؤں کی دوسری عورتوں سے کرتی رہتی۔ بیچاری نتاشا اس کی ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آ چکی تھی۔ لیکن صبر کا دامن اس نے کبھی نہ چھوڑا۔ وہ جانتی تھی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ایک نہ ایک دن مجھے یہ میٹھا پھل ضرور دے گا۔

دونوں نے کھانا کھایا، نتاشا نے برتن سمیٹے۔ اظہر اسی چارپائی پر دراز ہو گیا جب کہ ساتھ والی چارپائی پر نتاشا دن بھر کے ارمان آنکھوں میں سجائے بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ فاصلے پر اس کی ساس صغراں خراٹوں سے پر نیند لیے بے خبر سو رہی تھی۔ اظہر نے بیوی کی طرف پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''آج تو پھر روئی ہے نا۔ تیری یہ خوب صورت آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں، تجھے کتنی بار کہا ہے۔ اماں کی باتوں کو دل پر نہ لیا کر اولاد تو اللہ کی دین ہے۔ جب چاہے نواز دے۔ تو یہ دل ہولا نہ کیا کر پگلی۔''

''تم بھی تو ماں کو نہیں سمجھاتے۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ ہاتھ ہر وقت آسمان کی طرف

Digitized by Google

اٹھائے رکھتی ہوں کہ شاید اب کی بار اس سونے آنگن میں بہار آجائے۔ پر تمہاری ماں پر تو جیسے جن بھوت سوار رہتا ہے۔ جو قابو میں نہیں آتا۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ اپنے کلیجے پر انگارے سہتی رہتی ہوں۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ رونے سے اس کا حسن خود کہہ رہا تھا۔ روتے ہوئے کو چپ کراؤ۔

اظہر نے جب ثناشا کو یوں روتے دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''بھلی لوکے!! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تجھے میری محبت پر اعتبار نہیں۔ اولاد بھی ہو جائے گی۔ اگر نہ بھی ہوئی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اس چاند جیسی صورت کو دیکھنے کے لیے ساری عمر گزار دوں گا۔ پر تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ چل اب چپ کر جا ورنہ میں بھی رو دوں گا۔'' اظہر اس کے پاس جا کر سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

''چل اب سو جا مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ میں تو سونے لگا ہوں۔''

یہ کہہ کر اظہر نے کروٹ بدلی اور خراٹوں میں ڈوب گیا۔ جب کہ ثناشا دور خلاؤں میں اپنی شادی کے بعد کی زندگی کے ایک ایک پل کو کھوجتی رہی۔ پھر نجانے کب سو گئی۔

صبح کی سنہری کرنیں ہر طرف سنہرا پانی پھیر رہی تھیں۔ جیسے ہر شے سونے میں نہا گئی ہو۔ کسان کھیتوں کا رخ کرنے کے لیے اپنے بیل جوتنے لگے۔ دوشیزائیں سر پر گھڑے رکھے کنوؤں کا رخ کرنے لگیں۔ وہ سبز پگڈنڈیوں سے گزرتی اپنی چوڑی کنگنا کھنکار کر ست رنگی چنری مستی بھری فضا میں لہرا رہی تھیں۔ گاؤں کے ہر گھر میں ناشتے کی دلفریب مہک بھوک کا احساس بیدار کرنے لگی۔ لوگ عام طور پر ناشتے میں پراٹھے، مکھن اور لسی کا استعمال کرتے۔ صغراں چولہے کے پاس بیٹھ کر دیسی گھی سے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر ثناشا چاٹی کو زور زور سے گھما رہی تھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے مکھن نکالا۔ اور ایک برتن میں ڈال کر سائیڈ پر رکھ دیا۔ اتنے میں کچھ خواتین لسی پینے آ گئیں۔ اظہر کی اپنی زمینیں تھیں۔ جن پر وہ فصل کاشت کرتا تھا۔ کچھ جانور بھی رکھے ہوئے تھے۔ جن کے لیے اس کے نوکر چارہ پانی کا انتظام کرتے۔ ثناشا جب سے اس گھر میں آئی تھی۔ فصل بہت اچھی ہو رہی تھی۔ اور جانور بھی دودھ زیادہ دینے لگے تھے۔ رزق تو عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

لیکن اس بات کو ثناشا کی ساس جانے تب ناں۔

''ثناشا آج مجھے زیادہ لسی دینا۔ میرے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں تمہارے ہاتھ کی لسی بہت پسند ہے۔'' پروین نے ڈول زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

ثناشا نے خاموشی سے لسی ڈال دی۔

''کون آیا ہے تیرے گھر میں، آج تک تو تم نے کسی کا ذکر نہیں چھیڑا۔ یہ اچانک ہماری لسی کی مہک دور دور تک کیسے جا پہنچی۔'' صغراں روٹی پر دیسی گھی لگاتے ہوئے بولی۔

بس زمیندارنی جی جدھر میرے میکے والے رہتے ہیں وہاں سے کچھ لوگ میرے گھر ٹھہرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

''ارے کیسے لوگ؟ کچھ پتہ بھی تو چلے۔'' صغراں حیران نظروں سے بولی۔

میرے گھر پیر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ آج دوپہر کا کھانا کھا کر واپس روانہ ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی، ان کو تعویز دیتے ہیں۔ تو اللہ کے حکم سے ان کی گود ہری ہو جاتی ہے۔ میں بس آپ سے ہی بات کرنے والی تھی۔ آپ اپنی بہو کو آج میرے گھر لے آنا۔ ہو سکتا ہے آپ کے آنگن میں بھی بہار آ جائے۔ پروین بولی۔

''بہن تمہیں تو پتہ ہے، میں نے کہاں کہاں سے تعویذ لیے ہیں، لیکن ہر دفعہ آس امید پر اوس پڑتے دکھائی دیتی ہے۔ تم کہتی ہو تو آج ہم آئیں گے تیرے گھر۔''

ثناشا اپنی جگہ پر بیٹھی ساری باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی دو مہینے پہلے وہ ساس کے ساتھ کسی مزار پر گئی

Digitized by Google

تھی۔ وہاں سے تعویز اور پانی لائی تھی۔ لیکن اس سے بھی کچھ فرق نہ پڑا۔ وہ پچھلے آٹھ سالوں سے یہ ہی تو کر رہی تھی۔ جدھر ساس لے جاتی خاموشی سے چل دیتی۔ آگے جو اس کا نصیب اور قسمت۔ سرخ آنکھوں کے ڈوروں میں چھپا ضبط اندر کی وحشت بن کر بہنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اب ادھر بیٹھی روتی رہے گی یا ناشتہ بھی کرے گی۔ تو مجھے کیا دشمن سمجھتی ہے۔ جو تم پر روز اتنا ظلم کرتی ہوں۔ یہ سونا اور ویران گھر دیکھ کر میرا کلیجہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ کتنا سمجھایا تھا اظہر کو ادھر شادی نہ کر۔ مگر اس پر تو تیرے پیار کی پٹی بندھی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے میں یہی آرزو لیے مٹی تلے جاسوؤں گی۔ باہر نکلتی ہوں تو ہر کوئی مجھ سے سوال کرتا ہے۔ آپا..... تم دوسری بہو کیوں نہیں لے آتیں۔ قسمت کو آزما کر بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ بات سنتے میرے منہ پر گرہ لگ جاتی ہے۔ لبوں پر قفل پڑ جاتے ہیں۔ اپنی بیٹی افشاں کا خیال آنے لگتا ہے۔ جس کی تیرے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی۔ اگر تجھ پر سوتن پڑ گئی تو افشاں کا بسا بسایا گھر برباد ہو جائے گا۔ جس کا ماشاء اللہ سے تیسرا بچہ ہونے والا ہے۔ کم بخت تیری قسمت تو اچھی نکلی۔ جو تجھے چھوڑتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کلہاڑی اپنے پاؤں پر آ گرتی ہے۔ اٹھ وہاں سے اور سمیٹ سارے برتن۔'' صغراں سارے دن کا غصہ ایک دفعہ ہی نکال کر صحن میں بچھی چارپائی پر چائے کا کپ لیے بیٹھ گئی۔ اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے شوہر کے آگے ناشتہ رکھنے لگی۔

''اماں کوئی ضرورت نہیں، نتاشا کو کسی کے گھر لے جانے کی۔'' مجھے اچھا نہیں لگتا اپنے گھر کی عزت یوں در در بھیجنے پر۔ تم خود چکر لگا آنا۔'' اظہر گرم روٹی توڑتے ہوئے بولا۔

''میں بھلا اکیلی کیوں جاؤں کوئی ایسے تعویز دیتا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ دیکھیں گے کوئی دم کریں گے، پھر کوئی امید کی کرن نظر آئے گی اور تمہیں کیوں برا لگتا ہے۔ میں کون سا اسے ہر طرف لیے پھرتی ہوں۔ جہاں لوگ کہتے ہیں، وہاں اس کو لے جاتی ہوں اور وہ بھی تم سے پوچھ کر۔ اولاد پانے کے لیے انسان کو مشکلات تو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔'' صغراں چائے کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بولی۔

''یوں اظہر کے منع کرنے پر نتاشا ہمسائی کے گھر نہ گئی تعویز لینے۔ ایک دن افشاں اپنے بچوں اور شوہر جو نتاشا کا بھائی تھا، سے ملنے آئی۔ آمنے سامنے کا رشتہ تھا۔ دونوں نند بھابی ایک دوسرے کے گلے لگیں۔ افشاں کے دو بچے تھے۔ دونوں کی عمریں بالترتیب تین چار سال تھیں۔ جب کہ تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔ تین سالہ شوکت کو نتاشا جی بھر کر پیار کرنے لگی۔ جیسے اپنی ساری مامتا وہ شوکت پر نچھاور کرنے لگی ہو۔ شوکت کے رونے سے پہلے وہ اس کا فیڈر بنا کر رکھتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے پلاتی۔ اس کو اپنی گود میں سلاتی۔ اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی رہتی۔ کبھی اس کے ساتھ بچہ بنی کھیلتی رہتی۔

آج اتنے عرصے بعد تو وہ کھل کر ہنسی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گالوں سے سرخی ٹپک رہی تھی۔ وہ شوکت کے ساتھ چند دن گزار کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ جیسے اس نے سینے کے آر پار ہونے والے طنز کبھی سنے ہی نہ ہوں۔ افشاں نتاشا کو یوں شوکت کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر اور اس کے دودھ پانی کا خیال رکھتے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ نتاشا کے پاس آئی۔ جو شوکت کے ساتھ دل بہلا رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''اللہ نے چاہا تو وہ تجھے اس سے بھی خوب صورت بیٹا نوازے گا۔''

تم شہر جا کر کسی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کیوں نہیں کرواتیں۔ افشاں شوکت کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولی۔

''میں اور شہر۔ اماں مجھے کبھی نہیں جانے دے گی اور پھر اظہر کو بالکل پسند نہیں کہ مجھے جگہ جگہ لے کر جائے۔ وہ کہتا ہے تم آرام سے گھر بیٹھو۔ جب حکم ہوگا تو اللہ چھپر پھاڑ کر دے گا۔''

''میں بات کرتی ہوں اماں سے آخر کوشش کرنے میں حرج کیا ہے۔'' افشاں تو چند دن رہنے کے بعد چلی گئی۔

Digitized by Google

اماں کے بار بار کہنے پر اظہر کسی طرح بھی راضی نہ ہوا کہ وہ بیوی کو شہر لے کر جائے۔ نتاشا اسے بھی قسمت کا لکھا سمجھ کر سہہ گئی۔ شوکت کے جانے کے بعد وہ بولائی بولائی پورے گھر میں پھرتی رہتی۔ اس کے ذہن میں ایک نئے خیال نے پرورش پائی۔ آج رات کو وہ اظہر سے بات کرے گی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد اظہر سونے کے لیے لیٹا تو نتاشا پاس بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے نتاشا کچھ کہنا چاہتی ہو۔'' اظہر بیوی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

پہلے وعدہ کرو میری بات نہیں ٹالو گے۔

میں پہلے تیری کون سی بات ٹالتا ہوں۔ ساری باتیں تو مانتا آیا ہوں۔ یہ بات بھی ماننے والی ہوئی تو ضرور مانوں گا۔ اظہر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

دیکھو نا جب سے افشاں گئی ہے گھر کیسا سونا ہو گیا ہے۔ مجھے ہر پل شوکت یاد آتا ہے۔ اگر تم کہو تو نتاشا بات کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

بولو بھئی کیا بات ہے۔ کھل کر بتاؤ مجھے۔

ہم کیوں نا شوکت کو گود لے لیں۔ ویسے بھی افشاں کا تیسرا بچہ ہونے والا ہے۔ وہ شوکت کی جگہ بھر دے گا۔ ہمارے آنگن میں بھی بہار آ جائے گی۔

اری نیک بخت یہ باتیں اماں نے سن لیں تو قیامت آ جائے گی۔ اپنی بہن سے اس کا جگر گوشہ کیوں چھینو۔ تمہیں یہ خیال آیا بھی کیسے۔ بھلا اس طرح کوئی اپنا بچہ کسی کے حوالے کرتا ہے۔ تم آج کے بعد یہ بات نہیں کرو گی۔ اظہر انگلی کے اشارے سے اسے سمجھانے لگا۔ شوہر کی بات سن کر نتاشا رونے لگی۔

تم رویا ہنسو لیکن آج کے بعد دوبارہ ایسی بات نہیں کہو گی۔ اب چپ کر جاؤ۔ اماں کی آنکھ کھل گئی تو ایک نیا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ بہتر ہے اس بات کو ادھر ہی دفن کر دو۔ تم بس خوش رہا کرو۔ اچھے اچھے کپڑے پہنا کرو۔ مجھے تم بنی ٹھنی بہت اچھی لگتی ہو اور میرے آنے کا انتظار کیا کرو بس۔

نتاشا شوہر کی بات سن کر سوچنے لگی۔ یہ کیسا مرد ہے۔ جسے صرف اپنی انا اور خوشی عزیز ہے۔ میری خوشی کی میری حسرتوں کی کوئی پروا نہیں لیکن پھر اس کے پاس شوہر کی بات ماننے کے علاوہ اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پھر اس نے کیا ہی کیا۔ اب وہ اداس نہیں ہوتی تھی۔ نہ روتی تھی، اس کے اندر اچانک تبدیلی آنے لگی تھی۔ اس نے حالات اور قسمت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اب خوش رہنے لگی تھی۔ اسے مان تھا اپنے شوہر پر جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا اور سب سے بڑھ کر ماں کے آگے بول جایا کرتا تھا۔ اس نے بھی بن سنور کر رہنا شروع کر دیا۔

بہو کے یہ انداز دیکھ کر صغراں دل ہی دل میں کڑھتی رہتی کہ بہو کا دماغ نجانے کیسے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ وہ تو اب خوش رہنے لگی ہے۔ ایک میں ہوں جو بروقت جلتی بھنتی رہتی ہوں۔ ہاں بیٹے کی ماں جو ٹھہری۔ کلیجہ بھی تو میرا ہی جلے گا۔ ناں۔

اظہر جب بیوی کو یوں بنا سنورا دیکھتا تو آنکھیں جھپکانا بھول جاتا۔ دونوں رات گئے تک ڈھیروں باتیں کرتے۔ نتاشا شوہر کے آنے سے پہلے گلاب کی پتیاں اس کی راہ میں بچھا دیتی۔ اظہر کے بکھیے پر اس کا نام گلاب کی پتیوں سے لکھتی۔ اور جب وہ رات کو کمرے میں داخل ہوتا تو پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو سے خود کو معطر پاتا۔ اس کی سرمے والی کالی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے کھو جاتا۔ تب چونکتا جب نتاشا کانوں کے پاس جا کر ہلکی سی سرگوشی کرتی۔

آج نتاشا نے زندگی میں پہلی بار شوہر سے گلاب کے گجروں کی فرمائش کی تھی۔ وہ بیوی کی فرمائش ہر حال میں پوری کرنا چاہتا تھا۔ سارے کام چھوڑ کر وہ شہر گیا اور کاغذ میں لپیٹے ماں سے چھپا کر گہنے لے آیا۔ اس کی گوری کلائیوں میں پہناتے ہوئے بولا۔

Digitized by Google

''نانا اولاد دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ لیکن جب تمہاری طرح نیک خوب صورت اور فرماں بردار بیوی ہو تو زندگی یوں بھی حسین لگتی ہے۔ نتاشا میں تم سے محبت کرتا رہا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ تمہیں چھوڑنے کا تو کبھی تصور بھی نہ کروں۔''

''یہ سب باتیں تم دل سے کہہ رہے ہو نا۔ کیونکہ میں نے سنا ہے مرد کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اگر تمہاری نیت میں ذرا سا بھی فتور آ گیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔''

''اللہ نہ کرے نتاشا کیسی باتیں کرتی ہو، تمہاری ذرا سی تکلیف پر ساری رات تمہارے سرہانے بیٹھ کر گزار دوں۔ خبردار جو ایسی بات پھر کی۔'' اظہر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

دن مہینے پہلے کی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ نتاشا کا نیا روپ دیکھ کر گاؤں کی دوسری عورتیں اس پر رشک کرنے لگیں۔ دیکھو تو شادی کو نواں سال چڑھنے والا ہے۔ یوں خوش پھر رہی ہے جیسے کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ یہ تو پہلے والی نتاشا رہی نہیں جو اداس اور پریشان رہتی تھی۔ ہاں سنا ہے اظہر اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا ہے۔ ہاں بھئی بیوی ہر وقت تیار رہے تو کون مرد پیچھے ہٹتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں۔

قسمت ہم پر تب تک مہربان رہتی ہے جب ہم اس سے نباہ کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ کمزور رشتوں میں دراڑ پڑتے دیر کہاں لگتی ہے۔ ان کی سولی پر لٹکتے رشتے ایک معمولی سی رنجش سے چکنا چور ہی تو ہو جاتے ہیں۔

کچھ دنوں سے صغراں کی بھانجی نسرین اپنی خالہ کو ملنے آئی ہوئی تھی۔ نسرین خیکھے نقوش کی لڑکی تھی۔ جسم قدرے فربہ اور قد درمیانہ تھا۔ رنگ سانولا اور آنکھیں ہرنی جیسی تھیں۔ اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑا۔ رات دن نسرین کو مارتا رہتا اور تشدد کا نشانہ بناتا رہتا۔ آخر خاندان کے بڑوں نے دونوں میں صلح کر کے اسے گھر لے آیا۔ سوتن بھی نرین کے ساتھ رہنے لگی۔ دونوں کی ہر وقت کی نوک جھوک سے تنگ آ کر شوہر نے نسرین کو شادی کے دو سال بعد طلاق دے دی۔ بچہ تو کوئی تھا نہیں انتظار کر لیے کرتا۔ طلاق کے تین بول کہہ کر اسے چند روپوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے میکے بھیج دیا۔ نسرین گاؤں میں پلی بڑی تھی۔ اس کا بچپن گاؤں کی ہر گلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ عدت پوری کرنے کے بعد بچپن کی یادیں تازہ کرنے اور خالہ سے ملنے کے بہانے وہ گاؤں دیکھنے چلی آئی تھی۔ کیونکہ صغراں بی بی کو چند دن پہلے گھٹنے کا شدید درد ہوا تھا اور وہ خالہ کی تیمارداری کرنے چلی آئی۔ گاؤں کی ہریالی سوندی سوندی سرسوں اور دیسی گھی کی مہک بھلا شہر میں کہاں ملتی ہے۔ نسرین کے رنگ ڈھنگ اور باتوں سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ طلاق یافتہ ہے۔ ہرنی جیسی آنکھیں جس کی طرف اٹھتیں۔ اسے دیوانہ کر لیتیں۔ باتوں میں اتنی تیز کہ خدا کی پناہ۔ آتے ہی اس نے خالہ کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ ان کے گھٹنے کی مالش کرتی، اور سر دباتی۔

نتاشا کو نسرین کا فری ہونا بالکل پسند نہیں تھا۔ سارا دن نتاشا کام کرتی رہتی۔ مجال ہے جو نسرین نے کسی کام کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ کچھ کہنے سے پہلے ہی جواب دے دیتی۔ کہ میں تو یہاں مہمان ہوں۔ چند دنوں کی بھلا کوئی مہمانوں سے بھی کام کرواتا ہے۔ اور پھر دونوں خالہ بھانجی باتوں میں مشغول ہو جاتیں۔

گرمیوں کے دن تھے۔ نتاشا آپی ہمسائی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ کہ اچانک اظہار دوپہر کو ہانپتا اور چیختا ہوا گھر آیا۔ اس کے ہاتھ کی انگلی پر کسی چیز نے ڈس لیا تھا۔ نتاشا کدھر ہو۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بیوی کو پکارنے لگا۔

ہے کیا ہو گیا اظہر پتر..... اماں نتاشا کہاں ہے۔ آ جائے گی ذرا ہمسائی تک گئی ہے۔ نسرین نے جب اظہر کی انگلی کو دیکھا تو فوراً سمجھ گئی کہ شہد کی مکھی نے کاٹا ہے۔ جو درد سے سوجھی ہوئی ہے۔

آپ کی انگلی پر تو شہد کی مکھی نے کاٹا ہے۔ جب تک ڈنگ اندر رہے گا آپ کو درد ہوتا رہے گا۔ ٹھہریں میں ڈنگ نکالتی ہوں۔ نسرین نے جونہی اظہر کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ خالہ آپ چولہے پر گرم پانی رکھیں۔ خالہ تو باہر چلی گئیں اور نسرین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے انگلی پکڑ کر اپنے دانتوں تلے زور سے دبا لی۔

Digitized by Google

ڈنک نکلنا تھا کہ انگلی سے خون بھی رسنے لگا۔ ادھر اظہر کی چیخ نکل گئی۔ اظہر کے گرم ہاتھوں سے جب نرم انگلیاں ٹکرائیں تو وہ دم بخود ہو گیا۔ فوراً اٹھا اور باہر آ گیا۔ صحن میں کھڑا ہوا تو ثناشا بھی آ گئی۔ اپنا سارا غصہ بیوی پر نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ تمہیں کیا پڑی تھی باہر جانے کی۔ وہ مجھے لگی......

شہد کی مکھی نے ڈنک مارا تھا۔ میں نے نکال دیا ہے۔ اب ان کی طبیعت ذرا ہولی ہوئی ہے۔ نسرین نے فوراً اظہار کی پوری بات کرنے سے پہلے اپنا تیر پھینک دیا۔ یہ عورت میرا گھر خراب کر کے دم لے گی۔ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ میرے سر پر۔ ثناشا دل میں سوچنے لگی۔ اب یوں بھی کہاں گئی تھی۔ اظہر انگلی دباتے ہوئے بولا۔

میں پروین کی طرف گئی تھی۔ اس کی بیٹی کو تین چار دل سے بخار تھا۔ اس کی طبیعت پوچھنے گئی تھی۔

تجھے کتنی دفعہ کہا ہے میری اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالا کر۔ اندر سے دوائی لا۔ اور میری پٹی کر، دیکھ کتنا خون نکل رہا ہے۔ پٹی نہیں اسے گرم پانی سے دھوئیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ نسرین نے کہا اور اظہار ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اندر کمرے میں چلا گیا۔

"دوسری عورت جب مرد کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو مرد کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ عورت کا لمس ایسی چیز ہے کہ مرد بار بار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نا چاہنے کے باوجود بھی وہی مرد جو کل بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ آج وہی اسے دھوکے اور آنسوؤں کے حوالے کر دیتا ہے۔"

نسرین دو ہفتے رہنے کے بعد میکے چلی گئی تو ثناشا نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد کوئی ہنگامہ کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ ثنا کی شادی کو دس سال پورے ہو گئے۔ صغراں بی بی کو ایک دن فالج کا اٹیک ہوا اور اس کا دائیں بازو مفلوج ہو کر رہ گیا۔ لیکن بہو پر اب بھی زبان ویسی چلتی تھی۔ ثناشا سارے گھر کا کام کرتی۔ اور ساس کی بھی خدمت کرتی۔ پھر بھی اس کو وہی جلے کٹے جلے سننے کو ملتے۔ محلے کی عورتیں صغراں بی بی کا حال پوچھنے آتیں تو جگر ثناشا کا چھلنی کر جاتیں۔ ارے بہن تم بیٹے کی دوسری شادی کیوں نہیں کر دیتیں۔ بھلا کبھی سوکھا درخت بھی ہرا ہوا ہے۔ جواب میں صغراں بی بی کی خاموشی ہو جاتی۔

اس بار باقی کسانوں کے مقابلے میں اظہر کے ہاں چاول کی فصل خوب اچھی ہوئی تو وہ اسی خوشی کے بہانے پہلی بار بیوی کو شہر لے گیا۔ چوڑیاں، کپڑے، جوتے غرض جس شے پر ثنا انگلی رکھتی وہی خرید کر دیتا رہا۔ ثناشا آج بالکل بچی بنی ہوئی تھی۔ آج وہ دل سے ہنس رہی تھی۔ یوں جیسے ایک ہفتہ ہی گزرا ہو اس کی شادی کو۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور شادمانی کی چمک دیکھ کر اظہر بھی خوش ہو رہا تھا۔ وہ اس کو خوش کرنے اس کے ناز اٹھانے ہی تو لایا تھا۔

ثناشا کو ماں کی یاد کافی دنوں سے ستا رہی تھی۔ رات ہوئی تو ثناشا نے شوہر سے بات کی کہ میں اپنی ماں سے مل آؤں۔ ہاں کیوں نہیں۔ ویسے بھی تمہیں چھ ماہ ہو گئے ہیں، میکے گئے ہوئے۔ میں تمہیں صبح چھوڑ آؤں گا۔ تیار رہنا۔ اظہر منہ دسری طرف کرتے ہوئے بولا۔ یوں شہر سے واپسی کے دو دن بعد ثناشا اپنی ماں کو ملنے میکے چی گئی۔ وہ جب بھی ماں سے ملنے جاتی ایک رات بھی نہ رہتی۔ صبح جاتی اور شام کو لوٹ آتی۔ حالانکہ ماں بہت اصرار کرتی کہ تم چھ ماہ بعد آتی ہو اور یہ کیا صرف منہ دکھانے آتی ہو یوں جواب میں ثناشا بس یہی کہتی۔ اماں اظہر کو میرے ہاتھ کی روٹی بہت پسند ہے۔ وہ کسی اور کے ہاتھ کی روٹی کھانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن آج تو میرے پاس ایک رات ضرور رہے گی۔ میں تجھے ایسے نہیں جانے دوں گی۔ تجھ سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ تیرا سونا مکھ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اس رات دونوں ماں بیٹی نے دل کھول کر باتیں کیں۔ ماں ثناشا کو آنے والے دنوں کے لیے مطمئن کرتی رہی۔ اس کے اندر صبر کا مادہ بھری رہی۔ جاتے ہوئے اسے کامیاب زندگی اور ہمت و برداشت کی ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اگلے دن گھر پہنچی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ جلد از جلد اظہر کے پاس جانا چاہتی تھی کیونکہ شادی کے بعد شاید یہ پہلی

Digitized by Google

رات تھی وج اس نے اکیلے گزر دی تھی۔ صحن میں قدم رکھا تو اس کے کمرے سے ہنسنے اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر حیرانیوں اور وسوسوں نے جنم لیا۔ آج تک میرے کمرے میں کسی چڑیا نے پر نہیں مارا۔ یہ باتوں کی اور ہنسنے کی آوازیں کہاں سے آنے لیں، تماشا نے دماغ کو زور سے جھٹکا دے کر اسے اصل حالت میں لانا چاہا، ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔

اظہر تو ابھی زمینوں سے واپس نہیں آیا۔ وہ تو رات کو آتا ہے، دل کو تسلی دیتے ہوئے برآمدے میں قدم رکھتے ہی جب اسی کانوں پڑی آواز سنائی دی۔

''آج سے میں ساری زمینیں تیرے نام کرتا ہوں۔ تجھ سے نکاح کر کے آج تو نے مجھے اتنی بڑی خوشی دی ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ زمین کیا میرا بس چلتا تو چاند تارے توڑ کر تیری مانگ میں بھر دیتا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اظہر مارے خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ آپ نے دنیا کی ہر چیز میری قدموں میں ڈال دی۔ تو کی امیں آپ کو یہ خوشی نہیں دے سکتی تھی۔'' اظہر اور نسرین اپنے چھ ماہ کے بیٹے کے وارے نیارے جا رہے تھے۔

اور وہ زمین میں زندہ دفن ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے زخمی دل اور مردہ ارمانوں کی ساتھ۔

☆.....☆.....☆

بدصورت

عشاء غدو

کلب میں بے شمار لڑکے اور لڑکیاں میوزک کے نام پہ بے ہنگم شور شرابے میں بری طرح سے ناچ رہے تھیں۔ کچھ لوگ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آ جا رہے تھے، نائٹ پب میں آج ڈسکو نائیٹ منائی جا رہی تھی۔ سارا پب رنگین لائٹوں سے منور ہو رہا تھا۔

ایک لڑکی شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑا رہی تھی۔ یہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی اور حسن میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی بل سے ٹکرا گئی۔ بل جو پوری شدت سے بے ہنگم ناچ رہا تھا، ایک دم سے وہ رک کر اپنے کندھے کو دیکھنے لگا۔ اس لڑکی کے گلے میں ایک خوبصورت سونے کی چین تھی اور اس پر ناچتی ہوئی لڑکی کی شبیہہ بنی تھی۔ پہلے اس نے لڑکی کا جائزہ لیا، اور وہ اسے پہلی نظر میں اچھی لگی۔ لڑکی ہو تو تم جیسی! بل نے دل ہی دل میں کہا۔

برلن میں اس پب کے اندر جو بے ہنگم ناچ گانا ہو رہا تھا، وہ صرف اور صرف اس خوشی میں ہو رہا تھا، کہ روس کی فٹ بال ٹیم نے سعودی عربیہ کو بدترین شکست سے دوچار کیا تھا۔ سب بے حد خوش تھے۔ اور بل خود بھی ایک انٹرجیٹک اور خوبصورت لڑکا تھا۔ اسے خوبصورتی اٹریکٹ بھی کرتی تھی۔ اس لیے اس کی کمزوری خوبصورت لوگ تھے۔ اور یہ لڑکی جو بے حد خوبصورت تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ بل نے ہاتھ بڑھا کر اس کو سنبھال لیا، اب وہ گر نہیں رہی تھی۔

باہر چلے! بل نے پوچھا۔ مگر پب کے اندر بے ہنگم میوزک کی ایسی تیز آواز تھی۔ کہ اس لڑکی نے کچھ بھی نہیں سنا۔ بل نے پی نہیں تھی۔ مگر وہ لڑکی پوری طرح نشے میں دھت تھی، اور اسی وجہ سے چاروں شانے چت ہو رہی تھی۔

باہر چلے، یہاں بات نہیں ہو سکے گی۔ بل نے اس کے کندھے کو جھنجوڑ ڈالا۔ لڑکی نے خمار الود نظروں سے بل کو دیکھا، پھر اس کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ بل اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر گھما کر پب سے باہر نکالنے لگا۔ اور ایسا کرنے میں اسے کافی مشکل پیش آئی۔ کیونکہ لوگوں کا ناختم ہونے والا ہجوم تھا، بل ایک ایک کو ہٹاتا ہوا آگے، جانے لگا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ دونوں پب سے باہر تھے۔

Digitized by Google

باہر رات کی تاریکی نہ ہونے کے برابر تھی، کیونکہ رات کی تاریکی کو شہر کی روشنیوں نے دور بھگا دیا تھا۔
وہ لڑکی ابھی بھی بل کے سہارے کھڑی تھی۔
تم کہاں سے ہو؟ بل نے معلوم کرنا چاہا۔ کہ وہ کون ہے؟
میں۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ بے ہوش ہوگئی، اور بل کے ہاتھوں میں لٹک گئی۔
اوہ! ایک نئی مصیبت گلے پڑ گئی۔ بل نے اسے بانہوں میں اٹھایا۔ اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے گاڑی کا لاک دروازہ کھول دیا۔ اور اسے بیک سیٹ پر ڈال دیا۔ پھر اس کی پرس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کا آئی ڈی کارڈ اس نے بیگ میں کافی سرچ کیا، پر میک اپ، اور پیسوں کے علاوہ بل کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا۔ اس لیے بل کو اس کا نام، اور رہائش کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔
میں اس حسین بلا کو کہاں لے جا سکتا ہوں۔ وہ سوچنے لگا، بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت گلے پڑ چکی ہے۔
وہ کار میں بیٹھا، اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی، اور کار سٹارٹ ہوگئی۔ بیک سیٹ پر پڑی لڑکی کی آنکھیں جھٹکے سے کھل گئیں، مگر وہ بدستور اسی طرح پڑی رہیں۔ اس کے خدوخال تبدیل ہونے لگے۔
اب کار، سڑک پر رواں دواں تھی۔ ''واہ بل آج تو قدرت نے خود مجھے ایک خوبصورت موقع فراہم کر دیا ہے۔ کیوں نہ اس موقع سے خوب فائدہ اٹھالوں۔'' بل دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اس نے بیک مرر میں لڑکی کو دیکھا، وہ اسی طرح گاڑی میں پڑی تھی۔
وہ بہت امیر تھا اور آج کل تنہا بھی تھا۔ اس کی بیوی نکی ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ اور بل اس کے بعد ایک تنہا مرد تھا، کئی لڑکیوں نے اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کو چاہتا نہ تھا۔ دراصل وہ اپنے بزنس کو پورا ٹائم دے رہا تھا۔ اس لیے وہ کسی لڑکی کے ساتھ اٹریکٹ نہ ہو سکا۔
اس کے پاس سب کچھ تھا۔ مگر پیار نہیں تھا، اور جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ تب اس کی زندگی میں پیار تھا۔ اس نے سب کچھ حاصل کرنے کے لیے پیار کی قربانی دے دی۔

.....☆☆.....

نکی ایک پینتیس سال کی عورت تھی مگر، وہ کئی شوہروں کو بھگتنے کے بعد، بلا آخر اس نے شادی کے نام سے توبہ کر لی۔ وہ ایک کامیاب بزنس وومن تھی، کارپوریٹ میں وہ ایک معتبر نام تھی۔ اس کے بزنس کی ساکھ بہت مضبوط تھی۔ اس کی پانچ کی پانچ شادیاں بے دریے ناکام ہو چکی تھی۔ وجہ اس کی بدصورتی تھی۔ اس نے اپنے بدصورت چہرے کو دولت سے بدلنے کی بہت کوشش کی، مگر ہر بار پلاسٹک سرجری کے بعد وہ مزید بری لگتی۔ پہلی شادی اس کی بیس سال کی عمر میں ہوئی، اس کا شوہر ایک امیر ترین شخصیت تھا، مگر امیری تو نکی کو بھی وراثت میں ملی تھی، اور اس آدمی نے صرف دولت کی وجہ سے اس کے ساتھ شادی کی۔ کہ اس کی دولت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ تبھی وہ، شادی کے بعد اسے وہ پیار نہ دے سکا۔ جو نکی کا حق تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتا۔ اور نکی کو دیکھتا تک نہیں تھا۔ مگر نکی تب اتنی بدصورت تو نہیں تھی۔ وہ گندمی رنگ کی مالک تھی۔ اچانک وہ بال جڑ نامی بیماری کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بال جگہ جگہ سے گنج پن کا شکار ہو گئے۔ اس نے اس بیماری کے روک تھام کے لیے خوب کوشش کی، مگر وہ پوری طرح سے گنجی ہو گئی۔ ایک تو بدصورت تھی۔ اوپر سے گنج پن نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ اس لیے میکل نے اس کو طلاق دے دی۔ وہ بہت روئی، مگر نا کام شادی کامیاب نہیں کرا سکی۔
دوسری شادی اس کی بہت جلد ہو گئی، اس کے گھر یلوں نوکر ایڈم سے!
ایڈم تو غریب تھا، مگر دل کا اچھا تھا۔ بس اس کی ایک بیماری تھی، اور وہ جب بات کرتا، تو اس کے منہ سے بدبو کے

Digitized by Google

بھکے اٹھ کر سامنے کھڑے شخص کو پاگل کر دیتے۔ اس لیے اس بار نکی نے ایڈم کی بیماری برداشت نہیں کی۔ اور اسے چھوڑ دیا۔ ایڈم کا خوبصورت وجود اس کے بیماری نے پس منظر میں گم کر دیا تھا۔ اور وہ تنہائی میں اس کی یہ بیماری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ شادی اس کے گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اس لیے نکی کے باپ نے ایڈم کا علاج شروع کر دیا۔ مگر بیماری کا پتہ لگتے ہی کہ اس کے حلق اور پاخانے کا پھیپھڑا جو اندر سے زخمی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ فوراً اپنی بیٹی کے فیصلے کو سراہا۔ اور ایڈم کو چلتا کر دیا۔ نکی اکلوتی اولاد تھی، اس کا باپ نکی کا گھر بسانا چاہتا تھا۔ اور زندگی میں سب کچھ نکی کے نام کر دیا تھا۔ وہ نکی کے بچے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ مگر اس کی بیٹی کے بدصورت چہرے کی وجہ سے اس کی زندگی مشکلات کا شکار ہو گئی تھیں۔ اس لیے دو شادیوں کے پے، در پے ناکامی کے بعد، نکی کے باپ نے اس کو بزنس میں مصروف کر لیا۔ ایک سال کے بعد جو بھی نکی کو دیکھتا، ایک بار دیکھنے کے بعد نگاہ چرا لیتا، اس کے چہرے کا گوشت جگہ جگہ سے لٹک گیا۔ اس کی ناک چپٹی ہو گئی، اور ہونٹ بھر بھرے، جیسے پھولے ہوئے غبارے! یہ سب ایک بیماری تھی، جس میں انسان وقت سے پہلے بوڑھا ہونے لگتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت عمر کا ہو چکا ہے۔ شروع شروع میں تو نکی نے پلاسٹک سرجریز کے سہارے سے بیماری کو قابو کیا، مگر وہ اس میں ناکام ہو گئی۔ اور یہ غم نکی کے باپ کی جان لینے پر تل گیا۔ وہ پیسہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ مگر بیماری رکنے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی جھریاں نظر آنے لگیں۔

تب اپنی دولت اور جائیداد کو، بطور ہتھیار بنا کر اس کے باپ نے پیپر میں اشتہار دیا۔

جو میری بیٹی نکی سے شادی کرے گا اور شادی دو سال تک نباہے گا، میں اپنی جائیداد اس کے نام کر دوں گا۔ نیچے نمبر اور ایڈریس لکھا تھا۔

اشتہار کے آنے کے بعد تو جیسے نکی کے لیے رشتوں کی لائن لگ گئیں، اس کے باپ نے ایک غریب لڑکے کو نکی کے لیے چن لیا۔ نکی بھی اپنی بیماری کا مقابلہ کر رہی تھی تو اس نے ہاں کر دی، مگر اسے پتہ تھا کہ اس کے بدصورت وجود نے اس کی یہ والی شادی بھی ناکام کر دینی ہے۔ کیونکہ وہ بھی تو کسی کی بیماری برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اور اسے چھوڑ دیا تھا۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اور شروع میں نکی اسٹیبل کے ساتھ خوش بھی بہت تھی۔ دونوں ہنی مون پر کئی ملکوں کی سیر پر بھی گئے۔ مگر شادی کے بعد اسٹیبل، گم صم اور پریشان رہنے لگا، اسے لگنے لگا، کہ نکی کے ساتھ رہتے ہوئے یہ بوڑھے پن کی بیماری کہیں اس میں نہ منتقل ہو جائے، اس لیے اسٹیبل نے نکی سے دور ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ اسٹیبل جو کچھ نکی اور اس کے باپ سے ہتھیا سکتا تھا، ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ نکی کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تیسری شادی سے وہ خوش تھی، مگر یہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس شادی کی ناکامی نے نکی سے زیادہ اس کے باپ جوزف پر اثر ڈالا۔

اس بار نکی نے بزنس اور علاج میں خود کو مصروف کر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آئندہ اس کی زندگی مذاق بنے۔ اس لیے وہ دن رات محنت کرنے لگی۔ اور اپنے بزنس اتنا پھیلا دیا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔

اس کا باپ، نکی کی اولاد چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی شادی پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ مگر نکی اب اپنی زندگی کے ساتھ مذاق نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس بار اس کے باپ نے ٹھیک دو مہینے کے بعد ہی ایک درمیانہ درجے والا مرد ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کاٹ کا مالک تھا، اور اس کا چھوٹا قد جو تین فٹ اور گیارہ انچ کا تھا۔ مضحکہ خیزی کا سبب بنتا رہا تھا۔ چھوٹے قد کی وجہ سے وہ آدمی بدصورت لگتا تھا، اور اس لیے اسے معاشرے نے قبول نہیں کیا تھا۔ نکی کے باپ کا خیال تھا، کہ اس بار شادی کامیاب ہو گی۔ مگر تین شادیوں کے طلاق کے بعد نکی ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اور اس نے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس بار جیسن نے اسے یقین دلایا کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہو گا۔ تب بہت مشکلوں سے نکی اور ماٹھے قد کے مالک جیسن کی شادی ہو گئی۔ اور یہ شادی کافی لمبے عرصے تک چلی۔ مگر نکی کا باپ اپنی آخری خواہش لیے قبر میں چلا گیا۔ کیونکہ اس شادی سے نکی اور جیسن کی کوئی بھی اولاد پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ جیسن بانجھ تھا۔ یہ بات جیسن نے نکی اور اس

Digitized by Google

کے باپ سے چھپائی تھی۔ ورنہ جوزف اپنی بیٹی نکی کی شادی کبھی بھی بانجھ مرد سے ہرگز نہ کرواتا۔
اب نکی ۳۰ (تیس) سال کی اور جیسن ۲۲ (بائیس) سال کے تھے، مگر ان دونوں میں اب جھگڑے شروع ہو گئے۔ کیونکہ جیسن اس کے ساتھ بے وفائی کرنے لگ گیا تھا۔ اب جیسن کے پاس نکی کے باپ کے دیے ہوئے پیسے تھے۔ اور وہ کافی خوش تھا۔ وہ ڈرنگ کرنے لگا تھا۔ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ آنے جانے لگا تھا۔ بقول نکی کے وہ اپنی اوقات بھول چکا تھا۔ نکی بدستور اپنا علاج کرانے میں مصروف تھی۔ مگر اس کو کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ دن بدن وہ کارپوریٹ مارکیٹ میں اپنی ساکھ مضبوط کر رہی تھی۔ اور ایک دن اس نے بھی عدالت کے تحت جیسن سے علیحدگی حاصل کر لی۔ اب وہ اکیلی تھی۔ اور زندگی سے خوش بھی تھی۔ وہ اب شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی عرصے تک وہ اکیلی رہی۔ کئی سال گزر گئے۔ اس بار وہ کوئی بچہ ایڈاپٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ اور اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہی تھی۔ پانچ سال کا عرصہ اس نے اکیلے اور سخت محنت کرتے ہوئے گزارا۔

......☆☆......

بل یونی سے باہر نکلا، تو ازبیلا اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی۔ اور اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ "بل تم یونی سے فارغ ہو گئے۔ اب تم جلدی سے کوئی سا بھی اچھا جاب ڈھونڈ لو، اور مجھ سے شادی کر لو۔"
ہاں بالکل اب یہی تو زندگی میں کرنا ہے۔ بل نے سائیکل کے ہینڈل کو پکڑا، اور اسے سائیکلوں کے بیچ میں سے نکالنے لگا۔ وہ سائیکل پر بیٹھ گیا۔ اور اس کے آگے ازبیلا بیٹھ گئی۔ اب وہ سائیکل چلا رہا تھا۔
ازبیلا! کہاں جائیے؟ بل نے پوچھا۔ آج میں تمہیں تمہاری من پسند ڈش کھلاؤں گا۔
اوہ! تو تم مجھے بیچ کارنر لے جاؤں، وہاں آج خوب ہلا گلہ ہو رہا ہے۔ ازبیلا نے کہا۔
ابھی لے جاتا ہوں، بل نے کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اور اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا۔ وہ اور ازبیلا ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مگر بل یونی میں پڑھ رہا تھا، اور پارٹ ٹائم جاب کر رہا تھا۔ اس لیے اس کا گزارہ ہو رہا تھا۔ مگر اب اسے جاب ڈھونڈنی تھی، اور زندگی میں کچھ نہ کچھ بن جانا تھا۔ بل ایک اکیلا نوجوان تھا، بہت سے دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح اس کے ماں باپ کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، کہ وہ کیسے اور کب اور کس بیس پر اس دنیا میں پیدا ہوا، اور وہ اپنے ماں باپ کی جائز اولاد تھا بھی یا نہیں؟ مگر اس کی ابتدائی پرورش یتیم خانے میں ہوئی، اور وہ زندگی بھر خود کو یتیم ہی کہتا رہا تھا۔
اس کی سائیکل بیچ کارنر پر رک گئی، اور ازبیلا کھو دگئی۔ بل نے سائیکل ایک طرف روکی، اور ازبیلا کے پاس آ گیا۔ ماحول میں اچھی رنگینی تھی۔ لوگ بیچ میں کھڑے، نعرے بازی کر رہے تھے۔ کچھ سمندر میں نہا رہے تھے۔ اور کچھ جھینگے کھا رہے تھے۔ وہاں ایک جوڑا فٹ بال سے کھیل رہا تھا۔
ازبیلا، بھی ایک طرف بیٹھ گئی، بل دوڑتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دونوں مستقبل کی باتیں کرنے لگیں۔ اور ہنسی خوشی وہ لمحے گزارنے لگے۔ جو قابل تعریف تھے۔

......☆☆......

نکی اس دن یتیم خانے گئی ہوئی تھی، مگر اس کو کوئی بھی چھوٹا نومولود بچہ نہ مل سکا۔ کیونکہ یتیم خانے کے سارے بچے بڑے اور بدتمیز تھے، اور اسے بدتمیز لوگوں سے چڑ تھی۔ اس لیے اسے واپس خالی ہاتھ جانا پڑا۔ واپس جانے کے بعد اس کے چہرے کے خدوخال، بہت بدصورت ہو گئے تھے، اس لیے وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس لندن چلی گئی۔ اس بار لندن میں اس نے سرجری کے ساتھ، ساتھ دوسری مکمل چیک اپ بھی کیا۔ اس نے اپنے سارے ٹیسٹ کیے۔ اور اس کی رپورٹس نارمل آئی، وہ نارمل طریقے سے ماں بن سکتی تھی۔ مگر اگر اس کے ساتھ کوئی شادی کرتا تو وہ ماں کے رتبے پر فائز ہو سکتی تھی۔ چار شادیوں کے ناکامی کے بعد وہ کافی حد تک ڈر چکی تھی۔ اور ایک نیا تجربہ کرنے سے کترا رہی تھی۔ مگر

Digitized by Google

ڈاکٹر واٹسن نے اسے حوصلہ دیا۔ اور اسے کافی سمجھایا کے دنیا میں اب بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ تم کسی کو ڈھونڈ لوں، اور ڈیل کر کے اس کے ساتھ شادی کرلوں، جب تم ماں بن جاؤں، تو اگر وہ چاہے تو اس سے علیحدہ ہو جانا، اگر نہ چاہے تو ساتھ رہنا، ورنہ دوسری صورت میں تمہیں سوروگیٹس ممی بننا ہوگا۔ سوروگیسی کا طریقہ نیا طریقہ تھا، اور یہ ان عورتوں کے لیے تھا، جو بانجھ تھی۔ یا پھر ماں بننے کے عمل میں پیچیدگیوں کا شکار ہو چکی تھی۔ مگر ڈاکٹر واٹسن اسے جو امید دے سکتا تھا، دے چکا تھا۔ اور اس نے اس بات پر سوچنا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر اسے سوروگیسی کے ذریعے بے بی پیدا نہیں کرنا تھا، اسے نارمل بے بی چاہیے تھا۔ وہ واپس برلن آ گئی۔

......☆☆......

وہ پینتیس سال کی تھی، اور بہت بڑے بزنس ایمپائر کی مالک تھی۔ اس کی کمپنی میں نئی برتیاں ہو رہی تھی۔ اور ہیڈ ہونے کی وجہ سے وہ خود انٹرویوز لے رہی تھیں۔ اور جب اس کی نظر انٹرویو، میں آئے ہوئے بل پر پڑی، تو اسے وہ کافی حد تک اچھا لگا۔ کسی کو زندگی میں کوئی تو اچھا لگا۔ اور وہ بھی پہلی دفعہ! اس سے پہلے جن چار مردوں سے اس کی شادی ہوئی تھی، وہ اس کی مجبوری تھی۔ ان شادیوں میں کوئی محبت نہیں تھی۔ اس لیے وہ کوئی پسند ناپسند کے معیار تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ بس ہو گئی تھی۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے بل کے کاغذات اچھے طریقے سے دیکھ لیے، تو اسے خوشگوار حیرت ہوئی، کیونکہ بل ایک یتیم تھا۔ اور اس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ اس نے بل سے سوالات پوچھنے شروع کر دیئیں۔ تو بل اسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے ایک بار دیکھ چکا تھا۔ اب نیچے دیکھ رہا تھا۔ اس کی وجہ بل کی وہ حیرانی تھی، جو باقی سب کو تھی، وہ عمر میں پینتیس سال کی تھی۔ مگر لگتی ساٹھ سال کی تھی۔ اس لیے کہ اس کی بیماری ہی ایسی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سرجری کروائی تھی۔ مگر یہ سرجری اتنی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ بل چلا گیا۔ اور باقی سارے انٹرویوز بھی آرام سے ہو گئے۔ اس نے بل کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اسے یہ پوسٹ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ چاہے پیار سے یا پھر ڈیل سے۔ مگر وہ بل کو اپنانا چاہ رہی تھی۔

اگلا دن بل کی زندگی کا بہترین دن تھا، اسے خود کمپنی کے طرف سے جوائن کرنے کا لیٹر مل چکا تھا۔ اسے اتنی جلدی امید تو نہیں تھی۔ مگر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس لیے وہ ازبیلا کے پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کے بکے تھا۔ اور وہ آتے ہی اس کے گلے کا ہار بن گیا۔ اور اسے باہنوں میں اٹھا کر کہا۔

ازبیلا مجھے جاب مل گئی۔ یہ دیکھوں میرا جوائننگ لیٹر۔ اس نے کاغذ ازبیلا کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

تو اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ کل سے تمہیں جوتوں کی دکان پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ازبیلا خوشی سے اچھل پڑی۔

ہاں بالکل! اب دیکھنا تم، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ہم دونوں ایک ہو جائینگے۔

مجھے تم پر یقین تھا ڈیئر! ازبیلا نے اس کے گلے لگتے ہی کہا۔

اور مجھے خود پے! اب میں پیسے جمع کروں گا، تا کہ میں ایک اچھا گھر بنا سکوں۔ اور پھر تم اس گھر کو سجاؤں، سنواروں اور جب میں شام کو تھکا تھکا گھر کو لوٹ آؤں، تو تم میرے پیر دباؤں۔ اور پھر ہم اچھی ساڈنر کرنے باہر چلے۔ اور پھر کسی اچھے سائن پلیکس میں نئی موووی دیکھیں۔

ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا۔ تم بھی پورے پاگل ہوں! ازبیلا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

ہاں تمہارے پیار میں پاگل ہو چکا ہوں۔ بل نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔

ویسے ابھی تو انجوائے کر دوں! شادی کے بعد بچے اور پھر اس کو سنبھالنے کی مصیبتیں! تم مرد کیا جانوں کے ہم عورتیں گھر کیسے چلاتی ہیں۔

میں تمہارے بچے بہت پیار سے پالوں گا۔ بل ہنسا۔

Digitized by Google

کیوں کیا وہ تمہارے بچے نہیں ہونگے۔ ازبیلا برا مان گئی۔
اوہ! وہ تو ہم دونوں کے بچے ہونگے۔ اور ہم دونوں ان کو بہت پیار سے پالے گے۔ اور ان کی ہر خواہش کو پورا کرینگے۔ بل نے دونوں ہاتھوں سے ازبیلا کا چہرہ پکڑا۔
ہاں بالکل، اور ہماری زندگی بہت مثالی ہوں گی۔
ہاہا، وہ دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔

.....☆☆.....

آج بل کا آفس میں پہلا دن تھا۔ اور وہ اپنا دل کام میں لگانے کی پورا پورا کوشش کر رہا تھا، مگر اس کے پاس کچھ خاص کام تھا ہی نہیں، جس وجہ سے وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے کیبن میں بیٹھا ہوا کبھی اس طرف دیکھتا، تو کبھی اس طرف، اس کی تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔ اور وہ اس جاب سے بے حد خوش بھی تھا اچانک اسے انٹر کام پر اس کی باس نے اپنے روم میں طلب کیا۔
وہ اٹھا اور اپنی لیڈی باس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اجازت لی، اور باس کے سامنے بیٹھ گیا۔
بل! آج تمہارا پہلا دن کیسا ہوگا۔ یہ تم پر ہے کہ تم پہلے دن یہاں پوری طرح سے گزار پاؤ گے یا نہیں؟ نکی نے اس کی طرف آنکھیں چھوٹی کر کے کہا۔
میم! میں سمجھا نہیں۔ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی بدصورت چہرے والی عورت کو دیکھا۔ اس پر دوسری نگاہ ڈالنا تک وہ نہیں چاہ رہا تھا۔
بل! تم ایک نوجوان ہوں، غریب ہوں اور میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتی ہوں، اگر تم امیر بننا چاہو، تو بہت آسان طریقہ ہے۔
مگر، مجھے تو نوکری مل چکی ہے، اور میں اپنی اس جاب سے خوش ہوں۔ بل نے قدرے جتایا۔
تمہیں یہ نوکری میں نے دی، تم تو اس پوسٹ کے قابل نہیں نہیں ہوں اور نہ تم اس پوسٹ کے اہل تھے۔ نکی نے لہجہ قدرے سخت کیا۔
میں تمہارا مشکور ہوں، اور زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ بل نے نکی سے کہا۔
اگر تم چاہتے ہو کہ تم میری آدھی جائیداد، اور اس کمپنی کے مالک بن جاؤں، تو تمہیں ایک کام کرنا ہوں گا۔
بل اسے حیرت سے دیکھنے لگا، اسے لگنے لگا کہ اس نے کبھی پی تو نہیں ہے۔ اور اس لیے وہ ہوش میں نہیں ہے۔
تم مجھے حیرانگی سے نہ دیکھوں، میں سچ کہہ رہی ہوں، تم چاہتے ہوں کہ تم امیر بنوں، اور دولت مند کہلاؤں۔ نکی اسے دیکھنے لگی۔
ہاں دولت مند ہونا تو ہر کسی کی خواہش ہوتی ہیں، کہ وہ دولت مند ہوں۔ بل نے سمپل سی مثال دی۔
جی بالکل! مگر میں تم سے پوچھ رہی ہوں، میں نے تمہیں نوکری اس لیے دی، کیونکہ تم غربت میں پلے بڑھے ہوں، اور تم کو اس نوکری کی ضرورت تھی۔ مگر تم اس پوسٹ کے اہل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکھا کیونکہ تم مجھے پسند آئے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلوں۔ میں آدھی پراپرٹی تمہارے نام کردوں گی۔ اور یہ کمپنی بھی! نکی رُکی۔ اور اس نے بل کو دیکھا۔ بل کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، اور ایک جارہا تھا۔ وہ حیرت سے سامنے اس بدصورت عورت کو دیکھ رہا تھا۔
بل نے نکی کے چہرے کو دیکھا، وہ اس دنیا کا سب سے عجیب چہرہ تھا، اور اسے لگا کہ یہ بڑھیا سٹھیا گئی ہیں۔ تبھی ایسی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔ یا پھر یہ نشے میں ہے۔
اور تم اگر انکار کرتے ہوں، تو تم کو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونے ہونگے۔ نکی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

Digitized by Google

بل نے دونوں ہونٹ آپس میں جمائے۔ وہ بدستور اسی طرح خاموش تھا۔
ہاں، شادی سے پہلے میری کچھ شرائط ہیں۔ نکی نے اس سے پوچھا، وہ دوٹوک ایسی بات کررہی تھی، جیسے کہ کسی چیز کا سودا کررہی ہوں۔
کیسی شرائط؟ بل کو اپنا منہ کھولنا ہی پڑا۔
دراصل بل، تمہاری طرح میں بھی اکیلی ہوں، اور میرے مرنے کے بعد یہ سب کچھ ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں شادی کرلوں، اور اس جائیداد کا کوئی ایک وارث پیدا کرلوں۔ میں اور تم تب تک شادی کے بندھن میں بندھے رہے گے، جب تک میں ماں نہیں بن جاتی۔ نکی نے اسے دیکھا۔
مگر میم! مجھے نہیں لگتا کہ آپ ماں بن پائے گی۔ یا کسی زندہ وجود کو جنم دے پاؤں گی۔ بل نے جلدی سے کہا، اس بدصورت بڑھیا کو دیکھوں اور اس کی خواہش کو دیکھوں، بل دل میں گویاں ہوا۔
کیوں کہا، تم نے ایسا کہ میں ماں نہیں بن سکتی؟ نکی جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔
میم! آپ کی ایج، کتنی زیادہ ہوگئی ہے۔ بل نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا کر کہا۔
میری عمر صرف پینتیس سال ہے، اور یہ سب بکواس جو میں کررہی ہوں۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرکے کررہی ہوں۔
مگر آپ تو بہت زیادہ عمر کی لگتی۔ بل بات کرنے والا تھا۔ کہ نکی نے اس کی بات کاٹ دی۔
لگتی ہوں، مگر ہوں نہیں بل، یہ ایک قسم کی بیماری ہے، جو لاکھوں میں سے کسی ایک انسان کو لگتی ہے، اس میں انسان وقت سے پہلا بوڑھا اور اس کا چہرہ بدصورت ہو جاتا ہے۔ میں اس بیماری کا شکار ہوں، میری صرف ظاہری حالت ایسی ہے، اندر سے میری عمر اس جوان عورت کی سی ہیں، جس کے اندر جذبات کا ٹاٹھے مارتا سمندر موجزن ہوتا ہے۔
او کے میم! میں اس بارے میں کل تک سوچ کر جواب دوں گا۔ بل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔ نکی نے بھی اسے روکا نہیں جانے دیا۔ اور وہ اپنے روم کے بلڈنگ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اور اب وہ آفس سے باہر تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ وہ سیدھا چلتا گیا۔ اور اب وہ سڑک کنارے سست قدموں سے جارہا تھا۔ وہ نجانے کتنی دیر چلتا رہا اسے کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ وہ کافی دیر تک اور بہت دور تک آگیا تھا۔ مگر اس کا دل اور دماغ میں ایک جنگ چڑ گئی تھی۔ وہ دل سے بے بس تھا، کتنے عرصے سے ازیلا کو چاہتا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا بھی تھی، کہ وہ امیر بن سکے۔ اب قسمت اسے ایک موقع دے رہی تھی۔ تو وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا تھا۔
وہ بہت جلد اور کم عرصے میں امیر و کبیر بن سکتا تھا، مگر اس کی قیمت بہت بڑی تھی، وہ اپنی محبت اس میں کھو سکتا تھا، مگر کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اور اپنے روم جانے لگا۔ اس کے پاس تو گھر بھی نہیں تھا۔ کرائے کا ایک کمرہ تھا۔

.....☆☆.....

اگلے دن وہ سج دھج کر تیار ہوا، اس نے پہلے ازیلا سے بات کرنے کا سوچا۔ پہلے وہ کافی گھبرا گیا۔ مگر پھر مطمئن ہوگیا۔ ازیلا سے وہ یہ بات چھپا تو نہیں سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے سمجھائے گا، اور وہ سمجھ جائے گی۔
وہ آفس گیا۔ تو اس نے ذہنی طور اس فیصلے کے لیے خود پہلے سے تیار کررکھا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا، مگر نکی میم نے اسے نہیں بلایا۔ اس نے معلوم کیا تو اسے بتایا گیا، کہ آج میم آف پر ہے۔
اسے شدید مایوسی ہوئی، اسے لگنے لگا، کہ شائد وہ بدصورت عورت کل داروں کے نشے میں دھت ہوکر بکواس کررہی تھی۔ اس کا سارا دن بے سکونی میں گزرا۔ چھٹی ہوگئی، تو وہ روم میں چلا گیا۔
اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی، اور شرٹ کو اتار پھینکا۔ بنا شرٹ کے وہ ایسے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ غصے میں ایسا ہی

Digitized by Google

کرتا تھا۔

اچانک روم کا دروازہ کھلا، اور ازیلا اس میں سے اندر داخل ہوگئی۔ وہ اس کے اوپر گر گئی۔ اور اسے بے تحاشا چھومنے لگی۔ بل ہڑبڑا یا اور اس نے منہ موڑ کر دیکھا۔

او تم ہو، میں سمجھا کہ کون ہے؟ جو ایسی حرکت کر رہا ہے۔

بل! تم کل سے رابطہ نہیں کر رہے ہو؟ کوئی پریشانی ہے کیا۔

ہاں میں کچھ پریشان تھا۔ اس نے ازیلا کو خود سے دور کیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کیا پریشانی تھی۔ ازیلا نے پریشانی سے پوچھا۔

کل تم میرے آفس آجاؤں، مجھے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔ بل اٹھ کر دوبارہ شرٹ پہننے لگا۔

کیا کوئی بہت مسئلے والی بات تو نہیں! ازیلا کا چہرہ صاف پریشان لگ رہا تھا۔

تم سے کل میں وہاں بات کروں گا۔ آؤں باہر چلے، اس نے ازیلا سے پوچھا۔

باہر سے تو ابھی میں آئی ہوں۔ اور پھر سے جانے کی بات کر رہے ہو، بل کیا بات ہے؟ ازیلا نے اسے اپنی طرف گھمایا۔

ازیلا کچھ نہیں ہے، تم کل میرے آفس آؤں۔ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔

اچھا باہر چلتے ہیں۔ ازیلا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ عجیب ہونے والا ہے۔ وہ دونوں اب روم سے باہر جا رہے تھے۔ اور کافی دیر پیدل چلنے کے بعد، وہ ایک کافی شاف کے اندر چلے گئے۔ ویٹر انکے لیے دو کافی کے مگ لے آیا، ازیلا نے اپنا مگ اٹھایا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔

تم کچھ پریشان ہوں، بتاؤں گے نہیں۔ ان کا عرصے کا ساتھ تھا۔ ازیلا اسے دیکھ کر سمجھ جاتی کے وہ کچھ پریشان ہے۔

نہیں، ابھی نہیں۔ میں کل تمہیں بتاؤں گا، جب تم میرے آفس آؤں گی۔ بل نے ٹیبل سے مگ اٹھایا۔

ہوں! ٹھیک ہے۔ ازیلا نے سپ لیتے ہوئے ہوں کیا۔

اب دونوں ایک دوسرے کو کافی دیر تک دیکھتے رہیں۔ اور پھر اپنے اپنے آشیانوں کے طرف چلے گئے۔

.....☆☆.....

آج جب بل آفس آیا، تو نکی میم آچکی تھی۔ بل کو کوشوار سی حیرت ہوئی۔ اور وہ انتظار کرنے لگا، کہ میم اسے ضرور آج بلائے گی۔ دوسری طرف، اس نے ونڈو کے شیشے سے باہر دیکھا۔ تو باہر سڑک پر بے شمار گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ وہ ازیلا کا بھی منتظر تھا۔ وہ اکیلا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ کل ازیلا اگر اسے الزام دے تو وہ جواب تو دے سکے۔

اس لیے جب تک ازیلا نہیں آئی، تب تک وہ بے چین ہی رہا۔

اچانک انٹر کام بجا۔ اس کے خیالات کی رو، واپس آگئی۔ اس نے وائیرلس اٹھایا۔ پیچھے کاؤنٹر گرل کی کال تھی۔

سر آپ سے کوئی لڑکی ملنے آئی ہے۔ اس کے کانوں میں ریسپشن کی آواز آئی۔

جی اسے اوپر بھیجیے گا۔ وہ میری جاننے والی ہے۔ بل نے ہدایت دے کر وائیرلس رکھ دیا۔

اب وہ ازیلا کا منتظر تھا۔ اس نے وہیل چیئر گھمائی، اور وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نکی اپنے روم سے نکلی، اور کسی کام سے باہر جانے لگی۔ ازیلا لفٹ سے باہر نکلی۔ اور سیدھا چلتی ہوئی نکی کے بالکل سامنے آگئی۔ نکی پر اس کی نگاہیں ٹھہر گئیں، وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی، اور ازیلا بھی اسے دیکھنے لگی۔ ''یخ!'' اتنا بھی کوئی بدصورت ہوسکتا ہے۔ ازیلا نکی کو دیکھ کر منہ کے زاویے بگاڑ گئے۔ اور اس پر دوسری نگاہ غلط تک نہ

Digitized by Google

ڈالی۔اسے نظر انداز کر کے سیدھا بل کے کیبن نما روم میں گھس گئی۔
اوہ! یہ لڑکی کون ہے؟ نگی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔اور حیرت کا جھٹکا سے تب لگا، جب وہ لڑکی بل کے روم میں داخل ہوگئی۔نگی مڑی اور چل کر بل کے کمرے کے دروازے کے باہر رک گئی۔وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ لڑکی کون ہے؟ اور کس لیے اس کے آفس میں بل سے ملنے آئی ہے؟
ازبیلا جب اندر گئی، تو بل کی پشت تھی، اور وہ دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔
واؤ بل مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہوں، اور تمہیں کتنا شاندار روم ملا ہے۔ازبیلا چلتی ہوئی بل کے کندھے تک جھک گئی اور دونوں ہاتھ اس سے گھمادیئں۔
بل نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔اور خود اٹھ کر اس کو اپنے کرسی پر بٹھایا۔
ازبیلا! تم نہیں جانتی میں جس مسئلے میں گرفتار ہوں، تم سے وہی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔
ازبیلا اسے دیکھنے لگی۔
بل تمہیں پتہ ہے، ابھی باہر میں نے ایک بہت ہی بدصورت عورت کو دیکھا۔سچ مانوں تو میرا ایک نگاہ دیکھنے کے بعد، دوبارہ اسے دیکھنے کو جی نہ کیا۔پتہ نہیں اس کے گھر والے اسے کیسے برداشت کرتے ہونگے۔ازبیلا نے آفسوس یا تمسخر سے کہا۔
بل اسے دیکھنے لگا۔اور خاموش ہو گیا۔
تم کوئی مسئلے کی بات کر رہے تھے۔اس نے سوچوں میں گم بل کے آگے ہاتھ لہرایا۔
ہاں، تم جس عورت کی بات کر رہی ہوں، وہ اس گروپ آف کمپنی کی مالکن ہے، بل نے اسے بتایا۔
اچھا، اتنی بدصورت اور اڈھیڑ عمر ہے۔مجھے تو سچ مانوں، کوئی چڑیل لگی۔کیا واقعی ایسا ہوگا۔ازبیلا نے ہنستے ہوئے کہا۔جیسے اس عورت کی اسے کوئی پرواہ ہی نہ ہوں۔
بل نے اس کو دونوں شانوں سے تھاما، اور اسے نگی کے بارے میں بتانے لگا۔
کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہوں، وہ پاگل ہو چکی ہے، اس کی عمر تو دیکھوں، اور خواہش، اور وہ تمہیں صرف، سبز باغ دکھا رہی ہیں۔سب کچھ سننے کے بعد ازبیلا نے غصے سے لال پڑ گئی۔
نہیں ازبیلا، وہ واقعی سچ کہہ رہی ہے۔اور اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔
مگر وہ ساتھی تم نہیں ہوں، تم اگر اس کا ساتھ دوں گے، تو مجھے چھوڑنا ہوں گا۔اور تم اس کی بکواس سننے کے بعد بھی اس کے آفس میں بیٹھے ہوں، اگر کوئی اور ہوتا تو اس کے چہرے پر تھوک کر کب کا جا چکا ہوتا۔
ازبیلا میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، مگر نگی سے شادی کر کے میں سب کچھ پالوں گا، اور پھر جب اس کا بچہ پیدا ہو جائے گا۔تو میں اس کو چھوڑ کر تمہیں اپنالوں گا۔اور ہم بہت خوش رہے گے۔
مجھے تمہاری دوسری بیوی نہیں بننا، اور اگر تم فیصلہ لے ہی چکے ہوں، تو مجھے یہاں بلانے کی ضرورت کیا تھی؟ تم جو کچھ کرنا چاہوں، کروں، مگر اس کے بعد میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوں گا۔ازبیلا اٹھ کر جانے لگی۔نگی نے اپنے کانوں سے سب کچھ سنا۔وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گئی۔
ازبیلا، صرف دو ہی سال کی تو بات ہے۔بل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔جسے ازبیلا نے بری طرح سے جھٹک کر چھڑا لیا۔اور غصے سے چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد نگی اپنے روم میں چلی گئی، اور بل نے پریشانی سے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔نگی کچھ سوچنے لگی، اسے بل سے شادی نہیں کرنی تھی۔اس نے یہ فیصلہ بل پر چھوڑ دیا۔کیونکہ وہ ازبیلا کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ایک عورت ہی دوسری کا گھر اجھاڑتی ہے، مگر اس نے سوچا، کہ مجھے ایسا نہیں کرنا۔

......☆☆......

Digitized by Google

کچھ دیر کے بعد نکی نے بل کو اپنے روم میں بلایا۔
جی! میم آپ نے یاد کیا تھا۔
ہاں بل، تم نے کیا سوچا، شادی کے بارے میں؟ نکی نے انجان بن کر پوچھا۔
میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ بل نے اعتماد سے کہا۔
تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی ہے؟ اس سوال پر نکی نے اب فیصلہ کرنا تھا، کہ بل اگر جھوٹ بولے گا تو وہ اسے ریجیکٹ کردے گی۔ کیونکہ اسے سب پتہ چل چکا تھا۔
ہاں! اس کا نام ازبیلا ہے، ابھی اسے آپ سے ملوانے یہاں لے کر بلایا تھا۔ مگر وہ میرا یہ فیصلہ سن کر ناراض ہو گئی۔ اور چلی گئی۔ بل نے کہا۔
تم نے سچ کہا، اور میں نے اس بات پر سوچا بھی، تمہاری ایک گرل فرینڈ بھی ہے، جو ہماری شادی سے دکھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی گرل فرینڈ سے شادی کرلو، میں تمہیں نوکری سے نہیں نکال رہی ہوں۔
نہیں میم! میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ بل نے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ مڑوڑ کر کہا۔
مگر تمہاری وہ گرل فرینڈ! نکی نے کہنا چاہا۔
وہ ابھی ناراض ہے مگر بعد میں میرے فیصلے سے بہت خوش ہوں گی۔ بل نے یقین سے کہا۔
ٹھیک ہے ہم آج ہی شادی کر لیتے ہیں، اور میں اپنی آدھی پراپرٹی اور یہ کمپنی تمہاری نام کر رہی ہوں، مگر تم تب تک شادی نباؤ گے۔ جب تک میں ماں نہیں بن جاتی۔ اور اگر اس سے پہلے تم نے شادی یا مجھے چھوڑنے کی کوشش کی۔ تو سب کچھ دوبارہ میرے نام ہو جائے گا۔
میں شادی نباؤں گا۔ تب تک جب تم ماں بن جاؤں گی، اس کے بعد کوئی فیصلہ لوں گا۔
چلوں اٹھوں، سارے آفس والوں کا منہ میٹھا کرے۔ نکی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔
یہ فیصلہ بل کا اپنا تھا۔ نکی کا اس پر کوئی زور نہیں تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر آسانی سے سب کچھ اپنے نام کرانا چاہا تھا۔ نکی تو اس کو نوکری سے بھی نہیں نکال رہی تھی۔ مگر بل کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔
اگلے دن دونوں نے میڈیا کے سامنے شادی کرلی۔ یہ خبر جب نیوز میں ازبیلا نے سنی، تو غصے سے وہ ٹی، وی بند کر کے باہر نکل گئی۔ اور کتنی دیر بے آواز روتی رہی۔

.....☆☆.....

چند ماہ بعد!
نکی امید سے ہوگئی۔ اور اس کے وجود کے اندر ایک نئی زندگی نے جنم لیا، اس عرصے میں بل نے ازبیلا سے رابطے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ازبیلا اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بل کو زندگی میں ہر قسم کا عیش و آرام مل چکا تھا۔ مگر اس کی محبت اس سے چھن گئی تھی۔ اور وہ اس کی ذمہ دار نکی کو سمجھنے لگا۔ ماں بنتے ہی نکی اس سے علیحدگی لینے والی تھی۔ وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ نکی کی ڈلیوری میں، بس چند دن رہ گئے، وہ انتہائی حد تک، اپنی کیئر کر رہی تھی۔ مگر ایک دن پھر وہ ہو گیا جس کی اسے توقع تک نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے اسے تھوڑا، تھوڑا، سا چلنے پھرنے کی ہدایت دے رکھی تھی۔ وہ اکثر کمرے میں تھوڑی سی واک کرلیا کرتی تھی۔ اس دن بل بھی گھر پر تھا۔ اور نکی بچے جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے بل سے کہا۔ کہ اسے بچے لے جائے۔ بل نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔ پہلی سیڑھی، پر قدم رکھتے ہی نکی نے بل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسری تیسری سیڑھی تک خیر رہی، چھوتی پر قدم رکھتے ہی

Digitized by Google

بل نے پوری قوت سے نکی کو دھکا دے دیا۔ وہ سیڑھیوں میں لڑھکڑاتی ہوئی فٹ بال کی طرح نیچے جانے لگی۔
آہ۔ آہ۔ نکی کی چیخ کی گونج سارے گھر میں گونج رہی تھی۔
اگر تم بچہ پیدا کرو گی، تو آدھی جائیداد اس کے نام کر دیتی۔ تجھے تمہارا سب کچھ چاہیے۔ بل نے نخوت سے کہا۔
نکی لہولہان ہوگئی۔ اس کی چیخیں، پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ اور جب وہ سنگی فرش پر پہنچی۔ تو وہ اپنا پیٹ پکڑ کر درد سے بلبلا رہی تھی۔ وہ غیر یقینی سے بل کو دیکھنے لگی۔
میں اس جائیداد میں حصہ دار نہیں چاہتا۔ تم جیسی بدصورت عورت کو اتنے عرصے برداشت کیا۔ اس سب پر اصولاً میرا حق بنتا ہے۔ بل اس کے سر پر کھڑے ہو کر چیخا۔ بل نے اس کے سر پر زوردار لات ماری، اس کا سر زور سے گول کے پیچھے بنے دیوار سے ٹکرایا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔
اس کے مرنے کے بعد، سب کچھ بل کے نام منتقل ہوگیا۔ بل نے سب کو یہی بتایا کہ سیڑھیوں میں پھسلن کی وجہ سے وہ ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ نکی کے مرنے کے بعد وہ ازیلا سے ملنے گیا تھا، مگر اس کے شوہر ڈیم سے سامنا ہوگیا۔ تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ نکی کے مرنے کے بعد اور اس کی نظر میں ازیلا کی بے وفائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے خود کو بزنس میں دن رات مصروف کر لیا۔ اور لڑکیوں سے دور ہوگیا۔ مگر وہ اب بھی ازیلا کو ہی چاہتا تھا۔

.....☆☆.....

بل نے گاڑی اپنے بنگلے کے سامنے روکی، اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے پچھلے سیٹ کا دروازہ کھولا، اور اس لڑکی کو گاڑی سے باہر نکالا۔ یہ پب میں اسے ملی تھی۔ اور ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس نے بے ہوش حسینہ کو بانہوں میں اٹھایا۔ اور اپنے گھر کے اندر لے گیا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔
تب حسینہ نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ بل نے اسے بیڈ پر ڈال دیا۔ اور اس پر جھک کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
تم بہت زیادہ خوبصورت ہوں۔ میری سوچ سے بھی زیادہ۔ بل نے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے۔
لڑکی کے چہرے میں دھیرے، دھیرے تبدیلی ہونے لگی۔ اور اس کا چہرہ نکی کے چہرے میں ڈھل گیا۔
میں کوئی خوبصورت نہیں بے حد بدصورت ہوں۔ نکی نے بل کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اسے اٹھا کر اپنے سامنے کیا۔
نکی، تم۔ تم تو مر چکی تھی۔ بل کے پسینے چھوٹ گئے، اور وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا۔
ہاں۔ اور مجھے تم نے مارا تھا۔ نکی نے کہا۔ وہ لڑکی پوری طرح نکی کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔
مگر تم یہاں کیسے؟ اور ابھی تو یہاں کوئی اور تھی؟ تم اس کے وجود میں ڈھل گئی۔ تم ایک روح ہوناں! بل حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈر تھا۔
ہاہاہا..... ہاہاہا..... ہاہاہا..... نکی کا قہقہہ، بہت بھیانک تھا۔
میں تم سے اپنا انتقام لینے آئی ہوں۔ وہ چیخی۔ بل نے بیڈ سے چھلانگ لگا دی، اور باہر کی طرف بھاگنا چاہا، مگر نکی کا ہاتھ پلاسٹک کی ربڑ کی طرح لمبا ہوگیا۔ اور بل کو گردن سے پکڑ کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ وہ کسی فٹ بال کی مانند اچھلا۔
آہ۔ بل کی چیخ ارتعاش کی طرح کمرے میں پھیلنے لگی۔
یہ سب کچھ اب ٹرسٹ کو جائے گا، تم ان سب کے حق دار نہیں ہوں۔ کمرے کی الماری کھل گئی، اور کاغذ، اُڑ کر باہر آنے لگے۔ ہوا میں پین اڑتا ہوا آیا۔ اور بل کے رائٹنگ میں وصیت لکھنے لگا۔
تم خودکشی کر رہے ہوں۔ ہاہاہا..... نکی استہزائیہ ہنسی۔ ”تم مرنے والے ہو بل“ کمرے میں رسی اُڑ کر آئی۔ اور بل

Digitized by Google

کے گلے میں بندھنے لگی۔
نکی تم مجھے چھوڑ دوں۔ بل کے پسینے چھوٹ گئے۔
تم نے مجھے موت دی ناں! میں تمہیں وہی لوٹا رہی ہوں۔ ہاہاہا..... ہاہاہا..... ہاہاہا..... ادلے کا بدلہ
اس نے سیلنگ فین سے رسی باندھ دی اور بل کو رسی کے زریعے گردن سے لٹکا دیا۔ بل کی آنکھیں باہر ابلی ہوئی تھیں۔
نیچے وصیت پڑ پڑا رہی تھی۔
میں بل بقائمی ہوش اور حواس میں وصیت تحریر کر رہا ہوں، کہ نکی کو میں نے جائیداد کی خاطر مار ڈالا۔ مگر جس سے میں محبت کرتا تھا۔ میری محبوبہ نے میرے ساتھ بے وفائی کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اس غم کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اپنی جان لے رہا ہوں۔ اس لیے میرے مرنے کے بعد میرا سب کچھ ٹرسٹ کو چلا جائے۔
بل! اس کے آگے تاریخ، وقت درج تھا۔
کئی دنوں کے بعد لوگوں کو پتہ چلا، اس کی لاش گھڑ سڑھ چکی تھی۔ کیونکہ گھر کے باہر نکی نے بڑا سا تالا ڈال دیا تھا۔ نوکر رات کو گھر چلے جاتے تھے۔ اور تالے کی وجہ سے گھر میں کئی دنوں تک داخل نہ ہو سکے۔
ازبلا نے جب یہ نیوز چینل پر دیکھی۔ اس کے ساتھ ڈیم بیٹھا ہوا تھا۔
چی! ڈارلنگ لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اتنے امیر ہو کے خودکشیاں کر رہے ہیں۔
ہاں امیر سنکی ہوتے ہیں۔ اتنے مال کے باوجود ان کو سکون کی نیند نصیب ہی نہیں ہوتی۔ ڈیم نے ہلکا سا تبصرہ کر کے چینل تبدیل کر لیا۔ ازبلا کو کوئی دکھ نہیں تھا۔ اسے لگنے لگا کہ بل کو صرف دولت سے محبت تھی۔ اگر اس سے پیار کرتا تو کچھ تو اس کے نام چھوڑ جاتا۔ سب کچھ تو ٹرسٹ کو دے دیا۔
ہونہہ! اب جہنم میں بل اور نکی ایک ساتھ ہونگے۔ ازبلا نے سوچا۔ اور مسکرا دی۔ وہ جیسی بھی تھی پر اپنی زندگی میں ڈیم کے ساتھ خوش تھی۔

.....☆☆☆.....

شناخت

خلیلہ جبار

حافظ غفران جب نواب شاہ سے لوٹا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کسی بات نے اُسے گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔ آج صبح وہ جب تیار ہو کر نیو سعید آباد سے نواب شاہ روانہ ہوا تھا بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔
پاکستانی فوج میں اندرون سندھ سے راجپوت برادری میں سے بے شمار لوگ شامل ہیں۔ اپنی برادری کے لوگوں کو دیکھ کر حافظ غفران کو بھی شوق ہوا کہ وہ بھی اپنے ملک کی فوج میں شامل ہو کر ملک کو ضرورت پڑنے پر وہ اس ملک کے کام آئے۔ ملک کا دفاع کرتے ہوئے جان قربان کر دینے پر شہادت کا رتبہ اور کامیاب لوٹنے پر غازی بن جاتا ہے۔ فوج میں بھرتی کے لیے اس کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود تھے۔ والد کے شناختی کارڈ کی ضرورت تھی۔ یہ کام اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کا والد شناختی کارڈ دیدے گا۔
محمد یوسف عرف جوسا نے اپنی بیٹی سعیدہ کی شادی نواب کے نوجوان محمد عباد راجپوت سے شادی کر دی تھی۔ ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب یہ شادی زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ دونوں میاں بیوی میں اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ بات طلاق تک پہنچ گئی۔ دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو جانے پر سعیدہ اپنے گھر آ کر بیٹھ گئی۔ ایسے میں بیٹے کی ولادت کے بعد اس کے لیے کراچی سے ایک رشتہ آ گیا اور اس کی شادی کراچی میں ہو گئی۔ محمد عباد

Digitized by Google

راجپوت نے بھی دوسری جگہ شادی کرلی۔ دوسری بیوی کا حزان محمد عباد سے مل گیا تھا اس لیے ان کی یہ شادی قائم رہی۔

محمد عباد راجپوت ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اس نے اپنے بیٹے غفران عرف غفو کو اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے جب پانچویں جماعت پاس کرلی محمد عباد نے اسے اپنے پاس بطور کنٹریکٹر رکھ لیا۔

ایک رات جب محمد عباد گھر لوٹا۔ اس کی بیوی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

کیا بات ہے، آج بڑے غصے میں دکھائی دے رہی ہو۔

بات ہے غصے کی۔ وہ بولی

آخر پتا چلے کہ بات کیا ہے۔ وہ بولا

مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے اور میری اولاد سے محبت نہیں جبھی اپنی سابقہ بیوی کے تحفے کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ محمد عباد نے کہا۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تمہیں ضرورت کیا ہے اُسے اپنے ساتھ کنٹریکٹر بنا کر اپنے ساتھ رکھنے کی۔

پھر میں کیا کروں؟

اس تحفے کو اپنی سابقہ بیوی کے حوالے کردو، کیا اسے پالنے کا ٹھیکہ تم نے ہی لے لیا ہے وہ بھی اس کی ماں ہے۔ اپنے بیٹے کو اپنے پاس رکھے۔

طلاق کے بعد یہی طے ہوا تھا کہ غفران میرے پاس رہے گا۔ محمد عباد نے کہا۔

جوان ہو کر غفران تم سے جائیداد میں سے حصہ مانگے گا اور حصہ لے کر اپنی ماں کے پاس جا کر بس جائے گا۔

ہاں تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، بڑا ہو کر یہ اپنا حصہ مانگ سکتا ہے۔

میں اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ غفران کو اس کی ماں کے حوالے کردو تاکہ اسے بھی پتا چلے ساری ذمہ داری تمہاری کوئی ہے۔ وہ بولی۔

محمد عباد بیوی کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ بڑے ہو کر ضرور جائیداد میں سے حصہ لے کر اپنی ماں کے پاس رہنا شروع کردے۔ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اس کا وار کام کر گیا ہے۔

محمد عباد کی بیوی نے اب بہانے بہانے سے غفران کے خلاف کان بھرنا شروع کردیئے تھے۔ بیوی کے بار بار سمجھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد عباد نے اپنے بیٹے غفران کو سعیدہ کے پاس بھجوا دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو دو چار دن کو اپنے پاس رکھ سکتی تھی مگر مستقل اپنے پاس رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس کے سسرال والوں کو غفران کا سعیدہ کے پاس رہنا پسند نہیں آرہا تھا غفران کو سعیدہ اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی اور محمد عباد بھی اسے رکھنے کو تیار نہ تھا وہ دونوں کے درمیان پس کر رہ گیا تھا۔

نانی سکونتی کو اس موقع پر نواسے کا خیال آگیا اور اس نے غفران کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

نانی سکونتی نے دنیا دیکھی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی جن بچوں کو ماں باپ کی سرپرستی میسر نہ آئے وہ بگڑ کر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے نانی نے غفران کی تربیت کا ذمہ اپنے سر لے لیا تھا۔ اس کی اچھی تعلیم و تربیت کی خاطر اسے اس کول میں داخل کردیا۔ نانی کی اچھی تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ غفران دنیاوی اور دینی تعلیم حاصل کر کے حافظ غفران دین کی طرف راغب ہو گیا۔

گلی نمبر 9 میں علاقے والوں کے پانی بھرنے کو ایک کنواں تھا۔ ہر گھر میں پائپ لائن کے ذریعے پانی آنے لگا تھا۔ اس لیے اب وہ کنواں علاقے والوں کے کام نہیں آرہا تھا۔ علاقے کے

Digitized by Google

لوگوں نے باہمی مشورے سے اس کنویں کو بند کر کے اس پر مسجد قائم کردی۔ مسجد کے قائم ہونے سے علاقے کے لوگوں کو نماز پڑھنے دور جانا نہیں پڑ رہا تھا۔
مسجد میں موذن کے فرائض حافظ غفران دینے لگا تھا۔ اس کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ مسجد؟؟ سے اس کا اذان دینا لوگوں کو اچھا لگتا تھا۔ جب غفران اپنی میٹھی اور رسیلی آواز میں نعت پڑھتا نمازیوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی توجہ کا مرکز بھی بن جاتا تھا۔
محمد عباد راجپوت غفران کا باپ تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ شناختی کارڈ کی کاپی دیدے گا اسی لیے وہ نواب شاہ پہنچ گیا۔ ایک عرصے بعد جب وہ اپنے باپ سے ملا وہ خوش ہونے کے بجائے حیرت سے دیکھنے لگا۔
ابا میں فوج میں بھرتی ہونا چاہ رہا ہوں۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔
غفران بیٹے میرے تعلقات فوج میں کہاں ورنہ میں خود جوانی میں فوج میں بھرتی ہو جاتا۔ محمد عباد نے کہا۔
میں آپ کے پاس سفارش کی غرض سے نہیں آیا ہوں۔
پھر کس غرض سے آئے ہو۔ وہ چونکا۔
میرے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں بس ایک کمی رہ گئی ہے۔
وہ کیا ہے؟
میرے کاغذات میں آپ کے شناختی کارڈ کی کمی ہے۔ شناختی کارڈ کی کاپی مل جانے پر میرے کاغذات مکمل ہو جائیں گے۔
شناختی کارڈ۔ محمد عباد سوچ میں پڑ گیا۔ شناختی کارڈ میرے پاس نہیں ہے۔
شناختی کارڈ بہت ضروری چیز ہوتی ہے وہ آپ کے پاس کیسے نہیں ہے۔
میرے پاس شناختی کارڈ ہوتا ہے لیکن میں نے ضمانت کے طور پر ایک جگہ رکھوایا ہوا ہے۔ چند دن بعد مجھے مل جائے گا۔ اس نے بات بنائی۔
ٹھیک ہے ابا میں ایک ہفتے کے بعد آجاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا آیا۔
غفران کیوں آیا تھا۔ بیوی نے پوچھا۔
بھئی وہ شناختی کارڈ کی کاپی لینے آیا تھا۔
شناختی کارڈ کی کاپی کیوں مانگ رہا تھا۔
وہ فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے اس لیے کاپی مانگ رہا ہے۔
فوج میں جا رہا ہے یا کوئی اور چکر ہے۔
چکر کیسا چکر؟ محمد عباد چونکا۔
تمہارا بیٹا اب جوان ہو گیا ہے۔ ظاہر اسے جائیداد میں حصہ لینے کو یہ ثابت کرنا پڑے گا نا وہ تمہارا بیٹا ہے اسی لیے شناختی کارڈ مانگ رہا ہے۔ وہ بولی۔
تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ ہو سکتا ہے۔ شناختی کارڈ کی کاپی مل جانے پر اسے میرا بیٹا ہو، کی شناخت مل جائے گی۔ محمد عباد نے کہا۔
میں کہہ رہی ہوں اسے کسی قیمت پر شناختی کارڈ کی کاپی مت دینا ورنہ سمجھ لو تم خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے۔
اسی لیے میں نے شناختی کارڈ کی کاپی نہیں دی اسے ٹال دیا ہے۔
یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ آئندہ بھی ایسے ہی اسے ٹالتے رہنا۔ وہ بولی۔
محمد عباد نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ وہ بیوی کا کہا کیسے ٹال سکتا تھا اس لیے اس نے فوراً سے ہاں میں گردن ہلائی

URDU TUBE A HOME OF ENTERTAINMENT www.urdutubes.com
Digitized by Google

تھی۔

حافظ غفران کو اپنے ابا سے بڑی امید تھی کہ اس کا ابا شناختی کارڈ کی کاپی ضرور دیدے گا۔ وہ کئی ماہ تک نواب شاہ کے چکر لگاتا رہا۔ لیکن محمد عباد ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔

غفران کو اپنا شناختی کارڈ لازمی بنوانا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر اب تبلیغی جماعت کے ساتھ مختلف شہروں میں جاتا رہتا تھا۔ دوران سفر اکثر مقامات پر چیکنگ کے دوران پولیس اور رینجرز کے جوان مسافروں سے شناختی کارڈ مانگتے تھے۔ وہ اب جوان ہو چکا تھا۔ اس لیے شناختی کارڈ بنوانا لازمی ہو گیا تھا اور یہ جبھی ممکن تھا کہ اس کے والد کا شناختی کارڈ کی کاپی مل جائے۔

بار، بار نواب شاہ جا کر خالی ہاتھ لوٹنے پر وہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید اس کا باپ یہ سمجھ رہا ہے کہ کہیں میں وراثت میں سے حصہ نہ مانگ لوں۔ اسی لیے صبح نواب شاہ روانہ ہونے سے قبل اس نے ایک تحریر برائے دستبرداری وراثت لکھ لی تھی۔ یہ تحریر دیکھ کر وہ لازمی شناختی کارڈ کی کاپی دیدے گا۔ غفران کی توقع کے برعکس وہ تحریر دیکھ کر محمد عباد غصے میں بھڑک اٹھا۔

تم کیا سمجھتے ہو میں اس لیے شناختی کارڈ کی کاپی نہیں دے رہا ہوں کہ تم مجھ سے کہیں وراثت میں سے حصہ نہ مانگ لو۔

ابا میں چکر لگا کر تھک گیا اس لیے یہ تحریر لکھ دی ہے۔

میں تمہیں کاپی دے دیتا لیکن تمہاری اس حرکت پر اب میں تمہیں شناختی کارڈ کی کاپی ہرگز بھی نہیں دوں گا۔

ابا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے اپنی شناخت سے محروم نہ کریں۔ حافظ غفران کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے نا کہ تمہیں شناختی کارڈ کی کاپی نہیں ملے گی تم فوراً ابھی اور اسی وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ محمد عباد غصے سے بھڑک اٹھا۔

ابا یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔

اپنے مستقبل کے تم خود ذمے دار ہو، جو کرنا ہے وہ کرو مگر اس گھر کی دہلیز پر قدم مت رکھنا ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا۔

غفران نے باپ کی خوب منت سماجت کی مگر اس سے مس نہ ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ اس کی اس حرکت کے بعد کسی صورت میں اسے شناختی کارڈ کی کاپی نہیں ملے گی۔

محمد عباد اس کا والد تھا۔ اسے ہرگز بھی ایسے رویے کی اس سے امید نہ تھی۔ اس کا باپ سنگدل ہو گیا تھا۔ غفران کو اپنے سگے باپ کے گھر سے دھکے پڑ گئے تھے۔ اس کے دل کو جو تکلیف آج پہنچی تھی وہ زندگی میں کبھی نہیں پہنچی تھی۔ وہ ٹوٹے دل سے گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کے اندر ہی اندر ایک لاوا پک رہا تھا۔ جس سے سب بے خبر تھے۔ وہ لاوہ پھٹنے پر کچھ بھی باقی نہ بچتا۔ غفران کو رہ، رہ کر اپنی بے عزتی کا خیال آ رہا تھا۔ جب وہ باپ کے گھر سے سسکتہ قدموں سے نکل رہا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے باپ کے گھر سے غفران کا ہمیشہ کے لیے پتہ صاف کرا دیا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

کسی کے بھی علم میں یہ نہ تھا کہ غفران کا اب اگلا قدم کیا ہوگا۔ حافظ غفران نے نیا جوڑا پہنا اور مسجد میں نماز کے ساتھ نوافل بھی ادا کیے اور گھر چلا آیا۔ اس پر جو کیفیت طاری تھی۔ جو اس کے دل پر گزری تھی وہ اپنی نانی کو سنانے کو بے تاب تھا۔ وہ اپنی اشکبار آنکھیں لیے اپنی نانی کے پاس آیا۔

نانی یہ دنیا مجھے شناخت نہیں دے سکی۔ میں ایسی دنیا میں رہنا نہیں چاہتا اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دوں

Digitized by Google

گا۔

نہیں بیٹے ایسے فضول باتیں اپنے منہ سے نہیں نکالتے۔ تم ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے تیری نانی پر حرف آئے کہ نانی نے تیری تربیت اچھی نہیں کی۔ سکونتی نے اس سے کہا۔

نانی میں نے جو فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ اب تبدیل نہیں ہوسکتا، اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔

تو نے کیا فیصلہ کرلیا ہے۔

نانی میں نے اپنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

لے تیرے تینوں ماموں اقبال، عثمان اور فرحان تیرے سر پر سہرا باندھنے کی سوچ رہے ہیں اور تو ہے کہ دنیا کو چھوڑنے کی بات کررہا ہے۔ ایسی غلط بات نہیں کرتے۔ سکونتی نے کہا۔

نانی اب کچھ نہیں ہوسکتا میں نے اپنے والدین کی نفرتوں کے جواب میں جراثیم کش گولیاں کھا کر اپنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فیصلے پر عمل کرلیا ہے۔

کیا!! نانی چیخی۔

ہاں نانی یہ حقیقت ہے میں نے جو گولیاں کھائی ہیں وہ اپنا کام کرچکی ہیں۔ میں بس چند منٹوں کا مہمان ہوں، پھر میرا ہمیشہ اس بے رحم دنیا سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

حافظ ہو کر یہ تو نے کیا کردیا۔ میرے بچے۔ یہ انکشاف نانی پر بجلی بن کر گرا تھا۔

حافظ غفران کے انکشاف پر پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ لیکن دیر ہوچکی تھی۔ جراثیم کش گولیوں نے اپنا کام کردکھایا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا اسے سچ کردکھایا تھا۔

حافظ غفران کی جوان موت پر بوڑھی نانی اور سب گھر والے سمیت اس کے دوست ملک اسماعیل، نصرالدین سمیت سب ہی سوگوار تھے۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں، غم زدہ ماں سعیدہ بھی کراچی سے اپنے شوہر کے ساتھ میت میں شریک ہونے کو پہنچ گئی تھی۔ سنگدل باپ محمد عباد اپنے بیٹے غفران کی میت کو کندھا دینے تک نہ آیا تھا۔ اس کی بے حسی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا۔

مسجد سے لوگوں کے کانوں میں رس گھولتی حافظ غفران کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔ لوگ حافظ غفران کی آواز میں حمد و نعت سننے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوچکے تھے۔

حافظ غفران اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کی موت اس بے رحم معاشرے کے لیے کئی سوال چھوڑ گئی تھی۔ میاں بیوی کا جو مضبوط رشتہ ہوتا ہے جذبات کی رو میں بہہ کر سراسر انتہائی مضبوط اور گہرے رشتے کو ہمیشہ کے لیے ایسے ختم کردیتے ہیں کہ جیسے معمولی بات ہے مستقبل میں ان کے اس فیصلے سے ان کے بچوں پر کیا اثر پڑے گا بالکل بھی نہیں سوچتے۔ ان کی اولاد کا اس میں کیا قصور ہے۔ انہیں کیوں بے رحم معاشرے کے رحم و کرم پر ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنی شناخت دینا ان کا اخلاقی اور قانونی حق ہے پھر کیوں انہیں شناخت نہیں دی جاتی وہ بھی ان کا خون ہوتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے پاس رہنے والے بچوں کو اپنا خون سمجھتے ہیں انہیں اپنی شناخت دیتے ہیں۔ وہ اپنے خون سے کیوں آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

حافظ غفران کو شناخت مل جانے پر وہ نا صرف حرام موت سے بچ جاتا بلکہ فوج میں بھرتی ہو کر اپنے ملک پر جان دے کر شہید کہلاتا اور جان نہ دیتا تو غازی کہلاتا۔

.....☆☆☆.....

ہماری چاہ

بنت حوا

Digitized by Google

بہار کی ٹھنڈی تر و تازہ پھڑ پھڑاتی ہوا نے موسم میں خنکی پیدا کر دی تھی کمرے کے دروازے ہلنے لگے تھے اور ان پر لگے پردے اندر کی طرف مسلسل اڑ رہے تھے گویا انکو بھی موسم سے لطف مل رہا ہو۔ فجر کی آذانوں کی بلند ہوتی ہوئی آوازیں منظر کو مزید خوبصورت بنا رہی تھی۔ جب کہ وہ ارد گرد سے بیخبر سردی کو محسوس کرتی بیڈ کی ایک جانب سمٹی ہوئی سی سوئی ہوئی تھی۔

.....☆☆.....

قرات الفجر عام سی شکل وصورت والی لڑکی جس میں کوئی خاص بات نہیں تھی نہ ہی کوئی خوبصورتی اور نہ ہی شخصیت کا کوئی متاثر کن تاثر جو اس کی طرف مبذول کرے البتہ اس کی گہری تجسیل نما آنکھیں متوجہ کرنے کا باعث ضرور بنتی تھیں۔ سلمان صاحب اور اقراء بیگم کی دو بیٹیوں اور دو بیٹوں میں درمیانی اولاد تھی جو ہمارے معاشرے کی طرح تھرڈ اگنور ڈ ڈاٹر تھی۔ زندگی کے مقصد سے، آشنا اک حساس، خاموش اور خود کو الگ تھلگ رکھنے والی لڑکی! جسکی اپنی ہی دنیا تھی، اپنا رنگ وڈھنگ، اپنا سلیقہ۔ جس کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ تک سے مکمل واقفیت نہیں تھی جسکی زندگی میں قرآن ''ضابطہ حیات'' کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا اور لوگوں کے درمیان رہنا اسے پسند نہیں تھا نہ حقوق اللہ سے آشنائی نہ حقوق العباد کی ہی پرواہ! یہ زندگی بمقصد تو نہیں بتا مجھے کیسے شناسا کرواؤں تجھے اس سے!

.....☆☆.....

فجر!! فجر!! کہاں ہو؟ برابر والے گھر سے آتی پارس نے اندر داخل ہوتے ہی اسے پکارا تھا۔ برآمدے میں بیٹھی اقراء بیگم نے ٹوکا' ایسے دروازے سے ہی لڑکیوں کے نام سے نہیں پکارتے آتے جاتے باہر گزرتے لوگ کیا سوچیں گے؟ لوگوں کی ہی فکر رہتی ہے ہر وقت! پارسا برا سا منہ بنا کر بڑبڑائی۔ فجر اوپر چھت پر ہے' اقراء بیگم نے گھورتے ہوئے کہا تو وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ بالکنی کے پاس پڑے نیم کے پودے کو پانی دیتی وہ نیچے ہونے والی گفتگو سن چکی تھی اور اب اسی کی جانب آرہی تھی۔ کیا ہوا ہے؟ فجر نے آہستگی سے پوچھا۔ پارسا نے شانے اچکا کر کہا کچھ ہوا تو نہیں لیکن میرے پاس ایک خبر ہے۔ کیسی خبر؟ فجر نے کچھ تجسس سے پوچھا۔ ایسے ہی بتا دوں؟ چائے پانی کا تو پوچھتی نہیں تم تو کیا اب بیٹھنے کا بھی نہیں کہو گی؟ اس نے کچھ خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ فجر نے ہنسی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سمجھتے ہوئے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نیلو آپا بتا رہی تھیں کہ گلی کے آخری والے گھر میں کوئی فہم دین کورس ہونے والا ہے میں تو داخلہ لینے کا سوچ رہی ہوں تم بھی ساتھ کر لو کورس فجر' اس نے وضاحت سے بات بتائی۔ فہم دین کورس؟ یہ کیا ہے بھلا؟ فجر نے کچھ نا سمجھی سے پوچھا۔ پیاری بہن یہ دین اسلام کی ابتدائی تعلیمات پر مبنی کورس ہے جس میں ہمیں اسلام کی بہت سی باتیں سکھائی جائیں گی۔ اس نے مزید وضاحت کی تھی۔ اچھا! تم لے رہی ہو داخلہ تو میرا بھی کروالو' فجر نے حامی بھر لی۔

.....☆☆.....

آج پہلی کلاس تھی جب پارس اور فجر اندر داخل ہوئیں تو تنزیلہ بیگم کے گھر کا ڈرائنگ روم کچھ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا وہ دونوں بھی صوفے کے پاس ایک طرف کونے میں بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کی خوبصورت خاتون سلام کرتے اندر داخل ہوئیں۔ تمام لڑکیوں نے یکجا ہو کر جواب دیا پھر انہوں نے چاشنی بھرے لہجے میں زندگی کے حوالے سے بتانا شروع کیا جب کہ وقتاً فوقتاً لڑکیوں سے سوال بھی کرتی جاتیں۔ فجر پر نئے انکشافات ظاہر ہو رہے تھے اس پر زندگی کی حقیقت کھل رہی تھی وہ بہت دلچسپی سے انکی ساری باتیں سنتی رہی۔

.....☆☆.....

Digitized by Google

زندگی کا نیا موڑ شروع ہو چکا تھا قرآن سے وابستگی ہوگئی تھی تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے کی فکر لگ گئی۔ اس نے ہر چیز کو اچھے سے نبھانے کے لیے نئے راستوں کی تلاش شروع کر دی تھی تبھی پارس اور فجر نے مل کر انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا سوچا۔ فجر نے گھر کے ہی ایک کمرے میں بچیوں کو دین کی بنیادی تعلیم دینا شروع کر دی تھی پارس کے علاوہ حنا اور نور بھی اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔

.....☆☆.....

سادہ سے عبایا میں لائٹ پنک کلر کا سکارف گندمی رنگت والے چہرے کے گرد لیے وہ کسی گڑیا کی سی لگ رہی تھی۔ اس کی گہری آنکھوں میں چمک اٹھی تھی جب اس نے قرآن پاک تھمایا تھا۔ گلابی ہونٹوں پر مسکان سجی تھی اور اندر جیسے سکون اتر گیا تھا اس نے قرآن پاک کو چوم کر سینے سے لپیٹ لیا تھا۔ پیچھے سے آتی پارس نے اسے چونکایا تھا تبھی اس نے اس کے چہرے سے جھلکتی پریشانی کو دیکھ لیا تھا ایک دم اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ کیا ہوا ہے؟ فجر نے کچھ فکر سے پوچھا۔ مکالمہ مجھ سے نماز نہیں پڑھی جاتی فجر! مجھ لگتا ہے نماز بوجھ ہے' اس نے بجھی سے سر جھکا کر کہا۔ نماز تو بوجھ اٹھاتی ہے پارس! وہ کیسے بوجھ ہو سکتی ہے بھلا؟؟ فجر نے اسے سمجھانا چاہا۔ پارس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تو فجر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ تھام کر حوصلہ دینے لگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے صبر اور نماز سے مدد لو۔ تمہیں شیطان بہکا رہا ہے پارس نماز تو مؤمن کا میعار ج ہے ناں پھر شیطان کیسے چاہے گا مؤمن بار بار اللہ سے ملاقات کرے؟؟ تم اپنی روٹین کا بھی جائزہ لو دیکھو وہ کون سی چیز ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بن رہی ہے اور تمہیں نماز کی توفیق نہیں مل رہی' اس نے بہت نرمی سے سمجھایا تھا۔ پارس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا وہ بہت بدل گئی تھی۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو فجر واقعی شیطان کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ مؤمن اللہ سے بار بار ملاقات کرے میں جا رہی ہوں نماز کو دیر ہو رہی ہے' وہ نئی امید لیے کہہ کر جا چکی تھی۔ فجر نے مسکرا کر دل میں دعا کی تھی!

.....☆☆.....

ادارہ تھوڑے سے دنوں میں ہی کامیابی سے ترقی کی طرف گامزن تھا جب کہ فجر اس کو مزید بہتری کی طرف لانے کی سوچ رہی تھی اور اس نے بڑی عمر کی خواتین کے لیے بھی کچھ کرنے کا عزم کیا اور خود ہی اس کی منصوبہ بندی کرنے لگ گئی جب کہ پارس کو خبر ہوتے ہی اس کی طرف سے ناراضگی کا شدید اظہار ہوا جسکی وجہ سے حنا اور نور بھی مخالفت پر اتر آئیں۔ فجر نے انکو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود وہ اس چیز کو مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھیں اور نہ ہی اس کو اکیلے آگے بڑھنے ہی کے لیے چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہ ہمارے معاشرے کی بہت بھیانک شکل ہوتی ہے جب آپ کے عزیز ترلوگ آپکو آگے بڑھتا نہیں دیکھ پاتے ہیں حسد کرتے ہیں اور رکاوٹیں کھڑی کرنے کی ہر ممکن کوشش کر گزرتے ہیں ایسا کرتے وقت ''تعلق'' تک کو بھول جاتے ہیں' وہ چھت کو دیکھ کر سوچ رہی تھی آنسو اس کی آنکھوں میں منڈھلا رہے تھے۔

.....☆☆.....

صبح سے ہی وہ خاموش اپنے کمرے میں اندھیرے میں بیڈ پر پڑی رہی تھی اسکا بدن بخار کی لپیٹ میں تھا۔ ادارے کو مزید بہتر کرنے کا فیصلہ اس نے واپس نہیں لیا تھا سب کچھ اس پاک پروردگار کے حوالے کر کے خود کو سب کچھ اکیلے سنبھالنے کی ذمہ داری لینے پر آمادہ کر چکی تھی۔ اس دن کے بعد اس کی ان تینوں سے بات نہیں ہوئی تھی جب کہ ادارے کی کچھ دنوں سے چھٹی کر لی تھی۔ فجر! دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی وہ پارس تھی اس کی آواز کو وہ کیسے نہ پہچانتی؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟ انٹی نے بتایا کہ تمہیں بخار ہے؟ اس نے بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ کر پوچھا۔ ٹھیک ہوں میں' فجر نے آہستگی سے جواب دیا۔

Digitized by Google

تم نے اپنی یہ حالت کیوں بنا دی ہے ہم نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہا تھا تم خود پر اتنی بڑی ذمیداری کیوں ڈال رہی ہو جب کہ تم جانتی ہو یہ چیز زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی' پارس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ذمیداری تو اللہ نے ہمارے اوپر ڈال دی ہے پارس اب ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں وہ آگے پہنچانا ہے تاکہ لوگوں کی بھلائی ہو لوگوں کو دین کے بارے میں علم ہو کیا تم چاہتی ہو یہ سب بچیاں اور عورتیں بھی ہماری طرح لاعلمی میں زندگی گزاریں؟ ہمیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں لوگوں کے کام آنے انکے لیے بھلائی کا کام کرنے کی توفیق دے رہا ہے بجا مخالفت ہے' فجر نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ لیکن!

لیکن کیا پارس؟ کیا تم اللہ کے آگے جوابدہ نہیں ہو گی جب وہ تم سے یہ پوچھے گا کہ اس کے بندوں کے لیے تم نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق ادا کیا؟ ہمارے معاشرے میں دیکھو کتنی برائی ہے تو کیا ہم اس کو روکنے کے لیے لوگوں کو دین کی تعلیم نہ دیں؟ فجر نے دوٹوک انداز میں کہا تھا اور دل میں رب سے مدد طلب کی تھی۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پارس اس کی جانب بڑھی اور ہاتھ تھام کر کہا' تم صحیح کہہ رہی ہو فجر واقعی میں اس چیز کی ہمارے معاشرے کو ضرورت ہے اور واقعی مجھے بھی امر بالمعروف کا حق ادا کرنا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں' وہ دونوں مسکرائی تھیں۔ الحمدللہ آج ایک سال مکمل ہو گیا ہے اور ادارے سے بیشمار بچیوں کے ساتھ خواتین بھی مستفید ہو رہی ہیں۔ ہمارا فیصلہ صحیح تھا پارس فجر نے اچانک ہی بیتے سال کے حوالے یاد دہانی کروائی تو پارس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا وہ دونوں خوشی سے سجدہ شکر بجالائیں۔

☆☆☆

رقیب جان

سلماء بشیر

URDU TUBE
www.urdutubes.com

وہ جنوری کی اوائلی، دھند میں لپٹی صبح تھی۔ موسم بہت ہی سہانا تھا۔ سڑکیں بھیگ کر نئی نویلی دلہن کی طرح چمک رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے لگے درخت کے پتوں سے اوس ہلکی ہلکی اس طرح گر رہی ہو جیسے کسی عاشق کو بہت سالوں کے بعد اس کی محبوبہ کی یاد آئی ہو اور وہ بے اختیاری کے عالم میں اس کو یاد کرتے ہوئے آنکھوں کو وضو کروا رہا ہو۔

میں کسی پاگل انسان کی طرح بنا کسی مقصد کے سڑک کے کنارے سر پہ چھتری سجائے کھڑا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں وہاں کیوں کھڑا تھا۔ بس اتنا پتہ ہے کہ وہ صبح میری زندگی کی سب سے خوبصورت صبح تھی۔ بالکل اس طرح جیسے میں نے اسی صبح اس دنیا میں اپنی آنکھیں کھولی ہوں۔

میں نے سیاہ رنگ کا لمبا سا اوورکوٹ پہنا تھا جس نے میری خوبصورت سفید شرٹ اور بلیو جینز کو چھپا رکھا تھا۔ دھند کے باعث اوس میری چھتری کے اردگرد سے جگہ بنا کر میرے بالوں کو گیلا کر رہی تھی۔ اوس کی چند بوندیں سرکتی ہوئی میری کشادہ سانولی پیشانی پہ اُمڈ آئی تھیں۔

میں اپنے گھر کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ سڑک کے کنارے۔ دفعتاً دھند چھٹنے لگی۔ دھند کے چھٹنے کا عمل صرف میرے سامنے ہی جاری تھا۔ باقی کی جگہیں اسی طرح دھند سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

میرے سامنے جب منظر تھوڑا صاف ہوا تو میں نے اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت تصویر دیکھی۔

اس نے بلیو رنگ کی جینز کے اوپر اون کی لمبی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا دستانہ تھا جس سے وہ اپنے دوسرے ننگے ہاتھ کو رگڑ کر حرارت پہنچا رہی تھی۔ اس کی ناک میں گولڈن کلر کی نتھلی تھی اور اس کے ہونٹ۔ اس کے ہونٹ شاید قدرتی طور پر گلابی تھے۔

Digitized by Google

اور اس کی آنکھیں۔ اس کی آنکھیں گہری کالی اور موٹی تھیں۔ پلکوں کی تراش بھی شاید قدرتی طور پر باکمال تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑھ کر حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

ایک پل لگا۔ صرف ایک پل۔ مجھے اس سے محبت ہونے میں۔

وہ ایک پل آج بھی میں اپنی زندگی کے سب سے حسین پلوں میں شمار کرتا ہوں۔

وہ جب میرے پاس سے گزر کر دھند میں کہیں غائب ہوگئی تو مجھے ہوش آیا۔ نا جانے کتنا ہی وقت میں نے اس کے جانے کے بعد مدہوشی میں گزار دیا تھا۔

اسی دن مجھے معلوم پڑا کہ وہ ہماری کالونی میں نئی آئی تھی۔

میں روز اسکا اسی جگہ دھند میں کھڑے ہو کر انتظار کرتا رہتا۔ وہ جاب پہ جاتے ہوئے میرے پاس سے گزرتی۔ اس کی نگاہیں نا ہی مکمل طور پر سامنے ہوتیں نا ہی زمین پہ گڑی ہوتیں۔ وہ جب میرے پاس سے گزر جاتی تو میں گھر کو لوٹ آتا اور اس کے واپس آنے کا انتظار کرتا۔

ایک شام جب وہ جاب سے واپس لوٹی تو اس کے ساتھ ایک میرا ہم عمر لڑکا بھی تھا۔ میں سڑک کے کنارے پڑے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری نگاہیں جب اس لڑکے پر پڑیں تو نا جانے کیوں میرے دل نے اسے میرا رقیب مان لیا۔

وہ آپس میں شوخی بھری باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئے اور میں وہیں ان کو انکے گھر میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ گھر داخل ہونے سے ایک لمحہ پہلے اس لڑکے نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میرا ہاتھ پتھر کی سل پہ جانے کب سے رگڑیں کھا کھا کر لہولہان ہو چکا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ آنسوؤں سے میرا چہرہ بھی بھیگ چکا تھا۔

نا جانے کسی نے مجھے اس حالت میں دیکھا تھا یا نہیں۔

اگر دیکھا تھا تو یقیناً وہ مجھے پاگل تسلیم کر چکے تھے۔

پھر وہ لڑکا مجھے روز ہی اس کے ساتھ دکھائی دینے لگا۔ میں انکا پیچھا بھی کرتا تھا۔ ایسا کرنے سے میرے دل میں لگی آگ اور بھڑک جاتی تھی اور میں اپنی لگائی آگ میں جلنے لگتا تھا۔

میں اکثر راتوں میں اس کو خواب میں دیکھ کر جاگ جاتا تھا۔ جاگ آنے پر چھت پر چلا جاتا۔ چھت سے اسکا گھر بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔

بہت دن گزر گئے تھے۔ اس لڑکی کو بھی شاید اب یہ علم ہو گیا تھا کہ میں وہاں صرف اور صرف اس کے لیے ہی کھڑا ہوتا تھا۔

پھر ایک شام اس لڑکی کے گھر روشنیاں چمکنے لگیں۔ شور وغل کے ساتھ رومینٹک گانے بجنے لگے۔

اس شام اس لڑکی کی منگنی تھی۔ اسی لڑکے کے ساتھ۔

مجھے جب پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اگر پہلے علم ہو جاتا تو بھی میں نے کیا کر لینا تھا۔ اس سے آج تک بات تو کر نہیں پایا تھا۔ ساری رات میں روتا رہا۔ ایسی محبت تو میں نے خود سے بھی نہیں کی تھی۔

اگلی صبح میری زندگی کی ایک بھیانک صبح ثابت ہوئی۔

میں نے اس کو آتے دیکھ کر سڑک پر ہی اسکا رستہ روک لیا اور مجنوں کی طرح اس سے اظہار محبت کر دیا۔

تبھی بادلوں کی گرج میں ایک دہشت سنائی دی اور پٹاخ کی آواز کے ساتھ میرے سانولے گال پر اس کی انگلیوں کے نشان رقم ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا تھا۔

ہاں صرف مجھے ہی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور میرے گال پر بھی۔ وہ لڑکا پاس خاموش کھڑا رہا۔

Digitized by Google

میری آنکھوں سے خوشی اور غم کی وجہ سے آنسو بہنے لگے۔
خوشی اس بات کی کہ اس نے مجھ ناچیز پر نگاہ قہر ڈالی اور مجھے چھو کر گوہر نایاب بنا دیا۔ اور غم اس بات کا کہ اس نے رقیب کے سامنے ایسا کیا۔
وہ لڑکا کچھ بھی نہیں بولا۔ وہ لڑکی آگے بڑھ گئی۔ وہ لڑکا میرے پاس ہی کھڑا رہا پھر اس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور آنکھوں سے اظہار افسوس کر کے چلا گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی غصہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ من کی سچائی سے میرے مردہ دل پہ فاتحہ پڑھ رہا تھا۔
میں نے دیکھا تھا۔ کہ۔ وہ میرے جیسا نہیں تھا۔ آہ۔!
ایک ہفتہ میں گھر میں پڑا رہا۔ اس کو دیکھے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ دل پہ اس کے لفظوں کے تیزاب بھی برستے محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن آنکھیں پھر بھی اس کی دید کو ترس رہی تھیں۔ بہہ بہہ کر فریاد کر رہی تھیں۔ دل کی آہ و زاریاں بھی شدت اختیار کر گئی تھی اور اوپر سے فروری کی بارشیں۔
مجھے یاد ہے کہ میں نے وہ بارشیں خود بادلوں سے شرط لگا کر برسائی تھیں۔ ایک جانب بادل برس رہے ہوتے اور جانب میری آنکھیں۔
پھر ایک رات جب میں سردی میں تھوڑا ٹھٹھر رہا تھا اور رات کے گیارہ بجے سنسان سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا سگریٹ کے مرغولوں سے اسکاٹس بنا رہا تھا تو میرا رقیب میرے پاس خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔
میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں۔
کچھ دیر کے بعد اس نے میری انگلیوں سے خود ہی سگریٹ پکڑ کر کش لگا اور بجھا کر پھینک دیا۔ میں حیرانی سے اس انسان کو دیکھ رہا تھا جس کے ساتھ میرا رشتہ فقط دشمنی کا بنتا تھا لیکن اس کے ماتھے پر تو ایک غصے کی شکن بھی نا تھی۔
پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا؛
''دوست۔ محبت انسان کو بناتی ہے۔ بگاڑتی نہیں۔ محبت تو مضبوط بناتی ہے۔ لیکن تم کیوں کمزور پڑ گئے ہو۔؟''
اتنا کہہ کر وہ پھر سے میرا کندھا تھپک کر چلا گیا اور مجھے خیالوں میں قید کر گیا۔
وہ کیوں مجھ سے ہمدردی کر رہا تھا۔؟
وہ تو اسکا محرم بننے والا تھا پھر کیوں وہ کسی نامحرم کو اس کے محرم کو محبت کرنے سے روک نہیں رہا تھا؟؟؟
وہ کیوں اتنا اچھا تھا۔؟
اس ساری رات میں نے پہلی بار اپنے رقیب کو سوچا تھا۔
وہ واقعی بہت اچھا انسان تھا۔ حسن و خوبصورتی میں بھی کمال تھا۔ اسے محبت کو کھلا چھوڑ دینا آتا تھا شاید سب سے بڑی قید یہی کھلا چھوڑ دینا ہی ہوتا ہے۔
میں اس جیسا نہیں تھا۔ میں بیسٹ انسان تھا۔ مکار تھا میں۔ شاید میری محبت بھی صرف مکاری ہی تھی۔ اگر واقعی محبت ہوتی تو رقیب کی طرح میں مطمئن ہوتا۔ دل میں کوئی غم نا ہوتا۔
نا جانے میں محبت کر رہا تھا یا صرف مکاری ہی کر رہا تھا۔
اس رات پہلی بار اپنی جوانی کے دنوں میں میں خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوا تھا۔ پہلی بار کسی لڑکی کے لیے خدا کے سامنے رویا تھا۔ پہلی بار۔
بہت سی چیزیں پہلی بار ہی میری زندگی میں ہو رہی تھیں۔
بہت دن گزر گئے تھے اور میں نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ دراصل میں نے اس کی راہ تکنا چھوڑ دی تھی۔
میں جان گیا تھا کہ محبت میں دکھاوہ نہیں ہوتا۔ میں اسے دکھاوہ کر کے اپنی محبت کا یقین نہیں دلوا سکتا تھا۔

Digitized by Google

میرا کام تو بس محبت کرنا تھا۔ بے پناہ محبت۔

ایک شام میں بارش میں بھیگتا ہوا گھر آ رہا تھا کہ تبھی اس لڑکی سے میرا سامنا ہو گیا۔ میرے منہ سے سردی کی وجہ سے ہلکا ہلکا دھواں نکل کر بارش کی بوندوں میں اپنا عکس کھو رہا تھا۔ میرے سارے کپڑے بھیگ کر جسم سے بالوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ اپنے گھر کی طرف جاتی سڑک مڑتے ہی وہ دوسری طرف سے میرے مقابل آ گئی۔

سڑک اس وقت بالکل سنسان تھی۔ شاید خدا نے ہماری اس بھیگتی ملاقات کی خاطر تبھی کو چھپا دیا تھا۔ اس کی اچانک سے مجھ پر نظر پڑ گئی۔

دل اچانک سے زور سے دھڑکا۔ دو بار آنکھیں بند کر کے کھولیں تا کہ اس کرشمے کا یقین ہو سکے۔ وہ تھوڑا بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے پاس چھتری تھی جسے اس نے سر پہ تان رکھا تھا۔

میں اس کو دیکھ کر خود بخود ہی رکھ گیا تھا۔ نا جانے کیوں وہ بھی رک گئی تھی۔

کچھ دیر وہ بھی چپ کھڑی رہی اور میں بھی۔

سڑک پہ گرتی بارش کی بوندیں کوئی مدھر سا گیت بن رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر کہیں بھی حقارت نظر نہیں آ رہی تھی۔ آج کچھ اور تھا ان آنکھوں میں۔ کچھ ایسا جو بہت خاص تھا اور جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ میرے قریب آ گئی۔ بہت قریب۔ اس کی سانسوں کی آواز مجھے سنائی دینے لگی۔

پھر اس نے چھتری آدھی میرے سر پر تانی اور آدھی اپنے سر پر اور بولی؛

''اب چلیں۔؟''

ان دو لفظوں میں کتنا کچھ تھا۔ میرے لیے یہ دو الفاظ کائنات کی سبھی کتابوں کے حروف سے اہم تھے۔ کیونکہ یہ دو الفاظ اس نے خاص میرے لیے بولے تھے۔ ہاں۔ صرف میرے لیے۔ کسی نفرت بھرے لہجے کے بغیر۔

میں نے اس کو دیکھا اور اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے ساری کائنات ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔

اسے کیا خبر تھی کہ میرے چہرے پہ پھیلنے والے پانی میں زیادہ تر بوندیں نمکین پانی کی تھیں۔ شدت جذبات سے میری آنکھیں بہے جا رہی تھی۔ ہم ساتھ ساتھ ہو کر بھی میلوں کی مسافت پہ کھڑے تھے۔

ہمارے درمیان ہمارا رقیب دیوار نا سہی لیکن ایک کنکر کی مانند ضرور کھڑا تھا۔ میرے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔

ایک اور خوشگوار بات پتہ چلی۔ وہ یہ کہ اسے میرے گھر کا پتہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس چار دیواری کے اندر ایک ایسا انسان رہتا ہے جو اس پہ مرتا ہے۔ وہ جانتی تھی سب۔ ہاں جانتی تھی وہ۔

یہ فخر ہی کافی تھا میرے لیے کہ اسے میرے حجرے کا پتہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے عشق میں جوگی بنا انسان یہاں رہتا ہے۔

پھر میری طرف اس نے ایک بار پھر سے دیکھا۔ مکمل نظروں سے۔ اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ اپنے گھر کے دروازے کے پاس رک کر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں وہیں جما کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

میری جاب شارٹ ہو گئی تھی۔ کام کے علاوہ کوئی اور کام تھا ہی نہیں۔

بس آفس سے شام کو واپسی ہوتی اور آتے ہی بستر پر ڈھے جاتا۔ اس کو دیکھے ہوئے بھی ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے یاد نہیں کرتا تھا۔ وہ تو ہر پل میری سوچوں میں آفس کی فائلوں میں نظر آتی رہتی تھی۔ بس اس کو دیکھے بہت دن ہو گئے تھے۔ ایک شام میں شاپنگ کرنے مال میں گیا تو ایک دوکان میں میرا اس سے سامنا ہو گیا۔ وہ اکیلی

Digitized by Google

نہیں تھی۔ میرا رقیب۔ اسکا مگیتر اس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے منگیتر کو شرٹ کا رنگ بتا رہی تھی کہ یہ رنگ تم پہ اچھا لگے گا۔ میں بھی شرٹس ہی دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہ نظر میری جانب کر کے دیکھ لیتی۔ شاید وہ دیکھ رہی تھی کہ میں اپنے لیے کونسا رنگ منتخب کرتا ہوں۔ اس کی نظریں مجھے بتا دیتی تھیں کہ یہ رنگ اچھا نہیں ہے۔ پھر ایک شرٹ پہ آ کر اس کی آنکھوں میں چمک بھر آئی۔ میں نے وہی شرٹ خرید لی اور گھر لوٹ آیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی تھی۔ اور پتہ نہیں سوچتی بھی تھی یا نہیں۔ لیکن میرے دن اور رات اسی کو یاد کرتے بیت جاتے تھے۔

وہ ایک گرمیوں کی شام تھی جب میں اپنے گھر کی چھت پہ لیٹا ہوا تھا۔ بیل بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھول کر دیکھا۔

میرا رقیب میرے سامنے کھڑا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ اسے دیکھ کر اب مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہاں ایک بات ضرور تھی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ حسینہ اس کو چاہتی تھی۔ کہتے ہیں نا کہ محبت تو وہی ہے جس میں محبوب کے محبوب کو بھی چاہا جائے۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا تو اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ میں اسے اپنے ساتھ مہمان خانے میں لے آیا۔ اس کے لیے چائے بنائی اور اس کو کپ تھما کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ چائے پینے کے بعد اس نے میری طرف نم آنکھوں سے دیکھا۔ یہ ایک پل میں اس کی چمکیلی آنکھوں میں نمی کہاں سے امڈ آئی تھی۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کچھ کہنے ہی آیا تھا۔ ایسے ملنے تو آیا نہیں۔

"پرسوں ہماری شادی ہے۔ میں تم کو شادی پہ مدعو کرنے آیا ہوں۔ میرا ارادہ تو تمہیں یہ بات بھی بتانے کا نہیں تھا لیکن آبش نے کہا کہ میں تم کو شادی پہ ضرور بلاؤں۔ اسی لیے میں آ گیا۔"

اس نے شرمندگی سے کہا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کو کندھوں سے پکڑ کر گلے لگا لیا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لیے کتنا درد اور غم تھا۔ وہ میرے لیے غمگین تھا۔ اپنے رقیب کے لیے آنسو بہا رہا تھا۔

میرے رقیب کے توسط سے آج اس مہ جبیں کے نام کا بھی علم ہو گیا تھا۔

آبش۔

آہ۔ کتنا پیارا نام تھا۔

میرا رقیب اس شام میرے پاس دو گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ وہ مجھے صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ دونوں کتنی شدت سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اس بے بتایا تھا آبش صرف اور صرف اسی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن پھر اس نے کچھ ایسا بھی بتایا جو میرے لیے بہت معنی رکھتا تھا۔

اس نے بتایا کہ آبش اس سے بہت محبت کرتی ہے لیکن جب سے میں نے سڑک پہ اس سے اپنی جنونی محبت کا اظہار کیا ہے تب سے وہ مجھ سے کوئی بھی محبت کی بات کرنے سے ڈر محسوس کرتی ہے۔ میری باتوں میں نا جانے کہاں وہ تم کو لے آتی ہے۔

اس کی خواہش ہے کہ اب جلدی سے مجھ سے شادی کر لو۔ نا جانے کیوں وہ اس بات سے پریشان ہے کہ کہیں اسے تم سے محبت ہی نا ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے لیکن دوست شاید تمہاری محبت اس کو مکمل میرا نہیں ہونے دے گی۔ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ آدھی تمہارے پاس ہی رہے گی۔ اور دوست ادھوری چیزیں ہوں یا محبت۔ بہت تکلیف دیتی ہیں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں اس کی باتوں پہ غور کرنے لگا۔

نا جانے وہ مجھ سے مدد طلب کر رہا تھا یا میری محبت سے ڈر رہا تھا۔ اس ساری رات میں سو نہیں پایا۔ میں نا چاہتے

Digitized by Google

ہوئے بھی دو محبت کرنے والوں دلوں میں دیوار بن گیا تھا۔
اور آبش نے اتنی جلدی شادی کا ارادہ بھی اسی لیے کیا تھا کہ کہیں وہ میری محبت میں اپنے منگیتر کو مسترد نا کر دے۔
میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔
کہتے ہیں کہ جب دل اور دماغ کی جنگ جاری ہو اور کوئی بھی بات سمجھ نا آرہی ہو تو خود کو ڈوبتے شخص کی طرح لہروں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ بہتا لکھا ہوا تو کوئی تنکا آپکی دسترس میں ضرور آجائے گا۔
دو دن کے بعد اس کی شادی تھی۔
میں چھت پہ کھڑے ہو کر اس کے سجے ہوئے گھر کو دیکھ کر دل میں آنسو بہاتا رہا۔ اس دن میں نے آنسوؤں کے مدد سے اس کو آخری بار یاد کیا تھا۔ میں اسے اپنے رقیب اور اس کی خوشی کی خاطر اپنی محبت سے قدم پیچھے ہٹا رہا تھا۔
میں کیا تھا اور کیا بن گیا تھا۔ میں تو ایسے ہی ان دونوں کے درمیان آدھمکا تھا۔ کیوں اب کی خوشیاں خراب کرتا۔
اس دن میرا رقیب بارات لے کر نہیں آیا۔
وہ دلہن بنی اسکا انتظار کرتی رہی مگر وہ کبھی نہیں آیا۔
وہ بھی جانتی تھی اور میں بھی کہ میرا رقیب اس کو صرف میرے لیے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ ادھوری آبش کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔
میں اس کے گھر میں بیٹھا افسوس کر رہا تھا جب وہ اپنی ماں کے ساتھ دلہن بنی میرے پاس آکر رک گئی۔ میں نے اس دن وہی شرٹ پہنی تھی جو اس نے میرے لیے پسند کی تھی۔
میں نے دیکھا کہ دھوپ تھی لیکن ایک دم سے ہر طرف سایہ ہو گیا۔ اس نے مہرون کلر کا لہنگا پہنا ہوا تھا اس دن وہ جنت کی ستر حوروں میں سے ایک لگ رہی تھی۔
میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
میں نے سوچا تھا کہ وہ بارات نا آنے پر مجھ پہ غصہ ہوگی۔ کہے گی کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نا ہوتے تو یہ سب نا ہوتا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔
اس نے مجھے گہری نظروں میں دیکھا۔ میں نے شرمندگی سے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔
پھر بولی؛
''شادی کرو گے مجھ سے؟؟''
میں نے حیرت سے تڑپ کر اپنی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی شاید وہ سب کچھ پہلے سے ہی انہیں بتا چکی تھی۔
''بولو۔ کرو گے شادی؟؟؟''
نا جانے کیوں میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کو انکار دینا چاہیئے تھا۔ مگر میں بہت مطلبی تھا نا۔ مجھے تو اس کو حاصل کر لینے سے مطلب تھا۔ محبت تو میرا رقیب کر گیا تھا یا وہ کر رہی تھی۔
ہمارا نکاح ہو گیا اور وہ دلہن بن کر میرے گھر میں آگئی۔ اس کو پا کر ایسا لگا جیسے میں نے دنیا جیت لی ہو۔
لیکن بعض دفعہ دل جیتنا دنیا جیتنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔
میں اس کے ساتھ خوش تھا اور وہ بھی وہ بھی نہیں تھی۔
پھر میری محبت نا جانے کیوں سرد پڑتی گئی۔ اس کو حاصل جو کر لیا تھا۔ مگر شاید اس کے دل کو جیت نہیں پایا تھا۔ وہ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں ثابت ہوئی تھی۔

Digitized by Google

ہمیشہ میرا رقیب میری دعاؤں میں شامل رہا۔ وہ انسان سچ میں محبت کو امر کر گیا تھا۔ آبش کے دل میں بھی صرف اسی کے لیے ہی محبت تھی۔ وہ شاید مجھے کبھی پیار نہیں کر پائے گی۔ میرا رقیب مجھے اس دن کے بعد کبھی نظر نہیں آیا۔ لیکن ہاں۔ وہ آبش کی آنکھوں میں ہر پل موجود رہتا تھا۔

یہ بھی سچ تھا کہ میں اس سے کبھی نفرت نہیں کر پایا تھا۔ وہ ایسا رقیب تھا جس سے صرف محبت کی جا سکتی تھی۔ مجھے اور آبش کو ایک کر کے بھی وہ ایک نا کر پایا۔

میری محبت کی داستان میں تین لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے پیار کو ترستے ہی رہے اور شاید مرتے دم تک ترستے ہی رہیں گے۔

محبت میں ''دینا'' ہی محبت ہوتی ہے۔

اور وہ دونوں محبت کر گئے تھے۔ ایک دوسرے سے۔ ایک دوسرے کی خاطر۔

میں اس کو حاصل کر کے بھی خالی ہاتھ کھڑا تھا۔!

آہ۔ یہ محبت۔!

......☆☆☆......

بانو

عصنا عباسی

جب بھی نورے کو گھوڑے کی رفتار میں کمی محسوس ہوتی وہ جلدی سے گھوڑے کو چابک مار کر ٹک ٹک کرنے لگ جاتا تھا- آخر تانگہ گاؤں کے کچے راستے سے ہوتے ہوئے خان لالا کے گھر کے سامنے آ پہنچا-

''اچھا بھائی نورے بس یہی ٹھیک ہے...... . روک دو...... . اللہ خیر کرے ''نورے نے جونہی گھوڑا روک لیا خان لالا اللہ کا نام لیتے ہوئے اپنے عصا کے مدد سے تانگہ سے اتر آئے-

''تو اچھا نورے چائے پیو گے''

''جی نہیں بس شکریہ'' نورے نے رسماً انکار کیا-

''تو چلو پھر یہ بتاؤ کتنا ہو گیا؟'' خان لالا نے اپنی چادر کو لپیٹ کر کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا-

''کیا خان لالا......؟'' نورے نے انجان بننے کی کوشش کی-

''ارے بھائی میں پیسوں کی بات کر رہا ہوں''

''جی وہ تو آپ جو مناسب سمجھے''

''اچھا اچھا...... . یہ لو اور گن لو اگر کم ہو تو بتا دینا'' خان لالا نے جیب میں سے پیسے نکال کر نورے کو تھماتے ہوئے کہا-

''خان لالا بس یہ بہت ہے'' نورے نے پیسے گن کر جیب میں رکھ دیئے اور اللہ حافظ کہتے ہوئے اپنا تانگہ لیکر چلتے بنا- نورے کیر خصت ہونے کے بعد خان لالا عصا احتیاط سے رکھتے ہوئے اپنے گھر کے چوبی دروازے پر زنجیر سے دستک دیتے ہوئے دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑے ہو گئے-

''السلام علیکم خان لالا'' دروازہ کھولتے ہی سکینہ نے اپنے دوپٹے کا پلو سر پر درست کر لیا-

اگر چہ خان لالا کا اصل نام فقیر خان تھا مگر باہر والوں کیساتھ ساتھ گھر والے بھی انھیں خان لالا ہی کہتے تھیں-

''وعلیکم السلام . . . وعلیکم السلام'' خان لالا نے ہنس کر سکینہ کو جواب دیا- سکینہ خان لالا کی آخری سنتان تھی جسے اپنے شوہر نے شادی کے چند ماہ بعد ہی طلاق دے دی تھی اس لیے یہ تب سے خان لالا کے خدمت کا فریضہ

Digitized by Google

انجام دے رہی ہے۔

"ارے گل خانا ہا چہ (بچے)" خان لالا نے شاید صحن میں آتے ہی گل خان کو دیکھ لیا تھا جو کہ ایک کمرے کے باہر عین اس کے دیوار کے سائے تلے جائے نماز پر بیٹھ کر بندوقوں کو تیل لگا کر ان کی صاف صفائی میں جھٹا ہوا تھا۔

"جی خان لالا" گل خان، خان لالا کے ناگہانی آمد سے قدرے جھجک سا گیا۔

"یہ بتاؤ یہ تم نے کس فضول کام میں خود کو مشتول (مشغول) کیا ہے" چونکہ خان لالا کی دور کی نظر تھوڑی کمزور تھی اس لیئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشانی پر ایک ہاتھ سے چھجہ بناتے ہوئے کافی غور سے گل خان کی جانب دیکھا۔

"ارے وہ خان لالا پرسوں اپنے خیرو کی شادی ہے ...... تو وہ دوستوں نے بندوقیں لانے کا کہا تھا" گل خان پلاسٹک کی قدرے موٹی سی ڈور کے ایک سرے سے تیل میں لتھڑا ہوا لیر باندھ کر ڈور کے دوسرے سرے کو بندوق کی نالی میں نکال کر لگاتار کھینچا چلا جا رہا تھا۔

"وہ تو ہمیں بھی پتا ہے...... مگر کس لیے؟"

"جی وہ فائے رنگ (فائیرنگ) کے لیئے" گل خان نے شست باندھنے کے لیئے اپنی ایک آنکھ بند کر کے بندوق کے سیدھ میں دیکھا۔

"ارے بیوقوفا (بیوقوف) اگر کسی کو گولی لگ گئی تو...... ؟" گل خان نے خان لالا کی سنی ان سنی کر دی اور بندوق ایک طرف رکھ کر کمرے میں داخل ہو کر چلمن کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"ہمیں اللہ نے بڑی کم بخت اولاد دی ہے" خان لالا نے بڑبڑا کر کہا اور نسوار لگا کر چارپائی پر نیم دراز ہو گئے۔

"ارے سکینہ لورے (بیٹی)" خان لالا نے سکینہ کو خود سے مخاطب کرنے کے لیے آواز دی۔

"جی خان لالا" خان لالا کی آواز سن کر سکینہ جلدی سے رسوئی سے نکل آئی۔

"وہ گل بانو دکھائی نہیں دے رہی"

"جی وہ اور کلثوم تو پہاڑوں کا سیر کرنے گئی ہے" سکینہ نے کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے" خان لالا کی بات سننے کے بعد سکینہ پھر سے رسوئی میں چلی گئی۔

بانو خان لالا کی پوتی تھی چونکہ بانو کے ماں باپ ایک کار حادثے میں جان بحق ہوئے تھیں اس لیے خان لالا نے بانو کو دس سال کے عمر میں ہی اپنے ماما کے ہاں لاہور بھیج دیا تھا اور بانو ہر سال کی طرح اس سال بھی چھٹیاں منانے سوات آئی ہوئی تھی۔ کبھی تو وہ چیڑ اور دیودار کے تناور درختوں سے ڈھکے ہوئے وادی کے درمیان خاموشی سے بہتے ہوئے ندی کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر ان حسین نظاروں سے مزے لے رہی تھی۔ اور ان ہرے بھرے پہاڑوں پر جا بجا ترتیبی سے پھیلے ہوئے گگروندوں سے ایک ایک گگروندا توڑ کر اس کے گلوب نما روئی کا پھوا پھونک مار مار کر اسے بلکل روئی جیسے ہوا میں، بجورتی اور گنجے ڈنٹھل کو ندی میں پھینک دیتی۔

بانو نے عمدہ نقاشی والا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اور اس کی گھنیری زلفوں کی چوٹی میں ایک خوبصورت جنگلی پھول اٹکا ہوا تھا۔ ساتھ میں اس کی ٹھوڑی پر سلائی سے کیے گئے تین تکون نما کالے خال اور ایک ہاتھ کی کلائی میں سونے کا گھسا ہوا کنگن بھی تھا جو کہ اس کی ماں کی آخری نشانی لگ رہی تھی۔

بانو جب اپنے بچپنے سے نکل آئی تو اس کی نظر سامنے والے پہاڑ پر پڑی۔ کیونکہ سامنے والے پہاڑ پر دو گڈریاں جن کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بھی تھا جسکا گریبان پورا کھلا ہوا اور بال الجھے ہوئے تھے بھیڑ بکریوں کو ٹشکاریاں دے کر شاید گھر لوٹ رہے تھیں۔ اور پہاڑوں کے دامن میں پنگھٹ اور قدرتی چشموں سے مٹکے بھر کر یا پھر بھرنے کے لیے کم سن دوشیزائیں اور ادھیڑ عمر کی عورتیں جن میں پانی سے مملو مٹکی اٹھانے کی سکت ہوتی، اپنی چنری کا پلو منہ میں دبا کر

Digitized by Google

ٹولیوں کے شکل میں پہاڑوں کے ٹیڑھے میڑھے گھاٹیوں پر خراماں خراماں چل رہی تھیں - اور وہ بھی قطار در قطار جیسے سپاہیوں کا دستہ ہو-

بانو اس خاموش نظارہ کو کچھ دیر بڑی خاموشی سے دیکھتی رہی، اور پھر اچانک اپنے جھولتے پیروں کو روک کر کہنے لگی-

''سچ میں اس باغ کی اور ہی ہوا ہے.......... کتنا خوبصورت نظارہ ہے...... کاش...... کہ یہ نظارہ ہمیشہ کے لیئے بس ایسا ہی رہتا...... کلی فضاء، تازہ ہوا اور اوپر سے یہ قاتل نظارے ...... جی تو چاہتا ہے کہ ساری عمر بس ان ہی نظاروں کو دیکھتی رہوں'' آخر میں بانو نے اس مرطوب فضاء میں ایک لمبی سانس لی-

بانو سے کچھ فاصلے پر کلثوم ندی میں کنکر پھینک کر لطف اٹھا رہی تھی شائید اس نے بانو کی پوری بات نہیں سنی-

''آپی...... تم نے کچھ کہا کیا......؟''

''نہیں تو...... چلو گھر چلتے ہے'' بانو جیسے ہی اٹھ کر گھر کے طرف چلنے لگی تو کلثوم نے بھی ایک آخری کنکر ندی میں پھینک کر بانو کا تعاقب کیا-

''ارے بانو آپی رکو تو سہی...... . کیوں بھاگی چلی جا رہی ہو؟'' لیکن بانو نے کلثوم کی سنی ان سنی کردی اور ہاتھ میں لی ہوئی چھڑی گھما گھما کر چلتی گئی-

راستے میں ایک گڈریا بڑے تعجب سے بانو کو ایک ٹک گھورتا رہا- جو کہ بھیڑ بکریوں کو ایوارے سے نکال رہا تھا- شہر کے باسی تو بانو کے نرم و نازک جسم اور چہرے کی صباحت کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ جاتے لیکن جہاں عورتیں بڑے بڑے اور سایہ دار برقعوں میں گھروں سے نکلتی ہیں وہاں بانو کی آزادی دیکھ کر کسی کا بھی دنگ رہ جانا بجا تھا- لیکن بانو کا گڈریے کے طرف دھیان ہی نہیں گیا اور اس نے ایوارے کے قریب سے گزر کر اپنے گھر کے عقبی دروازے کا رخ کیا جو کہ پھلوں کے باغات میں کھلتا تھا- گھر پہنچ کر جونہی بانو نے خان لالا کو دیکھا تو اس نے ان کے طرف قدم بڑھا لیے-

''السلام علیکم دادا جانی'' بانو نے مسکرا کر کہا-

وعلیکم السلام دادا کی جان...... . آ گئی تم؟.......... صبح سے تم کہاں غائب تھی؟'' بانو خان لالا کے قریب سرہانے کے مخالف جانب بیٹھ گئی-

''دادا جانی وہ میں اور کلثوم ندی کنارے گئے تھیں'' بانو نے خان لالا کے پیر دوں کو دابتے ہوئے کہا-

''اچھا اچھا ٹھیک ہے.......... . مگر زیادہ دور مت جایا کرو...... . . . کہیں تمھیں کچھ ہو نہ جائے'' خان لالا نے نسوار ایک طرف تھوک کر کہا--

''مجھے کچھ نہیں ہوگا دادا جانی.......... آپ کو میری اتنی فکر نہیں کرنی چاہیئے'' بانو نے خان لالا کو تسلی دیتے ہوئے خندہ پیشانی سے جواب دیا-

''کیسے نہ کروں فکر.......... . . . ارے سکینہ لورے (بیٹی)...... . . . ایک گلاس پانی تو پلاؤ''

''میں لاوں؟'' بانو نے استفہامیہ انداز میں کہا اور فوراً اٹھ کھڑی ہوگئی-

''ارے تم بیٹھو سکینہ لا دے گی نا'' خان لالا نے بانو کو روکتے ہوئے کہا لیکن تب تک بانو گھڑونج پر پڑے مٹکیوں سے ایک آبخورہ بھر لائی تھی-

''یہ لیجیے پانی ...... بس اتنی سی بات کے لیے آپ خواہ مخواہ آپی کو تکلیف دے رہے تھیں'' بانو نے خان لالا کو آبخورہ پیش کرتے ہوئے کہا

''شکر الحمد اللہ.......... . اللہ تمھیں خوش رکھیں بیٹی'' پانی پینے کے بعد خان لالا نے بانو کو آبخورہ تھماتے ہوئے دعا دی-

Digitized by Google

''ارے کمبخت (کمبخت) بس کرو نا'' خان لالا پھر سے گل خان پر غصہ ہو گئے کہ اب دوسرے بندوق کی شست باندھ رہے تھے۔

''خان لالا بس یہ آخری بندوق ہے'' گل خان نے لجاجت سے کہا۔

اور اچانک گل خان کے ہاتھوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی بندوق فیر ہو گئی اور چونکہ وہ بندوق کو قابو نہ کر پایا اس لیے آدھی گولیاں فضاء میں غائب ہو گئی اور آدھی بانو کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ خان لالا بانو کے جسم کو تھامنے کے لیے فی الفور چارپائی سے پھلانگ کر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اگرچہ انھوں نے بانو کے مردہ جسم کو زمین پر گرنے سے بچا لیا مگر افسوس کہ وہ اس کی زندگی بچا نہ پائے اور اس طرح جو ہاتھ خان لالا مہندی سے لال کرنے کا سوچ رہے تھے وہ ہاتھ خون سے لال ہو گئے.....!!!

.....☆☆☆.....

لفظوں کا لہو

محمد علم اللہ

ہندوستان میں ان دنوں ایک نیا رجحان تشکیل پا رہا ہے کہ اردو ادب میں نئے لکھنے والے قلمکاروں نے فکشن کی جانب توجہ مرکوز کی ہے اور اس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہیں، ان کے یہاں صرف خیال وتراکیب ہی نہیں ہیں؛ بلکہ ان کو پیش کرنے اور بہتر انداز میں برتنے کا طور طریقہ بھی ہے، اس نو جوان اور ہنر مند کارواں میں عادل فراز، ابو فہد، عمران عاکف خان، کامران غنی صبا، نورین علی حق، شہناز رحمان وغیرہم چند نمایاں نام ہیں، یہ قلمکار جس انداز سے اپنے قلم کو حرکت دے رہے ہیں، اگر وہ اسی انداز سے لکھتے رہے، تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ آسمان ادب کے نیر تاباں ثابت ہوں گے۔

سلمان عبدالصمد اسی قبیلے کے ایک قلمکار ہیں، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما سے عالمیت کی سند حاصل کی ہے اور اب جے این یو جیسے معروف ادارہ سے اردو زبان وادب میں تحقیق کر رہے ہیں، انھوں نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا لیکن زیادہ دنوں تک وہ اس دشت کی سیاحی نہیں کر سکے اور بہت جلد اس سے تائب ہو کر اپنی ایک الگ راہ بنانے کی ٹھانی۔ اردو صحافت میں ان دنوں جس قسم کی کالا بازاری اور دلالی کا زور ہے، اس میں کسی بھی جینوئن انسان کا رہنا واقعی بہت مشکل ہے، شاید اسی وجہ سے سلمان عبدالصمد سمیت بہتوں نے اس وادی کو خیر باد کہنا شروع کر دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے کلیتاً حرف وقلم سے رشتہ توڑ لیا ہے اور اب وہ اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتے ہیں؛ لیکن یہ خوش آئند بات ہے کہ سلمان نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا؛ بلکہ اپنی راہ بدل دی اور بہت کم وقت میں ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سلمان عبدالصمد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنا قلمی سفر جاری رکھا ہے اور فکشن کے ذریعے معاشرہ کو جگانے اور بیدار کرنے کی مہم کا ساتھ دے رہے ہیں، ابھی حال ہی میں ان کی کتاب ''لفظوں کا لہو'' منظر عام پر آئی ہے، یہ ان کا ناول ہے، جو تقریباً 1 2 2 صفحات پر مشتمل ہے، یہ ناول صحافت اور اس کے پس پردہ میں ہونے والی گھٹیا حرکتوں اور صحافت کے نام پر جاری ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کرتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے جاہل، استحصال پسند اور نام نہاد صحافت کے علمبردار مدیران و مالکان کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہار اور اس کے گرد ونواح سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے اردگرد کہانی گھومتی ہوئی بہار سے دلی اور پھر دلی سے سعودی عرب ہوتے ہوئے دوبارہ بہار پہنچتی ہے۔ لو سے لو جلاتے، چراغ سے چراغ روشن کرتے، حالات کی ستم ظریفیوں اور تھپیڑوں سے لڑتے، مار کھاتے اور طنز وطعنہ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ لفظوں کے لہو کو بے ضمیری

Digitized by Google

اور زرخریدی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے بچاتے ہوئے امید اور حوصلے کے پھریرے لہرانے میں یہ ناول کامیاب ہے۔

پوری کہانی بہار کے دیہات سے تعلق رکھنے والے محسن اور اس کی دو بیویوں نائلہ اور زنیرا، نائلہ کی سہیلی نیلا اور اس کے شوہر عبید کے اردگرد گھومتی ہے۔ یوں تو اکمل، ڈاکٹر رستوگی، صوفیہ، تمیم اور شبنم کے علاوہ ثانیہ، پنڈت جی اور نورشیہ جیسے ذیلی کردار بھی کہانی کا حصہ ہیں؛ لیکن یہ لوگ ذرا سی جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اخیر تک محسن، اس کی دونوں بیویاں، نیلا اور عبید ہی باقی رہتے ہیں۔ سماج کو کچھ دینے، اسے بدلنے اور ایک نئی دنیا سے متعارف کرانے کا ان پانچوں کو شوق ہے۔ اس کے لئے وہ لوگ صحافت کی وادی کو چنتے ہیں لیکن اولین دنوں میں کامیابی نہیں ملتی۔ محسن دہلی کے ایک اخبار میں کام کرتا ہے؛ لیکن مدیران کے استحصالی رویہ اور کم تنخواہ سے عاجز آ کر ایک دن اخبار چھوڑ کر تلاش روزگار کے لیے سعودیہ چلا جاتا ہے، اس کی دونوں بیویاں دہلی میں ہی رہتی ہیں، ایک گھر بار دیکھتی ہے، جبکہ دوسری ایک اسپتال میں نرس کی ملازمت شروع کر دیتی ہے، وہیں اس کی ملاقات نیلا نامی ایک غیر مسلم لڑکی سے ہوتی ہے، جو اس کی سہیلی بن جاتی ہے، دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں، ایک دن نیلا بھی اسپتال چھوڑ دیتی ہے اور کہیں روپوش ہو جاتی ہے، کئی سال کے بعد جب وہ واپس لوٹتی ہے، تو صحافت کی دنیا میں اپنا مقام بنا چکی ہوتی ہے، محسن بھی سعودیہ سے واپس آ جاتا ہے اور یوں سب ملکر چراغ سے چراغ جلانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ناول کا بیانیہ واجبی اور ٹھیک ٹھاک سا ہے، زبان و بیان کی بے شمار غلطیاں ہیں، جو باذوق قاری کو الجھن میں ڈالتی ہیں، شروع کے تقریباً پچیس صفحات کی زبان تو بہت عمدہ ہے، ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے ان کو بہت توجہ اور یکسوئی کے ساتھ لکھا ہے؛ لیکن اس کے بعد سے کسی حساس قاری کو اسلوب کے رنگ بدلنے کا جو احساس ہوتا ہے، وہ تقریباً اخیر تک جاری رہتا ہے، شروع کے پچیس صفحات کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے اس کو بہت ٹھوک بجا کر نگینے کی طرح بہت خوبصورتی سے سجایا ہے، مگر آگے کام کرنے کا غالباً موڈ نہیں بنا اور زبردستی بس خانہ پری کر دی ہے، پروف ریڈنگ کے علاوہ گرامر اور تراکیب کی بھی بہت سی غلطیاں ہیں، لگتا ہے مصنف کسی رو میں اس قدر بہتے چلے گئے کہ انھیں اس بات کا خیال ہی نہیں رہا کہ انہیں کیا اور کیسا لکھنا چاہیے اور کیا لکھ گئے ہیں؟ لکھنے کے بعد ناول پر شاید مزید کام نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ ایک بہترین ناول بنتے بنتے رہ گیا، اشاعت میں جلد بازی کا اظہار متعدد مقامات سے ہوتا ہے، جہاں خیالات کی تکرار کے ساتھ ساتھ کرداروں کی زبانی ہونے والی گفتگو یعنی مکالمہ اور ڈائلاگ بھی ملتے جلتے ہیں۔

ایک ہی بات کو بار بار گھما پھرا کر کہنے اور ایک جیسے الفاظ کو متعدد مرتبہ نقل کرنے سے ناول کا فن متاثر ہوتا ہے، اسی طرح کتاب میں کثرت سے غیر ضروری انگریزی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ ان کے خوبصورت اردو متبادل موجود ہیں، ذیل میں ایسے ہی کچھ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

جوائن کرنا (ص 3 9): اس کا خوبصورت اردو متبادل منسلک ہونا یا وابستہ ہونا موجود ہے۔

جرنلسٹ (ص 6 9): اس کا اردو متبادل صحافی یا صحیفہ نگار اردو میں مستعمل ہے۔

کمپرومائز (ص 1 1 2): اس کا اردو متبادل سمجھوتہ/صلح وغیرہ موجود ہے۔

آئڈیل (ص 1 1 2): اس کا متبادل مثالی ہے۔

لنچ (ص 167): دوپہر کا کھانا۔

ہسٹری (ص 167): تاریخ۔

کوئچن (ص 167): سوال۔

Digitized by Google

ڈسکس (ص 167): بحث ومباحثہ، گفتگو، مکالمہ۔
انفارمیٹیو (ص 167): معلوماتی۔
ڈیتھ (ص 167): موت۔
اپ سیٹ (ص 168): اداس/غمگین۔
سپوز (ص 169): فرض کرنا۔
پرپوز (ص 169): اظہار محبت کرنا۔
رفرنس (ص 170): حوالہ۔
ریزلٹ (ص 170): نتیجہ۔
فرسٹریٹڈ (ص 172): ذہنی الجھن، خلجان یا پریشانی کا شکار ہونا وغیرہ۔

یہاں صرف چند الفاظ کی نشاندہی کی گئی ہے، ورنہ ناول نگار نے پورے ناول میں کثرت سے ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال نہ کیا جائے؛ لیکن اردو متبادل کی موجودگی کے باوجود ایسے الفاظ کا استعمال ادب میں بے ادبی کی علامت ہے۔

کچھ بے محل الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں، جن کی نشاندہی نہ کرنا زیادتی ہوگی، ناول نگار ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایام طفلی کی سرحد میں نے پار کرلی، اب جا کر کچھ خلاصہ ہوا کہ یوں ہوتا ہے خون شیریں''۔ (ص 92)

یہاں لفظ ''خلاصہ'' انکشاف کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو اردو کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، اس طرح اردو الفاظ کا قابل اعتراض استعمال ہندی داں کرتے ہیں، جن کو الفاظ کے مادہ کا پتہ نہیں ہوتا یا پھر وہ ان کے استعمال کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہوتے، مدرسہ سے پڑھے ہوئے طالب علم سے کم از کم اتنی توقع تو رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اس قسم کی بھونڈی غلطی نہ کریں۔

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''شرمیلی روشنی میں دونوں کے چہرے کارواں رواں جاگ گیا تھا، ملگجی روشنی میں چہرے پر تازگی پھیلی ہوئی تھی۔'' (ص 117)

اب قاری تو اسٹوڈیو میں بیٹھا نہیں ہے کہ کارندہ نے سوئچ فوراً آن سے آف اور آف سے آن کردیا ہو کہ جس سے روشنی شرمیلی سے ملگجی ہوگئی، فن تحریر کی ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

ایک جگہ نائلہ اپنی سہیلی نیلا سے بات کررہی ہے، اسے اپنی داستان سنا رہی ہے۔ (ص 138)

اس 12 سطر کی تحریر میں آٹھ جگہ ' نیلا ' ، ' نیلا ' پکارا گیا ہے، زنیرا اگر کہانی سنا رہی ہے تو ایک ہی جگہ نام لینا کافی تھا، اگر وہ توجہ نہیں دے رہی تھی تو اسے ٹھوکا لگایا جاسکتا تھا؛ لیکن اتنا زیادہ نیلا نیلا کردیا کہ پورا صفحہ ہی نیلا ہوگیا۔

ناول میں جگہ جگہ '' پتہ نہیں کیوں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا''۔

'' جانے کیوں آج وہ مغموم تھا'' (ص 76)

جیسے جملوں کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے، جس سے لگتا ہے کہ مصنف کو خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، ان کے پاس صرف الفاظ کی ہی کمی نہیں ہے؛ بلکہ وہ تکنیک کا شکار ہیں۔ ہندی الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، جس سے گمان ہوتا ہے کہ کہیں اردو کے بجائے ہندی کا ناول تو زیر مطالعہ نہیں؟۔

گرماہٹ، بدبداہٹ، کہیں نہ کہیں، کھیاجانا، گرمادیا، مانو جیسے، بھومیکا وغیرہ جیسے الفاظ اگر کرداروں کی زبان سے ادا ہوں اور کردار بھی واقعتاً اسی لسانی مزاج کے ہوں، تب تو روا سمجھا جاسکتا ہے؛ لیکن پڑھا لکھا اور بہترین اردو جاننے

Digitized by Google

والا اس طرح کے الفاظ استعمال کرے تو انھیں فصیح کہنے میں تامل ہوگا؛ کیونکہ اس ناول کا ہیرو محسن اچھا خاصا پڑھا لکھا اور بہترین اردو جاننے والا بندہ ہے، جب وہ ایسی زبان استعمال کرتا ہے، تو طبیعت پر گراں گذرتی ہے، کتاب میں کئی جگہ ''نقل'' کو لال تحریر کیا گیا ہے۔

ناول میں گفتگو حال سے اچانک ماضی اور ماضی سے اچانک حال میں پہنچ جاتی ہے، جس سے قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ ابھی تو بات اِس کی ہو رہی تھی اب اُس کی بات کیسے شروع ہو گئی؟ بات چیت میں تو یہ انداز چلتا ہے؛ لیکن ظاہر ہے ناول میں یہ انداز قطعاً نامناسب ہوگا۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ ناول میں صرف غلطیاں ہی غلطیاں یا کمیاں ہی کمیاں ہیں؛ بلکہ ناول کی جو خصوصیت ہونی چاہئے، وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے، کچھ جملے اور مکالمے اتنے خوبصورت ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے، مثلاً ایک جگہ مصنف لکھتا ہے:

'لفظوں کو غلام بنانے والے، عدالتوں کو اتنے ہی الفاظ دیتے ہیں، جن سے ان کے افکار و خیالات کی ترجمانی ہو سکے۔ لفظ کے ذخیرہ اندوز اسکرینوں پر ایسے لفظوں کی پھول کیاریاں لگاتے ہیں، جو انھیں دلکش مالا اور ہار دے سکیں۔ صحافت کے سینوں پر ان لفظوں کا ہی خون بہایا جاتا ہے، جن سے انسانیت لہولہان ہو جائے، تہذیب زخم خوردہ اور تاریخ کی سرخیوں میں بدنمائی شامل ہو جائے''۔ (ص 8)

ناول کے بالکل اختتام پر نائلہ کی زبانی تقریر میں لکھا گیا ہے:

'دنیا میں دو بھوک بڑی خطرناکیوں کے ساتھ پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ایک پیٹ اور دوسری پیٹھ کی بھوک ہے۔ یعنی پیٹ اور جنس کی بھوک! ان دونوں بھوک سے ہی دنیا میں جرائم پنپ رہے ہیں، ان دونوں بھوک کی وجہ سے انسان، انسان کا لہو بہانے پر عار تک محسوس نہیں کرتا، ان دونوں بھوک کو مٹانے کے لئے ہی عدالت ہو کہ میڈیا گھرانے، لفظوں کا لہو بہایا جاتا ہے، میری نگاہ میں ان دونوں بھوک کے علاوہ ایک اور بھوک ہے، وہ ہے رشتوں کی بھوک! آج انسان رشتوں کی بھوک میں مبتلا ہے۔'' (ص 223)

یہ اور اس قسم کے کئی دلچسپ اور متاثر کن جملے، استعارے اور خیالات بتاتے ہیں کہ سلمان عبدالصمد میں ایک اچھے فکشن نگار کی صلاحیت موجود ہے؛ لیکن اس کے لیے ریاضت شرط ہے، یہ نقش اول ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا، اس ناول کو دائمی پرواز ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ 800 کی تعداد میں شائع شدہ اس ناول کی قیمت 100 روپے ہے۔

......☆☆☆......

سمجھدار

زوہینہ مریم

''اتنا آسان نہیں ہے رشتہ بنانا اور پھر اسے توڑنا۔'' حلیمہ خاتون اپنی بیٹی کو ڈانٹ رہی تھی جو مزے سے چیونگم کھاتے ہوئے موبائل پر معروف تھی۔

''میں تم سے بات کر رہی ہوں خدیجہ۔'' وہ اس کے نظرانداز کرنے پہ جھنجھلا گئی۔

''سن رہی ہوں میں امی بچپن سے یہ سب سنتی آ رہی ہوں۔''

''تم نہیں سنتی تم نہیں سن رہی سنتی ہوتی تو آج اتنی بڑی بات یوں نہ کہہ دیتی'' وہ سر پکڑ کہ بیٹھ گئی'' خدارا چھوڑ دو اسے میری طرف دیکھو'' ان کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

''امی مجھے یہ رشتہ نہیں نبھانا۔ وہ کہیں سے میرے سے match نہیں کرتا'' خدیجہ نے بلا کی بے باکی سے ماں کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

www.urdutube.com
Digitized by Google

''اور تمہیں آج معلوم ہوا ہے۔ یہ رشتہ تم سے پوچھ کے ہوا تھا۔ match ہونا کیا ہوتا ہے تمہارے ابا مجھ سے نہیں match کرتے تھے (خدیجہ نے بے اختیار جمائی لی) میں لاہور آرٹس کالج کی شوخ لڑکی وہ لاء کالج کے خشک مزاج۔ گزار رہے ہیں ناں۔ کبھی جھگڑا تک نہیں ہوا'' انہوں نے جیسے کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ بیرونی دروازہ کھلا خدیجہ کے تایا کی بیٹی داخل ہوئی مزاج میں اور تلخی گھل گئی۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ ''سلام تائی۔ ہائے کھادی'' وہ چھلانگ لگا کہ خدیجہ کے ساتھ ہاتھ ملاتی اسے ساتھ بیٹھ گئی۔

''تائی کچھ بنا ہے لا دیجئے۔ آج اماں پھر پڑوسن کے ساتھ بازار چلی گئی ہیں''

''ہاں اس نے سوچا ہو گا جوان لڑکی گھر چھوڑ کے جا رہی ہوں واپس آوں گی پکا ہوا ملے گا۔'' وہ غصہ اس پہ اتارنے لگی۔

''تائی بیٹیوں کی جوانی کا ایسے تذکرہ نہیں کرتے اور buddy کیسی ہے'' وہ پہلے حلیمہ اور پھر خدیجہ سے بولی۔

''کچھ نہیں یار بریک اپ ہو گیا'' منہ بسور کہ بولی

''مذاق سمجھ رکھا ہے؟ تائی اسی لیے ڈانٹ رہی تھی؟'' وہ سر جھکا گئی

''کھادی حد ہوتی ہے یار۔ اب کیا ایشو ہے؟''

''ہم ایک بہت بڑا matchmiss ہیں''

''عورت اور مرد الگ جنس رکھتے ہیں same کیسے ہو سکتے ہیں''

''میں مزاج کی بات کر رہی ہوں''

''جب مشین ایک جیسی نہیں ہے تو working بھی الگ ہو گی ناں''

''تم مجھے قائل کر لو گی اسی لیئے میں تمہیں نہیں بتا رہی تھی'' وہ اٹھ گئی

''کیوں کہ تم سچ کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی۔ اللہ حافظ تائی'' وہ دوپٹہ ٹھیک کرتے اٹھ گئی۔

''تمہیں لگ رہا ہے یہ سب بہت آسان ہے'' رات کے کھانے میں پھر وہی جنگ ہو پڑی

''امی یار کھانا تو ٹھیک سے کھانے دو۔ آپ کو بیٹی پیاری ہے یا وہ لنگور''

''مجھے صرف عزت پیاری ہے'' وہ چبا چبا کہ کہتی میز سے اٹھ گئی

......☆☆......

''تم پاگل ہو گئی ہو'' خدیجہ نے جیسے سنا اس کے تایا نے عروہ کا رشتہ ایک ا ?اؤنٹس مینیجر سے کر دیا ہے وہ بھاگی بھاگی آئی۔

''ابھی تک تو نہیں اب تم آ گئی ہو تو معلوم نہیں کیا حالات ہوں'' وہ بلا کی بے نیازی سے بیڈ پہ پھیلے میگزین کی طرف متوجہ تھی۔

''بکواس مت کرو تم نے اس کی شکل دیکھی ہے؟ اتنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک پہنتے ہیں موصوف'' اس نے دو انگلیوں سے موٹائی بتائی۔

''میں نے دیکھ رکھا ہے'' وہ اس بار بھی آرام سے بولی خدیجہ کے تلووں لگی سر پہ بجھی

''بی بی مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے وہ تمہارے مزاج کا نہیں ہے . . . تم کینوس لے کے بیٹھی ہو گی اور وہ حساب کتاب نکال رہا ہو گا''

''ہاں اچھا ہے ناں میں ویسے بھی حساب میں کمزور ہوں''

''ادھر مجھے دیکھو۔ کیا بات ہے؟'' وہ فکر مند ہو گی اس کے ہاتھ پکڑ کے بولی

Digitized by Google

''ڈیڈ کہتے ہماری بیٹی ہمارا مان نہیں توڑے گی'' خدیجہ کی گرفت ڈھیلی ہوگی۔ ''وہ کہتے ہیں ہم نے عروہ کو اس لیے تو نہیں پڑھایا کہ وہ matchmatch کرتی رہے۔ بہت سے لوگ مس میچ تھے شادی نبھا کہ مر گئے'' وہ مرعوب سی ہوئی

''یہ تمہارے اپنے خیالات ہیں'' وہ کہتی اٹھ گئی

''مجھے عاصم کی کال آتی رہی میں نے نہیں اٹھائیں اس نیامی کو کال کردی۔ حد ہوتی ہے یار'' خدیجہ غصے میں تھی۔ عروہ نے وجہ پوچھی تو بتانے لگی۔

''صحیح کیا ناں اس نے وہ رشتہ بچانا چاہتا ہے'' وہ میز سے مٹر اور برتن اپنی طرف کرتے بولی

''وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے''

''یہ حرکتیں تمہیں پہلے کیوں نظر نہیں آئیں'' وہ مٹر چھیل رہی تھی۔

''عرصہ ہی کتنا ہوا ہے ہمارے رشتے کو؟ پہلے وہ باہر ہوتا تھا بات نہیں ہوتی تھی جب سے یہاں آیا ہے نیا ہی جونک لگتا ہے'' وہ ہاتھ اٹھاتے بولتی رہی۔ عروہ نے جواب نہیں دیا وہ مٹر چھیلتی رہی۔

''مجھے جو رنگ پسند ہیں موصوف کو ان سے الرجی ہے جس کی طرح کا وہ میوزک سنتا ہے وہ مجھے لوری سے کم نہیں لگتا کیاں کروں کدھر جاؤں''

''تم نے عاصم سے کہا رشتہ ختم کرنے کو؟'' ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی

''ہاں ناں اس کو امی نے تمہاری منگنی پہ بلا بھی لیا ہے۔ عروہ تمہارا کیا ہے تم بھیڑ بکری کی طرح کسی کے بھی کھونٹے کے ساتھ لگ سکتی ہو مجھے نہیں رہنا'' وہ کہتے ہوئے مڑ گئی۔ عروہ کے ہاتھ میں بظاہر بھرا ہوا مٹر پھڑک کر کے کھلا اور اندر سے بلکل خالی۔ اسکا دل بھی ایک دم اسی طرح خالی ہوا تھا۔

.....☆☆.....

''تم اعجاز سے ملی ہو؟ چھوٹی ماں بتا رہی تھی۔'' خدیجہ بیٹھتے ہوئے بولی

''ایک تو تمہاری چھوٹی ماں'' وہ کپڑے اٹھاتی اٹھی۔ ''بتاؤں ناں'' پیچھے سے آواز لگائی

''ہاں مل آئی ہوں'' وہ واپس آئی۔ ساگ لے کے بیٹھ گئی (ایک تو اسکا سگھر پن)

''کیسا ہے۔ مجھے بھی لے کے جاتی ناں''

''مجھے بھی لے کے جاتی ناں۔ جلسہ ہو رہا تھا جو دیکھنے جانا تھا'' وہ ڈانٹتے ہوئے بولی خدیجہ برا سا منہ بنا گئی۔ اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''ٹھیک ہے'' (یعنی ڈیشنگ ہے)

''قد بھی نارمل ہے'' (اچھا خاصا لمبا ہے)

''رنگ بھی صاف ہے'' (گورا چٹا ہوا)

''جاب کے علاوہ بزنس بھی ہے ان کا'' (امیر بھی ہوا) وہ بول رہی تھی اور خدیجہ ڈی کوڈنگ کر رہی تھی۔

''تمہارے تو عیش ہو گئے'' خدیجہ اٹھ کے ناچی

''ہاں'' وہ چہرہ جھکا کہ مسکرائی۔

''منگنی تمہاری ہے جان میری نکلی جا رہی ہے'' خدیجہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بے چینی سے انگلیاں مروڑتے چٹخاتے ہوئے ٹہلنے لگی۔ جبکہ عروہ سر جھکائے سسرال سے آئے ہوئے سوٹ کے دوپٹے کو ہاتھ میں لیے گھور رہی تھی۔ وہ تیز چبھتا نارنجی رنگ تھا۔ اس پہ پیلے اور نیلے رنگ کا اماں حوا کے دور کا کام ہوا تھا۔ وہ رنگ بھی انکی کام والی نے بھی نہیں پہنا ہوگا۔ ابھی خدیجہ نے نہیں دیکھا تھا ابھی کسی نے نہیں دیکھا تھا پیکٹ عروہ نے ہی وصول کیا تھا اور عروہ نے ہی

Digitized by Google

کھولا تھا۔
''یہ کیا تنبو پھیلا کے بیٹھی ہو؟'' خدیجہ کی نظر پڑی۔
''سسرال سے آیا ہے'' وہ اتنا دھیمی بولی خود اس کو بھی اپنی آواز نہ آئی اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔
''یہ۔ تمہارا جوڑا ہے؟۔ میرا مطلب ہے منگنی کا؟'' وہ جلدی سے بستر پہ آلتی پالتی مار کہ بیٹھ گئی۔ اور عروہ کو دیکھنے لگی۔ عروہ سمجھ گئی تھی ان نظروں کے پیچھے کیا مطالبہ ہے۔ عروہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکی۔
''ڈیڈ کہتے ہماری بیٹی مان نہیں توڑے گی'' لفظ پھڑ پھڑا کر ہی رہ گئے۔

.....☆☆.....

''ہم نکاح کرنا چاہتے ہیں'' اعجاز کے والد نے عروہ کے ڈیڈ کو فون کیا
''دیکھیے ہم نے تو اتنی جلدی میں یہ سب کیا کسی رشتیدار کو بلا ہی نہ سکے'' وہ پریشان ہو گئے۔
''اس میں اتنی بڑی کیا بات ہے شادی میں بلا لیجیے گا'' وہ مصر تھے۔
''لیکن ایسا کیا ہو گیا کہ بڑے میاں نکاح کا کہہ رہے ہیں'' گھر کا گوشہ گوشہ سرگوشیوں میں لگ گیا۔
''ابے اس میں برائی ہی کیا ہے۔ منگنی کریں گے پھر اگلی بار نکاح کا الگ خرچہ تیسری دفعہ شادی کا الگ انتظام'' عروہ کے والد نے چیخ کر اپنے اندر کی بڑھتی ویرانی کو چپ کرایا۔
''ابا ذرا بات سنیے'' یہ عروہ کہ بڑے بھائی صاحب تھے۔ بیوی کے غلام۔ منگنی والے دن شرکت کرنے آ گئے۔
''ہاں میاں کہو۔ تمہیں بھی ماں باپ یاد آ گئے'' ابا نے پورا زور لگایا مگر وہ ڈھیٹ رہا
''ابا اعجاز کی خبر آئی ہے (ارد گرد دیکھتے ہوئے) لڑکا ٹھیک نہیں ہے۔ شادی پہ راضی نہیں ہے''
''چلو ادھر۔ بڑا آیا بڑا بھائی۔ تجھے ابھی خبر ملی ہے نکاح والے دن۔ آتا ناں پہلے تو مان بھی لیتا اب تو وہ اچھا ہو کے برا اسی کے ساتھ بھیجو گا عروہ کو'' وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر بولتے گئے۔ ارد گرد سب مہمان چپ ہو گئے۔ بھائی صاحب کھسک گئے۔
''کیا ہو گیا ہے عروہ کے ابا۔ کیوں تماشا بنا رہے ہیں''
''اعجاز شادی سے خوش نہیں ہے'' ادھر اعجاز میاں کے والد نے اعجاز کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ اس کی ماں تو سکتے میں آ گئی۔ ایسے کیسے اتنی بڑی نعمت کا کفران کر سکتا ہے۔
''ہوا کیا ہے''
''کہتا ہے پڑھی لکھی لڑکیاں بہت بولتی ہیں۔ اور نا جانے کتابیں شاعری اور رنگ وغیرہ کے فضول شوق پال لیتی ہیں'' اس کی ماں بس سر پیٹ کر رہ گئی۔ ''نکاح تبھی تو حل نہیں ہے ناں

.....☆☆.....

''میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا انکار کر دو''
خدیجہ کانوں سے جھمکے اتارتے ہوئے بول رہی تھی۔ اعجاز کے گھر والوں نے لڑکے کی طبیعت ٹھیک نہیں کہہ کہ تقریب ملتوی کر دی۔
''میں کچھ نہیں کر سکتی'' اس کی خاموشی خدیجہ کو ہر بار بھڑکا جاتی تھی۔
''ہم بھیڑ بکری نہیں ہیں عروہ۔ ہمیں بتانا چاہئے کہ یہ مزاج ابا جی ہمارا نہیں ہے۔ آپ کے سامنے ہم اپنے شوق ڈر کے مارے نہیں کھول سکے آپ کو علم نہیں مزاج کا اگلا تو کوئی ایسا دیں جو کام کا ہو'' تقریر شروع ہو چکی تھی۔
''تمہارا معاملہ ٹھیک ہوا؟'' وہ خاموشی چاہتی تھی۔ اس سوال کے بعد وہ مل بھی گئی۔
''اعجاز کے گھر والوں نے انکار کر دیا ہے'' بند دروازے کے پار دادی نے فون کا کریڈل رکھتے ہوئے کہا۔ عروہ

Digitized by Google

کے ہاتھ سے کپڑے گر گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ سکتہ تھا صدمہ تھا یا شاک۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔
''مجھے بات کرنی ہے اعجاز سے'' خدیجہ سپاٹ لہجے کہتی عروہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اتنے دنوں سے اس سے بات کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ عروہ نے خاموشی سے اپنا فون آگے سرکا دیا۔
''میں خدیجہ بول رہی ہوں عروہ کی چچازاد بہن'' نا جانے کیا کہا کیا نہیں عروہ کی تو حسیات ہی منجمند ہو چکی تھی۔

......☆☆......

کافی شاپ پہ بیٹھی وہ کافی دیر سے فیسبک کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔ اس کو اعجاز پہ غصہ آرہا تھا۔ وہ کیوں نہیں رہا تھا۔ اتنی دیر میں اس کی میز کسی نے بجائی۔ وہ چونکی۔ گہرے گندمی رنگ کا چھوٹے قد کا عجیب سے نقوش کا حامل کوئی کھڑا تھا۔ خدیجہ ڈر گئی۔
''Aijaazmelts''
اگر وہ خود نہ بولتا تو خدیجہ کو شبہ ہوتا کہ یہ کوئی دوسرے سیارے کی مخلوق نہ ہو۔۔۔
خود کو سنبھال کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بیٹھنے کا کہا۔ بہت ہی برداشت کر کے وہ بولی۔
''آپ نے عروہ کو انکار کیوں کیا؟'' یہ سوال وہ پچھلے ایک ہفتے سے سوچ رہی تھی۔ وہ شروع سے لے کہ آخری دن تک یہ رشتہ نہیں چاہتی تھی۔ مگر اعجاز کے انکار پہ وہ تپ گئی تھی۔
''بہت سی وجوہات ہیں''
''وجہ نمبر ایک؟؟''
''ہم کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہماری عورتیں بہت ہی conservative سی ہوتی ہیں۔ عروہ چاہتی تھی وہ اپنی سوشل ایکٹیوٹیز کو ختم نہ کریں''
''وجہ نمبر دو؟'' وہ بیتاثر چہرے سے تکے جا رہی تھی۔
''ہمارا match نہیں تھا'' وہ نظریں چرا گیا۔
''اس کی وجہ بتایئے'' وہ چیخی تھی۔
''میں شوقین مزاج لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ ہر وقت بولنے والیاں، یہ تصویریں بنانا، ڈائجسٹ ناول پڑھنے والیاں، فیسبک ٹویٹر کو جاننے والیاں۔'' اس کی بات کاٹ دی گئی۔
''تمہیں پتہ ہے میاں تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم 'جیسوں' کا مسئلہ کیا ہے؟۔ تم لوگ خود سوشل رہنا چاہتے ہو۔ خود رنگین ہوتے ہو۔ خود پرفیکٹ ہوتے ہو۔ اور یہ نہیں چاہتے ہماری بیویاں ان دروازوں کو کھولنا جانتی ہوں جنکو ہم نے چور دروازے بنا رکھے ہیں۔ تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟ کبھی عروہ دیکھی ہے؟ میں تمہیں اگر رشتے سے پہلے دیکھ لیتی تو واویلا مچا دیتی یہ تو عروہ تھی جو تمہیں ہینڈسم اور گڈ لکنگ کہتی رہی۔ تمہیں اور ان ماؤں کو ایک دفعہ بغل میں دبائے اپنے سپوتوں کے چہروں کو بھی دیکھنا چاہیئے جو چراغ لے کے بہوؤں کو ڈھونڈنے نکلتی ہیں۔''
اعجاز کا سمجھ نہ آئی وہ کیا کہے۔ ''میں شرمندہ ہوں اور اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں'' وہ شرمندہ دکھ نہیں رہا تھا یا دکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔
''کاش الفاظ بھی واپس ہوتے'' وہ کہتی کرسی سے اٹھ گئی۔

......☆☆......

کتنا خوبصورت تھا اسکا آخری جملہ
ساتھ بس اتنا ہی تھا اب۔ الوداع!

Digitized by Google

عروہ بستر پہ لیٹی ڈائری پڑھ رہی تھی۔ دھرام سے دروازہ کھلا اور خدیجہ اندر آئی عروہ کی ڈائری دیکھ کہ لمحے بھر کو رکی۔ اور بولی

پاس ہونے سے جدا اچھا ہے
ایسے ماننے سے خفا اچھا ہے
عشق سب لے گیا ہے عقل و خرد
کوئی بتلائے کہ کیا اچھا ہے
حادثے راہوں کے گھر لا ڈالے
اور سمجھا کہ ہوا اچھا ہے
طنز اچھا ہے مزاح اچھا ہے
پوچھتے وہ ہیں بتا اچھا ہے
خوب دو ٹوک کہا منہ در منہ
تو پرانا ہے نیا اچھا ہے
ہاتھ اس کے تھے، مری گردن تھی
اور دلاسہ تھا چھرا اچھا ہے
شوخ جو کہتا ہے براہم کو
تھا کبھی کہتا برا اچھا ہے
ہے دغا بات بری مان لیا
پر جو اس نے ہے دیا اچھا ہے
تم کسے پھر ہو چلے جانے کا
گر کہے خلق جیا اچھا ہے
دیکھ دنیا کا کبھی اچھا برا
ہم نہیں گے کہ خدا اچھا ہے
وائے خوش فہمی یہ تیری ابرک
سمجھے دنیا سے ذرا اچھا ہے
جھوٹ شامل ہے ترے لکھے میں
یہ الگ بات لکھا اچھا ہے

''سلام تائی'' عروہ خاموشی سے اندر آئی اور اسی خاموشی سے اندر جانا چاہتی تھی مگر لاؤنج میں تائی کو دیکھ کہ رک گئی۔ انہی سے چھپ کے جانا چاہتی تھی۔

''وعلیکم سلام۔ لڑکی تم کہاں ہوا تنے دنوں سے کیا کرتی ہو۔ ہو کیا گیا ہے تمہیں'' وہ تخت پوش پہ آلتی پالتی مار کہ بیٹھی تھی۔ شروع ہو گیا انٹرویو۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

''یہیں تھی۔ مجھے کہاں جانا ہے'' وہ بے زار ہوئی۔ اسکا نام سن کے خدیجہ بھی آ گئی۔ اسکا بھائی ہاسٹل سے گھر آیا ہوا تھا خدیجہ اسی کہ ساتھ مصروف دکھتی تھی۔ اسی لیئے عروہ کو خود آنا پڑا۔

''ہائے کیسی ہو'' شکر ادا کیا خدیجہ آن ٹپکی۔ عروہ وہیں بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہوں'' بچھی ہوئی چادر پہ انگلی سے لکیریں بناتے بولی۔ خدیجہ نے اس کو غور سے دیکھا پھر نظر انداز کرتے

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com
Digitized by Google

بولی

"دانیال آیا ہوا ہے اسی لیئے نہیں آسکی آپ لوگوں کی طرف" وہ اپنے طور پہ اس کے خاموش ہونے کی وضاحت دے رہی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے مجھے پتہ چل گیا تھا" اب وہ سامنے پڑے میٹ کو گھورتے بولی۔ خدیجہ نے اس بار نوٹ نہیں کیا۔ دانیال کمرے سے نکلا۔ اس نے خدیجہ کے ساتھ بیٹھی عروہ کو دیکھا عجیب سی حالت میں وہ عروہ نہیں تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے، ہونٹوں پہ پپڑی جمی ہوئی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔

"کیسی ہو عروہ" وہ آگے بڑھا عروہ چونکی۔

"م۔میں۔میں؟؟ میں ٹھیک ہوں۔ اچھا تائی پھر آؤں گی" وہ پہلے دانیال سے پھر تائی سے کہتی تیزی سے دروازہ پھلانگ گئی۔

دانیال کی نظریں دور تک اس کے تعاقب میں گئی۔

دانیال کی آمد پہ عروہ کی ماں نے دعوت رکھی تھی۔ جو صرف و صرف دانیال کے لیئے تھی۔ باقیوں کو بادل ناخواستہ انہیں برداشت کرنا پڑا۔

"یہ کیا پکایا ہے؟" عروہ پہلے برتن کا ڈھکن اٹھا کہ چیخی۔

"آرام سے عروہ!" امی نے تنبیہہ کی

"مجھے یہ نہیں کھانا" بچوں جیسی ضد تھی۔ دانیال حیرت سے اسے دیکھے گیا۔ کم از کم وہ اس سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے جیسے یہ معمول کی بات ہو۔

"تمہاری دعوت نہیں ہے یہ عروہ" میاں صاحب لقمہ توڑتے ہوئے بولے۔ عروہ نے ان پہ نظر ڈالی اور کرسی پیچھے کر کے اٹھ گئی۔ "مجھے بھوک نہیں ہے" دانیال انتظار کرتا رہا کوئی اسے روکے گا۔ کوئی اسے ڈانٹے گا۔ کوئی تو منت کر کے بٹھائے گا۔ مگر سب ایسے ایکٹ کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی۔۔نہ۔ بمشکل کھانا کھا کہ چائے پی کہ وہ کسی طرح اس کے پیچھے آیا۔

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

"ہمیں دور کی نگری
آواز دیتی
ہے
ہمیں ساتھ بلاتی ہے
چندا سورج تارے شبنم
کیسے اتنے پیارے ہیں
ہمیں یہ دنیا پاس بلاتی ہے

لالالالا۔" وہ ٹیرس کی منڈیر پہ ہاتھ رکھے آنکھیں بند کیے گنگنا رہی تھی۔ بارش کے بعد منظر صاف ستھرا ہو گیا تھا۔ دانیال دبے پاؤں آیا اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ گلا کھنکھارا۔ جس سے وہ مڑی اور سہم گئی۔

"کیا ہوا ہے" وہ اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا مگر اس کو دیکھا نہیں۔

"کچھ نہیں" عروہ دانیال کو دیکھے گئی وہ کیوں اس کے پیچھے آیا ہے۔ دانیال نے غیر متوقع طور پہ گردن اس کی طرف موڑی نظریں ملنے پہ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

"کیا کرتی ہو آجکل" عروہ کجھی تھی وہ ڈانٹے گا۔ ڈپٹے گا۔

"گھر میں ہی ہوتی ہوں" کندھے اچکا کہ جواب دیا گیا۔ دونوں نے منڈھیر سے ٹیک لگالی تھی اور ایک دوسرے

کو دیکھنے سے کترا رہے تھے۔

''گھر میں تو نہیں ہوتی تم'' وہ بولا۔ عروہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی باتیں عام نہیں ہوتی تھی۔

''میں۔ گھر میں ہی ہوتی ہوں'' اس نے صفائی دینے کے انداز میں کہا۔ وہ اب اس کی طرف مڑ چکا تھا۔

''نہیں!۔ تم ڈگری کالج میں ہوتی ہو، کبھی اعجاز کے گھر ہوتی ہو، کبھی سرگودھا ہوتی ہو اور کبھی خلاؤں میں'' عروہ سمجھ گئی۔ مگر پھر بھی نہ سمجھی۔

''کیا مطلب'' بہت احتیاط سے پوچھا گیا۔

''سوچوں میں۔ خیالوں میں۔ خوابوں میں'' وہ مسکرایا بائیں آنکھ کے نیچے گڑھا بنا۔

''سرگودھا کون ہوتا ہے میرا'' اب الفاظ میں بھی احتیاط تھا۔

''یہی تو پوچھنے آیا ہوں'' وہ ہمیشہ چھوٹے جملے اور معنی خیز جملے بولتا تھا۔ ''تم نے اکثر میرے سامنے سرگودھا کا ذکر کیا ہے'' وہ بول رہا تھا اور بے خبر تھا ساتھ کھڑی لڑکی بے آواز رو رہی ہے۔

دن چڑھ آیا تھا عروہ کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ گھر کے سب افراد دروازہ کھٹکھٹا کہ جا چکے تھے۔ وہ کہتی ''سونے دو ناں'' حالانکہ سب کو معلوم تھا وہ سو نہیں رہی۔ گھر والوں کو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی لاکھوں لڑکیوں کی منگنیاں ٹوٹتی ہیں، رشتے مڑتے ہیں، نکاح ختم ہوتے ہیں، شادی ٹوٹ جاتی ہیں وہ اتنا اوور۔ ری ایکٹ نہیں کرتی تو عروہ کیوں اتنی عجیب ہوگئی۔ وہ اتنی حساس بھی نہیں تھی۔ ''سمجھدار'' تھی۔ دن کے ایک بجے دروازہ کھل ہی گیا۔ سیاہ رنگ کے کاٹن شلوار قمیض میں اسکا دودھیا رنگ اور بھی نکھر گیا تھا۔ دادی نے دیکھتے ہی دل میں بلائیں لی۔ وہ سلاد کاٹ رہی تھی۔ ''کون آرہا ہے دادی'' کھیرے کا ٹکڑا اٹھاتے پوچھا۔

''عاصم'' وہ مختصر بولتی تھی۔

''ارے واہ۔ لگتا ہے کھادی کے معاملات درست ہو گئے ہیں'' وہ اوپن کچن میں تھے عروہ ادھر ادھر چیزیں ڈھونڈنے لگی کہ کچھ کھانے کو ملے ساتھ ساتھ بول رہی تھی۔

''معاملات درست کرنے آرہا ہے جواد (خدیجہ کہ والد) کی بیٹی نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ویسے کم تم بھی نہیں ہو'' وہ ہاتھ نچاتی بولی

عروہ کو سیب مل گئے تھے۔ چولہے پہ چڑھی ہانڈیاں پکی تھی ابھی۔

''مجھے کیا ہوا ہے'' وہ چھری ڈھونڈنے لگی۔

''ماں باپ پریشان ہیں تمہارے اس نمورے اعجاز کے لیے تم نے کیوں اپنی یہ حالت بنالی ہے (چھری مل چکی تھی) بی بی ادھر میرے ہاتھوں کی طرف دیکھو! کہو تو دانیال سے تمہاری بات کروں'' ترک کر کے سیب کے کٹنے کی آواز آئی اور وہ اندر سے سیاہ کالا۔

''دادی مجھے ہر تجربے کی بھینٹ نہ چڑھائیں''

''انکل میں ہر حال میں اس رشتے کو نبھانا چاہتا ہوں'' جواد صاحب نے خدیجہ کی بتائی تمام شکایتیں سامنے رکھیں تو عاصم نے سر جھکا کی کہا

''انکل میں ہر حال میں اس رشتے کو نبھانا چاہتا ہوں'' کمرے میں تمام نفوس کو سانپ سونگھ گیا۔ دادی صبح سے تسبیح کر رہی تھی کچھ ایسا ہو جائے یہ رشتہ بچ جائے۔

''بیٹا امی ابا کو لے آؤ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں دانیال بھی آیا ہوا ہے بھگتا لے گا'' دادی نے ہی شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے پہل کی۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کمرے سے باہر کھڑی عروہ اور خدیجہ بھی ہکی بکی کھڑی تھیں۔

''جی دادی ماں میں بھی یہی چاہتا ہوں میں آج ہی بات کروں گا۔ اب چلتا ہوں'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ سب

Digitized by Google

خاموش تھے۔ دروازے تک پہنچ کر وہ مڑا اور جواد صاحب کے ہاتھ پکڑ لیے "انکل لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں ایک تیج کا جواب لیٹ ہو جائے تو دوسری بیوی کی بابت سوچنے لگ جاتی ہیں۔ انکو اندازے اور قیاس کی بیماری ہوتی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں ایک اچھا داماد ثابت ہوں گا" وہ مسکراتا ہوا سب کو سکون دے گیا

"تمہیں میں نے کہا تھا وہ ایک اچھا بندہ ہے تم نے یونہی ہوا بنایا ہوا تھا اس مسئلے کو۔ پتہ ہے دنیا۔" وہ کتابیں ترتیب سے رکھتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔ وہ بہت باتونی ہو گئی تھی۔ خدیجہ اسے نہیں سن رہی تھی وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی جہاں عاصم سب کو مل رہا تھا۔ سب اسے الوداع کہنے دروازے پہ تھے۔ "یہ اچھا کیسے ہو گیا" وہ بڑبڑائی۔ عروہ کا لیکچر شروع تھا۔

.....☆☆.....

گھنٹی کی آواز پہ عاصم نے کھڑکی سے جھانکا۔ نیچے گلی میں ایک لڑکا ہڈ پہنے کھڑا تھا۔ جسکی وجہ سے اسکا چہرہ پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے نہانے کا ارادہ ترک کر کے نیچے جانا پڑا۔ گھر کوئی دوسرا نہیں تھا۔

"اسلام علیکم میں دانیال ہوں۔ جواد صاحب کا بیٹا۔ ام۔ خدیجہ کا بھائی" ان کی پہلی ملاقات تھی۔

"جی جی آیئے آیئے۔" اس نے راستہ دیا۔

اندر لا کہ بٹھا کہ وہ خانسامے کا کردار نبھانے لگا۔

"تکلف کی ضرورت نہیں ہے میں آپ سے ملنے آیا ہوں"

"اور سنایئے فرصت ملی آپ کو" فراغت کے بعد بیٹھتے ہی وہ بولا۔

"اصولاً تو آپ کو ملنے آنا چاہیئے تھا" وہ بھی ڈھیٹ کرنے میں کمال رکھتا تھا۔

"میں ضرور آتا۔ مجھے آنا بھی چاہیئے تھا مگر خدیجہ کے ساتھ میرے معاملات تھوڑے کشیدہ ہیں میں نے نہ جانا ہی بہتر سمجھا" دانیال کو بندہ پسند آیا۔

"انہی معاملات کو نبھانے آیا ہوں" عاصم کی سانس حلق میں رک گئی۔

"جی۔ یہ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ" اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا واضح دکھ رہا تھا۔

"آپ کو کیا ایشو ہے اس رشتے سے؟" دانیال پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا

"دانیال بھائی مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے میں اس رشتے کی بقا چاہتا ہوں" وہ گھبراہٹ میں صوفے پہ آگے ہو کر بے چینی سے بولا

"خدیجہ کیوں آپ سے نالاں رہتی ہے پھر"

"آپ اسکا موقف سن چکے ہیں؟"

"بلکل۔ وہ کہتی ہے آپ کا مزاج اس سے نہیں ملتا"

"کیا کسی مرد کا مزاج عورت سے مل سکتا ہے؟ کیا وہ برابر سوچ سکتے ہیں؟ دو مختلف جنس کے لوگ کیسے ایک جیسا نقطہ نظر رکھ سکتے ہیں" دانیال دل ہی دل میں خوش ہوا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں" دانیال نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"مجھے خدیجہ سے محبت ہے وہ بہت سادہ ہے مگر جانے شادی کو لے کر وہ کونسی توقعات لے کہ بیٹھی ہوئی ہے" وہ پریشان دکھ رہا تھا

"اگر آپ پورے شرح صدر کے ساتھ رشتے کے ساتھ اس رشتے کو نبھانا چاہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ یہ لڑکیاں بہت چھوٹے دل کی ہوتی ہیں ہر چیز کو بہت جلدی assume کر لیتی ہیں اور نتیجے پہ بھی پہنچ کر سزا بھی سنا دیتی ہیں۔ مجھے اپنی بہن سے اسی لاابالی کی امید ہے چلتا ہوں بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" وہ مسکراتا

Digitized by Google

ہو چل دیا۔ دل سے خوش ہوا اس کی نا اہل بہن کسی اہل کے حوالے ہو رہی ہے۔
اسے کل جانا تھا وہ عروہ ڈھونڈنے آیا تھا مگر اس کو سام سے کسی نے نہیں دیکھا تھا قوی امکان تھا وہ ٹیرس پہ ہو۔
ٹیرس کی منڈیر پہ ٹانگیں لٹکائے وہ کسی نرسری کے بچوں کی طرح ایک لے میں کوئی نظم گنگنا رہی تھی۔
''مجھے معلوم تھا تم یہیں ہو گی'' وہ چونکی، مڑی اور چھلانگ مار کہ اتری
''اور مجھے پتہ تھا تم میرے پیچھے آؤ گے'' وہ مسکرایا۔ دور سورج ڈھل رہا تھا
''مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں''
''مجھے بھی'' جیسے کوئی بچی مچلی ہو۔
''پہلے میں'' وہ بھی بچہ لگ رہا تھا
''کہو''
''تمہارے ساتھ سرگودھا میں کیا ہوا تھا؟'' اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ عروہ کو بتانا پڑا۔
''بی سی ایس میں میرا ایک کلاس فیلو تھا''
''اعجاز'' دانیال نے پوچھا نہیں بلکہ یہ بتایا تھا کہ میں جانتا ہوں۔ عروہ نے اس کو پوچھا نہیں اس کو دانیال کی صلاحیتوں پہ یقین تھا۔ ویسے بھی وہ کسی خلاء • کو گھور رہی تھی۔ اسے نہیں سن رہی تھی۔
''اس کو میں پسند تھی۔ اسی نے قدم بڑھایا۔ اسی نے پرپوز کیا۔ سب کچھ وہی کرتا رہا۔ مجھے اپنے والدین سے ملوانے بھی چلا گیا۔'' گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔
''آ گے'' اس کے خود بولنے سے اس کی بھرا اس نکل رہی تھی وہ ایک ابنارمل فیز سے نکل رہی تھی۔
''میں نے بہت دل لگا کہ خود سجایا اس کے گھر پہنچی تو ان سب کو میں پسند نہ آئی۔ تم بتاؤ عروہ۔ (دانیال کی طرف مڑی) میں کیوں پسند نہیں آئی اس کے گھر والوں کو ایسا تو نہیں کرنا چاہیئے تھا ناں'' وہ رو رہی تھی۔
''یہی وجہ تھی تم نے دوسرے اعجاز کو بھی اسی لیے قبول کیا کیونکہ تمہیں پہلے اعجاز سے محبت تھی'' ٹیرس کی لائٹ آن ہو گی۔
''وہ حیرت سے اس کو دیکھنے لگی جس سوال کا جواب وہ خود کو اتنے عرصے سے نہیں دے پا رہی تھی دانیال نے جھٹ سے کہہ دیا
''میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں دانیال۔ مجھ سے لوگ ڈرتے ہوں جیسے مجھ سے نفرت کرتے ہوں جیسے'' وہ دل میں مسکرایا۔ اس کو سنتے ہوئے نیچے کی طرف'' مجھے کسی اپنے کا کندھا چاہیئے'' وہ مچل رہی تھی۔ دانیال مسکرا کہ سیدھا ہوا
''عروہ ہر کیفیت کا فیز ہوتا ہے اور اس فیز کا ایکسپائر ڈیٹ بھی ہوتا ہے تمہیں اب اس فیز سے نکالنے میں، میں نے تھوڑی مدد کی ہے۔ تمہیں پتہ ہے کمزور لوگوں کی خامی کیا ہوتی ہے وہ ذرا سا سہارا ملتا ہے وہ سہارے پہ جھک ہی جاتے ہیں میں نے تمہاری مدد اس لیئے نہیں کی کہ تمہیں ہمیشہ اپنا محتاج بنالوں تمہیں خود کھڑا ہونا ہے۔ نیچے سب سمجھ رہے تھے میرا تمہارا کوئی افیئر چل رہا ہے۔ لوگ بھی جانے کیا سمجھ لیتے ہیں۔ اور ہاں ایک اور بات لڑکیوں کو جب کوئی ریجیکٹ کرتا ہے وہ لڑکی کو نہیں اپنی خوش قسمتی کو ٹھکراتا ہے یہ دکھ ساری عمر پالنا نہیں چاہیئے ہر کامیابی کہ پیچھے ایک ناکامی ضرور ہوتی ہے daygood'' وہ کہتا مسکراتا چلا گیا۔
عروہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ ایک گہری سانس لی۔ دور کہیں چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا

.....☆☆☆.....

کالک

فرحین ناز طارق

Digitized by Google

جوانی میں ہی ابا نے عاصمہ کا اسکول کا بستہ چھین کر اسے گھر کی چاردیواری کے اندر محدود کر دیا تھا۔ وہ تب اماں، ابا کی ترجیحات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ سارا دن گھر کے صحن میں بولائی بولائی پھرتی رہتی۔ اپنا اسکول اپنی سہیلیاں اسے بہت یاد آیا کرتی تھیں مگر کسی سے اپنے اسکول کے متعلق پوچھنے کی ہمت تو بہرحال نہ تھی کہ وہ بخوبی جانتی تھی ابا دھلائی کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے بھی بچے ان سے ڈرتے تھے اور وہ تو ان کا سامنا کرنے سے بھی کتراتی تھی کچھ فطرتاً تو کچھ ماحول کی بدولت وہ کافی حد تک ڈرپوک ہو چکی تھی جو چیز جیسی مل جاتی اچھی یا بری قبول ہوتی یا نہیں اس کے ساتھ گزارہ کرنا عاصمہ کی عادت بن چکی تھی وہ بڑی ہوتی گئی ذمہ دار ہوتی گئی مگر اس سب کے باوجود گھر کے باہر کی دنیا دیکھنا اس کے لیئے ایک خواب کی طرح تھا اسے جب موقع ملتا ابا کی غیر موجودگی میں بیرونی دروازے کی چھوٹی چھوٹی درزوں سے جھانک کر اپنے شوق کی تسکین کر لیتی۔

ایک دن ایسے ہی دروازے سے جھانکتے پیچھے سے پیٹھ پہ دوہتھڑ پڑے آنا فانا کسی نے چوٹی سے گھما کر فرش پہ لا پھینکا۔

"بے غیرت گھر میں شرافت سے بیٹھے تجھے سکون نہیں ملتا کس یار کو تاڑ رہی تھی کس سے باتیں کر رہی تھی۔"

یہ القابات کافی تکلیف دہ تھے مگر اس لمحے وہ نہیں جانتی تھی کہ یہی القابات اس کی تمام زندگی پہ حاوی ہونے والے ہیں وہ چپ چاپ پٹتی رہی گھونسوں لاتوں سے بھائی جب ایک کمزور عورت پہ اپنی مردانگی کے جوہر دکھانے کے بعد وہاں سے رخصت ہو چکا تو وہ لڑکھڑاتی کانپتی ٹانگوں کو گھسیٹتی اسٹور میں جا بیٹھی سخت گرمی کے باوجود تمام دن وہیں بیٹھی رہی مار کھاتے اس کے کپڑے بھی گندے غلاظت سے بھر چکے تھے مگر وہ بے پروائی سے زمین پر بیٹھی روتی رہی شام کو اماں نے وہیں کھانا لا دیا تو کھانے بیٹھ گئی اس سے زیادہ وہ عورتیں ایک دوسرے کے لیے کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔

پھر ابا نے زیادہ وقت نہ لگایا اور اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ لائے اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی کے لیے لڑکی کی رضامندی ضروری ہوتی ہے مگر بعض لوگ "قبول ہے" کی فارمیلٹی بھی خود ہی پوری کر لیتے ہیں بیٹیوں کو اس تکلیف میں نہیں پڑنے دیتے اس کے ابا نے بھی خود ہی سارے مرحلے طے کر لیے اور اس سے صرف انگوٹھا لگوا کر اور چودہ پندرہ سال کی معصوم بچی کو ایک فربہ خرانٹ شخص کے حوالے کر کے اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو بیٹھے وہ جسے شادی کے نام پر صرف بہت سارے زرق برق لباس ملنے کی سمجھ تھی اس نے ماں کو گوٹا کناری روپہلی پلوؤں والے لباس تیار کرتے بارہا دیکھا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ یہ سب اس کو دیے جانے ہیں تو وہ خوشی خوشی شادی کے لیے رضامند ہو گئی مگر اسے ماں سے جدا ہونا پڑے گا یہ اس کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا رخصتی کے وقت وہ اتنا روئی کہ دیکھنے والی ہر آنکھ کو اشک بار کر گئی۔ ماں بابل کے آنگن کی واحد میٹھی یاد۔

دو چار اجنبی عورتیں اسے پکڑ کر دولہے کے کمرے تک چھوڑ آئی تھیں وہ روئی روئی اور حیران نظروں سے اردگرد دیکھتی رہی معاً اس کے باپ سے ذرا کم عمر کا خوفناک شکل کا آدمی اندر گھسا اسے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا عمر تو ٹھیک تھی مگر شاید رنگ و روپ میں وہ اس کے معیار سے کم تھی اسے تولتی نظروں سے آگے بڑھا اس کی دو چار باتوں پہ ہی وہ خوف سے کانپنے لگی خوفزدہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی جب آنکھیں کھلی تو خود کو فرش پہ اس کے ٹھڈوں کی زد پہ پایا۔

"بدذات، ناپاک عورت تیرا اتنا تو ہی باپ جانتا ہو گا تیرے کرتوت تبھی تجھے میرے گلے باندھ گیا تو تو ناپاک ہے۔"

وہ بہتی آنکھوں چپ چاپ اس سے پٹتی رہی کہ اس کی تو وہ عادی تھی اور عزت نفس تو بہت پہلے ہی اس کے اندر سے مٹا دی گئی تھی لیکن وہ ان لفظوں پہ پریشان تھی وہ ان کی گہرائی کو نہ ناپ سکی نجانے اس نے عاصمہ کو کس معیار کس

کسوٹی پہ پرکھا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس معاشرے میں لڑکی کو صرف اپنی عزت کی حفاظت ہی نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ اپنی پاک دامنی کا ثبوت بھی دینا ہوتا ہے پندرہ سولہ سالہ یہ کم عمر عورت اس بات کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا تھی کہ ہر سال نجانے کتنی لڑکیاں اپنے شوہروں کو اپنے کنوارے پن کا یقین نہ دلا سکنے کے باعث اپنے ارمانوں سے سجی سہاگ کی سیج پر اپنے جیون ساتھی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔ پہلے ہی قدم پر بنا کوئی گواہی یا دلیل سنے زانی کا فتویٰ لگا کر اندھیرے کمروں میں ہی ان کی سسکیوں تک کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیا جاتا ہے یہ ایسی رسم تھی جس پر بات کرنا ناجائز مگر نوبیاہتا کو بنا قصور سنگسار کرنا غیرت مندی سمجھا جاتا ہے دنیا اب تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کر سکی، جو عورت کی وفا یا بے وفائی ناپ سکے ہمارے، بہت سارے دیگر رسم و رواج کی طرح یہ بھی صدیوں سے چلا آنے والا ایک فرسودہ رواج ہے، جسے نجانے کب تک جہالت کے ثبوت کے طور پر ہم نے گلے میں لٹکائے ہوئے بجائے چلے جانا ہے۔

"تجھ جیسی عورتوں کا تو گلا دبا دینا چاہیے مگر میرا احسان سمجھ کہ میں تجھے زندہ چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ اس کے سر پر چیخا تھا۔ وہ اس ان جانے احسان کے زیر بار تمام عمر سر جھکاتی چلی گئی اسلم کئی کئی دن گھر نہ لوٹتا اور وہ گھر کی چار دیواری میں اکیلی ڈری سہمی بیٹھی رہتی ذرا سا کھٹکا بھی جان لیوا ہوتا کہ اگر عزت و کردار محفوظ نہ ہوں جہاں رات کی پرچھائی کو بھی اس کے معاشقے کے طور پر اس سے منسوب کر کے اذیت پہنچائی جانی فرض سمجھی جاتی ہو جہاں جسمانی اذیت سہنا مشکل نہیں بلکہ روحانی اذیت زیادہ تکلیف دہ ہو وہاں نیندیں اکثر روٹھ ہی جایا کرتی ہیں۔

اسی آنگن میں جہاں اس کا بچپن شک کی اذیت اٹھاتے بکھرا تھا۔ جہاں ماں کے ارمانوں سے بنائے روپہلی آنچل اوڑھتے اس پر بدکرداری کی تہمت لگتی اور گھنٹوں یا دنوں اس پر پہرہ دیا جاتا، کہ کہیں وہ یہ زرتار آنچل اوڑھے کسی کی منتظر تو نہیں جہاں اس کے ہر حق کو سلب کرنا اور اپنی اذیت پسند فطرت کو تسکین پہنچانا فرض اول تھا وہ اپنی زندگی کی حسین بہاریں گزارتی چلی گئی اب اس کے آنگن میں شور ہوتا، بچوں کی قلقاریاں ہوتی، بہت سارے بہلاوے ہوتے، جن کے ہمراہ زندگی کی تلخیاں کچھ کم ہو گئی تھیں یا شاید کم محسوس ہونے لگی تھیں اس کا شوہر بھی پہلے سے زیادہ خوفناک شکل و صورت اور قدرے بوڑھا ہو چکا تھا سو اب اس کے معمولات میں کافی فرق پڑ چکا تھا اب اس کے شب و روز گھر میں زیادہ گزرتے اس دن بھی وہ صحن میں لیٹا دھوپ کے مزے لوٹ رہا تھا جب اسے ایک چیخ سنائی دی ساتھ گالیوں کی آوازیں وہ چونک کر اٹھا اس کا بڑا بیٹا اس کی بیٹی کو مار رہا تھا۔

دوسروں کی کالک اپنے وجود کے ساتھ سمیٹ کر اپنے گھر لانے والا آج بے چین ہوا تھا اور اس نے اٹھنا بھی چاہا تھا اس کی نظر اپنی بیوی کے مضطرب چہرے پہ پڑی اور وہ نگاہیں چراتا واپس لیٹ گیا وہ جو دوسروں کو تشدد کا نشانہ بنا کر خوش ہوتا تھا اب مضطرب ہونے کا اس کے پاس بھلا کیا جواز تھا اسے تکلیف تھی، تو یہ اس کے اعمال کا بدلہ تھا اس کی سزا جزا کا کھاتا مکمل چکا تھا اس کے اعمال کی گٹھڑی بنا کر اس کی بیٹی کے سر لاد دی گئی تھی اس کے اعمال کا کفارہ اس معصوم کو ادا کرنا تھا اور وہ یہ بات سمجھ چکا تھا۔

Digitized by Google

ذوق آگہی

سباس گل

وقت

❁ وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے والے لوگ کبھی پیچھے نہیں رہتے کل پر ٹالنے والے لوگ کبھی آگے نہیں بڑھتے۔

❁ وقت آنے پا گزرنے کا شکوہ کرنے والے لوگ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔

❁ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ وقت اور موقع خود پیدا کرتے ہیں۔

اقراجٹ.....منچن آباد

غم

☆ جتنا رنج اور سختی اٹھائی جاتی ہے اتنا ہی اجر ملتا ہے۔

☆ وہ غم اچھا ہے جس کے بعد خوشی میسر ہو اور وہ خوشی کس کام کی جس کے بعد غم میسر ہو۔

☆ جس دل میں کوئی غم نہیں وہ دل بگڑ جاتا ہے۔

☆ جس قدر تو دنیا کا غم کرے گا اتنا ہی آخرت کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا اور جتنا تو آخرت کا غم کرے گا اتنا ہی دنیا کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا۔

☆ بڑھتی ہوئی آرزوئیں اور خواہشات ترک کردو تاکہ غم سے نجات مل جائے۔

☆ جو غم ماضی بن چکا جو غم گزر چکا اس پر رنجیدہ ہونے کا مطلب ہے کہ ہر ایک نئے غم کو دعوت دے رہے ہیں۔

☆ اپنے دل کا غم اپنے دل میں رکھو لوگ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے غم کوئی نہیں بانٹے گا۔

ریاض بٹ.....حسن ابدال

میری ماں

وہ رشتہ میں میری ممانی تھیں انہوں نے میری حقیقی والدہ کے فوت ہونے کے بعد مجھے حقیقی ماں کا پیار دیا ان کی وفات حسرت آیات پر لکھی گئی نظم پیش خدمت ہے۔

اک گھنے سائے کی صورت تھا مری ماں کا وجود
ہر گھڑی رہتیں خدا کے سامنے سر بسجود
ہو گئی ہیں وہ اچانک راہی ملک عدم
کر دیا ان کو سپرد خاک یوں با چشم نم
تھیں محبت اور الفت کا وہ بحر بے کراں
پنا کی صورت تھیں وہ بہنوں بھائیوں کے درمیاں
ان کی ہستی میں یقیناً خوبیاں تھیں بے شمار
حج و عمرہ کی ملی ان کو سعادت بار بار
ان کے لب پر تھیں دعائیں ہر کسی کے واسطے
تھے بڑے آسان ان کی زندگی کے راستے
ذات پر اپنی تھا ان کو پورا پورا اعتماد
دل میں ان کے تھا نہ کینہ اور نہ بغض و عناد
وہ تو مصروف عبادت رہتی تھیں صبح و شام
ان کے جانے سے ہوا ہے منقطع یہ سلسلہ
عابدہ تھیں زاہدہ تھیں ساجدہ تھیں با یقیں
اپنی پوری زندگی میں ایسی حالت میں رہیں
ہوں خدا کی رحمتیں ان پر نچھاور صبح و شام
جنت الفردوس میں ان کو ملے اعلیٰ مقام

ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

دوستی کیا ہے؟

◆ دوستی انسانی زندگی کا سب سے وفادار قیمتی رشتہ ہے۔

◆ دوستی ایک آئینہ ہے جس میں انسان اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔

◆ دوستی ایک مالا کی طرح ہے جس میں اگر اعتماد کے موتی پرو دیے جائیں تو یہ کبھی نہیں ٹوٹتی لیکن اگر حسد، بغض، عداوت، منافقت، کینہ، نفرت کے موتی پرو دیے جائیں تو یہ یوں بکھرتی ہے جیسے سوکھے پتے بکھرتے ہیں۔

◆ اچھے دوست کو کھونا خود اپنے آپ کو کھونا ہے۔

پرنس افضل شاہین.....بہاولنگر

ساون

ساون کو دلوں کے ملنے والوں کا موسم قرار دیا جاتا ہے یہ اپنی تمام تر حشر سامانیاں سمیٹے جلوہ گر ہوا کرتا ہے برکھا کی برستی رم جھم کچی مٹی میں اپنی سوندھی اور انمول خوش بو کا تاثر ظاہر کرتی ہے اور یہ پاس بندے کو اپنی بیکراں تنہائیوں کا احساس دلاتے ہوئے اسے بے قرار سا کر جاتی ہے پھر وہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے اپنوں سے وابستہ لوگوں کی تڑپ

Digitized by Google

اسے بے چین کرنے لگتی ہے۔ ساون کی رنگینیاں اپنی تمام تر خواہشوں، حسرتوں اور آرزوؤں کے ساتھ لوٹ رہی ہیں بستی کے مکین روز و شب باران رحمت کی دعائیں کرتے رہے اور بالآخر بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کی دعائیں رنگ لائیں اور آکاش کی وسعتوں پر پھیلے سیاہ اور ترندی بادلوں نے ننھی بوندوں کے ساتھ زمین کا رخ کیا پھر برستی رم جھم بڑھتی ہوئی بارش کا روپ اختیار کر گئی اور چھاجوں مینہ برسنے لگا اور پل بھر ہی میں گاؤں کے بازار اور گلیاں ندی نالوں کا منظر پیش کرنے لگیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے نشیبی گڑھے پانی سے بھر گئے بارش میں ذرا نرمی آئی بادل چھٹے اور پھر آسمان کے کناروں پر قوس و قزاح کے خوب صورت اور انمول رنگ بکھر گئے مگر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اب بھی آسمان پر چکرانے لگے۔ پرندے آشیانوں سے اپنے پر تول کر اڑتے ہوئے بہت ہی بھلے محسوس ہونے لگے پیڑوں کی تازگی پھل پھولوں کی انمول خوش بو اور لہلہاتی کھیتیاں لاتعداد مسرتوں کا اظہار کرنے لگیں۔ درخت، سبزہ، فصلیں، سبھی دھل کر صاف ہو گئے انسان اور چرند پرند سبھی خوشی میں نہال دکھائی دینے لگے مگر جانے کتنے دل جلوں کو اپنوں کی کمی کا احساس اندر سے زخمی سا کر گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ کاش وفاؤں کو سدا زندہ رکھنے اور ساتھ نبھانے کی انمول باتیں کرنے والے آج ساتھ ہوتے تو ساون کے رنگوں کا احساس کس قدر برقرار رہتا۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

اس ماہ کی بات

اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل کریں جو آئینہ اور سایہ بن کر آپ کے ساتھ رہیں، کیونکہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

صالح جبریل...... بہاولپور

امید کے دیے

امید کے دیے جلانے ہیں
اپنا کل بچانا ہے
اب آگے کرپٹ لوگ نہ آئیں
اس امید پر کل میں جانا ہے
وقت ہاتھ سے نہ جائے
زندگی بھر دکھ جھیل رہے تھے
اب زندگی کو سہل بنانا ہے
کھیتوں اور کھلیانوں میں ملوں اور کارخانوں میں
جم کر محنت کرنی ہے اب نیا پاکستان بنانا ہے

محمد رفاقت...... واہ کینٹ

حقوق والدین

ﷺ تین شخص ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام کر دیا ہے ان میں سے ایک ماں باپ کا نافرمان بھی ہے (الادب المفرد۔ احمد)

۞ ہر گناہ کے بدلے عذاب اور ہر جرم کی گرفت کو موخر کیا جاسکتا ہے لیکن ماں باپ کی نافرمانی کا گناہ ایسا سخت ہے کہ اس کا مواخذہ مرنے سے پہلے ہی کر لیا جاتا ہے۔ (الادب المفرد۔ حاکم)

۞ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا ہے۔ (الادب المفرد، بخاری و مسلم)

ایس حبیب خان...... کراچی

گھر ابدار

○ اللہ رب العزت انسان کے ساتھ ہے لوگ اسے آسمانوں پر ڈھونڈتے ہیں جنت ماں کے قدموں تلے ہے لوگ اسے دوسری نیکیوں میں تلاش کرتے ہیں۔

○ حکمت صبح اٹھنے میں ہے لوگ اسے کتابوں میں ڈھونڈتے ہیں۔

○ رحم حلم میں ہے لوگ اسے علم میں تلاش کرتے ہیں۔

○ اطمینان قلب ذکر میں ہے لوگ اسے فکر میں تلاش کرتے ہیں۔

○ صحت روحانیت سے ارتقا میں ہے لوگ اس کو دواؤں میں تلاش کرتے ہیں۔

○ تمنا قناعت میں ہے لوگ اسے مال کی فراوانی میں تلاش کرتے ہیں۔

○ نعمت اللہ کے شکر میں ہے لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔

○ قلب کی زندگی محبت و حیا میں ہے لوگ اسے خلوت میں تلاش کرتے ہیں۔

URDUTUBES
www.urdutubes.com

Digitized by Google

○ فراخی رزق سخاوت میں ہے لوگ اسے محنت میں تلاش کرتے ہیں۔
○ قبولیت دعا مریض کی عیادت میں ہے لوگ اسے لمبی دعاؤں میں تلاش کرتے ہیں۔
○ اللہ رب العزت کی معرفت نفس کی پہچان عرفان ذات میں ہے۔
○ لوگ اسے صفات میں تلاش کرتے ہیں۔
○ ولایت خموشی میں ہے لوگ اسے کلام میں تلاش کرتے ہیں
○ سکون، ذکر الٰہی و عبادت میں ہے لوگ اسے میوزک میں تلاش کرتے ہیں۔

عینی غزل...... ہری پور

ٹینو ڈائری

زندگی میں جب آسائشیں آئی تو ای کہنے لگی ہائے آسائشوں کا نام بھی زندگی، پہلے تجھ سے لڑتا تھا اب خود سے لڑتا ہوا ہی میں بہت ڈرتا ہوں جب کوئی اپنا بچھڑ جائے تو پھر موت سے بھی ڈر نہیں لگتا، والدہ صاحبہ کی وفات کے بعد زندگی کا ٹوٹل کونسپٹ ہی بدل گیا ہے۔

حسین خواجہ...... مچن آباد

اسکندر رومی کی فتوحات کا راز

اسکندر رومی سے پوچھا گیا۔ آپ نے مشرق و مغرب کے ملکوں کو کس طرح فتح کیا؟ اس لیے کہ آپ سے پہلے بادشاہ آپ سے زیادہ خزانے، ملک، عمر اور لشکر رکھتے تھے مگر ان کو ایسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی سکندر نے فرمایا۔ اللہ بزرگ و برتر کی مدد سے میں نے جس سلطنت پر قبضہ کیا اس کی رعیت کو ستایا نہیں اور پچھلے بادشاہوں کی خیرات کے طریقوں کو بند نہیں کیا اور ان بادشاہوں کا نام ہمیشہ بھلائی سے لیا برائی سے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

فائدہ: جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے نیک نام کو ضائع مت کرو تا کہ تمہارا نام دنیا میں باقی رہے۔

انتخاب: زرینہ الیاس...... شیخوپورہ

شیخ چلی جیسے خیالات رکھنے والا ایک سوداگر

میں نے ایک سوداگر کو دیکھا کہ ایک سو پچاس اونٹ رکھتا تھا اور چالیس غلام اور خدمت گار۔ ایک رات وہ جزیرہ کیش میں مجھے اپنے چھوٹے سے کمرے میں لے گیا رات بھر نہ خود سویا اور نہ مجھے سونے دیا، بہکی بہکی باتیں کرتا رہا کہ میرا فلاں سامان ترکستان میں ہے اور فلاں پونجی ہندوستان میں اور یہ فلاں زمین کی دستاویز کا کاغذ ہے اور فلاں چیز کا فلاں آدمی ضامن ہے اور کبھی کہتا کہ اسکندریہ کا ارادہ رکھتا ہوں کہ وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے، پھر کہتا کہ نہیں دریا میں طغیانی ہے پھر کہتا اے سعدی! ایک دوسرا سفر درپیش ہے اگر وہ بھی کرلیا جائے تو پھر پوری عمر سکون سے رہ سکوں گا۔ میں نے کہا کون سا سفر ہے؟ اس سوداگر نے کہا۔ ایرانی گندھک چین لے جاؤں گا اس کی وہاں بڑی قیمت ہے اور وہاں سے چینی پیالے روم لے جاؤں گا اور روم کا ریشم ہندوستان میں اور ہند کا لوہا حلب اور حلبی آئینے یمن میں اور یمنی چادریں پارس میں۔ بس اس کے بعد سفر چھوڑ دوں گا اور ایک دکان پر بیٹھ جاؤں گا۔ ایسی پاگل پن کی باتیں کرتا رہا پھر مجھ سے پوچھا اے سعدی! تم بھی کچھ کہو جو تم نے دیکھا یا سنا ہو۔ میں نے کہا تم نے سنا ہے کہ غور کے جنگل میں ایک سردار گزشتہ سال گھوڑے سے گر پڑا۔ اس نے کہا دنیا دار کی تنگ آنکھ کو قناعت یا قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔

فائدہ: انسان کو قناعت کرنی چاہیے اگر قناعت چھوڑ کر حرص میں پڑ گیا تو ایک بڑی سخت مصیبت میں پھنس جائے گا۔

مرسلہ: سید اعجاز علی...... کراچی

ایک سمجھ دار تاجر کی حکایت

ایک تاجر کو تجارت میں ہزار دینار کا نقصان ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا: مناسب نہیں ہے کہ کسی سے اس کا ذکر کیا جائے۔ لڑکے نے عرض کیا: ابا! آپ کا حکم ہے اس لیے میں کسی سے نہیں کہوں گا لیکن مجھے اس کے فائدے پر آگاہ رہنا چاہیے کہ چھپانے میں کیا مصلحت ہے؟ باپ نے کہا: تا کہ مصیبت ایک سے دو نہ ہو جائیں، ایک تو مال کا نقصان دوسرے دشمنوں کی خوشی۔

فائدہ: اپنے نقصان کا ذکر دوستوں کے سوا کسی اور سے نہیں کرنا چاہیے، دشمنوں کو سنانے سے نقصان تو پورا نہیں ہوسکتا البتہ ان کو خوش ہونے کا موقع ملے گا جو ایک مستقل مصیبت ہوگی۔

URDUTUBE A HOME OF ENTERTAINMENT www.urdutube.com
Digitized by Google

مرسلہ: عبدالستار.....فیصل آباد

غیبت

مجلس میں ایک شخص نے دوسرے کی بُرائی شروع کی' ایک عقل مند آدمی نے اس سے کہا: بھائی ہمارے سامنے کسی کی بُرائی مت کرو کیوں کہ اس سے اپنے بارے میں اچھا گمان ہونے لگتا ہے۔

محروم المقسمت لوگ بعض باکمال لائق انسانوں کی بُرائی کرنے لگ جاتے ہیں بوجہ حسد ان کو دیکھ نہیں سکتے' پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرتے رہتے ہیں' جس طرح عام کتے شکاری کتے کے پیچھے بھونکتے رہتے ہیں لیکن سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتے۔

حوالہ: گلدستہ گلزار سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ

انتخاب: مبارک احمد.....چیچہ وطنی

غیرت مند

ایک سکھ لڑکا روزانہ اپنی بہن کو چھوڑنے کالج جاتا تو راستے میں چند آوارہ لڑکے اس پر آوازیں کستے۔ بجاں نوں لے کے کتھے چلے او۔ وہ لڑکا خاموش رہتا۔ تنگ آ کر اس کی بہن نے کہا۔ تمہارا میرے ساتھ آنے کا کیا فائدہ بھیا۔ وہ لوگ کتنی غلیظ باتیں کرتے ہیں۔ تم انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ لڑکے کی غیرت جاگی۔ جوش میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ بس صبح میں ان بے غیرتوں کی بات کا منہ توڑ جواب دوں گا۔ چنانچہ جب وہ صبح اپنی بہن کو چھوڑنے گیا تو لڑکوں نے کہا۔ ''بجاں نوں لے کے کتھے چلے او۔'' لڑکا پر جوش انداز میں چلایا۔ او بے غیرتو! ایہہ بجن ہوون گے تہاڈے میری سگی بھین اے۔''

عبدالصبور خان.....کوہاٹ

کمی

شادی کے کچھ عرصے بعد شوہر نے نیا مکان خریدا تو بیوی نے خوش ہوتے ہوئے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے دوران پوچھا۔ اس میں الماریاں کتنی ہیں۔ سولہ الماریاں ہیں۔ شوہر نے فخر سے بتایا۔ سولہ یہ تو کم ہیں۔ بیوی بولی۔ کیا؟ شوہر حیرت سے بولا۔ کیا سولہ الماریاں تمہارے کپڑے لٹکانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ میرے کپڑے لٹکانے کے لیے تو کافی ہیں۔ بیوی بولی۔ لیکن جمہیں بھی تو آخر کپڑے لٹکانے کے لیے الماری کی ضرورت ہوگی۔

غلام عباس خان.....راجن پور

بقول ہٹلر

حضرات! آپ ہمارا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ تاریخ کی ابدی عدالت نے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ بہادر وقتی طور پر ہار سکتے ہیں۔ لیکن شکست نہیں کھا سکتے۔ بکھر سکتے ہیں' مٹ نہیں سکتے۔''

محسن علی.....کراچی

زندگی کے رہنما اصول

- بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔
- خونی رشتوں سے قطع تعلق کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔
- اس شخص پر دوزخ حرام ہے جو نرم مزاج اور نرم خو ہو۔
- دولت مت جمع کرو کفن میں جیب نہیں ہوتی۔
- دنیا کے بازار میں زندگی کا سب سے قیمتی سکہ حوصلہ ہے۔
- بلند حوصلہ بلند مقاصد کی تکمیل ہے۔
- بھوکا سویا رہنا مقروض ہو کر اٹھنے سے بہتر ہے۔
- ہم دولت سے ہم نشین حاصل کر سکتے ہیں دوست نہیں۔
- زندگی میں تین چیزیں نہایت سخت ہیں۔

خوف مرگ.....شدت مرض.....ذلت قرض

ماریہ کنول.....چک ورکاں

Digitized by Google

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

نعت رسول ﷺ

اشکوں میں پلکوں پر عیاں دیکھ رہا ہوں
دربار محمد کا سماں، دیکھ رہا ہوں
ہیں صبح مدینہ کے مناظر بڑے دلکش
ہر موج صبا عطر فشاں، دیکھ رہا ہوں
روشن ہیں مدینے کے در و بام انہی سے
رحمت ہے محمد کی جہاں دیکھ رہا ہوں
اتراتی ہیں آنکھیں بھی مقدر پر مری آج
میں روضہ جان دو جہاں دیکھ رہا ہوں
اعجاز ہے آقا کی ثناء کا ہی یقیناً
آج اپنا لب و لہجہ جواں دیکھ رہا ہوں
فائق! ہے تبسم میں نہاں ہجر مدینہ
ہر زخم محبت کو عیاں دیکھ رہا ہوں

عمران فائق..... اٹک

نظم

سنو پیاری لڑکی
خود ہی کر دو فنا
اپنے سپنوں کو خواہشوں
کے شیش محل کو
یہاں تو آنچل سر سے
حیا آنکھوں سے
چھین لی جاتی ہے
یہ تو پھر بھی خواب ہیں
سنو پیاری لڑکی
جس دن تمہارے
یہ سپنے کسی
سنگ دل سے ٹکرا گئے
تم بھی ان کے ساتھ
پاش پاش ہو جاؤ گی

اقرا جٹ..... منچن آباد

جگنو

آنکھیں ہجر سمندر جگنو
آ جاتے ہیں اکثر جگنو
رات کی گہری تاریکی میں
ہر سو رقص میں منظر جگنو
میرے گورے سے گال کو اکثر
چھو جاتے ہیں پتھر جگنو
میری قسمت جیسے یہ بھی
گھوم رہے ہیں بے گھر جگنو
ٹوٹ کے شاید آنکھیں روئیں
ہم نے دیکھے در در جگنو
دامن میں برسات فری ہے
میرے اندر باہر جگنو

شاعرہ: فریدہ جاوید فری

انتخاب: پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر

غزل

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا
یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا
یہ کانٹے اور تیرا دامن
میں اپنا دکھ بھول گیا تھا
کتنی باتیں کی تھی لیکن
ایک بات سے جی ڈرتا تھا
تیرے ہاتھ کی چائے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا
کسی پرانے وہم نے شاید
تجھ کو پھر بے چین کیا تھا
میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
اک اجڑے سے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

شاعر: ناصر کاظمی

انتخاب: صالح جبریل..... بہاول پور

غزل

ناروا کو روا نہیں کہتے
غیر کو آشنا نہیں کہتے
دامن احتیاط تھاما ہے

Digitized by Google

ہم سزا کو جزا نہیں کہتے
ہم کنائیوں میں بات کرتے ہیں
حال دل برملا نہیں کہتے
جن کا تکیہ خدا پر ہوتا ہے
مرض کو لا دوا نہیں کہتے
جو حقیقت پسند ہوتے ہیں
چاند کو چانس سا نہیں کہتے
ہوں اگر چہ وہ شب گزیدہ ہی
ظلمتوں کو ضیا نہیں کہتے
جن میں عقل سلیم ہوتی ہے
پتھروں کو خدا نہیں کہتے

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

تمہیں عید مبارک

جب پھول کھلیں تیرے آنگن میں
جب خوش بو چہار سو مہکے
جب دل کو پیار بہت آئے
تو کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک
جب ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوں
جب بادلوں کے سائے سائے ہوں
چھوٹی کرنیں بھی پیاری پیاری ہوں
تو کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک
جب پلکیں جھکی جھکی سی ہوں
شرم و حیا کی سرخی طاری ہو
لگے خود کو پیاری پیاری ہو
تو کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک
جب زلفیں ہوا میں اڑتی ہوں
چڑی اٹکھیلیاں کرتی ہو
تو خود میں ہی سمٹتی ہو
تو کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک
ایسے میں رم جھم ہوتی ہو
چہرے کو بوندیں چھوتی ہوں
تو بھیگی بھیگی مسکان میں
پھر کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک
سماں عید کا مہکا مہکا ہو
جواں جذبوں میں کوئی رہتا ہو
رومی عید سہانی ہو جائے
تو کہنا چپکے چپکے سے
تمہیں عید مبارک تمہیں عید مبارک

عبدالجبار رومی انصاری......بورے والا

نظم

نظروں کے تصادم بھی
دو زندگیوں میں آ کر
دنیا ہی بدل دیتے
پھر
قریب میں آ کر کسی کے
کوئی
بھول جاتا ہے اپنا آپ

چوہدری قمر جہاں......ملتان

غزل

وفا میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
حسین چہرے رشک غزلان سب جانے پہچانے ہیں
غم عمر بھر کے یوں بھی دے جاتے ہیں لوگ
شمع کے ساتھ آج بھی جلتے پروانے ہیں
سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہوگا محبت میں
کسی کی یاد میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے نذرانے ہیں
شام کے گہرے سائے تھے یوں زندگی کے ساتھ
جلتی بجھتی ہوئی روشنیوں میں پھر کئی فسانے ہیں
ساتھ کوئی نہیں دیتا کسی کا جہاں میں
کھلے گی جب آنکھ پھر خواب کئی سہانے ہیں

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

عشق میں ایسا ڈوبا چھڑا رہ گیا
چھوٹا لے آیا بیوی بڑا رہ گیا
وہ کہ ماموں بنا کے چلی بھی گئی
ایک نشتر کہ دل میں گڑا رہ گیا

URDU TUBE
A HUB OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

Digitized by Google

ایک باراتی سے ہی نکاح ہوگیا
دولہا سامان پہ ہی اڑا رہ گیا
ہاتھ پیروں میں لرزش اتر آئی ہے
اور پہلو میں دل بھی سڑا رہ گیا
اب ملیں گے آثار قدیمہ میں بس
نہ صراحی نہ گھر میں گڑھا رہ گیا
وہ بھی اماں کے پہلو میں جا سوئی اور
میں بھی بستر پہ نیر پڑا رہ گیا

نیئر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

نظم

کبھی تم وصل لکھو تو
ہوا کی باس پہ لکھنا
مہکتے پھول پہ لکھنا
تیرے ہم قدم ہو کے چلنے سے
جس سے اٹ گئے پاؤں
اس دھول پہ لکھنا
سکھ کے کھیت پہ لکھنا
گیلی ریت پہ لکھنا
ہجر کے دیت پہ لکھنا

محمد فرقان رومان......چکوال

غزل

ترے ہی نقش پا ہر گام دیکھوں
تری راہیں میں صبح و شام دیکھوں
کئی نظمیں ادھوری ہوں مکمل
چھلکتا جب نظر کا جام دیکھوں
ضمیر جسم کی لگتی ہے بولی
جدا ہر آدمی کے دام دیکھوں
ترانہ جس نے آزادی کا گایا
وہی بلبل میں زیر دام دیکھوں
بنا جو شرپسندوں کا مخالف
حیاتی کی پُرآلام دیکھوں
لہو میں تر نمازی مسجدوں میں
اسکولوں میں میں قتل عام دیکھوں
کسی کی چشم تر کی یاد آئی
ادھورا راہی میں ہر کام دیکھوں

برکت راہی......ڈگری سندھ

غزل

خاک و خون میں لت پت ٹوٹتی سانسوں کو جوڑ کر
ہم نے دشمن کے ناپاک عزائم کو اپنے پیروں تلے کچلا ہے
جب بھی اے وطن تو نے خراج مانگا ہوگا
نچوڑ کر رگوں سے اپنی ہم نے لہو دیا ہے
آئے تھے تجھ کو تسخیر کرنے تیرے دشمن
دے کر اپنی جانیں تجھ کو ہم نے ناقابل تسخیر کیا ہے
6 ستمبر ہے عہد وفا کی تجدید کا دن واجد
وہ عہد جو ہم نے اپنی دھرتی ماں سے کیا ہے

شاعر: واجد محمود قریشی

غزل

اپنے ماتھے سے جو بال اس نے ہٹائے ہائے
میں تو میں چاند بھی کرنے لگا ہائے ہائے
جب بھی آتی ہے مرے سامنے اس کی تصویر
کچھ زباں پر نہیں آتا ہے سوائے ہائے
ہائے ماتھے سے لبوں تک کا سفر طے نہ ہوا
زندگی بیت گی بیٹھے بٹھائے ہائے
وہ جسے کچھ بھی بنانا نہیں آتا اللہ......
وہ بنالائی مرے واسطے چائے ہائے
میرے ہاں کہنے سے پہلے ہی مرا دل حارث
اس کی ہر بات پر کہہ دیتا ہے آئے ہائے

حارث بلال......سرگودھا

غزل

یہ دلکش دلکش بہاروں کا ساتھ
کسی کے مہکتے اشاروں کا ساتھ
میرا دل ہے اب تک اسی سوچ میں
بھلا کون دے گا غم کے ماروں کا ساتھ
بہت ہم نے چاہا مگر دوستو
ملا نہ ہمیں اپنے پیاروں کا ساتھ
کناروں نے کسی کا دیا ساتھ کب
نہیں چاہیے ہمیں کناروں کا ساتھ
بناتے رہے ہم جہاں آشیاں
رہا رانا ہر دم شراروں کا ساتھ

قدیر رانا......راولپنڈی

URDU TUBE
www.urdutubes.com
Digitized by Google

غزل

کچا سا کوئی گھر ہو جو بنیاد کے بغیر
میں جی رہا ہوں آج بھی اولاد کے بغیر
اب دیکھ میری جان تجھ کو بھول بھی گیا
سب دن گزر رہے ہیں تیری یاد کے بغیر
جب محفلوں میں چار سو خوشیاں سی ہوں
ہم شعر کیا سنائیں کسی داد کے بغیر
اس دل کی داستاں بھی بھلا کس طرح لکھیں
اس داستاں کا کیا مزہ روداد کے بغیر
اب آئینے میں دیکھ میرا عکس بھی نہیں
اب مر گیا ہمزاد بھی دلشاد کے بغیر
کچھ اس طرح سے دوستو میں سرخرو ہوا
میں خود صلیب پر گیا جلاد کے بغیر

راشد ترین......مظفر گڑھ

لمحہ رخصت

ملنے کا آسرا پھر کیا ہوگا
سب کچھ تو بدل گیا ہوگا
آج تو زندگی اپنی ہے
کل جانے کون کس کا ہوگا
ہوسکتا ہے کبھی رستے میں ملیں
اور سمجھیں کہ نظر کا دھوکہ ہوگا
برسوں بعد کی ملاقات میں
کون کس کو پہچانتا ہوگا
کس کو تم سے اتنی محبت ہوگی
کون تمہیں اتنا جانتا ہوگا
یادوں کی نرم ریت پر
تمہارا نام مٹا ہوگا
سب باتیں بھول گئی ہوں گی
ہر منظر دھول سے اٹا ہوگا
تیری عمر ڈھل گئی ہوگی
میرا چہرہ بدل گیا ہوگا
بھول جانا آساں تو نہیں عمیس
مگر وقت کا تقاضہ ہوگا

عمیس احمد......جھنگ صدر

غزل

کبھی رخ دکھاؤ ذرا دھیرے دھیرے
یوں نظریں ملاؤ ذرا دھیرے دھیرے
ہے پھول کلیوں کے کھلنے کا موسم
اگر مسکراؤ ذرا دھیرے دھیرے
کبھی خال و خد کی تب و تاب سے ہی
وہ بجلی گراؤ ذرا دھیرے دھیرے
بسیرا ہے ہر سو عجیب خامشی کا
ہاں پائل جگاؤ ذرا دھیرے دھیرے
مجھے قتل ہونے کا بھی لطف آئے
جو مقتل سجاؤ ذرا دھیرے دھیرے
وفاؤں کو دی ہے نئی زندگانی
کبھی آزماؤں ذرا دھیرے دھیرے
تجھے حال دل میں سناتا ہوں اپنا
مجھے تم سناؤ ذرا دھیرے دھیرے
میرے شعروں میں نغمگی آپ کی ہے
انہیں گنگناؤ ذرا دھیرے دھیرے
مقدر پہ اپنے کیوں نہ ہوں نازاں
جو دل میں بساؤ ذرا دھیرے دھیرے
قدم آج ساحل کے بھی ڈگمگائیں
نظر سے پلاؤ ذرا دھیرے دھیرے

خالد ایاز ساحل......حافظ آباد

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

Digitized by Google

مرشد

قسط نمبر 15

ساحر جمیل سید

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بد معاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر..... وہ کسی کا مرید ہوگیا.....!!

شاہی محلے کا نمازی بد معاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی

وہ رات اور اگلا دن مرشد نے سخت بے چینی اور بے سکونی میں گزارا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے پہلے حجاب سرکار کا سراغ لگا کر ان تک جا پہنچے اور اس کے بعد انہیں ان کے پھوپھا کے ہاں بلوچستان پہنچانے کے بعد واپس آ کر اپنے ساتھیوں کے خون کا قرض چکائے چوہدری فرزند جس نے اپنی غلیظ زبان سے اس کی اماں کی شان میں گستاخی کی، گھٹیا اور گندی ترین باتیں کہیں اسے گردن سے آ دبوچے اور اس کے حلق سے اس کی زبان کھینچ کر اکھاڑ لے ابھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا ابھی اسے صرف حجاب سرکار کی فکر تھی ان کی تلاش جیسے سب باتوں سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری تھی۔

شام کے قریب، خنجر بیرونی دروازے پر تالا ڈال کر کہیں چلا گیا اور مرشد اور پرلے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ کر پسٹل کی صفائی کرنے میں مگن ہو گیا، خنجر کی دھار وہ پہلے ہی خوب اچھے سے چمکا چکا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق آج رات ایک بجے انہیں یہاں سے مغل پورہ جانا تھا رانا سرفراز کی گردن دبوچنے اور مرشد فیصلہ کر چکا تھا کہ رانا کو کل صبح کا سورج نہیں دیکھنے دے گا۔

کچھ یہ تھا کہ مرشد براہ راست تجربے سے گزرا تھا اور باقی اسے خنجر کی زبانی معلوم ہو گیا تھا تھانہ لٹی والے خون خرابے کے پیچھے رانا ہی کی عیاری اور کمینگی کارفرما تھی ملنگی گروپ کی پشت پناہی وہ عرصہ دراز سے کر رہا تھا جو گھوڑا تو اس کا ایک معمولی سا پیادہ تھا جس کی زندگی پر رانا نے ایسا شاطرانہ داؤ کھیلا تھا کہ مرشد کے تین یاروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے باقی ساتھی بھی مصیبت میں آ گئے تھے اور خود مرشد بھی مطلوب ترین مجرموں کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا رانا نے محض ذاتی مفاد (جو چوہدری سے وابستہ تھا) کی خاطر مرشد کے ساتھ دشمنی کی تھی ظلم ڈھایا تھا اور متوقع طور پر آگے وہ حجاب سرکار کے لیے بھی مشکل اور مصیبت کا باعث بن سکتا تھا مرشد کے نزدیک ایسے شخص کو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا دو قتل تو اب وہ کر ہی چکا تھا قاتل تو بن ہی چکا تھا خنجر کی واپسی رات دس ساڑھے دس کے قریب ہوئی مرشد اس وقت پلنگ پر چت پڑا چھت کی کڑیوں میں لٹکتے جالوں کو تک رہا تھا خنجر کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے کہ مرشد اس کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

"مرشد استاد، تھوڑی گڑبڑ سی ہے۔"

خنجر کے لہجے میں تشویش خیز سنسنی تھی اس نے ہاتھ میں موجود شاپرز ایک طرف میز پر رکھے اور کرسی گھسیٹ کر پلنگ کے قریب ہو بیٹھا۔

"گھنٹہ پون گھنٹہ پہلے رانا اپنی "شرعی رکھیل" کے ہاں پہنچ آیا ہے لیکن توقع کے بالکل خلاف آج اس کے ساتھ تین چار لوگ اور بھی ہیں اور بالکل یہی توقع کے خلاف نئے دو بندوں میں سے ایک استاد ملنگی ہے اور دوسرا اس کا جوڑی وال فوجی ہے۔" مرشد نے فوراً اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ خنجر اپنی خنجر جیسی تیکھی آنکھوں پر تنی بھویں اچکا کر بولا۔

"کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان کے ساتھ اور اک نیا بندہ کون ہے؟"

"میں کوئی غائب دان یا نجومی نہیں ہوں۔" مرشد نے کہا۔

"دو گاڑیاں تھیں رانا والی گاڑی ہمیشہ کی طرح جمشید ڈرائیو کر رہا تھا پیچھے ایک جیپ تھی ڈرائیور کے علاوہ اس جیپ میں ملنگی اور فوجی سوار تھے اور ان دونوں کے درمیان ایک جوان اور گوری چٹی لڑکی تھی اندازہ یہ ہے کہ لڑکی اپنی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ یہاں تک پہنچی ہے شاید اسے مجبور کر کے زبردستی لایا گیا ہو کیونکہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔"

مرشد کے لیے یہ اطلاع انتہائی چونکا دینے والی تھی وہ بے اختیار ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"لڑکی، اس کے بارے میں کیا اندازہ ہے کون ہو سکتی ہے۔"

"کوئی اندازہ نہیں وہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔" خنجر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"کہیں...... کہیں وہ سرکار ہی نہ ہوں خنجر۔" مرشد کے لہجے میں یکا یک ہی جیسے زمانے بھر کا اضطراب اُمڈ آیا۔

"میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" مرشد بے اختیار اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا اس کے رگ و پے میں ایک عجیب بے قراری

Digitized by Google

پھیل گئی تھی ہلکی ہلکی دھمن کا احساس جگانے والی بے قراری۔

"خنجر ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"نہیں یہ غلط ہوگا جو پروگرام ہم نے طے کر رکھا ہے وہ درست ہے ہمیں ایک بجے سے پہلے یہاں سے نہیں نکلنا چاہیے۔"

"اگر وہ سرکار ہی ہیں تو پھر ہماری طرف سے تاخیر ان کے لیے کسی نقصان یا تکلیف کا باعث بھی بن سکتا ہے۔"

"ہماری جلد بازی سارا کھیل چوپٹ بھی کر سکتی ہے اور پھر..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حجاب سرکار نہ ہوں کوئی اور ہو۔" خنجر کے جواب پر مرشد ہونٹ بھینچ کر رہ گیا گو کہ خنجر کا قیاس بھی معقول تھا لیکن پتا نہیں کیوں مرشد کا دل جیسے چیخ چیخ کر کہنے لگا تھا کہ ہو نہ ہو وہ حجاب سرکار ہی ہوں گی چوہدری، رانا اور ملنگی لوگ سب ایک ہی کچھ تو تھے سب ایک ہی مقصد ایک ہی مشن پر تو مصروف عمل تھے ملنگی اور فوجی نے کسی نہ کسی طرح سرکار کا سراغ پالیا ہوگا اس کے بعد انہوں نے انتہائی جارحانہ اور سفاکانہ انداز میں انہیں اغوا کیا ہوگا اور یہاں اٹھا لائے ہوں گے اگلے مرحلے میں اب وہ یقیناً چوہدریوں کے ساتھ معاملات طے کر کے سرکار کو ان فرعونوں کے حوالے کر دیں گے اور اس کے بعد.....

مرشد ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹک گیا کئی بھیانک اندیشے ایک ساتھ اس کے دماغ میں پھنکارا اٹھے تھے۔

"خنجر مجھے ابھی کے ابھی رانا کی اس رہائش گاہ تک پہنچنا ہے۔" مرشد کا لہجہ فیصلہ کن تھا خنجر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مرشد استاد جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو نقصان اٹھائیں گے۔"

"صرف میں اٹھاؤں گا تم صرف مجھے وہ عمارت دکھا دو اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔"

"اب یہ بات بھی تم غلط کر رہے ہو۔" خنجر کے لہجے میں اعتراض تھا شکایت تھی۔

"مجھے ابھی وہاں پہنچنا ہے۔"

مرشد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا خنجر چند لمحے اس کی صورت دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کندھے اچکا کر بولا۔

"ٹھیک ہے..... تمہاری مرضی..... یہ ٹھیک تو نہیں ہے لیکن چلو۔" اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجبوراً اتفاق کر رہا ہے اس کے بعد مرشد نے کھانا کھانے میں بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جس وقت وہ دونوں موٹر بائیک پر وہاں سے مغل پورہ کی طرف روانہ ہوئے اس وقت رات کے گیارہ بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

رات نسبتاً زیادہ گرم تھی فضا میں حبس گھلا ہوا تھا خنجر نے سڑک کی بجائے گلیوں کے راستے کا انتخاب کیا ایک عجلت انگیز سی بے چینی مرشد کے خون میں ہلکورے لے رہی تھی اس کا بس چلتا تو وہ پلک جھپکتے ہی اڑ کر رانا کی اس رہائش گاہ میں سرکار کے روبرو جا پہنچتا مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا بہرحال انہیں مطلوبہ علاقے تک پہنچنے میں کوئی بہت زیادہ دیر نہیں لگی رانا کی رہائش گاہ والی گلی میں داخل ہوتے ہی خنجر نے مرشد کو آگاہ کیا۔

آگے بائیں ہاتھ ترچھے گیٹ والی کوٹھی آئے گی وہی رانا کی رہائش گاہ ہے اس کے عقبی طرف بھی کوٹھی ہے البتہ بغلی طرف ایک گلی موجود ہے۔"

"بس پھر اسی گلی میں سے ہو کر دوسری طرف نکلو..... جائزہ لیتے ہیں۔" یہ گلی خاصی کشادہ تھی اور پرسکون بھی ساری گلی خالی پڑی تھی فاصلے فاصلے پر صرف دو جگہ بلب روشن تھے تقریباً دس گھر چھوڑ کر مرشد کی نظر اس ترچھے گیٹ والی عمارت پر پڑی لوہے کا گیٹ واقعی قدرے ترچھی پوزیشن میں لگوایا گیا تھا شاید ایسا گاڑی کی بہ سہولت آمد و رفت کی غرض سے کیا گیا تھا یہ نئے فیشن کی ایک دو منزلہ کوٹھی تھی جس کی بلند چار دیواری دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ کوٹھی خاصی وسیع اور شاندار ہے رانا نے اپنی حرام کمائی کو یہاں خوب کھلے دل سے خرچ کیا تھا۔

خنجر ڈرائیو کر رہا تھا اور مرشد اس کے عقب میں بیٹھا تھا اس کی تمام تر توجہ کوٹھی ہی پر مرکوز تھی جس وقت بائیک کوٹھی کے سامنے پہنچی ٹھیک اسی وقت گیٹ کے دونوں پٹ کھلے، گیٹ کھینچ کر کھولنے والا ایک محکوم نوعمر لڑکا تھا مرشد کو اس کی محض ایک جھلک دکھائی دی ساتھ ہی ایک لمحے کے لیے محض ایک لمحے کے لیے اس کی نظر کھلتے ہوئے گیٹ کے اس طرف موجود منظر پر پڑی اور بائیک آگے نکل گئی۔

Digitized by Google

''سیدھے چلتے رہو۔'' مرشد نے بے اختیار فوراً خنجر کے کندھے کو دباتے ہوئے اس کے کان کے قریب کہا ایک لمحے کا وہ نظارہ اسے چونکا گیا تھا گیٹ کے اس طرف اندر ایک جیپ کھڑی تھی کوٹھی کے کسی حصے کی طرف سے آتی ہوئی روشنی میں اس نے ایک شخص کو جیپ کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہوتے دیکھا اور ساتھ ہی جیپ کی عقبی طرف محض چند قدم کے فاصلے پر جیپ ہی کی طرف آتے ہوئے ملنگی اور فوجی کو بھی وہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے آ رہے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے۔

''بالکل پاک کی سیدھ ہی میں نا؟'' خنجر نے جیسے تصدیق چاہی تھی۔

''رفتار آہستہ کرلو۔'' مرشد نے عقبی طرف دیکھتے ہوئے کہا خنجر نے فوراً عمل کیا وہ چند قدم مزید آگے بڑھے ہوں گے کہ عقب میں وہی جیپ گیٹ سے باہر نکل آئی اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔

''روک دو۔''

مرشد کی ہدایت پر خنجر نے پاؤں بریک پر رکھ دیا مرشد کی توجہ تو پہلے ہی عقب میں تھی خنجر بھی موٹر بائیک روکتے ہی گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

''یہ تو ملنگی گروپ والی جیب لگ رہی ہے۔'' اس کی خیال آرائی نے مرشد کے اندازے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ ملنگی اور فوجی اپنا ایک اور مشن پایہ تکمیل تک پہنچا چکنے کے بعد اب اپنی کسی کمین گاہ کی طرف واپس جا رہے تھے ایک بار تو اس کے جی میں شدت سے آئی کہ بائیک فوراً موڑ لی جائے اور جیپ کے برابر پہنچتے ہی ملنگی اور فوجی کی کھوپڑیوں کا نشانہ لیتے ہوئے پسٹل کا پورا میگزین خالی کردے مگر ایک خیال نے مضبوط مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچے رکھا وہ خیال تھا حجاب سرکار کا وہ جو اس سے بہت بلند بہت جلدی اور نا آشنا تھی اور ساتھ ہی بہت قریب اتنا قریب تھی کہ جیسے سینے کی اتھاہ اور نارسا تہوں میں ازل سے مکین ایک مہربان اور ٹھنڈی روشنی جیسے ذات کی شروعات سے اس کی معراج تک کے سب رازوں سے واقف اور آشنا اپنی ذات ہی دوسرا حصہ اور وہ ہستی اس وقت یہیں تھی اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر موجود ایک تنگی چار دیواری کی اس طرف وہ چاہ کر بھی اب یہاں سے اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتا تھا یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی بے اختیار وہ جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔

ملنگی لوگوں کے ساتھ قرض ادائیگی کا معاملہ اس کی انا اور غیرت کے لیے سوال انگیز تھا جبکہ حجاب سرکار کا معاملہ اس کی غیرت کے ساتھ ساتھ اس کے اعتقاد و عقیدے اور قلب و ایمان کے لطیف و نازک تاروں سے جڑا ہوا تھا۔

ملنگی لوگوں کی جیپ گلی کے دوسری نکڑ سے مڑ جانے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوگئی تو مرشد خنجر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''چلو......بغلی طرف والی گلی سے پچھلی طرف کو نکلو۔''

''لگتا ہے قدرت ہماری طرف داری میں ہے۔'' خنجر نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کا ہینڈل گھمایا یقیناً ملنگی اور فوجی دونوں چلے گئے ہیں۔''

''یہ بات تو ان لوگوں پر صادق آتی ہے۔''

''او خیر شاباش ہے بھئی تمہارے حوصلوں کو یعنی تم آج ملنگی اور فوجی جیسے بندوں کا بھی نمبر لگانے والے تھے۔''

بائیک رانا کی کوٹھی کی بغلی گلی میں داخل ہوئی یہ بمشکل چار ساڑھے فٹ کی ایک تنگ اور تاریک گلی تھی کوٹھی کی دیوار تقریباً آٹھ دس فٹ بلند تو رہی ہوگی، موٹر بائیک عقبی گلی میں پہنچ گئی تو خنجر نے ایک جگہ بریک لگا دی کچھ فاصلے پر موجود ایک بڑے گھر کے دروازے پر دو لوگ کھڑے کچھ بات چیت کر رہے تھے جس جگہ خنجر نے بائیک روکی تھی اس کے برابر والی کوٹھی سے انڈین گانوں کی آواز باہر گلی تک آ رہی تھی۔

''کیا پروگرام ہے؟'' مرشد کے بائیک سے اترنے پر خنجر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں نے تو رانا کا نرخرہ کاٹنا ہے آج سرکار کو لے کر یہاں سے نکلنا ہے اور پھر انہیں بلوچستان ان کے وارثوں تک پہنچانا ہے اس کی میں نے انہیں زبان دی تھی وعدہ کیا تھا میں نے تمہیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم واپس مکان پر لوٹ جاؤ میں یہاں کا یہ پھڈا آسانی سے بھگتا لوں گا واپس تمہیں مکان ہی پر آ کر ملتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اچھا مشورہ ہے۔'' خنجر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا ''اور یہ آخری بات ہے تمہاری۔''

Digitized by Google

''سرکار۔'' مرشد کے چہرے پر چٹانی سنجیدگی تھی اور لہجے میں گہرا استحکام۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے اپنے لیے میں آپ فیصلہ کرنے کے قابل ہوں ابھی میں تمہارے ساتھ ہی اندر چل رہا ہوں۔'' خنجر کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے بھی پرخلوص عزم جھلک رہا تھا مرشد انگلی کی مدد سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری مرضی..... تو تمہارے مطابق اس وقت اندر چار افراد ہونے چاہیے ایسے ہی ہے نا؟''

''ہاں ہونا تو ایسے ہی چاہیے بلکہ آج تو ایک فرد اضافی ہے وہ لڑکی جسے یہ لوگ لے کر آئے ہیں۔''

''اس کے علاوہ؟'' مرشد نے سرسری انداز میں گردن گھما کر گلی کا جائزہ لیا خنجر نے انگلیوں پر حساب شروع کیا۔

''ہاتھ بھر کا ملازم چھوکرا جمشید، جمشید کی بہن اور بہن کا یار یعنی رانا سرفراز یہ ہو گئے چار ابھی چار کو ہونا چاہیے۔''

''چلو پھر دوبارہ گلی میں۔'' مرشد دوبارہ اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور خنجر نے بائیک موڑ لی مرشد کوٹھی کے اندر داخل ہونے کے لیے جگہ پہلے ہی منتخب کر چکا تھا بغلی گلی کے وسط میں کوٹھی کے اندر شیشم کا ایک درخت موجود تھا جس کی ڈھیر ساری گھنی شاخوں نے دیوار کا کچھ حصہ ڈھانپ رکھا تھا مرشد نے اس جگہ سے دیوار پر چڑھنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ٹھیک اسی جگہ اس نے بائیک رکوائی گلی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس جگہ کھڑی بائیک کو کچھ فاصلے پر سے دکھائی دینا مشکل تھا مرشد نے بائیک کو دیوار کے ساتھ جوڑ کر کھڑا کیا اور خود بائیک پر چڑھ کھڑا ہوا یوں باآسانی اس کے ہاتھ دیوار کے سرے تک جا پہنچے اس کے بعد وہ محض ایک لمحے میں دیوار کے اوپر موجود گھنی شاخوں میں پہنچ چکا تھا اس کے بعد خنجر بھی اس طرح دیوار پر اس کے برابر جا پہنچا۔

درخت کی شاخوں کے بیچ سے کوٹھی کی مختلف لائٹوں کی روشنائی دکھائی دے رہی تھیں جس جگہ وہ دیوار پر موجود تھے وہاں سے ان کے بائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر بیرونی گیٹ موجود تھا گیٹ سے آگے چار دیواری کے کونے میں ایک کمرہ موجود تھا جس کے اندر روشنی تھی پورچ میں دو کاریں کھڑی تھیں عمارت ان کے سامنے قدرے دائیں ہاتھ واقع تھی جس کی دوسری منزل پر صرف دو کمروں میں روشنی تھی جبکہ زیریں حصہ تقریباً تمام کا تمام ہی روشن تھا۔ ان کی سماعت و بصارت کے دائرہ کار میں نہ تو کوئی آواز آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی حرکت اندر مکمل طور پر سکون اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ گیٹ کے اس طرف چوکیدار ہے اس میں ملازم چھوکرا ہوگا اور باقی سارے افراد ادھر کوٹھی کے اندر ہوں گے۔'' خنجر نے دھیمے لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اس کو نظر انداز کرو چھوکرے کو کچھ بھی نہیں کہنا ہم نے میرا اصل ٹارگٹ رانا ہے اور مقصد سرکار کو حفاظت و سلامتی کے ساتھ یہاں سے لے کر نکل جانا اور اس سب میں زیادہ وقت بھی ضائع نہیں کرنا۔''

''بس پھر اندر تو رانا اور جمشید ہی ہوں گے اور ان دونوں میں سے صرف ایک جمشید ہی کی طرف سے کچھ مزاحمت کی توقع ہے رانا کی تو ویسے ہی تم پر نظر پڑتے ہی ہاتھوں پیروں سے جان نکل جائے گی ویسے ہمیں رومال یا صافے وغیرہ لے کر آنا چاہیے تھا منڈاسوں کے لیے۔''

''درست کہہ رہے ہو ایسا کرو کہ بھاگ کر دو صافے لے ہی آؤ۔'' مرشد کی آنکھیں اور حسیات مکمل طور پر اندرونی جانب لگی ہوئی تھیں۔ وہ عقابی انداز میں روشن کھڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''نہیں اب کیا جانا اب تو پہنچ آئے جو ہوگی دیکھی جائے گی اب۔''

''تیار ہو جاؤ پھر پہلے میں جاتا ہوں جیسے ہی میں ادھر بغلی حصے کے اندھیرے تک پہنچ جاؤں تم بھی چلے آنا۔'' مرشد نے اسے ہدایت دی اور درخت کی مضبوط شاخوں کے سہارے درخت کے ایک موٹے اور مضبوط تنے پر جا پہنچا وہاں سے وہ نیچے اترنے کا سوچ رہا تھا کہ کوٹھی کے اندرونی حصے سے ایک جوان نکل کر پورچ میں کھڑی کاروں کی طرف بڑھ گیا۔ خنجر کی تیز سرگوشی مرشد کے کانوں تک پہنچی۔

''یہ جمشید ہے۔''

جمشید ایک کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا خنجر نے دوبارہ سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

Digitized by Google

"لگتا ہے کہ یہ بھی اپنے گھر جا رہا ہے میدان بالکل ہی صاف ہو رہا ہے جگر۔" خنجر کا اندازہ شاید درست ہی تھا کار اسٹارٹ ہو کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی ساتھ ہی جمشید نے ہارن بجایا تو کونے والے کمرے سے فوراً ہی مکوم صورت نوعمر لڑکا نکلا اور دوڑ کر گیٹ تک جا پہنچا اس نے گیٹ کھولا اور جمشید کار کو آگے بڑھاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا لڑکے نے گیٹ بند کیا اور دوبارہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میدان ایک طرح سے واقعی صاف ہو گیا تھا متوقع طور پر اب اندر صرف دو عورتیں تھیں یا پھر مرد و درانا سرفراز خود تھا دو عورتوں میں سے ایک تو بقول خنجر رانا کی شرعی رکھیل عظمیٰ تھی اور دوسری...... دوسری ہستی یقینی طور پر حجاب سرکار کی تھی مرشد کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں کچھ ہی دیر میں وہ حجاب سرکار کے روبرو ہونے والا تھا۔

درخت سے نیچے اترنے کے بعد اس نے ایک ذرا اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا پھر دبے لیکن تیز قدموں سے آگے بڑھتا ہوا رہائشی عمارت کی بغلی طرف پہنچ گیا اس طرف قدرے اندھیرا تھا صرف ایک کھڑکی تھی جس سے معمولی روشنی باہر تک آ رہی تھی مرشد نے دیوار کے ساتھ رک کر خنجر کو درخت سے نیچے اترتے دیکھا پھر چند قدم کے فاصلے پر موجود کھڑکی تک جا پہنچا یہ کچن کی کھڑکی تھی محض چند ہی لمحوں میں خنجر بھی اس کے قریب پہنچ آیا۔

"کیا خیال ہے؟ سیدھے سے منہ اٹھا کر اندر نہ چلے چلیں۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آ جاؤ۔"

مرشد نے فوراً اس کی بات سے اتفاق کیا اور پلٹ کر کچن میں سامنے کے رخ چل پڑا یک ہی اس نے ہر احتیاط اور ہر اندیشے کو پس پشت ڈال دیا تھا بغیر کسی دقت یا پریشانی کے وہ دونوں کوٹھی کے کشادہ لاؤنج تک جا پہنچے ایک کونے سے خوب صورت سنگی زینے اوپر کی منزل پر جاتے تھے بائیں ہاتھ سامنے اور دائیں ہاتھ الگ الگ چار دروازے دکھائی دے رہے تھے ایک تو کچن کا دروازہ تھا جو پہلے سے کھلا تھا دوسرا ایک راستہ کمرے کا تھا جس میں کوئی موجود نہیں تھا تیسرا باتھ روم کا تھا اور چوتھا دروازہ ایک مختصر سے کوریڈور میں کھلتا تھا اس کوریڈور میں تین دروازے تھے ایک بالکل سامنے اور دو دائیں بائیں وہ دونوں چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ دائیں ہاتھ والے دروازے سے ایک بھاری مردانہ قہقہے کی آواز سنائی دی تو وہ دونوں ٹھٹک گئے دروازے میں معمولی سی جھری تھی۔

"اس طرح نہیں رانا صاحب اس طرح نہیں۔ میرے پانچ بندے بے موت مارے گئے ہیں خود میری اپنی زندگی اپنا کیریئر داؤ پر لگا ہے اس سارے ڈرامے کا نتیجہ مجھے کچھ بھی بھگتنا پڑ سکتا ہے اس لیے اس سب کی قیمت بھی تو پھر ویسی ہی ہونی چاہیے نا۔"

اندر رانا سرفراز کے علاوہ بھی کوئی موجود تھا آواز نشے سے بوجھل تھی پھر بھی مرشد نے اس آواز کو باآسانی شناخت کر لیا وہ شناسا سا آواز تھی لیکن مرشد نے اسے اپنا وہم خیال کیا اس نے دیوار کے ساتھ لگ کر دروازے کی جھری سے اندر جھانکا اتفاق سے نظر سیدھی ان صوفوں پر پڑی جہاں دو افراد آمنے سامنے بیٹھے تھے ان میں سے ایک تو رانا سرفراز ہی تھا جبکہ دوسری شخصیت پر نظر پڑتے ہی مرشد کا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا ایک شدید جھٹکا ایک کرنٹ تھا جو اس کی آنکھوں کے رستے اس کے پورے وجود میں دوڑ گیا تھا آواز کے بعد اب وہ اپنی آنکھوں سے صاحب آواز کو بھی دیکھ چکا تھا لیکن اسے جیسے اپنی سماعت اور بینائی پر شبہ ہو رہا تھا اسے اس شخص کی یوں یہاں موجودگی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

......☆☆......

میر صاحب تیسرے روز سہ پہر کے وقت وہاں پہنچے نومبر کی لطیف خنکی کے دن تھے حسن آرا کو دوپہر سے پھر ہلکی ہلکی حرارت کی شکایت تھی سو وہ کندھوں پر ایک سیاہ شال اوڑھے چھت پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھی مونگ پھلی ٹھنگور رہی تھی اور اداس نظروں سے بادشاہی مسجد کے پرشکوہ اور خاموش میناروں کو تک رہی تھی ابھی کچھ دیر پہلے تک سندس جہاں اور عشرت جہاں بھی یہیں اس کے ساتھ ہی موجود تھیں ادھر وہ اٹھ کر نیچے گئیں اور ادھر میر صاحب اوپر چلے آئے وہ بالکل قریب پہنچ آئے تھے جب حسن آرا کو ان کی آمد کا احساس ہوا اس نے فوراً اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن میر صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

www.urdutube...
Digitized by Google

''بیٹھی رہیے حسن آرا، آپ کو زحمت فرمانے کی قطعا بھی کوئی ضرورت نہیں براہ کرم تشریف رکھیے۔''

میر صاحب کی اس قربت اور کندھوں پر آ پڑنے والے ان کے مضبوط لیکن مہربان سے لمس نے حسن آرا کے پورے وجود میں سحر انگیز لہریں دوڑا دیں اس کے ذہن میں وہ لازوال اور ہوش ربا لمحات تازہ ہو آئے جو گزرے دنوں کی ایک خوش گوار رات کو اس نے میر صاحب کے انہی مضبوط اور مہربان بازوؤں کے حصار میں بتائے تھے۔

دل بے طرح سے دھڑکا وہ شال کو کچھ مزید اچھے سے لپیٹتے ہوئے شکریہ کہہ کر واپس بیٹھ گئی۔

آسمان پر گردش کرتی کالے بادلوں کی ٹولیاں وقفے وقفے سے شاہ خاور کے روبرو ہوئی تھیں اور چاروں طرف بکھرے تمام زندہ مناظر ایک سرمئی سے روپ میں ڈوب کر عجیب افسانوی سا ماورائی سا احساس جگانے لگتے تھے میر صاحب دوسری کرسی کو سامنے کی طرف سرکا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔''

''جی بہت بہتر ہے آپ کے فاروقی صاحب کل شام پھر ڈاکٹر صاحب کو لے آئے تھے۔'' بازو میں سرنج گھونپ گئے اور تھیلا دواؤں کا بھی دے گئے۔''

میر صاحب نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''لیکن آپ کے یہ رخسار اور گلابی ہوتی ناک تو کہہ رہی ہے کہ ابھی بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کچھ خاص نہیں بس ہلکی سی حرارت ہے دوا لی ہے ہم نے ٹھیک ہو جائیں گے۔''

چند لمحوں کے لیے چھت پر خاموشی سرسرائی پھر میر صاحب کی گمبھیر آواز حسن آرا کے کانوں میں اتری۔

''آغا جی ملنے آئے تھے آپ سے؟''

حسن آرا نے آہستہ سے ان کی طرف دیکھا۔

''آغا جی کون؟''

''ہمارے بڑے بھائی پرسوں تقریباً اسی وقت آپ سے ملاقات کی ہوگی انہوں نے۔'' میر صاحب کے چہرے اور لہجے میں گہری سنجیدگی تھی حسن آرا کو پرسوں والے مہمان یاد آئے پہلی ہی نظر پر اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ ہو نہ ہو یہ پروقار شخص میر صاحب ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اب ان لمحوں میر صاحب ہی کی زبانی اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ وہ میر صاحب کے بڑے بھائی تھے۔

''ہاں جی کچھ لمحوں کی ملاقات رہی ان سے۔''

''ہمیں اندازہ ہے وہ کس لیے آئے تھے اور کیا کہہ کر گئے ہوں گے۔''

''آپ نے ہمارے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ انہیں ناگوار گزرا ہے ہم پر بھی خفا ہو رہے تھے وہ۔''

''پھر..... آپ نے کیا جواب دیا انہیں؟'' میر صاحب نے اپنی واسکٹ درست کرتے ہوئے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔

''ہمارے لیے تو آپ کی خواہش بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے حضور اور آپ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا ہمارے نزدیک ایمان کا حصہ ہے لیکن۔''

''لیکن..... کیا؟''

حسن آرا کی ہچکچاہٹ پر انہوں نے فوراً استفسار کیا۔

''وہ دراصل آغا جی بھی تو اپنی جگہ درست ہیں ہم بھی پہلے آپ کے سامنے درخواست گزار چکے ہیں ہماری جگہ تو آپ کے پیروں کی خاک میں بنتی ہے ہم آپ کے پیروں کی دھول سے ہی تو ہیں آپ اس دھول کو اپنی مبارک پیشانی سے لگا کر کیوں ہمیں ہماری نظروں میں گناہ گار کرنا چاہتے ہیں۔''

حسن آرا کے لہجے میں جھجک تھی شرمندگی تھی یوں جیسے وہ نا چاہتے ہوئے بھی گستاخی ہو رہی ہو۔

''حسن آرا یہ آپ کی عاجزانہ فطرت ہے جو آپ کو ایسا سوچنے پر مجبور کرتی ہے ورنہ ہم آپ کو گناہ گاہ کہاں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ ہم آپ کو گناہوں کی اس بستی میں رہتے بستے سے پہلے ہی یہاں سے باہر نکال لیں اور آپ اچھے سے جانتی ہیں کہ اس طرح اصل میں ہم اپنے ہی گناہ دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رہی بات آغا جی کی تو وہ آپ کی نہیں، ہماری پریشانی ہیں۔''

میر صاحب نے آگے کو ہو کر حسن آرا کی گود میں پڑا مونگ پھلی کا لفافہ اٹھایا اور مٹھی بھر لینے کے بعد لفافہ واپس حسن آرا کی طرف بڑھا دیا۔

''بس کھالیے۔'' حسن آرا نے لفافہ تھام لیا اور قدرے اداس لہجے میں بولی۔

Digitized by Google

''ہمارے باعث آپ کا اپنے گھر بار، خاندان اور اپنے ہی لوگوں کے ساتھ بگاڑ پڑے گا ایسے میں ہر لمحہ ہم احساس جرم کی گھٹن کا شکار رہیں گے۔ آپ کے اور آپ کے سارے خاندان کے مجرم بن جائیں گے۔''

میر صاحب نے مونگ پھلی کے چند دانے نکال لیے تھے وہ دانے میر صاحب حسن آرا کے ہاتھ پر ڈالتے ہوئے اپنے مخصوص اور دھیمے لہجے میں بولے۔

''آپ خود کو ایسی سوچوں میں مت الجھایا کریں کہیں کوئی بگاڑ نہیں پڑے گا آغا جی کو ہم اپنا موقف سمجھا چکے ہیں آپ بالکل بے فکر رہیں۔''

''آپ کے والد صاحب بھی تو ہیں آپ نے بتایا تھا کہ وہ الگ مزاج کے مالک ہیں وہ.....!''

''ہمیں یاد ہے۔'' میر صاحب نے پھونک مار کر ہتھیلی سے مونگ پھلی کے چھلکے اڑائے ہم نے بتایا تھا کہ ہم ایک روایت پرست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم خود بھی روایت پرست ہیں ہم روایات کے معاملے میں اعتدال کے قائل ہیں حسن آرا، ہمارا ماننا ہے کہ روایات کو کم از کم زندہ انسانوں پر ترجیح نہیں دینی چاہیے بابا سائیں اس وقت ملک سے باہر ہیں دو دن بعد ان کی واپسی ہوگی تب آغا جی خود ہی اس مدعے پر ان سے بات کرلیں گے باقی ہم۔'' میر صاحب نے بات کرتے کرتے ایک لمحے کو خاموش ہو کر حسن آرا کی طرف دیکھا جس کی نظریں دور ابر آلود افق پر جمی ہوئی تھیں میر صاحب بولے۔

''باقی ہم اپنی شریک حیات کو بھی آپ کا تعارف دے چکے ہیں۔'' حسن آرا نے فوراً ان کی طرف دیکھا تھا۔

''ہمارا تعارف۔''

''جی..... ہم انہیں سب کچھ صاف صاف بتا چکے ہیں آپ کے بارے میں بھی اور آپ کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی سب کچھ۔''

''پھر انہیں برا نہیں لگا۔'' سوال از خود اس کی زبان سے پھسل پڑا تھا۔

''برا تو شاید نہ لگا ہو لیکن دکھ تو ہوا ہوگا وہ ایک بہترین عورت ہیں اور اس سے بھی زیادہ بہترین شریک حیات جب آپ کی ملاقات زہرہ خاتون سے ہوگی آپ خود جان جائیں گی ہم نے جس توقع کے تحت ان سے بات کی اس میں زہرہ نے ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا انہوں نے معاملے اور صورت حال کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ ہمیں آپ کے ساتھ نکاح کر لینے کی اجازت بھی دے دی ہے۔''

''وہ بہت صابر، شاکر، متحمل اور عالی ظرف خاتون ہیں ہم ملاقات سے پہلے ہی انہیں جان گئے۔''

حسن آرا نے مسکراتے ہوئے ایک نظر مشتاق میر صاحب کے چہرے پر ڈالی۔ اسی وقت سیڑھیوں سے نزہت بیگم نمودار ہوئی اس کے پیچھے پیچھے سندس جہاں تھی جس نے ایک پلیٹ میں شربت کا گلاس اٹھا رکھا تھا وہ تو گلاس میر صاحب کو تھما کر واپس پلٹ گئی جبکہ نزہت بیگم تیسری کرسی پر براجمان ہوگئی۔

''ہم کس دن مولوی صاحب کو لے کر آئیں؟'' میر صاحب نے شربت کا گھونٹ بھرا اور نزہت بیگم کی طرف متوجہ ہوئے نزہت بیگم ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے میر صاحب لیکن جو آپ چاہتے ہیں اگر ویسا کچھ ہوا تو یہ کوٹھا ہماری قبر بن جائے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔''

''کیسے رکھیں کہاں سے رکھیں ہر بات اپنی جگہ میر صاحب ہم اوقات نہیں رکھتے کسی بھی حوالے سے نہ آپ کے مقابل نہ چوہدری کے سامنے اور نہ ہی آپ کے خاندان کے دیگر لوگوں کے سامنے آپ.....آپ خدا کے لیے ہمیں ایسی مشکل میں مت ڈالیں ہم غریب لوگ بے موت مارے جائیں گے۔''

نزہت بیگم کے لہجے میں بے بسی تھی اندیشے تھے وہ حالات و واقعات کی نزاکت اور سنگینی کو بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

''چوہدری اکبر کے علاوہ آپ شاید آغا جی ہی کی بات کر رہی ہیں ان سے بات کر چکے ہیں پرسوں شام آپ لوگوں نے انہی کی ایما پر تھانے سے بیان واپس لیا ہے آپ لوگ ایسا نہ کرتے تو ہم چند ہی روز میں چوہدری اکبر کو قانونی طور پر اس طرح پابند کر دیتے کہ وہ آئندہ کبھی بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا بہرحال ہم اب کسی اور طریقے سے

Digitized by Google

اسے سمجھالیں گے آپ کو ان میں سے کوئی پریشان نہیں کرے گا۔''

''یہ نہیں کریں گے تو کسی اور کو بھیج دیں گے کوئی اور آجائے گا۔'' میر صاحب خالی گلاس کرسی کے پائے کے ساتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''پھر ایسا کریں کہ آپ کبھی یہ جگہ چھوڑ دیں یا پھر یہ شہر ہی چھوڑ دیں اور..... اور اگر آپ چاہیں تو ہم اس ملک سے باہر آپ سب کے رہنے جینے کا انتظام کر دیتے ہیں بولیں جیسے آپ چاہیں جیسے کہیں۔''

میر صاحب فیصلہ کن موڈ میں تھے نزہت بیگم بے اختیار کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئی اس کی آنکھوں میں شدید تذبذب کسمسانے لگا تھا۔

''آپ نے تو مشکل اور بڑھا دی ہماری۔'' نزہت بیگم نے جیسے بلند آواز میں خود کلامی کی ہاں بھی مشکل ناں بھی مشکل ہم کریں تو کریں کیا؟''

''آپ بس ہاں ہی کیجیے مشکلات کو ہم خود ہی سنبھال لیں گے۔''

نزہت بیگم نے خاموش نظروں سے اپنی ہی طرف دیکھتی حسن آرا پر ایک نظر ڈالی پھر میر صاحب پر اور بے چینی سے ہونٹ چبا کر رہ گئی میر صاحب نے اس کی اس الجھن زدہ خاموشی کو مثبت جانا وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

''آج اتوار کا دن ہے اگلے چار روز نکال دیں جمعۃ المبارک کی شام ہم اسی وقت چار افراد کے ساتھ آئیں گے اور حسن آرا سے نکاح کر کے انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے ہمیشہ کے لیے آپ آج کی رات مزید سوچ لیں فون نمبر تو ہمارا آپ کے پاس ہے ہی جو آپ کہیں گی جو منہ سے نکالیں گی وہ جمعرات کی شام تک پورا کر دیا جائے گا۔'' اس لمحے نزہت بیگم کو میر صاحب کی ذات کچھ مزید زیادہ پر رعب محسوس ہوئی اس سے کوئی بھی بات نہ بن پائی بس بے اختیار تھوک نگل کر رہ گئی، بے شک اس کے دماغ میں بہت سے اندیشے کلبلا رہے تھے وہ چوہدری اکبر علی اور آغا جی کے حوالے سے واقعی خائف تھی لیکن میر صاحب کی پیشکش ان کی شاہانہ فراخ دلی سے اسے سمرائز کر دیا تھا اندر بری طرح لپیٹا اٹھا تھا۔

مغرب کی اذان شروع ہوئی تھی میر صاحب نے حسب عادت خاموشی اختیار کرتے ہوئے گردن قدرے خم کر لی۔ ان کی طرف دیکھتی ہوئی حسن آرا نے بھی بے اختیار ان کی تقلید کی اس کا رواں رواں نہال تھا نزہت بیگم نے پہلے حسن آرا کی طرف دیکھا پھر گردن گھما کر سر خم کیے بیٹھے میر ارشد اللہ کو دیکھنے لگی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ قسمت اور دولت کا دیوتا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اذان کے بعد میر صاحب کی خواہش پر نزہت بیگم نے نیچے جا کر ان کے لیے مصلہ بھجوایا میر صاحب نے آگے بڑھ کر چھت کے کونے میں مصلہ بچھایا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے حسن آرا ایک ٹک انہیں دیکھے گئی یوں جیسے جاگتی آنکھوں خواب دیکھا جائے کسی ایسی حقیقت کو دیکھا جائے کہ جیسے دیکھتے ہوئے بھی اپنے دیکھے پر یقین نہ آئے۔

میر صاحب تو نماز کے فوراً بعد جلد اگلی ملاقات کا کہہ کر روانہ ہو گئے حسن آرا چپ چاپ وہیں بیٹھی رہی اور اس مصلے کو دیکھتی رہی جیسے میر صاحب شاید کسی عجلت کی بدولت اسی جگہ بچھا چھوڑ گئے تھے اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو حسن آرا خوابیدہ سے انداز میں اٹھی اور جا کر بے خودی کے سے انداز میں مصلے پر کھڑی ہو گئی، کچھ دیر پہلے اس جگہ دنیا کا خوب صورت ترین انسان کھڑا تھا حسن آرا کے بے اختیار تکبر کے لیے اٹھے اور نماز کی نیت سے بندھ گئے بالکل اسی طرح کھڑا تھا وہ خوب صورت انسان وہ عظیم ترین اور مہربان انسان جس کا نام میر ارشد اللہ تھا۔

اسی رات بارہ بجے کے قریب کوٹھے پر اچانک ایک افراتفری کا ماحول بن گیا محفل اپنے شباب پر چوپٹ ہو گئی سازوں کا اچانک دم گھٹ گیا حسن آرا کو بخار تھا وہ اپنے کمرے میں لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھی کہ کچھ نامانوس آوازیں اور آہٹیں سن کر فوراً اٹھ کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی سامنے کا منظر دیکھتے ہی اسے کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

چار اونچے لمبے اور مضبوط ڈیل ڈول کے اجنبی افراد نور کو کالر سے دبوچے اس کمرے کی طرف آ رہے تھے نور کی حالت دگرگوں تھی گریبان پھٹا ہوا تھا اور ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔

''حسن آرا تم ہی ہو؟'' قریب پہنچتے ہی ان میں سے ایک نے خشک لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

Digitized by Google

"جج، جی۔" ان چاروں کے تیور انتہائی کرخت دکھائی دے رہے تھے۔

"کوئی دوپٹا چادر اوڑھو اور چلو۔"

"کک..... کدھر؟ آپ لوگ ہیں کون؟" وہ گھبرا گئی نور کو چھوڑ کر ایک طرف دھکا دے دیا گیا۔

"کوئی سوال نہیں۔" وہی شخص تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کوئی سوال نہیں، صرف کہے پر عمل کرو ایک منٹ کے اندر کوئی چادر اوڑھ کر خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو تو ہماری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی دوسری صورت میں ہم تمہیں اسی طرح اٹھا کر لے جائیں گے اور کوئی نرمی یا رعایت بھی نہیں کریں گے۔" انتہائی کھردرا اور دوٹوک انداز تھا حسن آرا کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ اگر اس نے ان کے کہے پر عمل نہ کیا تو یہ اپنے کہے پر عمل کر گزریں گے اسے ان کی بات مان لینے میں ہی بہتری محسوس ہوئی یہ الگ بات کہ اس کے دماغ میں ایک بھونچال سا برپا ہو گیا تھا۔

پھر جس وقت وہ سیاہ شال اچھے سے اوڑھ کر ان چار ڈشکروں کے ساتھ نیچے ہال میں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں صرف وہی چار اجنبی نہیں تھے وہ ایک جیسے ڈیل ڈول اور ایک جیسی سنجیدہ اور کرخت صورتوں والے آٹھ افراد تھے ان آٹھ کے علاوہ دو پولیس والے بھی ان کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ استاد مبارک اور ساجے کے علاوہ تمام سازندے ایک طرف قطار میں مرعوب بنے کھڑے تھے جبکہ نزہت بیگم، عشرت اور سندس ایک طرف گھٹنے قالین پر ٹیکے بیٹھی تھیں، چاندنیاں، گاؤ تکیے، پاندان اور پھول گجرے ہال میں سارا کچھ بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا اور اتنے افراد کی موجودگی کے باوجود وہاں کی گہری خاموشی کسی سنگین خرابی کا اشارہ دے رہی تھی حسن آرا کے وہاں پہنچتے ہی ایک گرانڈیل شخص نے نزہت بیگم کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چل بی بی اٹھ اور آگے لگ۔"

نزہت بیگم کے چہرے پر پریشانی تھی سراسیمگی تھی۔

"مائی باپ اتنا تو بتا دیں کہ ہمیں لے جا کہاں رہے ہیں۔"

نزہت بیگم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بے چارگی سے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"بکواس نہ کر چل آگے ہو۔" اس شخص نے اسے جھٹکے سے اٹھا کر کھڑا کیا اور دروازے کی طرف دھکا دیا۔

"ہم غریبوں سے کیا غلطی ہوئی ہے کچھ تو بتا دیں۔" نزہت بیگم ایک بار پھر منمنائی۔

"اس حرافہ کے سوال ایسے ختم نہیں ہوں گے زبان کاٹ کر پھینک پہلے اس کی۔" یہ وہ تھا جو حسن آرا کو نیچے لے کر آیا تھا لب و لہجہ میں ایسی سختی اور بے رحمی تھی کہ حسن آرا نے اپنے وجود میں ایک سرد لہری دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"نن..... نہیں میں خاموشی سے چل رہی ہوں۔"

نزہت بیگم کا تو پتا پانی ہو گیا تھا اس کے بعد وہ سب اسے اور حسن آرا کو لے کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔

حسن آرا کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو ان لوگوں کا تعلق آغا جی سے ہے اور ان دونوں کو انہی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔

بازار پوری طرح زندہ تھا ارد گرد کی تمام آنکھوں نے انہیں فوجیوں جیسے جوانوں کے گھیرے میں ایک بند باڈی کی ویگن میں بیٹھتے دیکھا کئی ایک سرگوشیاں اِدھر اُدھر سرسرائیں اور گلی کی نکڑ پر موجود تینوں گاڑیاں اسٹارٹ ہو کر کسی نامعلوم منزل کی طرف دوڑ پڑیں۔

.....☆☆.....

مرشد نے لاشعوری طور پر خنجر کی طرف دیکھا تو خنجر کو اس کے چہرے اور آنکھوں میں شدید حیرت اور بے یقینی دکھائی دی اس نے اپنے مخصوص انداز میں بھویں اچکا کر استفسار کیا مرشد رخ بدل کر ایک بار پھر دروازے کی جھرلی سے اندر جھانکنے لگا۔

محض چند قدم کا فاصلہ تھا رانا سرفراز ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے دوسرے صوفے پر محکمہ پولیس کا دیانت دار اور قابل ترین پولیس افسر، ڈپٹی اصغر علی اعوان نیم دراز تھا۔

ہفتہ دس دن پہلے جسے گوجرانوالہ کے قریب نامعلوم افراد نے پانچ سپاہیوں کو قتل کرنے کے بعد اغوا کر لیا تھا اور جس کی تلاش میں پولیس مسلسل کوششوں میں مصروف تھی وہ اس وقت یہاں مرشد کے سامنے محض چند قدم کے فاصلے پر

Digitized by Google

ایک صوفے پر پورے اطمینان کے ساتھ نیم دراز تھا اس کے ہاتھ میں ولایتی شراب کا گلاب تھا اور وہ انتہائی مدبرانہ انداز میں رانا سے مخاطب تھا۔

''مجھے دو کروڑ پورا چاہیے...... ٹھیک ہے کہ آپ کا تھوڑا فائدہ ہوگا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ فائدہ ہوگا بھی تو دہرا ہے نا۔''

''فرزند علی بری طرح جھنجلایا ہوا ہے باپ بیٹے کے درمیان خاصی تو تکرار کا بھی پتا چلا ہے۔ بس نہیں چل رہا ان لوگوں کا۔''

رانا میر فراز کی اطلاع پر ڈپٹی اعوان ایک بار پھر ہنسا۔

''بس...... بس کیا چلنا اب ان کا پوری طرح پھنسے ہوئے ہیں وہ لوگ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ ڈیمانڈ کم کرنے کا کہہ رہے ہیں۔

ذرا دو چار دن مزید انتظار کریں اعصاب چور چور ہوجائیں گے ان کے ہاتھ جوڑ کر ڈیمانڈ پوری کریں گے بس آپ...... آپ کو جیسے جیسے بتایا ہے آپ ویسے ہی کہانی چلاتے جائیں۔''

''اس طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں میں نے پوری طرح فرزند کا دماغ سیٹ کر رکھا ہے اور آج صبح تو اس کے باپ اکبر علی کی جھنجلاہٹ اور بے بسی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔'' رانا نے عقب میں صوفے سے پشت لگائی، جس وقت میں نے اسے بتایا کہ دو چار دن بعد ڈپٹی صاحب منظر عام پر آ کر اپنے اغوا کے حوالے سے ان لوگوں کے خلاف بیان دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اس شاہ چھوکری کی طرف سے ان کے خلاف چھ قتلوں کی ایف آئی آر درج کریں گے تو اکبر علی کے ماتھے پر پسینے اتر آئے تھے چہرہ بالکل ہی بجھ گیا تھا اس کا۔''

ڈپٹی اعوان نے مسکراتے ہوئے اپنی ران پر دو تین بار ہاتھ مارا۔

''انہیں اچھے سے سمجھ آ رہی ہے کہ وہ کس بری طرح الجھ چکے ہیں حجاب کے ماں باپ اور بھائیوں کے قتل تو ان کے سر ہیں ہی اب پانچ سپاہیوں کا خون بھی اسی طرح انہی کی گردنوں پر آ پڑتا ہے پنجاب پولیس کے پانچ جوانوں کا خون۔''

ڈپٹی نے عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی موٹی گردن کو

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

امید اور ناامیدی کے درمیان پرورش پاتی حسین داستانیں

ماہنامہ

حجاب کراچی

شائع ہوگیا ہے

محبت، نفرت کی آمیزش سے مزین ناقابل فراموش کہانیاں

میرے خواب زندہ ہیں

محبت و بے وفائی مرد کا شیوا ہے، وہ اس میں کسی مقام تک جا سکتا ہے، نادیہ فاطمہ رضوی کی خوب صورت تحریر

شب آرزو تیری چاہ میں

محبت و جذبات اور خود سری کا اثر لیے ایک پراثر دلکش تحریر

نائلہ طارق کے قلم کا ایک نیا انداز، ایک نئی کہانی

عشق دی بازی

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے

ریحانہ آفتاب کے قلم سے ایک خوب صورت تحریر

اس کے علاوہ دنیا ادب کے نئے ستارے ہر ماہ اس میں شامل ہیں

Infoohijab@gmail.com

021-35620771/2

0300-8264242

Digitized by Google

ایک ذرا جھٹکا دیا۔

"منکے ٹوٹ جائیں گے رانا جی گردنوں کی ہڈیاں ایک ایک جھٹکے میں ٹوٹیں گی گلے چر جائیں گے اندر سے۔"

تقریباً ساری کہانی ہی مرشد کی سمجھ میں آ گئی تھی ڈپٹی اعوان اور حجاب سرکار کے اغوا کی ساری کارروائی محض ایک سنگین ڈرامہ تھا اس ڈرامے میں پانچ سپاہیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور کچھ زخمی حالت میں شاید ابھی تک اسپتال میں پڑے تھے۔

چند روز پہلے ملنگی لوگوں کی قید کے دوران مرشد پر ظاہر ہوا تھا کہ چوہدری فرزند اور رانا سرفراز کسی شخص کی وجہ سے بری طرح پریشان ہیں مرشد کو ان کے کچھ جملے بھی یاد تھے۔

"وہ بہت کایاں بندہ ہے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا ہے۔"

"اس کو بھی موقع پر ہی پار کر دینا چاہیے تھا بھروسہ کر کے غلطی کی۔"

"اس معاملے کو بڑے تحمل اور سمجھداری سے دیکھنا پڑے گا چوہدری صاحب، جذباتی ہو کر جوش اور غصے سے کام لیا تو سارے کا سارا معاملہ بگڑ جائے گا ساری کہانی الٹی پڑ سکتی ہے۔" یقیناً ان کی پریشانی کا باعث ڈپٹی اعوان ہی تھا۔ رانا سرفراز کی عیاری و مکاری میں بھی کوئی کلام نہیں رہا تھا۔

ایک طرف وہ بظاہر چوہدری لوگوں کا مخلص و ہم درد اور ان کا مددگار و طرف دار تھا تو دوسری طرف وہ ڈپٹی کے ساتھ مل کر انہی چوہدریوں کیخلاف ایک انتہائی خطرناک کھیل، کھیل رہا تھا۔ ڈپٹی کی دیانتدار صورت کے عقب میں بد دیانتی کی ایسی مکروہ اور گھناؤنی تصویر چھپی ہو گی یہ شاید کبھی کسی کے گمان میں بھی نہیں آیا ہو گا۔

مرشد کا ایک سے بڑھ کر ایک کینہ فطرت اور خبیث ترین انسانوں سے واسطہ پڑ رہا تھا اور وہ انتہائی کرب سے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تمام کے تمام خبیث انسان نما جانور حجاب سرکار کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں وہ نازک اور معصوم جان تنہا اتنے سارے خون آشام بھیڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔

ڈپٹی اعوان کی اصلیت منکشف ہونے کے بعد مرشد کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا ایک نادیدہ آگ نے جیسے یکایک اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور ڈب سے پسٹل نکالتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ خنجر اس کے اس خاموش اور اچانک عملی فیصلے پر ایک لمحے کو گڑبڑایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی پسٹل نکالتے ہوئے اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا کمرے میں اے سی کی خوش گوار خنکی تھی اور ہلکی سی شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی پہلے ڈپٹی اعوان کی نظر ان پر پڑی اس کے چہرے کے تاثرات اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ مرشد کے ہونٹوں پر زہر خندی بے اختیار ایک مسکراہٹ اتر آئی ڈپٹی اضطراری انداز میں سیدھا ہو بیٹھا تو رانا سرفراز مرشد پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا مرشد اتنے میں ان کے سامنے جا پہنچا تھا۔

"بیٹھ جا...... واپس بیٹھ جا۔" اس نے پستول سے رانا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن رانا کی تو جیسے سماعت ہی پتھرا کر رہ گئی تھی۔ رانا اور ڈپٹی دونوں کے فرشتوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرشد یوں یہاں اچانک ان کے سر پر آ کھڑا ہو گا ڈپٹی کی نسبت رانا کی حالت زیادہ دگرگوں ہوئی تھی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں شراب کا سارا نشہ مرشد کی زیارت ہوتے ہی اڑن چھو ہو گیا تھا وہ اپنی جگہ سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہا تو مرشد نے اچانک اس کی پسلیوں میں لات رسید کی اور وہ لڑکھڑا کر پہلے صوفے پر گرا اور وہاں سے لڑھک کر فرش پر۔

"میں نے کہا تھا تجھے کہ بیٹھ جا۔" مرشد مزید دو قدم آگے بڑھا۔

"دیکھو، دیکھو مرشد یہ طریقہ درست نہیں تم...... تم ابھی پوری حقیقت نہیں جانتے...... بس...... سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" رانا بے اختیار فرش پر پیچھے کو سرکا مرشد نے اسے قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر کہا۔

"یہیں سکون سے بیٹھ جا رانا منہ سے ایک ذرا آواز نہ نکلے ورنہ تیری اس گندی کھوپڑی میں گولی مارتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

"ہاں، ٹھیک ہے...... ہوں...... اوں۔" رانا نے فرمانبردار بچوں کی طرح فوراً رضامندی ظاہر کرتے ہوئے باقاعدہ سختی سے ہونٹ بھینچ لیے خنجر، پسٹل سنبھال کر ایک طرف صوفے کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا مرشد نے ڈپٹی اعوان

Digitized by Google

کی طرف رخ بدلا جو اپنی جگہ گلاس تھامے بیٹھا تھا اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی نہیں تھی البتہ تھوڑی دیر پہلے والا اطمینان اور بشاشت نہیں غائب ہو چکی تھی۔

''واہ ڈپٹی صاحب واہ تو اصل ڈپٹی اصغر علی اعوان آپ ہیں جسے شاید کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔''

مرشد کے انداز میں دکھ سے بھری کڑک تپش تھی ڈپٹی نے اپنی سرخ اور موٹی آنکھوں سے مرشد کے دائیں ہاتھ میں موجود پسٹل کو ایک نظر دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر مرشد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے متفسرانہ انداز میں بولا۔

''کیا ہے یہ سب کس لیے کیوں؟''

''سرکار کہاں ہیں ڈپٹی۔''

''کون سرکار..... اچھا تم شاید حجاب بی بی کی بات کر رہے ہو بالکل محفوظ ہیں وہ مضبوط اور محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔''

اگر وہ مضبوط اور محفوظ ہاتھ تیرے ہیں تو آج کے بعد یہ ہاتھ تیرے جسم کے ساتھ نہیں رہیں گے اب صاف صاف بتا کہاں ہیں سرکار؟''

مرشد پستول پکڑے، ڈپٹی کے سامنے محض دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اس کے عقب میں قدرے دائیں ہاتھ صوفے کے ساتھ ہی رانا سرفراز فرش پر بیٹھا کبھی مرشد اور ڈپٹی کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اس صوفے کے عقب میں پستول تھامے کھڑے خنجر کی طرف خنجر پوری طرح چوکنا تھا اس نے برابر رانا اور ڈپٹی پر نظر رکھی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اس کا دھیان کمرے کے چوپٹ دروازے کی طرف بھی تھا۔

مرشد کے غضب ناک لہجے اور تیوروں پر ڈپٹی اعوان کی آنکھوں میں ایک ذرا نا گواری لہرائی پھر اس نے گلاس میں موجود باقی ماندہ شراب حلق میں انڈیلی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''سکون سے بیٹھ جاؤ مرشد بیٹھ کر بتاؤ کہ تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے، اس پرابلم کو ختم کر دیتے ہیں۔''

''سرکار کدھر ہیں؟'' مرشد کا لہجہ سرد ہو گیا وہ مشکل سے خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

''تمہارے اس سوال کا جواب میں دے چکا ہوں تم اطمینان رکھو وہ میری ذمہ داری ہیں۔''

''نہیں۔'' مرشد نے فوراً اس کی بات رد کی تم ہر ذمہ داری سے بری ہوئے سرکار اب صرف مرشد کی ذمہ داری ہیں بتاؤ کدھر رکھا ہے انہیں۔''

''دیکھو مرشد حجاب بی بی کی زندگی کے لیے از حد ضروری ہے کہ چوہدریوں کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے فٹ کر دیے جائیں اور اس کی میں کوشش کر رہا ہوں صرف چند دن مزید۔''

وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا کہ مرشد کی لات حرکت میں آئی ڈپٹی کے سینے پر اتنے زور کی ضرب پڑی تھی کہ اس کے منہ سے بے اختیار اوخ کی آواز خارج ہوئی وہ عقب میں موجود صوفے سے ٹکرایا اور صوفے سمیت دوسری طرف پلٹ کر گر پڑا۔

''اور تو نے چوہدریوں کی گردنوں میں وہ پھندے فٹ کرنے کے لیے اپنے ہی پانچ بے گناہ ماتحتوں کو قتل کرا دیا ہے۔'' مرشد نے ترش لہجے میں کہا ڈپٹی گرتے ہی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اس کی آنکھوں میں غیض و غضب کی چمک تھی تمتمایا ہوا چہرہ غصے کی وجہ سے کچھ مزید تمتما اٹھا تھا۔

''مرشد..... ہوش کے ناخن لو۔'' ڈپٹی کا انداز غرانے والا تھا اس کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے وہ کوئی عام آدمی جو نہیں تھا ڈپٹی ایس پی تھا افسرانہ شان تو اس کے خون تک میں گھلی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے میں تجھے بے ہوشی کے ٹھڈے روں گا تیرا سارا اندر باہر پھاڑ کر ڈھیر کر دوں گا اپنی سلامتی چاہتا ہے تو فوراً بتا دے کہ سرکار کو کدھر چھپا رکھا ہے؟'' مرشد ایک قدم آگے بڑھا تو ڈپٹی اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو مرشد بے وقوف مت بنو، میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں حجاب بی بی کے بھلے کے لیے کر رہا ہوں یہ سب حجاب بی بی کے پھوپھا ان کے ہونے والے سسر کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔''

مرشد ٹھٹک گیا ڈپٹی کا آخری جملہ اسے چونکا گیا تھا۔

''تمہارا اغوا میرے ساتھیوں کا قتل، میرا اشتہاری ہونا تمہارے ماتحت پولیس ملازموں کا قتل اور اب تمہارا یہ دو کروڑ والا ڈرامہ تمہارے مطابق یہ سب سرکار کے پھوپھا

Digitized by Google

بلوچستان والے ان کے کہنے پر کیا گیا ہے۔" اس نے اپنی نظریں ڈپٹی کے چہرے پر گاڑھ دیں۔

"ہاں، میں یہی کہہ رہا ہوں اور یہ جو اتنا کچھ ابھی تم نے گنا ہے اغوا، قتل، کروڑ وغیرہ وغیرہ یہ سب غیر قانونی ہیں لیکن ان سب کے احکامات مجھے ڈی آئی جی صاحب نے براہ راست دیے ہیں ذاتی طور پر ملاقات کر کے۔"

ڈپٹی نے صوفہ اٹھا کر سیدھا کیا پھر سینے پر قمیص کی جگہ لگی ہوئی مٹی جھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔

"اس واہیات پرزے کو ایک طرف کرو اور اپنے خون کے ابال پر بھی تھوڑا قابو رکھو، سکون سے بیٹھ کر پہلے سب جان سمجھ لو۔"

ڈپٹی کے انداز میں سخت ناگواری اور بدمزگی تھی۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جاؤ بغیر بولے سنے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی کو اپنے قریب سرکایا جس پر شراب اور سوڈے کی بوتل دھری تھی مرشد کو اس کے تاثرات اور لب و لہجے کے اعتماد و روانی نے متذبذب کر دیا۔

لیکن اسے ڈپٹی کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا بے یقینی پیدا کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔

"انہیں بھلا اتنا بڑا کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بڑا کھڑاگ ہونہہ۔" ڈپٹی استہزائیہ سے ہنسا۔

"تمہیں یہ بڑا کھڑاگ لگ رہا ہے یہ کچھ نہیں ہے یہ سب تو ایک بہت پرانی دشمنی کا محض ایک حصہ ہے اتنی پرانی دشمنی کہ جب یہ خطہ برصغیر کہلاتا تھا انگریز راج تھا یہاں پر یہ سب کچھ اسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔"

ڈپٹی نے دو گلاس تیار کیے تھے ایک خود سنبھال کر دوسرا اس نے مرشد کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر یہ چوہدریوں اور سید سرکار لوگوں کی کسی پرانی دشمنی کا حصہ ہے تو اس دشمنی سے میرا کیا لینا دینا میرے اور میرے ساتھیوں کے قتل کا منصوبہ کس نے بنایا اور کیوں؟" مرشد نے خشک انداز میں ایک اور سوال کرتے ہوئے ڈپٹی کے ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا ڈپٹی کو چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی پھر وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

"منصوبہ صرف تمہارے قتل کا تھا تمہارے ساتھیوں کو ملتفی نے اپنے طور پر اس سب میں شامل کیا رہی بات یہ کہ یہ منصوبہ بنایا کس نے تو یہ تمہاری حجاب سرکار کے پھوپھا کا کام ہے یعنی بڑی سرکار کا۔"

"بڑی سرکار پر اس نے مسکراتے ہوئے زور دیا تھا۔

مرشد کے دماغ کو جھٹکا سا لگا یہ تو عجیب بات تھی وہ بولا تو حیرت و بے یقینی کا عنصر اس کے لہجے میں شامل تھا۔

"کیوں۔ وہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگے؟ مجھ سے انہیں کیا دشمنی ہے ہم تو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔" ڈپٹی کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی اس نے شراب کا گھونٹ بھرا اور بائیں طرف پڑے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹھ جاؤ مرشد بیٹھ کر سننے سے بھی بات سمجھ آجاتی ہے۔" مرشد نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا اور خالی گلاس ڈپٹی کے برابر صوفے پر اچھال کر خود بائیں ہاتھ موجود صوفے پر ٹک گیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے۔"

اس کے سوال پر ڈپٹی چند لمحے خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر اسی طرح دیکھتے دیکھتے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"صرف تم نہیں جانتے انہیں وہ تمہیں جانتے ہیں میں سارا کچھ تو نہیں جانتا بس میرا اندازہ ہے کہ تمہارے قتل کے منصوبے کی وجہ تمہاری والدہ ہو سکتی ہے۔"

ڈپٹی کی یہ بات بھی مرشد کے لیے قطعی غیر متوقع اور عجیب تھی وہ ناگواری سے بولا۔

"اب اس بکواس کا کیا مطلب ہوا؟"

"اگر یہ وجہ تمہیں بکواس لگتی ہے تو پھر دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بڑی سرکار کی جان کاری کے مطابق تم حجاب بی بی کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہو اور متوقع طور پر آنے والے وقت میں تم یقینی طور پر ان کے لیے ذلت اور تکلیف کا باعث بنو گے جو انہیں کسی صورت بھی گوارہ نہیں۔" ڈپٹی نے بات مکمل کرتے ہی گلاس ایک بار پھر ہونٹوں سے لگا لیا۔ مرشد کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا ایک ٹک دیکھے گیا پھر اچانک ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا

Digitized by Google

ہوا۔

''یہ سب بکواس ہے جھوٹ بول رہا ہے تو میرے نبی پاک کی آل اولاد میں سے کوئی بھی اتنا بے درد اور بے رحم نہیں ہوسکتا جو یوں ظالمانہ انداز میں دوسرے انسانوں کو قتل کراتا پھرے تو سراسر فضول بھونک رہا ہے اب فوراً سے پہلے مجھے یہ بتا دے کہ حجاب سرکار کو کدھر رکھا ہے جلدی بول۔'' یک بہ یک مرشد کے تیور ہی بدل گئے تھے اسے خیال آ گیا تھا کہ اب سے دو تین گھنٹے قبل ملنگی اور فوجی متوقع طور پر سرکار کو کسی دوسری جگہ سے لا کر یہاں چھوڑ گئے تھے ان کی آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کی خبر ملی تھی اب ڈپٹی اعوان کی یہاں موجودگی سے کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ وہ سچ میں حجاب سرکار ہی تھیں اور اس وقت یقینی طور پر اسی عمارت میں کہیں قید تھیں۔

''وہ جہاں ہیں وہاں انہیں بڑی سرکار نے رکھا ہے۔''

''غلط جواب۔'' مرشد آگے بڑھ کر ڈپٹی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت اسی کوٹھی میں موجود ہیں صرف اتنا بتاؤ کہ کدھر ہیں وہ؟''

''اس کوٹھی میں؟'' ڈپٹی نے اچنبھے سے کہا۔

''یہ تم سے کس نے اوراخ۔''

مرشد کی بھرپور لات ایک بار پھر اس کے سینے پر پڑی اور الفاظ اس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے صوفہ ایک بار پھر الٹتے الٹتے بچا۔

''اداکاری نہیں ڈپٹی صاحب مجھے معلوم ہے کہ اب سے ڈھائی تین گھنٹے پہلے ملنگی فوجی ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں یہاں لائے ہیں رانا اور وہ لوگ آگے پیچھے ہی یہاں پہنچے تھے۔'' اس بار ڈپٹی اعوان نے چونک کر رانا سرفراز کی طرف دیکھا مرشد بھی اس کی طرف پلٹا۔

''کیوں رانا؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔''

رانا نے گھبرائے ہوئے انداز میں باری باری ان تینوں کی صورتیں دیکھیں۔

''تم..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مرشد۔'' رانا سرفراز کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ خنجر نے آگے جھکتے ہوئے پسٹل کی نال سے اس کے سر پر ضرب لگائی رانا بے اختیار کراہ اٹھا تھا۔

''غلط فہمی کی سٹ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سیدھی طرح بک کدھر ہیں وہ؟'' خنجر نے آنکھیں نکالیں رانا فوراً بولا۔

''مم..... میں سچ کہہ رہا ہوں، وہ..... وہ نہیں ہے۔''

''تو کون ہے؟'' مرشد ڈپٹی کی طرف سے دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔

''وہ تو..... وہ تو ایک کنجری ہے۔'' مرشد نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر لیا۔

''ایک مہمان خنجر کے منہ سے کسی دوسرے کے لیے یہ لفظ کچھ اچھا نہیں لگتا کدھر ہے وہ؟''

''اوپر اوپر کے ایک کمرے میں۔'' رانا کے تو جیسے سانس ہی خشک ہو گئے تھے مرشد اور خنجر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مرشد رانا کو گریبان سے جھٹکا دے کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔

''چل مجھے دکھا وہ کمرہ خنجر ذرا ڈپٹی صاحب کا دھیان رکھنا طبیعت خراب نہیں ہونی چاہیے ان کی۔'' خنجر مسکرا کر بولا۔

''ڈپٹی صاحب سیانے بندے ہیں کچھ نہیں ہوتا ان کی طبیعت کو بے فکر رہو۔''

مرشد، رانا کو کالر سے دبوچے لاؤنج میں پہنچا وہاں موجود سیڑھیوں کے ذریعے وہ دوسری منزل کے ایک کوریڈور میں پہنچے جس میں زیرو پاور کے دو بلب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر روشن تھے رانا سرفراز مرشد کو لے کر کوریڈور میں موجود دوسرے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا دروازے میں مضبوط قفل تھا۔ جسے رانا نے جیب سے چابی نکال کر کھولا۔

رانا سے بتا چکا تھا کہ یہ کوئی اور لڑکی ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں مرشد کے دل میں ایک موہوم سی امید بھی تھی کہ شاید ڈپٹی اداکاری کر رہا ہو شاید رانا جھوٹ بول رہا ہو شاید دروازہ کھلے اور آنکھوں کے سامنے وہی چہرہ آ ٹھہرے جس کی دید کی طلب میں اس کی آنکھیں کب سے سلگ رہی تھیں جل رہی تھیں۔

دروازہ خود اس نے ہی دھکیل کر کھولا تھا اندر روشنی تھی مرشد نے رانا کو کالر سے جھٹکا دے کر کمرے کے اندر دھکیلا اور پھر خود بھی اندر داخل ہو گیا اس کمرے میں بھی اے سی کی ٹھنڈک موجود تھی دروازے سے قدرے بائیں ہاتھ، بغلی

Digitized by Google

دیوار کے ساتھ ایک انتہائی نفیس بیڈ موجود تھا اور اس بیڈ پر بیٹھی پریشان صورت پر نظر پڑتے ہی مرشد بے اختیار ٹھٹک گیا وہ حجاب سرکار تو ہرگز نہیں تھی لیکن وہ مرشد کے لیے کوئی اجنبی یا نا آشنا بھی نہیں تھی مرشد اسے دیکھتے ہی متعجب ہوا تھا تو اس صورت پر بھی جیسے مرشد پر نظر پڑتے ہی حیرت و بے یقینی کے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھے مگر یہ کیفیت محض چند لمحوں کے لیے رہی پھر اس چہرے اور ان آنکھوں میں ایک رونق ایک گہرا اطمینان سرایت کرتا چلا گیا وہ کوئی اور نہیں فیروزہ تھی اس کی پڑوسن اس کی عاشق۔

''کیسے پہنچی ہو یہاں؟'' مرشد نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''مجھے زبردستی لایا گیا ہے چار بدمعاش صورت بندے مغرب کے بعد اچانک اندر گھس آئے تھے پھر ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے مجھے گھسیٹ کر لے آئے۔'' کمرے کی فضا اچانک ایک زور کی چٹاخ سے گونج اٹھی مرشد نے رانا سرفراز کے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا وہ لڑکھڑا گیا۔

''کیوں، اب اس سے کون سی دشمنی ہے تیری بول بتا؟'' مرشد نے آگے بڑھ کر رانا کو دو تین تھپڑ اور ٹکا دیے دو تین ضربیں پسٹل کے دستے سے بھی لگائیں رانا بری طرح کراہنے لگا فیروزہ کے چہرے پر سکون کی روشنی سی پھیل گئی وہ وہیں بیٹھے بیٹھے عجیب محبت پاش نظروں سے مرشد کو دیکھنے لگی تھی۔

''بتا بول اپنی اس ماں سے کون سی دشمنی چکانا چاہ رہا ہے۔'' مرشد نے پسٹل کے دستے سے اس کی گدی میں ایک زوردار ضرب لگائی تو رانا کراہ کر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔

''میری کوئی دشمنی نہیں، کوئی بھی دشمنی نہیں اس سے۔''

''تو پھر اس کو یوں اٹھوایا کیوں ہے رانڈ کھانے۔'' مرشد نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی رانا بری طرح بلبلاتے ہوئے فرش پر لڑھک گیا۔

''یہ یہ میں نے اپنے ایک کاروباری ساتھی کے کہنے پر کیا ہے اس نے اس کام کے لیے میرے ساتھ سودا طے کیا تھا۔

اچانک کوٹھی کے سامنے کے رخ سے مدہم سی ہارن کی آواز سنائی دی تو مرشد کے کان کھڑے ہو گئے وہ رانا کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کمرے میں سامنے کے رخ موجود کھڑکی تک پہنچ گیا ایک ذرا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو کوٹھی کا گیٹ اسے بالکل سامنے دکھائی دیا گیٹ کے اس طرف باہر ایک کار کھڑی تھی اور ملازم لڑکا تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''یہ وہی ہوگا۔'' رانا کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔

''جس نے میرے ساتھ سودا طے کیا تھا میں نے اسے بارہ بجے کے بعد یہاں آنے کا کہا تھا یہ وہی ہوگا مجھے نہیں بتا اس کی، اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے میری بالکل بھی کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' رانا سرفراز، مرشد کی توقع سے بھی زیادہ بزدل اور بودا نکلا تھا اس نے جب سے مرشد کو یہاں دیکھا تھا تب سے اس کی مٹی گم تھی رنگت متغیر تھی مرشد کی دہشت نے اسے پوری طرح اپنے نرغے میں لے رکھا تھا لڑکا گیٹ تک پہنچ چکا تھا مرشد کی نظریں کار پر جمی ہوئی تھیں کار کی اندرونی لائٹ روشن تھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص بخوبی دکھائی دے رہا تھا لیکن بلندی پر ہونے کی وجہ سے مرشد کی نظر سے اس کا چہرہ اوجھل تھا۔

مرشد کی توجہ یا تو نیچے گیٹ پر تھی یا پھر رانا سرفراز کی طرف نیچے کوٹھی کے اندرونی حصے سے اچانک گولی چلنے کی آواز بلند ہوئی تو مرشد بری طرح چونک پڑا آواز مدہم تھی لیکن اضح طور پر پسٹل کے فائر کی تھی اس کا دھیان فوراً خنجر اور ڈپٹی اعوان کی طرف چلا گیا ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا فائر ہوا چند ثانیے کے وقفے سے دو فائر مزید کیے گئے مرشد بے اختیار کمرے کے دروازے کی طرف دوڑا ان لمحوں اس کی نظروں کے سامنے خنجر کی صورت تھی اور بس.....

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Digitized by Google